BAIS601DST

تحریکات، ادارے اور مفکرین

Movements, Institutions and Thinkers

بیچلر آف آرٹس (بی۔اے۔)

(چھٹا سمسٹر)

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد-32، تلنگانہ-انڈیا

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Course: Movements, Institutions and Thinkers
ISBN: 978-81-974230-2-4
First Edition : **May, 2024**

Publisher	:	Registrar, Maulana Azad National Urdu University
Publication	:	2024
Copies	:	700
Price	:	**400**/-(The price of the book is included in admission fees of distance mode students)
Copy Editing	:	Dr. Mohammad Haziq, DDE, MANUU, Hyderabad
Cover Designing	:	Dr. Mohd Akmal Khan, DDE, MANUU, Hyderabad
Printer	:	Print Time & Business Enterprises, Hyderabad

Movements, Institutions and Thinkers
for
Bachelor of Arts (6th Semester)

On behalf of the Registrar, Published by:
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-500032 (TS), India
*Director:*dir.dde@manuu.edu.in*Publication:*ddepublication@manuu.edu.in
Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

© *All right reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing form the publisher (registrar@manuu.edu.in)*

Editor	ایڈیٹر
Prof. Syed Alim Ashraf Head Dept. of Arabic, MANUU, Hyderabad	پروفیسر سید علیم اشرف صدر شعبہ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
Language Editors	**لینگویج ایڈیٹرس**
Dr. Mohammad Haziq *Assistant Professor(Contractual), / Guest Faculty (Islamic Studies), DDE, MANUU*	ڈاکٹر محمد حاذق اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی (اسلامک اسٹڈیز)، ڈی ڈی ای، مانو
Dr. Mohd. Akmal Khan *Assistant Professor(Contractual), / Guest Faculty (Urdu), DDE, MANUU*	ڈاکٹر محمد اکمل خان اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی (اردو)، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو

Editorial Board	مجلس ادارت
Prof. Abdul Ali *Former Head, Dept. of Islamic Studies, AMU, Aligarh*	پروفیسر عبد العلی سابق صدر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
Prof. S. M. Azizuddin Husain *Former Head, Dept. of History & Culture JMI, New Delhi*	پروفیسر ایس۔ ایم۔ عزیز الدین حسین سابق صدر، شعبہ تاریخ و ثقافت، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
Prof. Mohammad Ishaque *Prof. of Islamic Studies, JMI, New Delhi*	پروفیسر محمد اسحاق پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
Prof. Mohd. Fahim Akhter *Dept. of Islamic Studies, MANUU*	پروفیسر محمد فہیم اختر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
Prof. Ghazanfar Ali Khan *Prof., of Islamic Studies, Kashmir Campus, MANUU*	پروفیسر غضنفر علی خان پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، کشمیر کیمپس، مانو
Dr. Abdul Majeed Qadeer Khwaja *Asst. Prof., Islamic Studies, DDE, MANUU*	ڈاکٹر عبد المجید قدیر خواجہ اسسٹنٹ پروفیسر، اسلامک اسٹڈیز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو
Dr. Mohammad Haziq *Assistant Professor(Contractual)/ Guest Faculty (Islamic Studies), DDE, MANUU*	ڈاکٹر محمد حاذق اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی (اسلامک اسٹڈیز)، ڈی ڈی ای، مانو
Dr. Syeda Amina *Assistant Professor(Contractual)/ Guest Faculty (Islamic Studies), DDE, MANUU*	ڈاکٹر سیدہ آمنہ اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی (اسلامک اسٹڈیز)، ڈی ڈی ای، مانو

کورس کو آرڈی نیٹر

پروفیسر سید علیم اشرف

صدر شعبہ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مصنفین	اکائی نمبر
ڈاکٹر عبد الرقیب، حیدر آباد	1
ڈاکٹر صالح امین، ریسرچ ایسوسی ایٹ، (ڈی ٹی ایل پی) مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	2،6
ڈاکٹر محمد حاذق، اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی، اسلامک اسٹڈیز، نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مانو	3،5،15،17
ڈاکٹر صلاح الدین، حیدر آباد	4
مولانا اشہد جمال ندوی، پی جی ٹی ٹیچر، سینیر سیکنڈری اسکول، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	7،8
پروفیسر غضنفر علی خاں، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، کشمیر کیمپس، مانو	9
ڈاکٹر سیدہ آمنہ، اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی، اسلامک اسٹڈیز، نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مانو	10،11
مولانا عمیر الصدیق، ریسرچ فیلو، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ	12،13
ڈاکٹر مزمل کریم، اسسٹنٹ پروفیسر (ٹمپروری) شعبہ عربی، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنو	14،23،24
ڈاکٹر شکیل احمد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، کشمیر کیمپس، مانو	16
ڈاکٹر عاطف عمران، گیسٹ فیکلٹی، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	18،19
ڈاکٹر محمد عبد الباری، اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	20
ڈاکٹر سراج الدین، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	21
محمد خالد، کنٹنٹ ڈیولپر بائز وبیہ، حیدر آباد	22

نوٹ: زیر نظر کتاب علمی مواد (**Study Material**) مختلف مصنفین نے لکھا ہے اور اس سے کو آرڈی نیٹر و ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

پروف ریڈرس:

اول	:	ڈاکٹر محمد حاذق
دوم	:	ڈاکٹر سیدہ آمنہ
فائنل	:	پروفیسر سید علیم اشرف

فہرست

پیغام	وائس چانسلر	7
پیغام	ڈائرکٹر	8
کورس کا تعارف	کورس کوآرڈی نیٹر	9

بلاک 1 :ہندوستانی تحریکات

اکائی1	جمعیت علمائے ہند	11
اکائی2	تبلیغی جماعت	27
اکائی3	جماعت اسلامی ہند	42
اکائی4	سنی بریلوی جماعت	55

بلاک 2 :عالم اسلام کی تحریکات

اکائی5	وہابی تحریک	73
اکائی6	سنوسی تحریک	85

بلاک 3 :عالم اسلام کی تحریکات

اکائی7	الاخوان المسلمون(حصہ اول)	99
اکائی8	الاخوان المسلمون(حصہ دوم)	113
اکائی9	نہضۃ العلماء	128
اکائی10	نورسی تحریک(حصہ اول)	142
اکائی11	نورسی تحریک(حصہ دوم)	158

بلاک 4 :ہندوستانی ادارے

اکائی12	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (حصہ اول)	173
اکائی13	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (حصہ دوم)	188
اکائی 14	دارالعلوم دیوبند	206
اکائی15	ندوۃ العلماء	221
اکائی16	جامعہ ملیہ اسلامیہ	234

بلاک5 : ہندوستان کے اہم مفکرین

اکائی17	شیخ احمد سرہندی	248
اکائی18	شاہ ولی اللہ (حصہ اول)	261
اکائی19	شاہ ولی اللہ (حصہ دوم)	275
اکائی20	شبلی نعمانی	289

بلاک 6:ہندوستان کے اہم مفکرین

اکائی21	اشرف علی تھانوی	307
اکائی22	محمد اقبال	320
اکائی23	ابوالکلام آزاد (حصہ اول)	334
اکائی24	ابوالکلام آزاد (حصہ دوم)	347
	نمونہ امتحانی پرچہ	359

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی۔ اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔ (1) اردو زبان کی ترویج و ترقی (2) اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی (3) روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور (4) تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔ یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔ کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند "ادبی" اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔ یہی کیفیت اکثر رسائل و اخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اُردو قاری اور اُردو سماج دور حاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔ چاہے یہ خود ان کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد و پیش ماحول کے مسائل ہوں، عوامی سطح پر اِن شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے۔ یہی وہ چیلنجز ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔ نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ اِسکولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیر بحث آتے ہیں۔ چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ یونیورسٹی کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرین علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ ہماری یونیورسٹی اپنی تاسیس کی 25 ویں سالگرہ منا رہی ہے، مجھے اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یونیورسٹی کا نظامتِ فاصلاتی تعلیم از سر نو اپنی کارکردگی کے نئے سنگِ میل کی طرف رواں دواں ہے اور نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی جانب سے کتابوں کی اشاعت اور ترویج میں بھی تیزی پیدا ہوئی ہے۔ نیز ملک کے کونے کونے میں موجود تشنگانِ علم فاصلاتی تعلیم کے مختلف پروگراموں سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ گرچہ گزشتہ برسوں کے دوران کووڈ کی تباہ کن صورتِ حال کے باعث انتظامی امور اور ترسیل و ابلاغ کے مراحل بھی کافی دشوار کن رہے تاہم یونیورسٹی نے اپنی حتی المقدور کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے پروگراموں کو کامیابی کے ساتھ روبہ عمل کیا ہے۔ میں یونیورسٹی سے وابستہ تمام طلبا کو یونیورسٹی سے جڑنے کے لیے صمیم قلب کے ساتھ مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کی علمی تشنگی کو پورا کرنے کے لیے مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کا تعلیمی مشن ہر لمحہ ان کے لیے راستے ہموار کرے گا۔

پروفیسر سید عین الحسن

وائس چانسلر

پیغام

موجودہ دور میں فاصلاتی طریقۂ تعلیم کو پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی ضروریات کے پیش نظر فاصلاتی طرز تعلیم کو متعارف کرایا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز 1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم سے ہوا اور 2004 میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم (Regular Courses) کا آغاز ہوا اور بعد ازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔

ملک میں تعلیمی نظام کو بہتر انداز سے جاری رکھنے میں یو جی سی کا مرکزی کردار رہا ہے۔ فاصلاتی تعلیم (ODL) کے تحت جاری مختلف پروگرام UGC-DEB سے منظور شدہ ہیں۔ UGC-DEB اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کماحقہ ہم آہنگ کر کے فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ (Dual Mode University) ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق Credit Based Credit System (CBCS) نظام متعارف کرایا گیا اور خود اکتسابی مواد (Self Learning Material) از سرِ نو، جس میں یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کیا گیا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ سترہ (17) کورسز چلا رہا ہے۔ ساتھ ہی تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جا رہے ہیں۔ متعلمین کی سہولت کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں 9 علاقائی مراکز بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر اور 6 ذیلی علاقائی مراکز حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک موجود ہے۔ اس کے علاوہ وجے واڑہ میں ایک ایکسٹنشن سنٹر بھی قائم کیا گیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِ دست 160 سے زیادہ متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centres) نیز 20 پروگرام سنٹرس (Programme Centres) کام کر رہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ نظامت فاصلاتی تعلیم اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا بھرپور استعمال کرتا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جا رہی ہیں، نیز آڈیو۔ویڈیو ریکارڈنگ کا لِنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ای میل اور وہاٹس ایپ گروپ کی سہولت فراہم کی گئی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔ پچھلے دو سال سے ریگولر کاؤنسلنگ کے علاوہ ایڈیشنل رمیڈیل آن لائن کاؤنسلنگ مہیا کی جا رہی ہے تاکہ طلبا کے تعلیمی معیار کو بلند کیا جا سکے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو عصری تعلیم کے مرکزی دھارے سے جوڑنے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہو گا۔ آنے والے دنوں میں تعلیمی ضروریات کے پیش نظر نئی تعلیمی پالیسی (NEP-2020) کے تحت مختلف کورسز میں تبدیلیاں کی جائیں گی اور امید ہے کہ یہ فاصلاتی نظام کو زیادہ مؤثر و کارگر بنانے میں مددگار ثابت ہو گی۔

پروفیسر محمد رضا اللہ خان
ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے لیے یہ بات انتہائی باعث مسرت ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی)، ڈسٹنس ایجوکیشن بیورو (ڈی ای بی) کے 2017 ضابطوں اور دوسرے ترمیمی ضوابط 2018 کے مطابق اسلامک اسٹڈیز کے موضوع پر اردو زبان میں درسی مواد تیار کیا گیا ہے۔ یو جی سی ہدایت کے تحت یونیورسٹی کے روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کے لیے ایک ہی نصاب لازمی قرار دیا گیا ہے؛ تاکہ نہ صرف ان دونوں نظام تعلیم کے طلبہ کا معیار یکساں ہو، بلکہ حصول تعلیم کے لیے فراہم کی جانے والی مختلف سہولیات کے اس دور میں ایک نظام تعلیم کے طلبہ کے لیے دوسرے نظام تعلیم کی طرف منتقلی بھی قابل عمل ہو۔

ان ضوابط کے تحت یونیورسٹی میں فراہم کیے جارہے تمام مضامین میں روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کا ایک ہی نصاب تیار کیا گیا، اور اس کے مطابق درسی مواد کی تیاری کی گئی جو بیک وقت دونوں نظام تعلیم کے طلبہ وطالبات کے لیے ذریعہ استفادہ بن سکے۔ یہ مواد بی اے کے تین سالہ (چھ سمسٹر) کورس اور ایم اے کے دو سالہ (چار سمسٹر) کورس کے لیے تیار کروایا گیا ہے۔ اس درسی مواد کی تیاری میں ملک بھر کے ماہرین اسلامیات، دانشوران اور اسلامی علوم پر گہری نظر رکھنے والے علما کی معیاری خدمات یونیورسٹی کو حاصل رہیں، اور اس میں اسلامیات کے تقریباً تمام ہی موضوعات اور پہلوؤں کا جامع احاطہ کیا گیا۔ اس طرح یونیورسٹی کے ذریعے تیار ہونے والا یہ درسی مواد ایک معیاری، ہمہ گیر اور اسلامیات کے پورے کورس پر محیط بن کر تیار ہوا، جس سے نہ صرف یہ کہ اسلامک اسٹڈیز کے طلبہ وطالبات کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل ہوئی بلکہ اسلامی مطالعات کے میدان میں قابل قدر اضافہ ہوا۔

اس نصاب کی تیاری میں قدیم نصاب کی خوبیوں کو باقی رکھتے ہوئے ضروری حذف واضافہ اور جدید تحریر کے ساتھ مضامین کی ایسی ترتیب اختیار کی گئی جو دونوں روایتی اور فاصلاتی تعلیم کے نظام کی ضرورت بیک وقت پوری کرسکے۔

یکساں نصاب کی تیاری کے بعد اسی کے مطابق درسی مواد کی تیاری بھی مطلوب تھی جس میں نئے نصاب کے مطابق پرانے تحریر شدہ مواد میں کہیں کم اور کہیں زیادہ حذف وترمیم اور تبدیلی کی ضرورت تھی۔ کئی مقامات پر کم یا زیادہ اضافہ بھی مطلوب تھا۔ بعض ذیلی عناوین پر بالکل نئی تحریر لکھنے کی ضرورت تھی اور بعض جگہوں پر مکمل اکائی کے اضافہ کی بھی ضرورت پیش آئی۔ ان سب کے علاوہ مواد کی ترتیب کو نئے نصاب کے مطابق بنایا گیا۔ نیز ہر اکائی کے تحت اکتسابی نتائج اور متنوع قسم کے سوالات کے تفصیلی نمونے شامل کیے گئے۔ ان تبدیلیوں کے بعد تیار ہونے والا مواد قدیم وجدید کا مجموعہ بن کر سامنے آیا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہم بی اے کے کورس کی یہ کتاب آپ کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ چھٹے سمسٹر کے اس پرچہ کا عنوان 'تحریکات ادارے اور مفکرین' ہے۔ یہ روایتی تعلیم کے تحت بی۔ اے سمسٹر ششم کے لیے ہے۔ اس پرچہ میں کل چوبیس اکائیاں ہیں، جن کو چھ بلاکس میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان بلاکس میں مختلف اسلامی تحریکات، مختلف مسلم ادارے اور معروف مفکر شخصیات سے متعلق تمام اہم معلومات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس پرچہ کا پہلا بلاک ہندوستان میں رونما ہونے والی تحریکات کے بارے میں ہے اور دوسرا اور تیسرا بلاک ان اسلامی تحریکات سے متعلق ہے جو مختلف مسلم ممالک میں احیائے اسلام اور اس کی حفاظت کے لیے رونما ہوئیں۔ چوتھا بلاک ہندوستان کے ان مسلم اداروں سے متعلق ہے، جو مغربی استعمار اور نظریات کے رد عمل کے طور اسلامی تعلیمات کی حفاظت اور مسلمانوں کی انفرادی شناخت کو باقی رکھتے ہوئے، عصری علوم سے آراستہ کرنے کے لیے وجود میں آئے۔ آخری دو بلاک میں ہندوستان کے اہم مفکرین پر تحریری مواد موجود ہے۔ اس کتاب میں ان سبھی عنوانات سے متعلق تحریری مواد مہیا کیا گیا ہے۔

پروفیسر سید علیم اشرف

کورس کوآرڈی نیٹر

تحریکات، ادارے اور مفکرین

Movements, Institutions and Thinkers

اکائی 1: جمعیت علمائے ہند

اکائی کے اجزا:

1.0 تمہید

1.1 مقاصد

1.2 قیام

1.2.1 اصول وضوابط

1.3 ترک موالات اور جمعیت علمائے ہند

1.4 جمعیت کی اجلاس اور اس کے مقاصد

1.4.1 ستیہ گرہ اور جمعیت علماء

1.4.2 جمعیت علمائے ہند کا نیا انتخاب

1.4.3 ''ادارہ حربیہ''جمعیت کا فعال ادارہ

1.4.4 1942ء کی انقلابی تحریک اور جمعیت کا موقف

1.4.5 ما قبل آزادی جمعیت کے دو حصے

1.5 جمعیت علماء ہند کے اغراض اور تعمیری پروگرام

1.5.1 اغراض ومقاصد

1.5.2 تعمیری پروگرام

1.5.3 جمعیت علماء ہند کی دو شاخیں

1.6 جمعیت علماء ہند کے تحت چلائے جانے والے شعبہ

1.7 اکتسابی نتائج

1.8 نمونہ امتحانی سوالات

1.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
1.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
1.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
1.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.0 تمہید

بر صغیر جنوبی ایشیا میں آزادی کی پہلی تحریک سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید کی زیر قیادت شروع ہوئی، یہ خالصتاً مذہبی تحریک تھی، جس میں علماء نے بھرپور کردار ادا کیا۔ 6 مئی 1831ء کو ان دو بزرگ شخصیتوں کی شہادت سے اس تحریک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔

اس کے بعد علماء نے 1857ء کی جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اس جنگ میں ناکامی کے بعد صادق پور کے علماء نے سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی تحریک جہاد کو جاری رکھا، ان علماء کی جدوجہد بھی 1882ء کے مقدمہ امبالہ کے ساتھ ختم ہو گئی۔ ان ہی علماء میں سے چند ایک نے 1866 میں دیوبند میں ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھی جس کا مقصد دینی تعلیم کو عام کرنا اور انگریزوں کی غلامی سے ہندوستان کو آزاد کرانا تھا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن نے پہلی جنگ عظیم کے دوران ہندوستان کی آزادی کا ایک منصوبہ بنایا اور اس مقصد کے حصول کے لیے مولانا عبید اللہ سندھی کو افغانستان بھیجا، لیکن قبل اس کے کہ اس منصوبے پر عمل ہوتا انگریز حکومت کو اس کا علم ہو گیا جس کی وجہ سے مولانا محمود حسن کو مالٹا میں نظر بند کر دیا گیا اور ان کے دوسرے رفقاء کو بھی مختلف قسم کی سزائیں دی گئیں۔

1.1 مقاصد

اس اکائی کے پڑھنے اور مطالعہ کرنے کے بعد آپ کو معلوم ہو گا کہ ہندوستان کی آزادی اور مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت کے لیے جمعیت علمائے ہند کی بنیاد ڈالی گئی۔ نیز آپ یہ بھی جانیں گے کہ ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے جمعیت علمائے ہند نے مختلف تحریکات کا ساتھ دیا، اسی طرح آپ آزادی سے قبل اس تحریک کی صورتحال نیز آزادی کے بعد کے حالات اور اس تحریک کے تحت چلنے والے مختلف اداروں کے بارے میں جانیں گے۔

1.2 قیام

ہندوستان میں طاقت کے ذریعہ انقلاب برپا کرنے کی آخری تحریک ''تحریک ریشمی رومال'' تھی، اس وقت اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا طریقہ نہ تھا، چنانچہ مالٹا کی قید سے واپسی کے بعد جب شیخ الہند ہندوستان واپس آئے، اس وقت ملک میں سیاسی بیداری کی ایک تیز لہر

چل پڑی تھی اور ہندوستان ایک نئی کروٹ لے رہا تھا۔ جلیان والا باغ میں نہتے عوام نے سینوں پر گولیاں کھا کر اور خاک وخون میں تڑپ کر جان دے دی تھی، اسی وقت ہندوستانی عوام نے محسوس کر لیا تھا کہ اس شکست میں بھی کامیابی کا ایک رخ ہے۔

مسلمانان ہند طاقت کے ذریعہ انقلاب برپا کرنے کے طریقے سے واقف تھے، اس لئے وہ راہ بھی اختیار کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی اور عدم تشدد کی راہ سے بھی واقف تھے، اس لیے اس نے جمعیت علمائے ہند کی بنیاد 1919ء میں ڈالی۔ جس کا پہلا اجلاس 28 دسمبر 1919ء کو پنجاب کے مشہور شہر امرتسر میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی صدارت میں ہوا۔

خلافت کانفرنس دہلی میں نومبر 1919ء میں منعقد ہوئی، جس کی کاروائیوں سے فارغ ہونے کے بعد کانفرنس میں شریک علماء کی ایک مجلس مشاورت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے صدارت میں منعقد ہوئی، جس میں یہ فیصلہ ہوا کہ علماء کرام کی ایک مستقل تنظیم بنائی جائے، تاکہ وہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مسلمانوں کی رہنمائی کے ساتھ جنگ آزادی سے متعلق کوششیں جاری رکھ سکے۔ اس مشورہ میں 25 علماء کرام نے شرکت کی تھی۔ جو مندرجہ ذیل ہیں۔

مولانا عبدالباری فرنگی محلی۔ مولانا انیس۔ پیر محمد امام سندھی۔ مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی۔ مولانا قدیم بخش بدایونی۔ مولانا خدا بخش مظفر پوری۔ مولانا محمد اکرم۔ مولانا سید داؤد۔ مولانا سلامت اللہ۔ مولانا اسد اللہ سندھی۔ مولانا خواجہ غلام نظام الدین بدایونی۔ مولانا حافظ سعید دہلوی۔ مولانا تاج محمد۔ مولانا مولا بخش امرتسری۔ مولانا میزان الزماں۔ مولانا سید اسماعیل۔ مولانا آزاد بخش۔ مولانا ابوالوفا ثناء اللہ۔ مولانا سید محمد فاخر۔ مولانا کفایت اللہ۔ مولانا سید کمال الدین۔ مولانا محمد ابراہیم دربھنگہ۔ مولانا عبدالحکیم گیاوی۔ مولانا صادق کراچی۔ اور مولانا عبداللہ۔

مولانا ابوالوفا ثناء اللہ کی تحریک اور مولانا منیر الزماں و دیگر حاضرین کی تائید سے مولانا عبدالباری فرنگی محلی جلسے کے صدر مقرر ہوئے تمام حاضرین جلسہ نے بالاتفاق منظور کیا کہ ایک جمعیت قائم کی جائے، جس کا نام (جمعیت علمائے ہند) رکھا جائے، جو تمام ہندوستان میں کام کرے اور ہر گوشۂ ملک میں اس کے ارکان اور شاخیں ہوں اور مسلمانوں کے فلاح و بہبود کے ذرائع وسائل پر غور کرکے سچی مذہبی خیر خواہی اور ہمدردی کے ساتھ ان کی رہنمائی کرے۔ چنانچہ اسی وقت تمام حاضرین نے جمعیت کی رکنیت منظور کر لی اور اس طرح جمعیت علماء ہند قائم ہو گئی۔

اور اس کے عارضی صدر مولانا کفایت اللہ کو بنایا گیا جبکہ ناظم کے عہدے پر مولانا احمد سعید دہلوی صاحب منتخب ہوئے اس تنظیم کی پہلی باقاعدہ نشست نومبر 1920ء میں دہلی میں ہوئی، جس میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب کو صدر اور مفتی کفایت اللہ صاحب کو نائب صدر اور مولانا احمد سعید صاحب کو ناظم بنایا گیا۔ شیخ الہند کے انتقال کے بعد چھ ستمبر 1921ء کو مجلس منتظمہ کے جلسے میں تیسرے اجلاس کے انعقاد تک مفتی کفایت اللہ صاحب کو صدر اور نائب کے عہدے پر خدمت انجام دیتے رہنے کے لیے مامور کیا گیا، جب کہ یہ مجلس لکھنؤ میں منعقد ہوئی تھی۔ پھر جمعیت علماء ہند کے مسند صدارت پر سات جون 1960ء تک حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب ہی مامور رہے جو تقریباً 20 سال کے عرصے پر محیط ہے۔

1.2.1 اصول وضوابط

جمعیت کے ابتدائی اصول اور آئین کفایت اللہ دہلوی نے مرتب کئے تھے۔ چنانچہ جمعیت کے امر تسر میں منعقدہ اجلاس عام میں طے پایا تھا کہ ان کو شائع کر کے علماء کی ایک جماعت کے آراجمع کر کے اس پر اگلے اجلاس میں دوبارہ بحث کی جائے۔

محمود حسن دیوبندی کے زیر صدارت دہلی میں منعقد جمعیت کے دوسرے اجلاس میں اصول وضوابط کی توثیق کی گئی، اور یہ بات طے پائی کہ اس تنظیم کو "جمعیت علماء ہند" کہا جائے گا، اس کا صدر دفتر دہلی میں ہوگا اور اس کی مہر پر الجماعت المرکزیہ لعلماء الہند (علمائے ہند کی مرکزی کونسل) لکھا ہوا ہوگا، اس کا مقصد کسی بھی بیرونی یا اجنبی خطرے سے اسلام کا دفاع اور سیاست میں اسلامی اصولوں کے ذریعہ عام لوگوں کی رہنمائی ہوگی۔

1.3 ترک موالات اور جمعیت علمائے ہند

خلافت کانفرنس کا انعقاد 9 جون 1920ء میں الہ آباد کے سرزمین پر ہوا، جس میں متفقہ طور پر ترک موالات کا اصول منظور کیا گیا اور ایک کمیٹی بنائی گئی، جس کے ذمہ یہ کام دیا گیا کہ وہ ترک موالات کے اصول اور پروگرام واضح طور پر مرتب کریں، چنانچہ 22 جون 1920ء کو مسلمانوں نے وائسرائے کو پیغام بھیجا کہ اگر یکم اگست 1920ء تک ترکوں کی شکایات رفع نہیں ہوتی تو تحریک عدم تعاون شروع کر دیا جائے گا۔ 30 جون 1920ء کو دوبارہ خلافت کمیٹی کا جلسہ الہ آباد میں منعقد ہوا اور یہ فیصلہ ہوا کہ ایک مہینہ کی نوٹس دے کر ترک موالات کا پروگرام شروع کر دیا جائے۔

یکم اگست کو نوٹس دے دیا گیا اور 31 اگست 1920ء کو تحریک عدم تعاون شروع ہوا، مسلمانوں کے جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ سر پر کفر باندھ کر میدان جہاد میں اتر آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انڈین نیشنل کانگریس بھی اتنی آگے تک نہیں پہنچی تھی اور نہ ہی اتنی گرم سیاست کے بارے میں وہ سوچ سکتی تھی، مسلمانوں کی جرأت مندانہ اقدام کو دیکھ کر کانگریس نے کلکتہ کے اجلاس میں نان کوآپریشن کی تجویز منظور کی۔ نومبر 1920ء میں شیخ الہند کے مشورے سے ترک موالات کو فتوی کی شکل میں مرتب کر کے ملک کے 473 معتبر علماء کرام کے دستخطوں کے ساتھ شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

1.4 جمعیت کی اجلاس اور اس کے مقاصد

دوسرا اجلاس

نومبر 1920ء میں جمعیت علمائے ہند کا دوسرا سالانہ اجلاس دہلی میں منعقد ہوا، اس جلسے میں ترک موالات کے حکم شرعی ہونے کا فیصلہ کیا گیا، نیز حکومت برطانیہ سے کسی بھی طرح کے تعاون کو حرام قرار دیا گیا۔ یہ جلسہ شیخ الہند کی زیر صدارت ہوا جس میں عام مشاہیر علماء کے علاوہ بنگال، سندھ کی سرحدوں سے تقریباً500 علماء شریک ہوئے اور یہ فیصلہ بھی ہوا کہ اس فتوی کو شائع کر دینا چاہیے، جس میں کہا

گیاہے کہ انگریز حکومت کی معاونت کرنا، ملازم رہنا، ملازمت کرانا، فوج میں بھرتی ہونا، بھرتی کرنا سب حرام ہے۔ ترک موالات کی تجویز اور برطانوی حکومت کے ساتھ نصرت کے تمام تعلقات و معاملات کی حرمت کے ساتھ حسب ذیل امور بھی واجب العمل ہوں گے۔

- برطانوی حکومت کے ذریعہ ملے ہوئے خطابات اور عہدے چھوڑے جائیں۔
- کونسلوں کی ممبری سے دستبرداری کا اعلان کیا جائے، نیز امیدواروں کے لیے رائے بھی نہ دی جائے۔
- دین اسلام اور مسلمانوں سے بغض و نفرت رکھنے والوں کو تجارتی نفع نہ پہنچایا جائے۔
- غیر سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں سرکاری امداد نہ قبول کی جائے اور سرکاری اداروں سے تعلق قائم نہ کیا جائے۔
- دین سے دشمنی کرنے والوں کی فوج میں ملازمت نہ کی جائے اور نہ ہی کسی قسم کی فوجی امداد پہنچائی جائے۔
- انگریزوں کے ذریعہ چلائے جانے والے عدالتوں میں مقدمات نہ لے جائیں اور نہ ہی وکیل کسی مقدمے کی پیروی کریں۔

مذکورہ بالا تجاویز ناظم جمعیت علمائے ہند مولانا احمد سعید صاحب نے پیش کی تھی جس کی تائید مولانا مرتضی چاندپوری، مولانا محمد داوٗد غزنوی، مولانا عبد الحلیم صدیقی لکھنو اور مولانا ثناء اللہ امرتسری نے کی۔

تیسرا اجلاس

مولانا ابو الکلام آزاد کے زیر صدارت جمعیت علمائے ہند کا تیسرا سالانہ اجلاس 18 تا 20 نومبر 1921ء میں لاہور میں منعقد ہوا، جس میں جمعیت نے اپنے سابقہ موقف کی وضاحت کی اور اعادہ کیا اور ایک تجویز کے ذریعہ اپنے سابق فیصلوں کی توثیق کی۔

فیصلہ یہ تھا کہ ”یہ اجلاس اعلان کرتا ہے کہ گورنمنٹ نے مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد مدنی، پیر غلام مجدد، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور مولانا نثار احمد کو خلافت کانفرنس کی 10 جولائی 1921 کی جس تجویز کی بنا پر گرفتار کیا ہے وہ اسلام کی تعلیم اور مسلم احکام میں سے ہے، جو 1300 برسوں سے موجود ہیں اس کا ہمیشہ سے اعلان ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا، مسلمان اس سے باز نہیں رہ سکتے“۔

اجلاس میں جو دوسری تجویز منظور کی گئی وہ جمعیت علمائے ہند کے موقف کی مزید توضیح تھی جس میں کہا گیا تھا کہ انگریزوں کی فوج اور پولیس کی ملازمت کا حرام ہونا صرف اسی بات پر مبنی نہیں کہ فعلاً مسلمانوں کا قتل بھی اس وقت درپیش ہے، بلکہ مسلم حکومتوں اور آبادیوں کے قتل یا حقوق کی پامالی کے لیے فوج اور پولس استعمال میں لائے جاتے ہیں۔

چوتھا اجلاس

9-10 فروری 1922ء کو دہلی میں مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیت علما کے زیر صدارت جو جلسہ منعقد ہوا اس میں بھی یہ مقصد کار فرما تھے کہ انگریز حکومت کے خلاف پورے ملک میں ایک ذہنی و فکری انقلاب کس طرح پیدا کیا جائے، چنانچہ اسی جلسہ میں یہ ریزولیشن پاس کیا گیا:

"یہ اجلاس اعلان کرتا ہے کہ انفرادی سول نافرمانی احکام شریعت کی رو سے جائز ہے، ایسے احکام جو کسی جابر حکومت کی طرف سے مذہبی یا قومی آزادی کے خلاف جاری کیے جائیں ان کو مذہبی وقار اور خودداری قائم رکھنے کے لیے نہ ماننا مستحسن ہے، وہی اجتماعی نافرمانی و عدم شروع کی قید کے ساتھ ملک کے موجودہ حالات کے لحاظ سے ہو سکتا ہے یہ جمعیت علماء کے زیر غور ہے"

1.4.1 ستیہ گرہ اور جمعیت علماء

1922 میں تحریک خلافت کی سرگرمیاں شباب پر تھیں، ہندوؤں اور مسلمانوں میں مثالی اتحاد تھا اس لیے سول نافرمانی کی تحریک شدت اختیار کرتی جارہی تھی، جس طرح علی برادران اور جمعیت علمائے ہند کے رہنما، "تحریک خلافت" کے روح رواں تھے، اسی طرح گاندھی جی "تحریک سول نافرمانی" کی قیادت کر رہے تھے، دونوں تحریکیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں، کیونکہ دونوں کا نشانہ برطانوی سامراج تھا، خلافت تحریک سے سیاسی بیداری عام ہوتی جارہی تھی اور عوام اپنی طاقت پہچاننے لگے تھے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تحریک سول نافرمانی میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔ انگریزی حکومت سے نفرت اتنی شدید ہو چکی تھی کہ ملک میں ہر طرف شورش برپا تھی، بائیکاٹ اور عدم تعاون نے جس طرح عدالتوں کا بائیکاٹ کیا تھا اسی طرح پولیس اور انتظامیہ سے بھی نفرت اور غصہ عام ہوتا جارہا تھا، لوگ ایسا محسوس کرنے لگے تھے کہ انگریز ہندوستان میں کچھ ہی دنوں کا مہمان ہے اور اس کا نظام درہم برہم ہو کر رہے گا یہی وجہ تھی کہ سول نافرمانی اور عدم تعاون کی تحریک طوفان کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔

1.4.2 جمعیت علمائے ہند کا نیا انتخاب

15 جنوری 1925 کو مولانا سید سلیمان ندوی کی صدارت میں جمعیت علمائے ہند کا نیا انتخاب عمل میں آیا جس میں مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب جمعیت علماء ہند کے صدر اور مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری اور مولانا نثار احمد خان پوری نائب صدر کے عہدے پر فائز ہوئے جبکہ مولانا احمد سعید صاحب سحبان الہند ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے۔

ان کے علاوہ ورکنگ کمیٹی کے لیے مولانا شبیر احمد عثمانی۔ مولانا ابو المحاسن محمد سجاد بہاری۔ ڈاکٹر سیف الدین امرتسری۔ مسیح الملک حکیم اجمل خان دہلی۔ مولانا حبیب الرحمن عثمانی۔ شیخ الاسلام سید حسین احمد مدنی۔ مولانا سید سلیمان ندوی۔ مولانا سید انور شاہ کشمیری۔ مولانا حسرت موہانی۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا ظفر علی خان زمیندار لاہور۔ مولانا عبد الحلیم صدیقی۔ مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری۔ مولانا داؤد غزنوی منتخب ہوئے۔

انہی دنوں حکومت نے ایک حکم نامہ جاری کیا کہ جو شخص حج بیت اللہ کے لئے جانا چاہے اس پر ضروری ہے کہ واپسی کا ٹکٹ بھی اس کے ساتھ ہو، جمعیت علماء ہند نے 26 جنوری 1925ء میں ایک جلسہ منعقد کیا اور اس میں مذکورہ حکم نامہ کی نہ صرف مخالفت کی بلکہ یہ کہا کہ مداخلت فی الدین ہے، اس کی اس وقت تک مخالفت کی جائے گی جب تک کہ حکومت اس قانون کو واپس نہ لے لے۔

1.4.3 ”ادارہ حربیہ“جمعیت کا فعال ادارہ

1930ء میں جمعیت علماء ہند نے تحریک آزادی میں کانگریس سے تعاون کی تجویز کو منظور کر لیا تھا، چنانچہ 1932ء میں کانگریس نے دوبارہ سول نافرمانی تحریک شروع کی تو جمعیت علماء ہند کانگریس کا ساتھ اپنے پلیٹ فارم سے دے رہی تھی، جس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ جمعیت کے رضاکار ہفتہ میں دو دن جتھوں کی شکل میں بھیجے جاتے جو بر سر عام قانون کی خلاف ورزی کرتے اور گرفتار ہوتے۔ پورے ملک میں سول نافرمانی اور خلاف ورزی قانون کے اس پروگرام کو چلانے کے لیے ایک مستقل نظام کی ضرورت تھی کانگریس نے اس مقصد کے لیے ایک جنگی کونسل قائم کر رکھی تھی، جو سارے پروگرام کو چلاتی تھی اسی طرح جمعیت علماء ہند نے بھی ادارہ حربیہ کے نام سے ایک جنگی کونسل بنائی تھی، چنانچہ جمعیت علماء ہند نے اس زمانے میں مجلس عامہ، صدر اور سکریٹری وغیرہ کے عہدے اور ذمہ داریاں ختم کر کے ڈکٹیٹر شپ قائم کر دی تھی جو یہ نظام چلاتا تھا اور جب وہ گرفتار ہو جاتا تو اپنے جانشین ڈکٹیٹر کا اعلان کر دیتا تھا، ایسے تمام حضرات کی فہرست خفیہ طور پر تیار ہوتی تھی اور ان کی تربیت بھی علیحدہ ہوتی تھی۔ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب جمعیت کے پہلے ڈکٹیٹر تھے اور وہ جب گرفتار ہوئے تو مولانا حسین احمد مدنی دوسرے ڈکٹیٹر مقرر ہوئے اور ان کی گرفتاری کے بعد تیسرے ڈکٹیٹر مولانا احمد سعید دہلوی مقرر ہوئے تھے مگر وہ قبل از وقت ہی گرفتار ہو گئے۔

اس جنگی کونسل کے ذمہ دار اعلیٰ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد تھے، جمعیت علماء ہند کے دفتر واقع بلی ماران ہی کے قریب تنگ گلی میں ایک مکان اس کونسل کے لیے کرائے پر لیا گیا جس میں مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد قیام پذیر تھے، جس کا علم صرف قاضی اکرام الحق صاحب کو تھا۔ جس کسی کو جنگی کونسل کی ذمہ داران اعلی سے ملنا ہوتا قاضی صاحب ان کو اس مکان تک پہنچا دیتے۔ باہر فیلڈ میں کام کرنے، لوگوں کو رضاکاروں میں بھرتی کرنے، سول نافرمانی میں شریک ہونے کے لیے تیار کرنے کی ذمہ داری مولانا حفظ الرحمن صاحب کی تھی، آپ جنگی کونسل کے کمانڈر تھے، آپ کا کام یہ ہوتا تھا کہ ملک میں گھوم پھر کر تحریک کا جائزہ لیں اور اس نظام کو کامیاب بنائیں اور لوگوں کو آمادہ کریں کہ وہ رضاکاروں کی فہرست میں اپنا نام درج کرائیں، اس ذمہ داری کو پورا کرتے ہوئے کچھ ہی دن گزرے تھے کہ آپ کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اس تحریک کے نویں ڈکٹیٹر مولانا سید محمد میاں صاحب تھے، جنہیں جامع مسجد دہلی میں تقریر کے بعد گرفتار کیا گیا اور چاندنی چوک کوتوالی میں قید کر دیا گیا۔

1.4.4 1942ء کی انقلابی تحریک اور جمعیت کا موقف

1942ء میں تمام تر کوششوں کی بنیاد پر جو نتیجے آنے تھے وہ آئینہ کی طرح صاف نظر آرہے تھے، تمام جماعتوں کا ایک ہی نعرہ تھا کہ ہمیں ملک آزاد چاہیے چنانچہ برطانوی حکومت نے آزادی کا مطالبہ کرنے والی جماعتوں سے بات کرنے کے لیے سر اسٹیفورڈ گریس کو بھیجا ابھی وہ ہندوستانی لیڈروں سے گفتگو بھی نہیں کر پائے تھے کہ جمعیت نے 20۔21۔22۔مارچ 1942ء کو اپنے سالانہ اجلاس میں تجویز منظور کر لی۔

”ہندوستان کی آزادی سے متعلق سر اسٹیفورڈ گریس برطانوی حکومت کا کوئی بھی نظریہ لائے ہیں، معلوم نہیں وہ نظریہ کیا ہے؟

اس لیے اس کے متعلق اظہار کا موقع نہیں تاہم یہ امر بھی یقینی ہے کہ برطانوی حکومت نے اس کام کا بہترین وقت اپنی ناعاقبت اندیشی اور مغرورانہ بے پرواہی کی وجہ سے ضائع کر دیا ہے پھر بھی اس نازک حالات میں ہندوستانیوں کے فرائض بہت اہم ہیں۔ جمعیت علماء ہند مسلمانان ہند اور مسلم جماعتوں پر زور دیتی ہے کہ اس وقت تمام مسلم جماعتیں اور ادارے اشتراک عمل سے کام لیں اور پورے غور و فکر کے بعد کسی متحدہ فیصلے پر سب متفق ہوں، ظاہر ہے کہ آزادی کی کسی گفتگو کے موقع پر ہندوستان کے تمام مسلمانوں کا فیصلہ وہی ہونا چاہیے جو بلا استثناء تمام مسلمانوں کے لیے مفید ہو اگر مسلم جماعتوں کے مختلف نظریات سامنے آئے تو خطرہ ہے کہ ہم آزادی کی راہ میں کوئی بہتر رول نہ ادا کر سکیں گے اور آزادی ہمارے لیے غلامی سے بدتر ہو جائے"

جمعیت نے اپنے موقف کا اعلان کیا کہ اس کا نصب العین مکمل آزادی ہے، اس میں تمام مسلمانان ہند متفق ہیں اور اسی کو ذریعہ نجات سمجھتے ہیں اور یہ بھی واضح کر دیا کہ وطنی آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے، ان کا مذہب آزاد ہو گا، مسلم کلچر اور تہذیب و ثقافت آزاد ہو گی وہ کسی ایسے آئین کو ہرگز قبول نہ کریں گے جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔

1.4.5 ماقبل آزادی جمعیت کے دو حصے

46-1945 کے فیصلہ کن انتخابات میں مسلم لیگ کے حامی علماء نے ایک علیحدہ جماعت جمعیت علماء اسلام بنالی، تاکہ کانگریس سے اشتراک عمل کرنے والی جماعت سے نبرد آزما ہو سکیں، یہ جماعت 26 تا 29 اکتوبر 1945 میں کلکتہ کے ایک بڑے اجلاس میں وجود میں آئی، مولانا شبیر عثمانی جنہوں نے پہلے سے ہی جمعیت علماء ہند سے علیحدگی اختیار کر رکھی تھی، انہیں جمعیت علماء اسلام کا صدر منتخب کیا گیا۔

1.5 جمعیت علماء ہند کے اغراض اور تعمیری پروگرام

1.5.1 اغراض و مقاصد

- اسلام، شعائر اسلام اور مسلمانوں کے ماثر و معابد کی حفاظت۔
- مسلمانوں کے مذہبی، تعلیمی، تمدنی اور شہری حقوق کی تحصیل و حفاظت۔
- ایسے اداروں کا قیام جو مسلمانوں کی تعلیمی، تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی ترقی و استحکام کا ذریعہ ہوں۔
- اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انڈین یونین کے مختلف فرقوں کے درمیان میل جول پیدا کرنا اور اس کو مضبوط کرنے کی کوشش کرنا۔
- علوم عربیہ و اسلامیہ کا احیا اور زمانہ حال کے مقتضیات کے مطابق نظام تعلیم کا اجرا۔
- تعلیمات اسلامی کی نشر و اشاعت۔

- اسلامی اوقاف کی تنظیم و حفاظت۔

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ہندوستان میں جہاں کہیں کوئی پروگرام چل رہا ہے، اس کی حوصلہ افزائی کرنے اور جہاں جہاں ضرورت ہے، وہاں اجتماعی جدوجہد کے لیے کارکنان اور دردمندان ملت کو آواز دینے اور ان کی صلاحیتوں کو ہندوستان کے مختلف طبقات کی خدمت، تنظیم اور ترقی کے لیے جمعیت علماء ہند نے مئی 1972 کے اجلاس عام میں یہ تعمیری پروگرام مرتب کیے تھے۔

1.5.2 تعمیری پروگرام

1. سماجی حلقے:

- مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا مشترکہ اجتماع۔
- نادار طلبہ کو تعلیمی وظائف دینے کا انتظام کرنا۔
- شہری ضروریات کے لیے قوم وملت کی خدمت کرنا۔
- پسماندہ لوگوں کی خدمت کرنا۔
- یتیم، بیواؤں، مجبور لوگوں اور غریب لڑکیوں کی شادی میں مدد کرنا۔
- فضول رسم و رواج اور اسراف بے جا کی اصلاح کے لیے اجتماعی جدوجہد کرنا۔

2. اقتصادی حلقے

- مسلم فنڈ یا امدادی فنڈ قائم کرنا اور اسے چلانا۔
- کوآپریٹو سوسائٹی کے ذریعے کاروبار وغیرہ کو فروغ دینا۔
- گھریلو دستکاریوں اور چھوٹی صنعتوں کو رواج دینا۔

3. دینی حلقے

- سیرت یا اخلاق یا تاریخ اسلام وغیرہ موضوعات پر اجتماع کرنا۔
- ترجمہ قرآن اور درس حدیث کا اہتمام کرنا اور رواج دینا۔
- مذہبی لٹریچر تیار کرنا اور اس کی نشر و اشاعت کا انتظام کرنا۔

4. دارالمطالعہ

- مذہبی اخلاقی اور اصلاحی و علمی رسالے اور کتابیں چھپوانا۔

- ماحول کے مطابق اصلاحی مقالے مرتب کرانا اور مباحثے کا انتظام کرنا نیز اجتماعی مطالعہ کو مقبول بنانا۔

1.5.3 جمعیت علماء ہند کی دو شاخیں

2006ء میں سید اسعد مدنی کے بعد مولانا ارشد مدنی جمعیت علماء ہند کے صدر منتخب ہوئے، تاہم 2008ء میں کچھ نا اتفاقی حالات کی وجہ سے یہ تنظیم دو حصوں میں منقسم ہوگئی، ایک جمعیت علماء ہند (الف) جو مولانا ارشد مدنی کے زیر صدارت کام کر رہی ہے، اور دوسری جمعیت علماء ہند (میم) جو مولانا محمود مدنی کے زیر نگرانی چل رہی ہے۔

صدور کی فہرست

- کفایت اللہ دہلوی نومبر 1920 سے 12 جولائی 1940
- حسین احمد مدنی 13 جولائی 1940 سے پانچ دسمبر 1957
- احمد سعید دہلوی دسمبر 1957 سے چار دسمبر 1959
- سید فخر الدین احمد دسمبر 1959 سے پانچ اپریل 1973
- اسعد مدنی 11 اگست 1973 سے چھ فروری 2006
- ارشد مدنی سات فروری 2006 میں صدر منتخب ہوئے تا حال۔ (جمعیت (م) کے صدر ہیں)

1.6 جمعیت علماء ہند کے تحت چلائے جانے والے شعبہ

جمعیت علما ہند ہندوستان کے اکثر صوبوں میں اپنی ریاستی تنظیمیں قائم کرتی ہے، جو بہت ہی متحرک اور فعال ہوتی ہے، جن کا تعلق مرکزی دفتر نئی دہلی سے براہ راست ہوتا ہے، اسی لیے مرکز ہمہ وقت پورے ملک کے قومی وملی مسائل سے باخبر رہنے کے ساتھ ریاست کے بنیادی مسائل سے واقف ہوتا ہے جو ان علاقوں میں خصوصیت کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ بہت سے قومی وملی مسائل جن کا تعلق براہ راست مرکزی دفتر سے ہے، جہاں پر ان کاموں کے لیے الگ الگ ذیلی دفاتر ہیں اور ان شعبوں سے متعلق ذمہ داران اس نظام کو باقاعدگی سے چلاتے ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں۔

امارت شرعیہ	ادارہ مباحث فقہیہ
شعبہ اصلاح معاشرہ	اجراء مکاتب دینیہ
ریلیف فنڈ	دینی تعلیمی بورڈ

جمعیت یوتھ کلب	حلال ٹرسٹ
جمعیت اوپن اسکول	لیگل سیل انسٹیٹیوٹ

1. امارت شرعیہ

جمعیت علماء ہند کے تحت چلنے والے شعبوں میں یہ ایک متحرک شعبہ ہے جسے 1986ء میں جمعیت علماہند نے قائم کر کے امیر الہند کا انتخاب کیا تھا، جس کے پہلے امیر الہند حضرت مولانا ابوالماثر حبیب الرحمن اعظمی نور اللہ مرقدہ تھے، ان کی وفات کے بعد مئی 1992 کو اس جلیل القدر منصب پر حضرت مولانا سید اسعد مدنی، صدر جمعیت علماء ہند کا انتخاب کیا گیا تھا۔ 2006 میں سید اسعد مدنی کی وفات کے بعد مولانا مرغوب الرحمٰن کو امارت شرعیہ کا تیسرا "امیر الہند" بنایا گیا، آپ کے انتقال کے بعد 2010 میں اس عہدہ کے لیے باتفاق دانشوران قوم وملت حضرت مولانا قاری عثمان منصور پوری کا انتخاب عمل میں آیا آپ نے اس عہدے پر رہتے ہوئے اس کے کام کو مزید تقویت بخشی اور اسے اپنے فعال و متحرک شخصیت کے ذریعہ کار آمد بنائے رکھا۔ آپ کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد 2021 میں امارت شرعیہ ہند کی میٹنگ میں مولانا سید ارشد مدنی صاحب کا نام امیر الہند کے لیے پیش کیا گیا جس پر دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا ابوالقاسم نعمانی نے تائید کی اور حاضرین مجلس نے متفقہ طور پر اس تجویز کو منظوری دی اور اس طرح امیر الہند خامس کے طور پر آپ کا انتخاب ہوا۔

2. ادارہ مباحث فقہیہ

1970ء میں ادارہ مباحث فقہیہ کا قیام مولانا محمد میاں صاحب کے زیر نگرانی ہوا جس میں دور جدید میں پیدا ہونے والے ایسے مسائل پر بحث و تحقیق کر کے شرعی حکم متعین کیا جاتا ہے جن مسائل کا قدیم فقہ کی کتابوں میں صراحتاً ذکر نہیں ہے۔ جدید ترین اور عصر حاضر کے پیدا کردہ مسائل پر اس شعبہ نے متعدد سیمینار کیے ہیں۔ چنانچہ 1985ء میں منعقدہ "علماء کانفرنس" بھی اس سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ صدر جمعیت علماء ہند مولانا سید اسعد مدنی کی مسلسل تحریک پر 1990ء میں مجلس عاملہ نے اپنی تجویز کے ذریعہ اس ادارے کی نشاۃ ثانیہ کی اور جدید مسائل میں اجتماعی غور و فکر کا سلسلہ باقاعدہ طور پر دوبارہ شروع کیا گیا، چنانچہ 8-9 فروری 1991ء میں ایک سہ روزہ فقہی اجتماع بعنوان "غیر سودی رفاہی ادارے اور سوسائٹیاں،، شیخ الہند ہال دیوبند میں منعقد کیا گیا۔ اسی طرح ایک اور فقہی اجتماع 28-29 نومبر 1991 کو "اسلامی نظام قضا اور ہندوستان" کے عنوان سے دیوبند کے وسیع و عریض ہال شیخ الہند میں منعقد کیا گیا۔ نیز "شیر ز اور ایکسپورٹ،، جیسے دوسرے مسائل پر فتوی اور عمل، غیر اسلامی ممالک میں عقود فاسدہ، کے اہم موضوعات پر فقہی اجتماعات و سیمینار کی کاروائی اور رپورٹوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہل علم اور اہل فتوی نے ان میں بڑی دلچسپی سے حصہ لیا اور اپنی قیمتی مقالات پیش کیے ایسے اجتہادی موضوعات پر مجتہدین کی آراء سے استفادے کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

3. شعبہ اصلاح معاشرہ

مسلم معاشرہ کو مغربی معاشرہ سے پاک وصاف رکھنے کے لیے اور معاشرتی اصلاح پر بھرپور توجہ دینے کے لیے جمعیت علماء ہند نے اصلاح معاشرہ کو اپنا ترجیحی ایجنڈ ابنایا چنانچہ 25-26 جنوری 1991 کو مسلمانوں کی معاشی و معاشرتی ابتری پر سنجیدگی سے غور کرنے کے لیے

ایک قرارداد منظور کی گئی، جس کا عنوان تھا "معاشرتی اصلاح اور معاشی جدوجہد" اس سلسلے میں 21 اپریل 1991 کو چند عملی اقدام کا فیصلہ کیا گیا جو مندجہ ذیل ہے۔

- حکومت کی فلاحی و ترقیاتی اسکیموں سے مسلمانوں کو باخبر کرنے کے لیے ریاستی، وضلعی سطحوں پر جمعیت علماء ہند کی طرف سے اطلاعاتی مراکز قائم کیے جائیں اور علاقائی زبان میں ان اسکیمات کا ترجمہ کیا جائے اور لوگوں کو ان سے باخبر کیا جائے۔
- معاشرے کی خرابیوں کے خلاف کام کرنے کے لیے اصلاحی کمیٹی تشکیل دی جائیں جن کے تحت ماہانہ اجتماعات منعقد ہوں جن میں عوام وسماج کے ذمہ دار افراد کو شرکت کی دعوت دی جائے۔
- نئی نسل کی اصلاح اور بہتری کے لیے خصوصی جدوجہد کی جائے اور اس کی اہمیت پر خاص زور دیا جائے۔
- ممتاز علماء کرام، دانشوران قوم، مدارس کے اساتذہ اور ائمہ مساجد کو اس مہم میں شریک کر کے اس اصلاحی پروگرام کو ملک گیر پیمانے پر عام کیا جائے۔

اس اصلاح معاشرے سے منسلک لوگوں کی کثیر تعداد جن علاقوں سے تعلق رکھتی ہے وہ ہریانہ، پنجاب، ہماچل پردیش، راجستھان، آندھراپردیش، تلنگانہ، تمل ناڈو، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، کرناٹک، مغربی بنگال، اتر پردیش وغیرہ ہیں، جہاں پر شعبہ اصلاح معاشرہ کے مرکزی دفتر کی جانب سے علماء کے وفود پہنچتے ہیں اور غلط رسوم ورواج کی نشاندہی کر کے ان سے بچنے کی تاکید کرتے ہیں۔

4. اجراء مکاتب دینیہ

مسلمانوں میں ابتدائی دینی تعلیم عام کرنے کے لیے مکاتب کا اجرا جمعیت علماء ہند کا ایک مثالی اور اہم ترین کارنامہ ہے۔

5. جمعیت یوتھ کلب

جمعیت علماء ہند کی جانب سے قائم کردہ ایک ادارہ "جمعیت یوتھ کلب" بھی ہے۔ جو جولائی 2018 میں قائم کیا گیا جس کا مقصد نوجوانوں کو مختلف دفاعی ٹکنیکوں کی تربیت فراہم کرنا ہے، اس پلیٹ فارم سے جمعیت ہر سال تقریبا1.25 ملین نوجوان کو تربیت دینے کی امید رکھتی ہے۔

اس تنظیم میں شمولیت کے لیے کچھ شرائط ہیں جن میں نمایاں شرائط یہ ہے کہ وہ فرد مسلمان ہو، عاقل بالغ ہو، نیز جمعیت کے مقاصد اور طریقہ کار سے پورا اتفاق رکھتا ہو، نیز شمولیت حاصل کرنے والوں کو اولاً بھارت اسکاؤٹ اینڈ گائیڈ کی ٹریننگ دی جاتی ہے، بعد ازاں جمعیت یوتھ کلب میں شامل کیا جاتا ہے، اور پھر اس میں سے منتخب افراد کو خدام ملت کا ممبر بنایا جاتا ہے اور یہی افراد جمعیت کے اصل خادم اور والنٹیر قرار پاتے ہیں۔ یوتھ کلب کا 10 سالہ طویل منصوبہ یہ ہے کہ 2028 تک سوا کروڑ نوجوانوں کو اس سے جوڑا جائے گا جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر سال تقریبا12 لاکھ پچاس ہزار افراد کو ممبر بنایا جائے گا، تاحال یہ مشن جاری ہے اور اس تنظیم سے جڑے بچے اور بچیوں

نے ٹریننگ حاصل کرتے ہوئے کئی مقابلوں میں حصہ لے کر انعامات کا نہ صرف حصول کیا بلکہ پوری دنیا میں ملک کا نام روشن کر رہے ہیں۔

6. دینی تعلیمی بورڈ

ہندوستان کی آزادی کے بعد جن مسائل سے مسلمانوں کو دوچار ہونا پڑ رہا تھا ان میں ایک سیکولر تعلیم بھی تھی، حکومت نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ کسی کے بھی مذہبی تعلیم کی ذمہ دار نہیں ہے، چنانچہ جمعیت علماہند نے 1954ء میں ممبئی کے اندر ایک دینی تعلیمی کانفرنس منعقد کر کے طے کیا کہ ہمیں اپنے مذہبی تعلیم کا خود انتظام کرنا چاہیے، چنانچہ جمعیت نے دینی تعلیمی اداروں کے قیام اور ان کے نصاب تعلیم کی تیاری کے لیے ایک دینی تعلیمی بورڈ بھی تشکیل دیا۔ بورڈ نے ایک طرف پوری سرگرمی کے ساتھ مکاتب کی تحریک شروع کی اور دوسری طرف ان کے لیے ایک ایسا نصاب تیار کیا جو پرائمری سطح تک دین و دنیا کے تعلیم پر مشتمل ہے۔

7. حلال ٹرسٹ

جمعیت علماہند کا ایک معروف شعبہ حلال ٹرسٹ بھی ہے، جو 2009 میں قائم کیا گیا اس ادارے کو "اسلامی ترقیات ملائشیا،، نے 2011 میں گوشت اور گوشت سے بنی مصنوعات اور سلاٹر ہاؤس کو حلال سرٹیفکیٹ جاری کرنے کے لیے ایک قابل اعتماد اور مستند ادارے کے طور پر تسلیم کیا تھا۔ اس ادارے کے چند مقاصد درج ذیل ہیں۔

- صحت بخش کھانوں کو ترویج دینا اور نقصان دہ مادوں کے استعمال کی آمیزش کی نگرانی کرنا۔
- تمام جاندار مخلوق کے حقوق کے تحفظ کو یقینی بنانا نیز جانوروں کو ظالمانہ سلوک سے بچانا۔
- اس ادارے کا مقصد شرعی طور پر مباح اور صحت بخش غذا کی ترویج ہے۔
- حلال کھانوں اور جانوروں کی مصنوعات اور ان کے مشمولات کی تحقیق کرنے کے بعد ملک اور بیرون ملک کے لیے حلال سرٹیفکیٹ جاری کرنا۔
- ایسے افراد کو تیار کرنا جو ٹرسٹ کے اصول و ضوابط کے مطابق مصنوعات کی جانچ پرکھ کر سکیں۔
- پوری دنیا میں حلال مصنوعات کے درآمد اور استعمال کو فروغ دینا۔

8. لیگل سیل انسٹی ٹیوٹ

جمعیت علماء ہند لیگل سیل انسٹی ٹیوٹ کو 2007 میں قائم کیا جس کے ذریعہ وہ دہشت گردی یا دیگر الزامات میں بے قصور مسلمانوں کو قانونی لڑائی لڑنے میں مدد فراہم کرنا ہے۔

9. جمعیت اوپن اسکول

فروری 2021 میں اس ادارے کا قیام عمل میں آیا، یہ ادارہ طلبہ کو تربیت یافتہ عملہ فراہم کرتا ہے جس کے ذریعہ وہ "نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکولنگ" NIOS کے تحت پیش کردہ مضامین پڑھا کر مدارس کے طلبہ کو دسویں اور بارہویں کا امتحان دلاتا ہے۔ یہ اسکول طلباء کو اعلی معیار اور عصری تعلیم فراہم کرنے کے لیے قائم کیا گیا ہے، اس لیے کہ ہزاروں طلبہ ہر سال مدارس دینیہ سے فارغ ہوتے ہیں، مگر اکثر میں عصری علوم کی کمی رہتی ہے، انہیں عصری علوم فراہم کرنا نیز پیشہ وارانہ کورسز جیسے بی ٹیک، ایم ٹیک، میڈیکل اور انجینئرنگ کے طلبہ کو وظائف فراہم کرنا بھی ہے۔

1.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد باقاعدہ طور پر علماء کرام کی ایک جماعت نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم کو چھوڑ کر ایک علیحدہ جماعت بنائی، جس میں ہر مکتب فکر کے علماء شامل تھے، جن کا مقصد تھا کہ برطانوی حکومت کے خلاف نہ صرف اپنی قوم کو ابھارا جائے بلکہ اس کوشش میں شامل تحریکات کا بھی ساتھ دیا جائے۔
- نومبر 1919 میں خلافت کانفرنس کا انعقاد دہلی میں ہوا، جس میں شریک علماء کرام نے ایک مجلس مشاورت دہلی میں منعقد کی اسی وقت یہ بات طے پائی کہ جمعیت علماء ہند کو قائم کیا جائے، چنانچہ 19 نومبر 1919 میں یہ تحریک وجود میں آئی۔
- جمعیت علماء ہند کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خلاف عدم تشدد کی جدوجہد جاری رکھی جائے اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مسلمانوں کی رہنمائی بھی کی جائے۔
- 8 ستمبر 1920 کو جمعیت نے ایک مذہبی اعلامیہ جاری کیا، جسے فتوی ترک موالات کہا جاتا ہے، جس کے ذریعہ برطانوی سامان کا بائیکاٹ کیا گیا تھا، یہ فتوی ابوالمحاسن محمد سجاد نے دیا تھا، جس پر تقریباً 500 علماء کرام کے دستخط تھے۔
- 1922 میں گاندھی جی کی قیادت میں چلنے والی سول نافرمانی تحریک میں جمعیت علماء ہند نے بھی حصہ لیا اور ملک میں انگریزوں کے ذریعہ چلایا جارہے عدالتوں کا بائیکاٹ کیا اور فوج و پولیس اور انتظامیہ سے نفرت کا اظہار کیا۔
- 1930 میں جمعیت علماء ہند نے کانگریس کے تعاون کے لیے ایک ادارہ "ادارہ حربیہ،، کے نام سے قائم کیا جس کا کام یہ تھا کہ ہفتے میں دو دن اس ادارے کے رضاکار کانگریس کے ساتھ جتھوں کی شکل میں بر سر عام قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گرفتار ہوتے تھے، یہ ادارہ ڈکٹیٹر شپ کے تحت بڑے رازدارانہ طور پر چلایا جارہا تھا۔

- جمعیت علماء ہند نے 1942 میں پورے شدت کے ساتھ تمام جماعتوں کے ساتھ مل کر یہ نعرہ لگایا تھا کہ ہمیں حکومت برطانیہ کے قاصد سے گفتگو نہیں کرنی ہے، بلکہ ہمیں اپنا ملک مکمل طور پر آزاد چاہیے۔

1.8 نمونہ امتحانی سوالات

1.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. جمعیت علماء ہند کا قیام کس سن میں ہوا؟

(a).1909 (b).1919 (c).1929 (d).1920

2. جمعیت علماء ہند کا پہلا اجلاس کس شہر میں منعقد ہوا؟

(a).دہلی (b).امرتسر (c).دیوبند (d).غازی آباد

3. جمعیت علماء ہند کے پہلے جلسے کی صدارت کس نے کی؟

(a).عبدالباری فرنگی محلی (b).مولانا ارشد مدنی (c).مولانا حسین احمد مدنی (d).سب غلط

4. جمعیت علماء ہند کے ابتدائی اصول کس نے مرتب کیے

(a).مولانا عبدالباری فرنگی محلی (b).مولانا کفایت اللہ (c).مولانا محمود الحسن (d).مولانا تاج محمد

5. فتوی ترک موالات کس نے دیا تھا؟

(a).مولانا عبدالمحاسن محمد سجاد (b).مولانا محمود الحسن (c).مولانا محمد قاسم نانوتو ی (d).تینوں نے

6. جمعیت علماء ہند کے پہلے صدر کون تھے؟

(a).مولانا محمود حسن (b).مفتی کفایت اللہ (c).مولانا اسد مدنی (d).مولانا حفظ الرحمن

7. جمعیت علمائے ہند کا تیسرا سالانہ اجلاس کس سن میں ہوا؟

(a).1919 (b).1920 (c).1921 (d).1922

8. ستیہ گرہ تحریک میں جمعیت علماء ہند شریک ہوئی تھی؟

(a).ہاں (b).نہیں (c).سب غلط

9. ادارہ حربیہ کس سن میں قائم کیا گیا؟

(a).1925 (b).1935 (c).1945 (d).1930

10. جمعیت یوتھ کلب کب قائم ہوا؟

2016.(a) 1916.(b) 2018.(c) 2014.(d)

1.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. جمعیت علمائے ہند کے اصول وضوابط مختصراًنوٹ فرمائیں۔
2. جمعیت علمائے ہند کے قیام کے اسباب بیان کیجیے۔
3. جمعیت یوتھ کلب پر مختصر نوٹ لکھیے۔
4. تحریک ترک موالات میں جمعیت علماہند کی شمولیت کو واضح کریں۔
5. جمعیت علمائے ہند کے پروگرام کو مختصرا تحریر کیجیے۔

1.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. جمعیت علمائے ہند کے اجلاس کے مقاصد مفصل تحریر کریں۔
2. ادارہ حربیہ کے قیام اور مقاصد پر نوٹ تحریر کریں۔
3. جمعیت علمائے ہند کے تحت چلنے والے اداروں کا تعارف کرائیں۔

1.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. جمعیت علماء ہند: اول، دوم، : پروین روزینہ
2. تاریخ جمعیت علماء ہند : اسیر ادروی
3. جمعیت علماء پر ایک تاریخی تبصرہ : حفظ الرحمن واصف دہلوی
4. جمعیت علماء نمبر ہفت روزہ الجمعیۃ 27 اکتوبر 1955 : محمد سالم جامی

اکائی 2: تبلیغی جماعت

اکائی کے اجزا:

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 بانی تبلیغی جماعت: ذاتی احوال اور تبلیغی جماعت کا آغاز

2.2.1 تبلیغی گشتوں کا آغاز

2.2.2 تبلیغی اجتماعات اور جلسے

2.2.3 وفات بانی جماعت

2.3 تبلیغی جماعت کے مقاصد

2.4 تبلیغی جماعت کے چھ اصول

2.4.1 کلمہ طیبہ

2.4.2 نماز

2.4.3 علم وذکر

2.4.4 اکرام مسلم

2.4.5 تصحیح نیت

2.4.6 تبلیغ

2.5 تبلیغی جماعت کے امیر

2.5.1 مولانا محمد یوسف کاندھلوی (امیر ثانی)

2.5.2 مولانا محمد انعام الحسن کاندھلوی (امیر ثالث)

2.5.3 مولانا محمد اظہار الحسن، مولانا محمد زبیر الحسن، مولانا محمد سعد

2.6 اکتسابی نتائج

2.7 نمونہ امتحانی سوالات

2.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

2.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

2.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

2.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

2.0 تمہید

ہندوستان اور عالمی سطح پر جو تحریکات اٹھی ہیں، ان کے خصوصی پس منظر رہے ہیں۔ ہندوستان میں آغاز ہونے والی تحریک 'تبلیغی جماعت' کا بھی ایک خاص پس منظر تھا۔ اس کے پیش نظر یہ بات تھی کہ مسلمانوں کے اندر اسلامی تعلیمات سے متعلق بیداری لائی جائے اور انہیں کتاب وسنت سے جوڑا جائے۔ اس تحریک کا آغاز دہلی اور میوات کے علاقے میں ہوا۔ اس وقت ان علاقوں میں زیادہ بے دینی تھی۔ اس کی تفصیل آپ آئندہ صفحات میں پڑھیں گے۔

2.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد مسلمانوں کی ایک اہم تحریک 'تبلیغی جماعت' سے متعلق معلومات فراہم کرنا ہے۔ اس اکائی کے پیش نظر طلبہ کو تبلیغی جماعت کے آغاز وارتقاء سے آگاہ کرانا ہے۔ تبلیغی جماعت کے امیروں کے احوال اور تبلیغی خدمات پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالنا، اس کے کام کرنے کے اصولوں اور مقاصد سے انہیں واقف کرانا اس اکائی کے اہم مقاصد میں شامل ہیں۔

2.2 بانی تبلیغی جماعت: ذاتی احوال اور تبلیغی جماعت کا آغاز

تبلیغی جماعت کے بانی مولانا محمد الیاس بن محمد اسماعیل ہیں۔ مولانا محمد الیاس صاحب کی پیدائش 1303ھ کاندھلہ، صوبہ اترپردیش میں ہوئی اور آپ کا تاریخی نام اختر الیاس رکھا گیا۔ قرآن مجید کا حفظ اور عربی وفارسی کی ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے والد صاحب سے، نیز کاندھلہ میں حکیم محمد ابراہیم سے حاصل کی۔ پھر 1314ھ کے اختتام یا 1315ھ کے آغاز میں اپنے بڑے بھائی مولانا محمد یحییٰ کے ساتھ مولانا رشید احمد گنگوہی کی خدمت میں گنگوہ تشریف لے گئے، اور آگے کی تعلیم وہاں جاری رکھی۔ 1323ھ میں مولانا گنگوہی کے انتقال کے بعد اپنے بڑے بھائی کی صحبت میں رہے، اور علماء وبزرگان نیز مولانا گنگوہی کے خلفاء سے تربیت وسلوک اور فیض حاصل کرتے رہے۔ بعد ازاں مولانا خلیل احمد سہارنپوری سے آپ نے راہ سلوک کی منزلیں طے کیں۔ 1326ھ میں آپ شیخ الہند مولانا محمود حسن کے درس حدیث میں

شریک ہونے کے لئے دیوبند تشریف لے گئے۔ پھر بعد میں اپنے بڑے بھائی مولانا محمد یحییٰ سے بھی حدیث کا دورہ کیا۔

شوال 1328ھ میں مظاہر العلوم سہارنپور میں خدمت تدریس سے وابستہ ہو گئے، جہاں آپ نے متوسط کتابوں کی تدریس انجام دی۔ 6/ذی قعدہ 1330ھ مطابق 17/اکتوبر 1912ء کو اپنے حقیقی ماموں مولانا رؤف الحسن کی صاحبزادی سے آپ کا نکاح ہوا۔ 25/ربیع الاول 1336ھ کو آپ کے سب سے بڑے بھائی مولانا محمد کا انتقال ہو گیا، جو دہلی میں والد صاحب کے قائم کردہ مدرسہ میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ میوات اور دہلی کے لوگ ان سے خصوصیت کے ساتھ مستفید ہوتے تھے۔ آپ ان کی تعلیم و تدریس کے ساتھ تربیت و سلوک کی مجلسیں بھی منعقد کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد مولانا محمد الیاس صاحب مظاہر العلوم سے دہلی منتقل ہو گئے اور وہیں اپنا کام جاری رکھا۔

اہل میوات کے ساتھ تعلق اور ان کی اصلاح کا کام آپ کے والد صاحب کے زمانہ سے ہی جاری تھا۔ والد صاحب مولانا محمد اسماعیل کے دہلی میں مدرسہ قائم کرنے سے پہلے ہی یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ مدرسہ قائم ہو جانے کے بعد والد صاحب اور آپ کے بڑے بھائی مولانا محمد کا طریقہ کار لوگوں کی اصلاح و تربیت کے سلسلہ میں یہ رہا کہ اپنے مدرسہ میں میوات کے بچوں کو رکھ کر ان کی خوب اچھی تعلیم و تربیت کرتے پھر انہیں ان کے علاقوں میں بھیج دیتے تھے، جہاں وہ لوگوں کی اصلاح و تربیت کا کام انجام دیتے تھے۔ لیکن جب مولانا محمد الیاس ان کی جگہ دہلی آئے تو انہیں اہل میوات کی اصلاح کے لئے والد صاحب اور بڑے بھائی کا یہ عمل کافی نہ لگا۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ میوات میں بھی مدارس اور مکاتب قائم کئے جائیں، تاکہ اصلاح و تبدیلی کی رفتار تیز ہو۔

اس وقت اہل میوات میں دینی جہالت اس قدر تھی کہ ان کے گھروں میں غیر مسلموں کے معبودان (مورتیاں) رکھے ہوتے تھے، وہ غیروں کے ساتھ ان کے مذہبی تہواروں میں شریک ہوتے تھے، حتیٰ کہ ان کے بچوں کے نام بھی غیر مسلموں کے نام پر ہوتے تھے، انہیں نماز، روزہ تو درکنار بسا اوقات کلمہ طیبہ کا بھی پتا نہیں ہوتا تھا۔ لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کے وہ عادی تھے۔

ان کی اس صورت حال پر مولانا محمد الیاس کا یہ قوی احساس تھا کہ اگر اس علاقہ میں دینی تعلیم کی اشاعت کی گئی تو وہاں کی جہالت اور بے دینی دور ہو جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے دہلی میں والد صاحب کے ذریعہ قائم کردہ مدرسہ کے علاوہ میوات کے علاقہ میں بھی مدارس اور مکاتب قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ لیکن یہ ایک دشوار گزار عمل تھا، کیونکہ اہل میوات کے نزدیک کاشت کاری اور گلہ بانی سے بڑھ کر کوئی منفعت بخش اور اہم کام نہ تھا، لہٰذا وہ کسی بھی طرح اس بات کے لئے رضامند نہ ہوتے تھے کہ ان کے بچے ان کاموں کو چھوڑ کر کسی دوسرے کام میں مصروف ہوں۔ لیکن مولانا الیاس کی مسلسل کوششوں اور انتھک محنتوں سے ان کا منصوبہ کامیاب ہوا، اور ابتداءاً ایک مکتب قائم کر لیا گیا۔ پھر چند ہی دنوں میں دس مکاتب ان کی نگرانی میں قائم ہو گئے۔ اس کے بعد بہت مختصر مدت میں بڑی تعداد میں مکاتب قائم ہو گئے اور لوگوں کی اصلاح اور دینی تعلیم کی مہم تیز تر ہو گئی۔

لیکن پھر جلد ہی انہیں اس بات کا بھی احساس ہو گیا کہ ان مکاتب سے جو طلباء فارغ ہو رہے ہیں ان کی خاطر خواہ اصلاح اور دینی تربیت نہیں ہو پا رہی ہے۔ اس نتیجہ کی مختلف وجوہات تھیں۔ بڑی وجہ یہ تھی کہ طلباء کے گھر اور محلہ والوں کے نزدیک دین کی کوئی قدر

وقیمت نہ تھی، اور نہ ہی اسے حاصل کرنے کا کوئی شوق وجذبہ تھا۔ چنانچہ طلباء کو گھروں میں دینی تعلیم کے حصول پر کسی قسم کا شوق نہیں دلایا جاتا تھا۔ وہ فارغ ہو کر آتے تھے تو ان کے علمی مقام کی بنیاد پر نہ ہی ان کی کوئی عزت ہوتی تھی اور نہ ہی ان کی باتوں کی کوئی وقعت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ فراغت کے بعد جب وہ اپنے خاندان اور محلہ میں جاتے تھے تو وہ انہی کے رنگ میں رنگ جاتے تھے۔

2.2.1 تبلیغی گشتوں کا آغاز

چنانچہ مولانا نے مدارس ومکاتب کے ساتھ لوگوں کی اصلاح وتربیت کی یہ تدبیر اختیار کی کہ تبلیغی گشت نکالی جائیں، جو لوگوں کے پاس جا جا کر دین کی باتیں بتائیں۔ ان تبلیغی گشتوں کا آغاز 1345ھ مطابق 1926ء میں ہوا۔ لیکن چونکہ لوگ اس طریقہ دعوت وتبلیغ سے نا آشنا تھے، اس لئے جب مبلغین گشت میں ان سے ملتے اور اسلام کے اصول وارکان بیان کرتے تو انہیں بڑی حیرانی اور تعجب ہوتا تھا، جس کی وجہ سے مبلغین کو بھی اپنی باتیں پیش کرتے ہوئے کچھ پس وپیش ہوتی تھی۔ لیکن پھر جلد ہی قصبہ نوح میں ایک اجتماع ہوا۔ اس اجتماع میں اس علاقے کے بالخصوص میوات کے سربر آوردہ لوگ شریک تھے۔ مولانا نے ان سے مفصل طور پر اپنا طریقہ دعوت بیان فرمایا اور ان سے مطالبہ کیا کہ جماعتیں بنا کر گاؤں اور قصبوں میں گشت کی جائے اور لوگوں کے سامنے اسلام کی بنیادی تعلیمات پیش کی جائیں۔ لوگوں نے آپ کے اس طریقہ دعوت کو پسند تو کیا لیکن آپ کے مطالبہ کو پورا کرنے میں قدرے سستی برتی۔ تقریباً ایک مہینہ کے بعد جماعت تیار ہوئی اور وہ گاؤں بھی طے ہو گیا جہاں جماعت جانی تھی۔ یہ جماعت ایک ہفتہ کے دورہ پر تھی۔ یہ طے کر دیا گیا تھا کہ یہ جماعت اختتام پر جمعہ 'سوہنے' گاؤں، ضلع گوڑ گانوہ میں پڑھے گی۔ اس موقع پر مولانا بھی جمعہ میں موجود تھے۔ وہاں دوبارہ جماعت تیار ہوئی، جو دورہ کرتے ہوئے آئندہ جمعہ تاؤڑو پہنچی۔ پھر جماعتیں بنتی گئیں اور میوات کے مختلف علاقوں میں ان کی گشتیں ہوتی رہیں اور اسلام کی بنیادی تعلیمات لوگوں کے سامنے پیش کی جاتی رہیں۔ (سید ابوالحسن علی ندوی، حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت، ص 91-92)

اب تک ان گشتوں کا سلسلہ میوات کے پانچ کوس کے دائرہ میں جاری تھا۔ ان گشتوں سے اگرچہ میوات کے لوگ دینی تعلیمات سے آگاہ ہو رہے تھے، لیکن مولانا کی نظروں میں ان گشتوں سے وہ فائدے حاصل نہیں ہو رہے تھے جن کی آپ توقع رکھتے تھے۔ چنانچہ محرم 1352ھ مطابق اپریل 1933ء سے آپ نے میوات کے کاشتکاروں کو میوات سے باہر دینی مراکز بھیجنے کا فیصلہ کیا، تاکہ وہ اپنے مشاغل سے مکمل طور پر فارغ ہو کر جماعت کی شکل میں نکلیں، اور جو کچھ اب تک سیکھتے رہے ہیں ان کا آپس میں مذاکرہ کریں اور ان پر پابندی کے ساتھ عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں۔ اس کے علاوہ دینی مراکز میں اللہ کے نیک اور دیندار بندوں کی زندگیوں اور نشست وبرخاست کا قریب سے مشاہدہ کریں، قرآن پڑھیں، مسائل وفضائل معلوم کریں اور ان کے مطابق اپنی زندگی ڈھالنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ اس مقصد کے ساتھ میوات کے لوگوں پر مشتمل پہلی جماعت کاندھلہ بھیجی گئی جو خود مولانا محمد الیاس کا وطن تھا، اور علماء کی بڑی تعداد وہاں آباد تھی۔ دوسری جماعت رائے پور (سہارنپور) بھیجی گئی، جو ایک روحانی مرکز تھا، اور جہاں شاہ عبد الرحیم رائے پوریؒ کے جانشین مولانا عبد القادرؒ کی خانقاہ قائم تھی۔

اس کے بعد جماعتیں نکلنے کا سلسلہ چلتا رہا، اور آہستہ آہستہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ میوات کے جن لوگوں کو پانچ کوس کی جماعت

میں نکلنا دشوار ہوتا تھا، وہ ملک کے کونے کونے تک اسلامی تعلیمات کی تبلیغ واشاعت کے لئے جماعتوں اور چلوں میں نکلنے لگے، ایک ایک گھر سے ایک ہی وقت میں کئی کئی افراد چلوں (چالیس دن) میں نکلتے تھے۔ مولانا سید محمد ثانی حسنی ان کے تبدیلیٔ احوال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"چند ہی سال میں میوات کے وسیع علاقہ میں دین اور دینداری کی ایسی اشاعت ہوئی اور اس تاریک خطہ میں ایسی روشنی پھیلی جس کی مثال دور دور نہیں ملتی۔ میواتی جو خود دین سے ناآشنا اور نابلد تھے، دوسرے شہروں اور دور دراز علاقوں میں اپنی سادگی کے ساتھ دین کی اشاعت کا کام کرنے لگے۔ جہاں میلوں اور کوسوں تک مسجد نظر نہیں آتی تھی وہاں گاؤں گاؤں مسجدیں بننے لگیں۔ جہاں دور دور تک کوئی قرآن پڑھنے والا نہ تھا، اب وہاں ایک گھر میں کئی کئی حافظ ایک ایک گاؤں میں کئی کئی عالم ہونے لگے۔ ہندووانہ وضع ولباس سے نفرت پیدا ہونے لگی، اسلامی وشرعی لباس کی وقعت دلوں میں پیدا ہوگئی، شادیوں کے مشرکانہ رسوم کا خاتمہ ہونے لگا۔ جرائم، فسادات اور بداخلاقیوں کا تناسب کم ہوگیا۔" (سید محمد ثانی حسنی، سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی. 154- 155)

اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تحریر فرماتے ہیں:

> "بعض علاقوں میں گاؤں کے گاؤں ایسے ہیں جہاں ایک بچہ بھی آپ کو بے نمازی نہ ملے گا۔ دیہات کی وہ مسجدیں جہاں یہ لوگ اپنے مویشی باندھتے تھے، آج وہاں پانچوں وقت اذان اور جماعت ہوتی ہے۔ آپ کسی راہ چلتے دیہاتی کو روک کر اس کا امتحان لیں۔ وہ آپ کو صحیح تلفظ کے ساتھ کلمہ سنائے گا۔ اسلام کی تعلیم کا سیدھا سادھا لب لباب، جو ایک بدوی کو معلوم ہونا چاہیے، آپ کے سامنے بیان کرے گا اور آپ کو بتائے گا کہ اسلام کے ارکان کیا ہیں۔ اب آپ وہاں کسی مسلمان مرد عورت یا بچہ کو ہندوانہ لباس میں نہ پائیں گے، نہ اس کے جسم کو بے ستر دیکھیں گے، نہ اس کے گھر کو، نہ اس کے لباس کو نجاستوں میں آلودہ پائیں گے۔ ان کی عادات وخصائل اور ان کے اخلاق میں بھی اس مذہبی تعلیم وتبلیغ کی وجہ سے نمایاں فرق ہوگیا ہے۔ اب وہ متمدن اور مہذب طرز زندگی کی طرف پلٹ رہے ہیں۔ جرائم میں حیرت انگیز کمی ہوگئی ہے۔ لڑائیاں، فسادات اور مقدمات بہت کم ہوگئے ہیں۔ ان کا علاقہ اب ایک پر امن علاقہ ہے جس کا اعتراف خود وہاں کے حکام کر رہے ہیں۔" (سید ابوالاعلیٰ مودودی، "احیاء دین کی جدوجہد کا صحیح طریقہ اور ایک قابل تقلید نمونہ۔ ص23-24)

چونکہ دہلی مرکز رہی ہے، وہاں بستی نظام الدین کی جامع مسجد میں ہر جمعہ کی رات کو اور ہر مہینہ کے آخری چہار شنبہ کو مولانا کا روح پرور اور مؤثر خطاب ہوتا تھا، جس سے بڑی تعداد میں لوگ متاثر ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں سے آنے والے لوگوں سے مولانا کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان کی اکثریت مولانا سے متاثر تھی، بلکہ اکثر وبیشتر مولانا کے طریقہ دعوت وتبلیغ پر کام کرنے کے لئے آمادہ ہوتے تھے۔ اس طرح یہ دعوتی وتبلیغی مہم بڑے پیمانے پر پورے ملک میں پھیلی۔ دہلی کی بڑی شخصیتوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین خان کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔ وہ مولانا سے بڑے متاثر تھے۔ ملک کے بڑے بڑے تعلیمی ادارے خصوصاً دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مظاہر العلوم سہارنپور، دار العلوم دیوبند وغیرہ کا بھی آپ کے ساتھ تعلق رہا ہے۔ وہاں کے فضلاء اور طلباء آپ کے طریقہ دعوت پر اپنے

اپنے علاقوں میں اسلام کا پیغام اور بنیادی اسلامی اصول وارکان کو عام کرتے رہے ہیں۔

2.2.2 تبلیغی اجتماعات اور جلسے

اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مہینہ میں ایک مرتبہ میوات میں کسی جگہ اور سال میں نوح کے مدرسہ میں ایک تبلیغی جلسہ ہوا کرتا تھا۔ ان جلسوں کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اس کے اصول وارکان سے واقف کرایا جائے، اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگ تبلیغی جماعتوں میں نکلنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ دراصل ان اجتماعات اور جلسوں میں جس قدر زیادہ لوگ تبلیغی جماعتوں میں جانے کے لئے تیار ہوتے تھے اسی قدر انہیں کامیاب اجتماع اور جلسہ مانا جاتا تھا۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ تحریر کرتے ہیں:

> ”ان جلسوں میں تقریریں اور مواعظ بالکل ضمنی تھے، اصل مقصود اور اصل کوشش نئی جماعتیں بنانے اور ان کو باہر نکالنے کی ہوا کرتی تھی، اور یہی جلسہ کی کامیابی کا معیار تھا کہ کتنی جماعتیں اپنے علاقے سے باہر جانے اور یوپی کے گشت کے لئے آمادہ ہوئیں، اور کتنے آدمیوں نے کتنا وقت دیا؟“۔ (ندوی، *حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت*، 140)

اسی نوعیت کا ایک جلسہ 8، 9، 10 ذی قعدہ 1360ھ مطابق 28، 29، 30 نومبر 1941ء میں قصبہ نوح میں ہوا تھا۔ یہ اجتماع اپنی نوعیت کا بڑا اہم اجتماع تھا۔ اس میں شرکاء کی تعداد کا اندازہ 25 ہزار لگایا گیا ہے۔ اس کی اہمیت اس اعتبار سے قابل قدر ہے کہ اس میں گاؤں اور قصبوں کے کاشتکار، تاجر، مدارس کے علماء وفضلاء، کالجز کے طلباء اور عصری علوم کے حاملین نے بڑی تعداد میں شرکت کی تھی، اور انہوں نے باہم مل کر کام کرنے کا عزم کیا تھا۔ یہاں سے جماعتیں بنا بنا کر مختلف علاقوں میں پھیل گئے تھے اور اسلام کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے میں بھرپور کوششیں کی تھیں۔ جس کے بعد سے تبلیغی جماعت کے چرچے ہر چہار جانب ہونے لگے تھے۔

1356ھ میں آپ حج کے لئے تشریف لے گئے۔ وہاں بھی آپ نے اپنے رفقاء اور احباب کے ساتھ لوگوں میں تبلیغی مشن کو جاری رکھا۔ مختلف مواقع پر آپ نے عوام سے خطابات کئے، لوگ کافی متاثر ہوئے، اور اس طرز پر کام کرنے کے لئے آمادہ ہوئے۔ آپ نے مکۃ المکرمہ کے سلطان سے بھی ملاقات کی، ان کے سامنے اپنی بات پیش کی انہوں نے تحسین فرمائی اور حوصلہ افزائی کی۔ اس کے علاوہ مدینہ منورہ کے امیر، اور مختلف دیگر امراء وحکام، تجار اور پیشہ وروں سے بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں، سبھوں نے اس کام کی تائید و تحسین کی، اور اپنے علاقوں میں اس طرز پر کام کرنے کا یقین دلایا۔

2.2.3 وفات بانی جماعت

مولانا محمد الیاس شروع ہی سے کافی کمزور تھے۔ پھر جب تبلیغی مہم کا آغاز ہوا تو اسی میں دن رات لگے رہے، اسی کی فکر ہر وقت دامن گیر رہتی، جس کی وجہ سے آپ کی صحت مزید خراب ہوتی چلی گئی۔ آخری عمر میں آپ کو پیچش کی شکایت ہوگئی تھی، جس سے کمزوری اس قدر بڑھی کہ آپ صاحب فراش ہوگئے۔ دو آدمیوں کے سہارے سے نماز کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔ بالآخر مرکز حضرت نظام الدین میں 11/ رجب 1363ھ مطابق 1/ جولائی 1944ء کو آپ مالک حقیقی سے جا ملے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ.

2.3 تبلیغی جماعت کے مقاصد

ہندوستان میں جو تحریکات اٹھیں، ان کے مقاصد مختلف تھے۔ تبلیغی جماعت کا آغاز جس خاص پس منظر میں ہوا اس کا ابتدائی مقصد یہ تھا کہ جو لوگ دین سے بالکل ناواقف ہیں، اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اس کے عقائد و نظریات سے بے بہرہ ہیں، انہیں کسی طرح ان تعلیمات سے نہ صرف آگاہ کر دیا جائے بلکہ ان کے دلوں میں ان پر عمل پیرا ہونے کا داعیہ پیدا کر دیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے مساجد کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ جماعتوں کی شکل میں دوسرے علاقوں کے اسفار اور گشتوں کے پیش نظر بھی یہی مقصد تھا کہ وہ اپنی تجارت وزراعت اور دیگر مصروفیتوں سے کچھ وقت اپنے لئے فارغ کریں اور ایک خاص فضا میں رہیں، اور جو کچھ پہلے سیکھتے رہے ہیں ان کا اپنے ساتھیوں کے ساتھ مذاکرہ کریں اور ان پر عمل پیرا ہو جانے کی کوشش کریں، عبادات واذکار میں وقت گذاریں، اور تربیت یافتہ ہو کر گھر واپس جائیں۔ پھر اسی مقصد کے ساتھ ان کی ابتدائی جماعتیں ایسے مقامات کی جانب روانہ ہوئیں جو علماء، صلحاء اور دینداروں کے مراکز تھے، تاکہ انہیں اسلامی تعلیمات کے عملی نمونوں کا مشاہدہ ہو، وہ ان کی صحبتوں میں رہیں، اور نتیجتاً ان کے دلوں میں ان تعلیمات پر عمل کا داعیہ پیدا ہو۔ اس کے ساتھ ہی ان اسفار اور گشتوں کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ جماعت کے امیر کی نگرانی میں اسلام کی ان بنیادی تعلیمات کو عوام تک پہنچائیں، انہیں ان تعلیمات کے مطابق زندگی اختیار کرنے کی تلقین کریں اور انہیں مسجدوں تک لانے کی کوشش کریں۔

البتہ یہ تبلیغی جماعت کے قیام کا ابتدائی مقصد تھا، جیسا کہ عرض کیا گیا۔ اس کے قیام کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اسلام کے پورے نظام حیات کو ساری قوم پر برپا کر دیا جائے، اور اس کے مطابق امت مسلمہ اپنی زندگی گذارے۔ تمام اوامر ونواہی اور احکام ومسائل میں محض اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو پیش نظر رکھا جائے۔ اس جماعت کے بانی مولانا محمد الیاس نے ایک موقع پر فرمایا تھا:

> "ہماری اس تحریک کا اصل مقصد ہے مسلمانوں کو 'جمیع ما جاء به النبي ﷺ' سیکھانا، (یعنی اسلام کے پورے علمی وعملی نظام سے امت کو وابستہ کر دینا) یہ تو ہے ہمارا اصل مقصد۔ رہی قافلوں کی یہ چلت پھرت اور تبلیغی گشت، سو یہ اُس مقصد کے لئے ابتدائی ذریعہ ہے، اور کلمہ ونماز کی تلقین وتعلیم گویا ہمارے پورے نصاب کی 'الف، ب، ت' ہے۔" (محمد الیاس، *ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ*، مرتبہ محمد منظور نعمانی (لکھنؤ، کتب خانہ الفرقان، بار ششم)، 31)

پھر ایک دوسری جگہ بانی جماعت اپنے مقصد کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "میں سچ کہتا ہوں کہ ابھی تک آلی (اصلی) کام شروع نہیں ہوا، جس دن کام شروع ہو جائے گا (یعنی زندگی کے تمام شعبوں میں پورا دین آجائے گا) تو مسلمان سات سو برس پہلے کی حالت کی طرف لوٹ جائیں گے، اور اگر کام شروع نہ ہوا بلکہ اسی حالت پر رہا، جس پر اب تک ہے اور لوگوں نے اس کو مجملہ تحریکات کے ایک تحریک سمجھ لیا ہے، اور کام کرنے والے اس راہ میں بچل گئے (یعنی جمود کا شکار ہو گئے اور اصل مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کی) تو جو فتنے صدیوں میں آتے وہ مہینوں میں آجائیں گے۔ اس لئے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔" (محمد الیاس، ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ، 42۔)

البتہ علماء کی جماعتوں اور گشتوں کا بنیادی مقصد شروع ہی سے یہ رہا کہ وہ عوام میں جائیں اور اسلام کے بنیادی ارکان واصول سے انہیں آگاہ کریں، انہیں ان پر عمل کرنے کی ترغیب دلائیں، ان کے سامنے عملی نمونے پیش کریں اور انہیں مسجدوں سے جوڑیں۔

تبلیغی جماعت غیر مسلموں میں تبلیغ کی قائل نہیں ہے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جب تک ہم اسلامی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ سے خود کو آراستہ نہیں کرلیں گے، اسلام کی اشاعت نہیں ہوگی۔ پھر جب لوگ اجتماعی طور پر اسلامی تعلیمات اور اخلاق حسنہ سے خود کو مزین کرلیں گے تو نہ صرف اس سے گردوپیش کے لوگ متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوں گے بلکہ اس سے ہمارے دنیاوی حالات بھی بدلیں گے اور ہمارے حق میں بہتر ہوں گے۔ (عبد الباری، *آزاد ہندوستان میں مسلم تنظیمیں: ایک جائزہ* (نئی دہلی: انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز، 2001ء)، 141-142)

2.4 تبلیغی جماعت کے چھ اصول

تبلیغی جماعت کے پیش نظر جو مقاصد ہیں انہیں حاصل کرنے کے لئے بانی جماعت نے چھ اصول مرتب کئے ہیں۔ یہ ان کے نزدیک کتاب وسنت سے ماخوذ ہیں اور ان کا نچوڑ ہیں۔ ان اصولوں میں وہ سارے امور شامل ہیں جن پر عمل کرنے سے ایک انسان کی زندگی میں بتدریج اسلامی تعلیمات مکمل طور پر داخل ہو جاتی ہیں، اور اس راستے میں جو بھی پریشانیاں اور مشکلات پیش آتی ہیں ان سے نبرد آزما ہونے کے لئے وہ اسے تیار کر دیتی ہیں۔ اس لئے تبلیغی جماعت میں نہایت ہی سختی اور پابندی سے ان پر عمل کرایا جاتا ہے۔ بانی جماعت ان کی اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے ایک موقع پر فرماتے ہیں:

> "دوستو! اس تبلیغ میں اصولوں کی پابندی نہایت ضروری ہے۔ اگر کسی اصول میں ذرا بھی کوتاہی کروگے تو خدا کا وہ عذاب جو شاید بدیر آئے فوراً ہی تمہارے سر پر آموجود ہوگا۔ اس تحریک کی تاریخ میں دو ایسے واقعات پیش آئے جب یہ تحریک ظاہراً اپنے بام ترقی پر پہنچ کر اصول کی غیر جانبداری ہی کی وجہ سے پھر نیچے گری۔ پس بھائیو! چھ اصولوں کی سختی سے پابندی کرو۔" (ندوی، *حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت*، 168)

اسی طرح تبلیغی جماعت اور بانی جماعت سے دیرینہ تعلق رکھنے والے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ایک مقام پر تبلیغی جماعت کی مختلف خصوصیات ایثار وقربانی کا جذبہ، رضائے الٰہی کی طلب، اسلام اور مسلمانوں کا احترام، فرائض کی ادائیگی کا اہتمام، یاد الٰہی اور ذکر خداوندی کی مشغولیت وغیرہ کا تذکرہ کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

> "جماعت کی یہ خصوصیت اور امتیاز، داعی اول کے اخلاص......... کے بعد ان اصول وضوابط کا بھی نتیجہ ہے جو شروع سے اس کے داعی اول (حضرت مولانا الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ) نے اس کے لئے ضروری قرار دیئے اور جن کی ہمیشہ تلقین وتبلیغ کی گئی۔ وہ کلمہ طیبہ کے معانی وتقاضاؤں پر غور، فرائض وعبادات کے فضائل کا علم، علم وذکر کی فضیلت کا استحضار، ذکر خداوندی میں مشغولیت، اکرام مسلم اور مسلمان کے حق کی شناسائی وادائیگی، ہر عمل میں تصحیح نیت واخلاص، ترک مالایعنی، اللہ کے راستہ میں نکلنے اور سفر کرنے کے فضائل وترغیبات کا استحضار اور شوق، یہ وہ عناصر اور خصائص تھے جنہوں نے

اس دعوت کو ایک سیاسی، مادی تحریک اور استحصال فوائد، حصول جاہ و منصب کا ذریعہ بننے سے محفوظ فرمادیا اور وہ ایک خالص دینی دعوت اور حصول رضائے الٰہی کا ذریعہ رہی۔

یہ اصول و عناصر جو اس دعوت و جماعت کے لئے ضروری قرار دیئے گئے، کتاب و سنت سے ماخوذ ہیں، اور وہ رضائے الٰہی کے حصول و دین کی حفاظت کے لئے ایک پاسبان و محافظ کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان سب کے مآخذ کتاب الٰہی اور سنت و احادیث نبوی ہیں۔"

چنانچہ ان چھ اصولوں کی اسی اہمیت اور ضرورت کے پیش نظر بانی جماعت کے صاحبزادہ اور امیر جماعت ثانی مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ نے احادیث نبویہ ﷺ پر مشتمل ایک پوری کتاب "منتخب احادیث" کے نام سے تالیف کر دی، جو تبلیغی جماعت کے انہی چھ اصولوں کے مرکزی عناوین کے تحت بیان ہوئی ہیں۔ وہ چھ اصول حسب ذیل ہیں:

2.4.1 کلمہ طیبہ

کلمہ طیبہ یعنی "*لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ*" میں کئی باتیں مضمر ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ کلمہ طیبہ ہر ایک کو بہترین تجوید کے ساتھ یاد کرایا جائے۔ پھر کلمہ طیبہ کو محض زبانی پڑھ لینے پر اکتفاء نہ کیا جائے، بلکہ اس کا معنیٰ بھی خوب اچھی طرح سمجھ لیا جائے، کیونکہ اسی کے ذریعہ سے اس کا رابطہ دل کے ساتھ استوار ہو گا، اور دل اس کا اثر قبول کرے گا، پھر جسم دل کی آمادگی پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو گا۔ تبلیغی جماعت کے اس اصل کا مطلب یہ ہے کہ یہ تمام اسلامی عقائد پر متضمن ہے۔ لہٰذا اس کا مقصد یہ ہے کہ جب کوئی شخص اسے پڑھے تو اس کا معنیٰ و مفہوم کو سمجھتے ہوئے اللہ کی وحدانیت کے ساتھ تمام اسلامی عقائد پر ایمان لائے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ انسان رسول خدا محمد ﷺ کی رسالت پر بھی ایمان لائے گا، جو کہ کلمہ طیبہ کا لازمی جزء ہے۔ اور آپ ﷺ کی رسالت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی سنتوں کو اپنی پوری زندگی میں اتارا جائے، اور اسے اپنا ضابطہ حیات بنالیا جائے۔

2.4.2 نماز

نماز پر بطور ایک اصل تبلیغی جماعت نے اس لئے زور دیا ہے کہ اس کے اثرات انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہیں۔ اس کے اثر سے جہاں انسان گناہ کے کام کرنے سے رک جاتا ہے (سورہ عنکبوت:45)، وہیں اللہ کے دیگر احکام کی ادائیگی کی جانب دلی آمادگی بھی پیدا ہوتی ہے۔ پھر کلمہ طیبہ کے اقرار کے بعد انسان سے جس کام کے کرنے کا مطالبہ سب سے پہلے ہے، وہ یہی نماز ہے۔ لہٰذا ایک کلمہ توحید کے مقر شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ نماز کی ہر اعتبار سے درستگی اور اصلاح کی کوشش کرے۔ ظاہری اعتبار سے بھی اور باطنی بنیادوں پر بھی۔ ظاہری اعتبار سے اپنی نماز درست کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے اندر جو چیزیں پڑھی جاتی ہیں مثلاً قرآن شریف، ثناء، تحیات، درود شریف، اور دعائے قنوت، ان کو خوب اچھی طرح درست کرلے، پھر نماز کی شرائط و ارکان کی ادائیگی مکمل طور پر تو کرے ہی، ساتھ ہی سنن و مستحبات کی بھی اپنی نمازوں میں خوب پابندی کرے۔ اور باطنی طور پر اصلاح کا مطلب یہ ہے کہ جب نماز کے لئے نمازی کھڑا ہو تو کمال خشوع و خضوع کے ساتھ اس کی ادائیگی کرے، پورے طور پر اس کی توجہ اللہ تعالیٰ کی جانب ہو، اور وہ ہر طرح کے خیالات اور تفکرات سے خالی ہو۔

2.4.3 علم وذکر

تبلیغی جماعت کا تیسرا اصل یہ ہے کہ حصول علم اور ذکر اللہ کے لئے صبح اور شام میں کچھ وقت فارغ کیا جائے۔ بانی جماعت نے حصول علم کے باب میں عام لوگوں کے لئے اور اہل علم کے لئے الگ الگ نصاب بتایا ہے۔ عوام کے لئے جو نصاب مقرر کیا ہے وہ ہے فضائل نماز (شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ)، فضائل قرآن (شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ)، حکایات صحابہ (شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ)، فضائل ذکر (شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ)، جزاء الاعمال (مولانا اشرف علی تھانویؒ)، اگر قرآن پڑھنا نہ جانتا ہو تو اس کی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ پھر اگر کوئی شخص صاحب علم ہو تو اس کے لئے کتاب الاعمال، کتاب العلم والاعتقادات یا کتاب السنۃ یا کتاب الجہاد، کتاب المغازی، کتاب الفتن، کتاب الرقاق، کتاب الامر بالمعروف وغیرہ کا مطالعہ کرتے رہنا ضروری ہے۔

بانی جماعت نے عمومی ذکر کے طور پر ہر شخص کے لئے جو نصاب مقرر کیا ہے ان میں کلمہ تمجید کی ایک تسبیح صبح میں اور ایک تسبیح شام میں، اسی طرح درود واستغفار کی دو دو تسبیحات صبح وشام میں، اور قرآن کریم کی تلاوت ذکر میں شامل ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص کسی شیخ کے ہاتھوں بیعت ہو تو اس کے کہے کے مطابق ذکر کا اہتمام کرے۔

2.4.4 اکرام مسلم

تبلیغی جماعت کی اس اصل کا تعلق حقوق العباد اور آداب واخلاق سے ہے۔ انسان سماج میں رہتا ہے، جس کی وجہ سے لوگوں پر ایک دوسرے کے حقوق اور ذمہ داریاں ہیں۔ ان کی ادائیگی لازمی اور ضروری ہے۔ اسی طرح بڑوں کا احترام وتوقیر، چھوٹوں سے شفقت ومحبت کا تعلق رکھنا بھی اس ضمن میں شامل ہے۔ اس اصل کی اہمیت اس اعتبار سے بھی ہے کہ جب کوئی شخص حقوق العباد کی ادائیگی کرتا ہے، اور اچھے اخلاق وکردار کا حامل ہوتا ہے، تو اس سے دین اسلام کی اشاعت ہوتی ہے۔ پھر مستقل طور پر ان اوصاف سے متصف ہونے اور حقوق وفرائض کی ادائیگی کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ بانی جماعت اس باب میں فرماتے ہیں:

"اس کا خلاصہ ادائیگی حقوق ہے۔ ہر شخص کے ذمہ کچھ حقوق ہیں۔ ایک عمومی: ہر شخص کے ذمہ ہر مسلم کا نفس اسلام کی وجہ سے حق ہے۔ دوم خصوصی: خصوصیت کے اعتبار سے۔ مثلاً چھوٹا ہونا، اس کے حقوق خصوصی مثلاً شفقت، بڑا ہونا اس کا اس کی توقیر ہے اور قرابت کے حقوق ہیں۔ ہر ذی حق کے حق کو ادا کرنا۔ ان حقوق کی ادائیگی کو اشاعت دین کا وسیلہ بنایا جائے۔ مقصود نہ بنایا جائے۔" (افتخار فریدی، ارشادات ومکتوبات بانی تبلیغ حضرت مولانا شاہ الیاس، 109)

2.4.5 تصحیح نیت

کتاب وسنت میں نیت کی درستگی کی بڑی تعلیم دی گئی ہے۔ ان تعلیمات کا حاصل یہ ہے کہ کوئی بھی دینی کام، خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو اگر اس میں اللہ کی رضا کی نیت نہ ہو، لوگوں کو دکھانے کے لئے یا اپنی شہرت وغیرہ کے لئے ہو تو اس بڑے کام کے ذریعہ سے آخرت میں اسے کچھ بھی حاصل نہ ہو سکے گا۔ تبلیغی جماعت میں اسے بطور ایک اصل اپنے اصول میں رکھتے ہوئے یہ تعلیم دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ جو بھی نیک عمل کرتے ہیں، خواہ وہ مستقل طور پر نماز، روزے اور دیگر عبادات ہوں یا اذکار اور تسبیحات، اگر ان میں نیت خالص نہ ہوئی تو یہ

سارے نیک اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ پھر اپنے دلوں میں نیتوں کی تصحیح کرنے کے مختلف طریقے بھی بتائے گئے ہیں، مثلاً یہ نیت کی جائے کہ میں یہ کام اللہ کی رضا کے لئے کر رہا ہوں، یا جنت حاصل کرنے کے لئے، یا آخرت کے خوف سے، یا جہنم سے بچنے کے لئے، یا محض اللہ کا حکم سمجھ کر عمل کر رہا ہوں۔ یہ سب اخلاص کے دائرہ میں داخل ہیں۔ اسی طرح نیک اعمال پر اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے اور بشارتیں دی ہیں ان کے شوق میں، یا برے اعمال پر جو وعیدیں سنائی گئی ہیں ان سے بچنے کے لئے جو بھی عمل کئے جائیں گے وہ بھی اخلاص نیت میں شامل ہوں گے۔ مولانا محمد الیاسؒ فرماتے ہیں:

"ان سب کاموں کو محض رضائے الٰہی خداوندی کے لئے کرنا اور اپنی اصلاح کے لئے کرنا۔ نظر کا کسی غیر کی طرف نہ جانا۔ اثر و نتیجہ کی طرف بھی ملتفت نہ ہونا۔" (ایضاً۔)

2.4.6 تبلیغ

یہ تبلیغی جماعت کی چھٹی اصل ہے۔ اس اصل کے تحت اس پر بہت زور دیا جاتا ہے کہ ہر شخص اسلامی تعلیمات اور اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچانے کے لئے اپنا کچھ وقت فارغ کرے، اور لوگوں سے ملاقاتیں کرے، جماعت کی شکل میں دوسرے علاقوں کا سفر کرے۔ ان تبلیغی اسفار اور جماعتوں کی مدّت تین دن، چالیس دن، چار ماہ اور ایک سال تک ہو سکتی ہے۔ یہ افراد اس دوران علاقے کی مسجد میں قیام کرتے ہیں۔

2.5 تبلیغی جماعت کے امیر

تبلیغی جماعت کا جب آغاز ہوا تھا تو عملی طور پر اس کے پہلے امیر مولانا محمد الیاس صاحب ہی تھے۔ ان کے تفصیلی حالات آپ اوپر پڑھ چکے ہیں۔ ان کے بعد تبلیغی جماعت کے جو دیگر امیر ہوئے ان کے حالات پر اختصار کے ساتھ ذیل میں روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

2.5.1 مولانا محمد یوسف کاندھلوی (امیر ثانی)

آپ کی پیدائش 25/ جمادی الاولیٰ 1335ھ مطابق 20/ مارچ 1917ء کو ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ دس سال کی عمر تک قرآن کریم حفظ کر لیا تھا۔ صرف کی تقریباً ساری کتابیں والد صاحب سے پڑھیں۔ مولانا مقبول حسن گنگوہی سے فقہ پڑھی۔ 1351ھ میں مظاہر العلوم سہارنپور تشریف لے گئے اور ہدایہ و میبذی وغیرہ وہاں پڑھیں۔ محض ایک سال کے اندر ہی آپ والد صاحب کے پاس لوٹ آئے اور ان سے مشکوٰۃ و جلالین کا درس لیا۔ پھر دوبارہ 1354ھ میں مظاہر العلوم سہارنپور گئے، ابھی صحاح ستہ کا کچھ حصہ ہی پڑھا تھا کہ والد صاحب کی خرابیٔ صحت کی وجہ سے واپس ان کے پاس لوٹ آئے، اور صحاح کا بقیہ حصہ اپنے والد صاحب سے پڑھا۔ آپ کو تصنیف و تالیف سے بھی خاص شغف تھا، چنانچہ آپ نے شرح معانی الآثار (مؤلفہ امام طحاوی) کی شرح "امانی" کے نام سے ایک جلد میں عربی زبان میں لکھی ہے، دوسری کتاب "حیاۃ الصحابہ" اردو زبان میں تین جلدوں پر مشتمل ہے، جن میں سے ہر ایک اوسطاً 850 صفحات پر محتوی ہے۔ یہ دونوں کتابیں آپ کی علمی یادگار ہیں۔

مولانا محمد یوسف جماعت کے کاموں میں شروع ہی سے والد صاحب کے ساتھ وابستہ رہے تھے۔ اس لئے انہیں جماعت کے کاموں میں والد صاحب کے طریقہ کار سے خوب آگاہی تھی، والد صاحب کی غیر موجودگی میں آپ ہی اس کی ساری سرگرمیوں کی نگرانی کرتے تھے، اور والد صاحب کے منشاء کے مطابق جماعت کے کاموں کو آگے بڑھاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بانی جماعت نے انتقال سے چند دنوں پہلے ہی اجازت وخلافت عطافرمادی تھی، پھر 1363ھ /1944ء میں جب آپ کے والد صاحب کا انتقال ہوا تو لوگوں نے اتفاق رائے سے آپ کو اپنا امیر منتخب کر لیا تھا۔ آپ اپنی وفات (1384ھ /1965ء) تک امیر جماعت کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے تھے۔

2.5.2 مولانا محمد انعام الحسن کاندھلوی (امیر ثالث)

آپ کی پیدائش کاندھلہ میں 18/ جمادی الاولیٰ 1336ھ مطابق 20/ فروری 1918ء کو ہوئی۔ حفظ قرآن اپنے وطن میں حافظ منگتو کی نگرانی میں کیا، پھر اپنے نانا سے بوستاں تک کی تعلیم پائی، بعد ازاں ابتدائی عربی کی تعلیم مدرسہ کاشف العلوم، نظام الدین، دہلی میں بانی جماعت مولانا محمد الیاس سے حاصل کی۔ 1351ھ میں مظاہر العلوم سہارنپور گئے۔ محض ایک سال کے اندر ہی مولانا محمد یوسف (امیر ثانی) کے ساتھ نظام الدین، دہلی لوٹ آئے اور مولانا الیاس سے مشکوٰۃ وجلالین پڑھیں۔ پھر 1354ھ میں مظاہر العلوم سہارنپور کا دوبارہ سفر ہوا، لیکن اس بار بھی صحاح ستہ کی تعلیم ادھوری رہی اور نظام الدین آکر انہیں مولانا محمد الیاس سے مکمل کیا۔

چونکہ بچپن ہی سے آپ کی رفاقت مولانا محمد یوسف کے ساتھ رہی تھی۔ تبلیغی کاموں میں بھی ان کے ساتھ تھے، اور برابر کا تجربہ بھی تھا۔ اس لئے اہل تبلیغ کے نزدیک مولانا محمد یوسف کے بعد سب سے مستند اور قابل اعتبار شخص مولانا محمد انعام الحسن ہی تھے۔ چنانچہ 1965ء میں جب مولانا محمد یوسف کی وفات ہوئی تو آپ کو امیر جماعت کے طور پر منتخب کیا گیا۔ آپ تاحیات اس منصب کی ذمہ داریاں انجام دیتے رہے۔ آپ کی وفات 10/ محرم 1416ھ مطابق 10/ جون 1995ء کو ہوئی۔

2.5.3 مولانا محمد اظہار الحسن، مولانا محمد زبیر الحسن، مولانا محمد سعد

مولانا محمد انعام الحسن کاندھلوی کی وفات سے قبل 1990ء میں ایک دس رکنی مجلس شوریٰ تشکیل دی گئی تھی جو دنیا بھر میں پھیلے تبلیغی جماعت کے کاموں کو باہمی مشورے سے انجام دیتی تھی۔ پھر جب جماعت کے تیسرے امیر مولانا انعام الحسن کا انتقال ہوا تو اسی مجلس شوریٰ نے اپنی ہی مجلس کے تین افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جو امیر جماعت کے قائم مقام ہو، اور مرکز نظام الدین کے ساتھ ہندوستان بھر میں تبلیغی جماعت کے انتظامی امور کو باہمی مشورے سے انجام دے۔ یہ کمیٹی جن تین افراد پر مشتمل تھی ان میں مولانا محمد اظہار الحسن، مولانا محمد زبیر الحسن، اور مولانا محمد سعد تھے۔ لیکن محض ایک سال کے بعد ہی 13/ اگست 1996ء کو مولانا محمد اظہار الحسن کی وفات ہو گئی۔ پھر 18/ مارچ 2014ء کو مولانا محمد زبیر الحسن کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس دوران مجلس شوریٰ کے دیگر اراکین بھی یکے بعد دیگرے فوت ہوتے گئے۔ آخری رکن حاجی محمد عبد الوہاب کی وفات 18/ نومبر 2018ء کو ہو گئی۔ اس وقت مجلس شوریٰ کے اراکین میں سے صرف مولانا محمد سعد کاندھلوی باحیات ہیں۔

2.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- تبلیغی جماعت کا آغاز 1345ھ مطابق 1926ء میں میوات اور دہلی کے نواح میں ہوا تھا۔ اس کے بانی مولانا محمد الیاس کاندھلوی ہیں۔
- تبلیغی جماعت کے قیام کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اسلام کے پورے نظام حیات کو ساری قوم پر برپا کر دیا جائے، اور اس کے مطابق امت مسلمہ اپنی زندگی گذارے۔
- تبلیغی جماعت کے کام کرنے کے چھ اصول ہیں جنہیں خود بانی جماعت نے مرتب کئے ہیں۔ وہ چھ اصول یہ ہیں: کلمہ طیبہ، نماز، علم وذکر، اکرام مسلم، تصحیح نیت، تبلیغ۔
- اس کے اولین امیر، بانی جماعت مولانا محمد الیاس تھے۔ پھر مولانا محمد یوسف کاندھلوی، مولانا محمد انعام الحسن کاندھلوی بالترتیب امیر ہوئے۔ بعد ازاں امیر کے طور پر شورائی نظام کو بروئے کار لایا گیا، اور اس کے لئے مولانا محمد انعام الحسن کے دور میں تشکیل دی گئی دس افراد پر مشتمل مجلس شوریٰ میں سے تین افراد کو مقرر کیا گیا، جن میں مولانا محمد اظہار الحسن، مولانا محمد زبیر الحسن اور مولانا محمد سعد شامل تھے۔

2.7 نمونہ امتحانی سوالات

2.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. بانی تبلیغ جماعت کا تاریخی نام کیا تھا؟

(a). محمد الیاس (b). اختر الیاس (c). احمد الیاس (d). الیاس اختر

2. تبلیغی جماعت کا آغاز کس علاقہ سے ہوا؟

(a). نوح (b). میوات (c). لکھنؤ (d). مئو

3. تبلیغ کی پہلی جماعت کب نکلی تھی؟

(a). 1933ء (b). 1920ء (c). 1926ء (d). 1940ء

4. تبلیغی جماعت کے سالانہ اجتماعات کہاں ہوا کرتے تھے؟

(a). نوح (b). میوات (c). لکھنؤ (d). دہلی

5. درج ذیل میں سے تبلیغی جماعت کے اصولوں میں کیا شامل نہیں ہے؟

(a). نماز (b). اکرام مسلم (c). تبلیغ ودعوت (d). مشورہ

6. امیر ثالث مولانا انعام الحسن کاندھلوی کی امارت کا دورانیہ کیا تھا؟

(a). 1970-1997ء (b). 1960-1992ء (c). 1965-1995ء (d). سب غلط

7. درج ذیل تبلیغی جماعت کے امیروں کی کون سی ترتیب درست ہے؟

(a). محمد الیاس، محمد انعام الحسن، محمد یوسف (b). محمد یوسف، محمد الیاس، محمد انعام الحسن

(c). محمد الیاس، محمد یوسف، محمد انعام الحسن (d). سب غلط

8. 1995ء میں تشکیل دی گئی سہ رکنی مجلس شوریٰ میں مولانا محمد اظہار الحسن اور مولانا محمد زبیر الحسن کے ساتھ تیسرے فرد کون تھے؟

(a). مولانا محمد سعد (b). مولانا محمد عمر پالن پوری (c). حاجی محمد عبد الوہاب (d). مفتی زین العابدین

9. عوام کے علم کے نصاب میں کیا داخل نہیں ہے؟

(a). فضائل نماز (b). حکایات صحابہ (c). قرآن کریم (d). کتاب الفتن کا مطالعہ

10. تبلیغی جماعت کے کل اصول کتنے ہیں؟

(a). آٹھ (b). چھ (c). پانچ (d). دس

2.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. تبلیغی جماعت کے آغاز وارتقاء پر گفتگو کیجیے۔
2. تبلیغی جماعت کے مقاصد پر روشنی ڈالیے۔
3. تبلیغی جماعت کے اصولوں میں سے کسی تین پر تعارفی نوٹ تحریر کیجیے۔
4. تبلیغی جماعت کے اجتماعات اور جلسوں کا جائزہ لیجیے۔
5. تبلیغی جماعت سے پہلے میوات کے دینی حالات کیا تھے؟ بیان کیجیے۔

2.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. بانی تبلیغی جماعت کے تفصیلی حالات قلم بند کیجیے۔
2. تبلیغی جماعت کے اصولوں پر ایک جامع مضمون لکھیے۔
3. تبلیغی جماعت کے امیروں پر ایک تجزیاتی نوٹ درج کیجیے۔

2.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت : مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
2. ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ : مولانا محمد منظور نعمانیؒ
3. مکاتیب حضرت مولانا محمد الیاسؒ : مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
4. ارشادات ومکتوبات بانی تبلیغ حضرت مولانا شاہ محمد الیاسؒ صاحب : افتخار فریدی
5. سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ : سید محمد ثانی حسنی

اکائی 3: جماعت اسلامی ہند

اکائی کے اجزا:

3.0 تمہید

3.1 مقاصد

3.2 جماعت اسلامی کا قیام اور اس کا تاریخی پس منظر

3.2.1 آزادی کے بعد جماعت اسلامی

3.3 بانی جماعت

3.4 جماعت اسلامی ہند

3.4.1 جماعت اسلامی ہند کا نصب العین

3.4.2 طریق کار

3.4.3 نظم جماعت

3.4.4 جماعت اسلامی ہند کی تعلیمی خدمات

3.4.5 جماعت اسلامی ہند کی رفاہی خدمات

3.4.6 ملکی وملی مسائل میں جماعت اسلامی ہند کا موقف

3.5 کلیدی الفاظ

3.6 اکتسابی نتائج

3.7 نمونہ امتحانی سوالات

3.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

3.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

3.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

3.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

3.0 تمہید

بیسوی صدی کی شروعات میں مختلف تحریکیں منظر عام پر آئیں۔ جس میں سیاسی، علمی، دعوتی، فکری اور نظریاتی تحریکات شامل ہیں۔ جماعت اسلامی بھی اپنی اصل کے اعتبار سے نظریاتی، فکری اور تہذیبی تحریک ہے۔ اس دور میں جب کہ مغربی فکر وفلسفہ اور تہذیب وتمدن کا ہر سو غلبہ تھا۔ امت مسلمہ میں بھی کچھ ایسے لوگ منظر عام پر آئے جنہوں نے اسلامی تہذیب کی سچائی کو فکر و عمل کے ساتھ زمانے کے سامنے پیش کیا اور اسلامی فکر کو مرتب کرنے میں اپنا مثبت کردار ادا کیا۔ ان تحریکوں نے امت کے اندر دینی بیداری اور اسلامی سوجھ بوجھ پیدا کی اور بحیثیت امت ان تحریکوں کے قائدوں نے اسلام اور اسلامی سماج میں ایک نئی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ انہی تحریکات میں ایک نام جماعت اسلامی کا ہے۔ جس کو سید ابوالاعلیٰ مودودی نے 1941ء میں قائم کیا۔ اس تحریک کا ماننا ہے کہ قرآن وسنت کی تعلیمات زندگی کے ہر گوشے میں عملی طور پر نافذ ہو اور پوری زندگی اسی کی رہنمائی کے مطابق گزاری جائے۔

3.1 مقاصد

اس اکائی میں آپ جماعت اسلامی کے بارے میں تفصیل سے جانیں گے کہ اس کا تاریخی پس منظر کیا تھا اور اس جماعت کے بانی نے کیا خدمات انجام دی، اس جماعت کا نصب العین اور طریق کار کیا ہے؟ آزادی کے بعد جماعت اسلامی ہند کے کون لوگ امیر ہوئے۔ اس کے علاوہ جماعت اسلامی کی تعلیمی ورفاہی خدمات کے بارے میں آگاہی حاصل ہوگی۔

3.2 جماعت اسلامی کا قیام اور اس کا تاریخی پس منظر

بیسویں صدی میں برصغیر کی شخصیتوں کا احاطہ کریں تو بے شمار شخصیتوں نے اپنے کارناموں سے اسلامی سماج کو متاثر کیا۔ انہی شخصیتوں میں ایک نام سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ہے جنہوں نے اسلامی، سماجی اور تربیتی پہلو سے امت مسلمہ کی خدمت کی۔ سید مودودی نے اپنے اطراف کا جائزہ لیا تو انہیں ہندوستان کی صورت حال بڑی تشویشناک دکھائی دی۔ آپ نے ترک قومیت اور عرب قومیت کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ خود ہندوستان کے اندر مسلمان اور ہندوؤں کے درمیان کھینچاتانی جاری تھی اور انگریزوں کے خلاف مخالفت بھی چل رہی تھی۔ مولانا کو اللہ نے بے شمار صلاحیتوں سے نوازا تھا، آپ نے ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی تحریر وتقریر کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی۔ آپ نے اپنی تحریروں سے ذہن سازی کی اور اپنے افکار و نظریات کو مجلات کے توسط سے فروغ دیا۔ آپ نے صحافت کو اپنا میدان بنایا اور اپنی صلاحیت کے بقدر باطل پروپیگنڈوں کے خلاف قلمی کوششیں شروع کیں۔ چنانچہ 1933 میں ترجمان القرآن کی ادارت سنبھالی اور ترجمان القرآن کے ذریعہ آپ نے مغربی مفکرین کے اسلام وعقائد پر اعتراضات کا علمی انداز میں جواب دیا۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت کی صحیح تصویر سے روشناس کرایا اور علی الاعلان اس بات کا پرچم بلند کیا کہ تمام مسائل کا حل اسلامی تعلیمات میں پنہاں ہے۔ آپ نے اس بات پر بھی زور دیا کہ اسلام اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنے والے قولی و عملی نمونہ دوسروں کے سامنے پیش کریں۔ حالات کتنے بھی ناموافق رہے ہوں لیکن سید مودودی نے اپنے مقاصد کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھا اور اپنے مضامین کے ذریعہ ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ آپ نے ترجمان القرآن میں ہی مسلم لیگ پر تنقید کی کیوں کہ ان کے مقاصد کا بھی اسلامی تعلیمات سے خاطر خواہ تعلق نہیں تھا۔ آپ نے اس بات کی کوشش کی کہ لوگ اسلامی تعلیمات کی طرف رجوع کریں، اس پر عمل پیرا ہوں اور دوسروں کو اس سے واقف کرائیں۔ ایک ایمان والے شخص کے لیے یہ موزوں نہیں کہ وہ انگریزوں سے تو آزاد ہو جائے لیکن انسانی غلامی میں جکڑا رہے بلکہ اللہ کی غلامی قبول کرے۔ غرض آپ کی تحریروں سے اندرون وبیرون ملک کے علما و صلحا اور مفکرین کافی متاثر ہوئے۔

اصلاحی سرگرمیوں کو جاری رکھتے ہوئے سید ابوالاعلیٰ مودودی کو اس بات کا احساس ہوا کہ ایک جماعت کی تشکیل لازمی ہے۔ اپنی تحریروں کے ذریعہ جماعت کی تشکیل دینے کا راستہ آپ ہموار کر چکے تھے۔ اس سلسلے میں ان کے دوست واحباب اور برصغیر کے علما و مفکرین بھی کافی عرصے سے اصرار کر رہے تھے کہ وہ باقاعدہ طور پر ایک جماعت بنائیں۔ سید مودودی نے بھی محسوس کیا کہ اقامت دین کی کوشش اجتماعی طور پر شروع کی جاسکتی ہے کیوں کہ باطل نظریات وعقائد پر تنقید کے بعد تعمیری کام کی سعی کی جاسکتی ہے۔ مولانا نے "دیوانوں کی ضرورت" کے عنوان سے مسلمانوں کو پکارا۔ ملک کے 75 لوگوں نے 25/ اگست 1941ء کو محلہ اسلامیہ پارک لاہور میں اکٹھا ہوئے اور جماعت اسلامی کی بنیاد ڈالی۔ باہمی صلاح ومشورے کے بعد سید ابوالاعلیٰ مودودی کو اس جماعت کا امیر منتخب کیا گیا۔ جماعت کے قائم ہونے کے بعد ایک تحریری دستور منظور ہوا اور دستور کے بموجب شوریٰ کا انتخاب عمل میں آیا اور شوریٰ کے اجلاس میں جماعت کے لائحہ عمل پر غور اور بحث مذاکرے کے بعد جماعت کے کاموں کو متعدد شعبوں کے تحت منظم کیا گیا۔ مثلاً شعبہ علمی و تعلیمی، شعبہ نشرواشاعت، شعبہ تنظیم جماعت، شعبہ مالیات، شعبہ دعوت وتبلیغ وغیرہ۔ جماعت اسلامی اپنے ارکان کی اخلاقی وروحانی تربیت پر کافی زور دیتی ہے۔ مختصر یہ کہ جماعت زندگی کے ہر حصے میں پورے طور پر انقلاب چاہتی ہے۔

"جماعت اسلامی اپنے ارکان کی اخلاقی وروحانی تربیت پر خاص طور پر زور دیتی ہے۔ جماعت کا مرکز تربیتی نصاب تجویز کرتا ہے اور ملک بھر میں حلقہ دار اور سیاسی طور پر تربیتی کیمپ منعقد ہوتے ہیں۔ اس تربیتی نصاب میں قرآن وحدیث کے مطالعے پر اور انہیں جدید دور کی ضروریات پر منطبق کرنے پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ امیر جماعت کا انتخاب پانچ سال بعد باقاعدگی سے ہوتا ہے۔ انتخاب میں کوئی امیدوار نہیں ہوتا۔ بلکہ درحقیقت کسی شخص کی طرف سے اقتدار کی خواہش کا ذرا سا اظہار بھی اس کو مکمل طور پر نااہل قرار دیتا ہے"

3.2.1 آزادی کے بعد جماعت اسلامی

جس مقاصد کے تحت جماعت اسلامی روبہ عمل میں آئی وہ منزل کی طرف رواں دواں تھی کہ تاریخ نے ایسا دردناک انمٹ نقوش چھوڑے کہ ہندوستان دو ملکوں میں تقسیم ہو گیا دوسرے کا نام پاکستان رکھا گیا۔ جس کی وجہ سے جماعت اسلامی بھی دو حصوں میں بٹ گئی۔

حالات اتنے پیچیدہ ہو گئے کہ جماعت اسلامی کا نظام ایک ملک سے دونوں جگہ کے نظام کو سنبھال لے یہ ممکن نہ تھا۔ ملک کا بٹوارہ ہونے کے بعد دونوں ملکوں کی جماعت نے از سر نو اپنا جائزہ لیا اور دونوں جگہ کے لوگوں نے امیروں کا انتخاب کیا۔

جماعت اسلامی ہند اور جماعت اسلامی پاکستان۔ جماعت اسلامی ہند نے اپنا راستہ الگ کر لیا اور جماعت کے لوگوں نے اتفاق رائے سے الہ آباد کے اجتماع میں 1948ء کو مولانا ابو اللیث اصلاحی کو جماعت اسلامی ہند کا امیر منتخب کیا۔ شروع میں کچھ دنوں کے لیے جماعت کا مرکز سرائے میر (اعظم گڈھ) رہا کیوں کہ مولانا ابو اللیث اصلاحی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔ 1948ء کے آخر میں جماعت کا مرکز سرائے میر سے ملیح آباد (لکھنو) میں قائم کیا گیا۔ پھر 1949ء میں اس مرکز کو رام پور منتقل کر دیا گیا۔ 1960ء میں جماعت کے مرکز کو دہلی کی حیثیت کو مد نظر رکھتے ہوئے یہاں پر منتقل کر دیا گیا۔ 1991ء میں اس مرکز کو جامعہ ابو الفضل انکلیو اوکھلا میں شفٹ کر دیا گیا۔

3.3 بانی جماعت

سید ابو الاعلیٰ مودودی 25 ستمبر 1903 کو اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں پیدا ہوئے۔ سادات گھرانے سے آپ کا تعلق تھا۔ خواجہ قطب الدین مودودی (و:527ھ) معتبر بزرگ شمار کیے جاتے تھے۔ آپ کا خاندان چشت سے برصغیر میں پندرہویں صدی عیسوی میں آیا۔ آپ کے خاندان کا مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر (و:1898) کے دربار سے گہرا تعلق تھا۔ آپ کے والد سید احمد حسن جنہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے F.A کی تعلیم مکمل کی اور الہ آباد سے وکالت کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وکالت کو معاش کا ذریعہ بنایا۔ آخر میں اورنگ آباد کو جائے سکونت بنایا اور یہیں پر وکالت کی۔ لیکن بعد میں دین کا رجحان بڑھنے کی وجہ سے وکالت کے پیشے کو ترک کر دیا اور اپنے آبائی وطن دہلی منتقل ہو گیے۔

سید ابو الاعلیٰ مودودی نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ اس کے بعد آپ کا مدرسہ فرقانیہ اورنگ آباد میں داخلہ ہوا جہاں عربی و انگریزی زبانوں پر دسترس حاصل کی۔ پڑھائی کے دوران آپ نے تحریری و تقریری مقابلوں میں بھی حصہ لیا۔ پندرہ سال کی عمر میں اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ انجمن نظر بندان اسلام کی طرف سے نکلنے والا اخبار "تاج" کی ادارت سنبھالی۔ سرکاری پالیسی کے خلاف ہونے کی وجہ سے یہ اخبار بہت زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا اور بند ہو گیا۔ 1920ء میں یہ اخبار دوبارہ شروع ہوا اور سید مودودی کو مدیر بنایا گیا لیکن کچھ مہینے بعد دوبارہ پابندی عائد کر دی گئی۔ اس کے بعد جمعیۃ علماء کے ترجمان "المسلم" (1921-1922) اخبار کے مدیر ہوئے۔ "المسلم" بند ہو گیا تو "الجمعیت" (1925-1928) کے مدیر بنائے گیے۔ شدھی تحریک کی پوری سازش اور اس کے خلاف مسلمانوں کے رد عمل کی وجہ سے غیر مسلم حضرات نے یہ مہم چھیڑ دی کہ قرآن اور اس کی تعلیمات امن اور سلامتی کے خلاف ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کی جامع مسجد کی تقریر کو سن کر سید مودودی نے جہاد کے فریضہ پر کتاب لکھنے کا فیصلہ کیا اور نظریہ جہاد کے خلاف جو ہنگامہ اٹھا تھا اس پر "الجہاد فی الاسلام" تحریر کی۔ الجمعیت سے استعفی دینے کے بعد آپ حیدرآباد منتقل ہو گیے اور تصنیفی و تالیفی کام میں مشغول ہو گیے۔ رسالہ ترجمان القرآن جس

کو ابو محمد مصلح نے شروع کیا تھا ان سے مالکانہ حقوق 1933ء میں حاصل کر کے اس کے مدیر ہو گیے اور اس ذمہ داری کو آپ نے آخری وقت تک ادا کیا۔ یہ رسالہ مسلمانوں اور تحریک کے لیے مشعل راہ ثابت ہوا۔ برصغیر اور عالم اسلام اس سے فیض یاب ہو تا رہا۔

مارچ 1938ء میں علامہ اقبال کی خواہش پر آپ حیدرآباد سے پٹھان کوٹ منتقل ہو گیے، اسلامیہ کالج لاہور کی پروفیسری اعزازی طور پر قبول کی۔ 1940ء میں آپ نے اعزازی پروفیسری چھوڑ دی کیوں کہ کالج انتظامیہ سرکار سے خوفزدہ تھا اور آپ نے تذبذب کو دیکھتے ہوئے الوادع کہہ دیا۔ اگلے سال 1941ء میں جماعت اسلامی کی بنیاد ڈالی۔ فروردی 1942ء سے تفہیم القرآن لکھنا شروع کیا جو رسالہ ترجمان القرآن میں قسط وار شائع ہو تا رہا۔ جون 1942ء میں ہی پٹھانکوٹ کے قریب جمال پور میں جماعت اسلامی کا مرکز دارالاسلام کے نام سے قائم کیا۔

مولانا مودودی زندگی بھر دین کے غلبے کے لیے کوشاں رہے اور اس کے لیے مختلف کوششیں کیں۔ آپ نے کئی اہم موضوعات پر قلم کو جنبش دی اور قرآن، حدیث وفقہ، دعوت و تبلیغ، تاریخ وافکار، عبادات و قوانین، معاشی و معاشرت، سیاست و سیادت وغیرہ اہم عنوانات پر آپ نے کتابیں تصنیف کیں۔ آپ کی مشہور کتابوں کے تراجم دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ آپ کی کتاب "دینیات" کا ترجمہ تقریباً 36 زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے خلافت وملوکیت، پردہ، سرور عالم، الجہاد فی الاسلام، مسئلہ قومیت اور مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش وغیرہ جیسے موضوعات پر قابل قدر تحریری سرمایہ چھوڑا۔ تقاریر، مکتوبات، استفسارات، تراجم اور صحافت کے ذریعہ اردو زبان کو جدید علم کلام سے مالا مال کیا۔ مولانا مودودی کی تحریروں کو عربی، انگریزی، ترکی، فارسی، ہندی، جرمن، تمل اور بنگالی وغیرہ زبانوں میں منتقل کیا جا چکا ہے۔

3.4 جماعت اسلامی ہند

مولانا ابواللیث اصلاحی کے امیر بننے کے بعد ملک کو کئی حلقوں میں بانٹا گیا اور ہر حلقہ میں ایک قیم مقرر کیا گیا جس کے ذمہ اپنے حلقہ میں جماعت کے کام کو آگے بڑھانا تھا۔ ہندوستان پاکستان کے بٹوارے کے بعد جماعت اسلامی ہند کے پاس صرف مولانا مودودی کا دستاویزی اثاثہ موجود تھا، اس کے علاوہ جماعت کو نئے سرے سے اپنے مرکز، نصب العین، سرگرمیاں اور مقاصد کو پروان چڑھانا تھا۔ ہندوستان کے اس وقت کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ راہ کانٹوں بھری نظر آتی تھی، جماعت کا کام بالکل ابتدا سے شروع ہوا، 1948ء کی فرقہ وارانہ فضا میں جب جماعت پر مسلمان اور غیر مسلم دونوں طرف سے الزام کی بوچھار لگ رہی تھی تو مولانا ابواللیث ندوی نے صبر و تحمل کے ساتھ سب کچھ برداشت کرتے ہوئے جماعت کے کارواں کو آگے بڑھاتے رہے۔ مولانا لگاتار 24 سال تک 1948 تا 1972 جماعت کے امیر رہے، اکتوبر 1981 سے لے کر 1990 تک پھر جماعت کی امارت آپ کے کندھوں پر آگئی۔ اس کے بعد مولانا نے معذرت کرلی۔ تقریباً 34 سال تک آپ جماعت کے امیر رہے اس دوران آپ نے جماعت کو ہر جہت سے قوت فراہم کی۔ مولانا نے ایک طرف ملی اتحاد واتفاق کے لیے ہر طرح کی کوشش کی تو دوسری طرف ملکی سالمیت اور قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے لیے بھی ممکنہ وسائل کا استعمال کیا۔ جماعت نے فسادات،

قحط اور سیلاب کے نازک مواقع پر خلق خدا کی راحت کے لیے جو قابل قدر خدمات انجام دی ہے اور آج تک رفاہی کام میں جو کوششیں کررہی ہے وہ اس کو دوسری جماعتوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ مولانا کو اپنی زندگی میں کئی بار جیل کی بامشقت صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں لیکن مولانا کے ارادے کے سامنے ساری مشکلات ہیچ تھیں۔ مولانا کی وفات 5/دسمبر 1990ء کو ہوئی۔ اس جماعت کے دوسرے امیر محمد یوسف صاحب منتخب کیے گیے۔ 1972-1981ء تک یعنی دومیقات تک اس عہدے پر فائز رہے۔ اس جماعت کے تیسرے امیر محمد سراج الحسن جن کو 1990ء میں جماعت اسلامی ہند کی امارت سونپی گئی اور 2003ء تک آپ نے بخوبی اس فرض کو نبھایا۔ چوتھے امیر ڈاکٹر عبد الحق انصاری صاحب منتخب ہوئے۔ آپ نے 2003ء تا 2007ء تک اس ذمہ داری کو ادا کیا۔ پانچویں امیر مولانا سید جلال الدین عمری 2007ء تا 2019ء تک اپنی خدمات انجام دی۔ 2019ء تا حال چھٹے امیر کی حیثیت سے سید سعادت اللہ حسینی ہیں۔ جماعت اسلامی ہند طلبہ کی تنظیم کے لیے ایس۔ آئی۔ او (اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا 1982ء میں قائم کی گئی) اور طالبات کے لیے جی۔ آئی۔ او (گرلس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا 1984ء میں قائم کی گئی) کی سرپرستی کرتی ہے۔

جماعت اسلامی ہند نے آزادی کے بعد اپنے دستور میں مختلف تبدیلیاں کیں۔ اپریل 2011ء تک ترمیم شدہ دستور جماعت اسلامی ہند میں کل 75 دفعات کا ذکر ہے اور یہ دستور پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔

حصہ اول: عقیدہ، نصب العین اور طریق کار

حصہ دوم: جماعت کی رکنیت

حصہ سوم: نظام جماعت

حصہ چہارم: مالیات

حصہ پنجم: متفرقات

3.4.1 جماعت اسلامی ہند کا نصب العین

جماعت اسلامی کا نصب العین اقامت دین ہے، جس کا حقیقی محرک صرف رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کا حصول ہے۔

اس دفعہ کی تشریح میں اقامت دین سے کیا مراد ہے۔ دستور میں اس کی ترجمانی موجود ہے ملاحظہ کریں:

اقامت دین میں لفظ "دین" سے مراد وہ دین حق ہے جسے اللہ رب العالمین اپنے تمام انبیاء کے ذریعے مختلف زمانوں اور ملکوں میں بھیجتا رہا ہے اور جسے آخری اور مکمل صورت میں تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے نازل فرمایا اور جو اب دنیا میں ایک ہی مستند، محفوظ اور عند اللہ مقبول دین ہے اور جس کا نام "اسلام" ہے۔ یہ دین انسان کے ظاہر وباطن اور اس کی زندگی کے تمام انفرادی واجتماعی گوشوں کو محیط ہے۔ عقائد، عبادات اور اخلاق سے لے کر معیشت، معاشرت اور سیاست تک انسانی زندگی کا کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس کے دائرے سے خارج ہو۔ (دستور جماعت اسلامی ہند، دفعہ 4، ص 7)

3.4.2 طریق کار

اپنے مقاصد کی حصولیابی کے لیے جماعت اسلامی ہند کا طریق کار حسب ذیل ہو گا۔

1. قرآن و سنت جماعت کی اساس کار ہوں گی۔ دوسری ساری چیزیں ثانوی حیثیت سے صرف اسی حد تک پیش نظر رکھی جائیں گی، جس حد تک قرآن و سنت کی رو سے ان کی گنجائش ہو۔
2. جماعت اپنے تمام کاموں میں اخلاقی حدود کی پابند ہو گی اور کبھی ایسے ذرائع اور طریقے استعمال نہ کرے گی، جو صداقت و دیانت کے خلاف ہوں یا جن سے فرقہ وارانہ منافرت، طبقاتی کشمکش اور فساد فی الارض رونما ہو۔
3. جماعت اپنے نصب العین کے حصول کے لیے تعمیری اور پر امن طریقے اختیار کرے گی۔ یعنی وہ تبلیغ و تلقین اور اشاعت افکار کے ذریعے ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح کرے گی اور اس طرح ملک کی اجتماعی زندگی میں مطلوبہ صالح انقلاب لانے کے لیے رائے عامہ کی تربیت کرے گی۔ (دستور جماعت اسلامی، ص8)

3.4.3 نظم جماعت

جماعت اسلامی ہند کا نظام شورائیت پر مبنی ہے اور تمام کام باہم صلاح و مشورے سے انجام پاتے ہیں۔ مرکزی نظام ان اجزا پر مشتمل ہو گا۔ مجلس نمائندگان، امیر جماعت، مرکزی مجلس شوریٰ، قیم جماعت۔ دستور میں مجلس نمائندگان اور دیگر ذمہ داریوں کے لیے کن صفات کا حامل ہونا ہے اس کی کارکردگی، اختیارات، فیصلے کے طریقے اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ امیر جماعت کی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے دفعہ 22 میں درج ہے: "جماعت اسلامی ہند کا ایک امیر ہو گا، جس کی حیثیت بہ اصطلاح معروف "امیر المومنین" کی نہ ہو گی بلکہ صرف اس جماعت کے رہنما کی ہو گی۔ ارکان جماعت اس کی اطاعت فی المعروف کے پابند ہوں گے۔ جماعت کی دعوت اپنے امیر کی شخصیت یا امارت کی طرف نہ ہو گی۔ بلکہ اپنے عقیدے اور نصب العین کی طرف ہو گی۔" امارت کے لیے مطلوبہ صفات، انتخاب، مدت کارکردگی اور فرائض و اختیارات پر گفتگو کی گئی ہے۔ مرکزی مجلس شوریٰ کی حیثیت امیر جماعت کی مدد اور مشورے کے لیے ہو گی۔ امیر جماعت ان سے اہم معاملات میں مشورہ طلب کرے گا، جن کا جماعت کی پالیسی یا اس کے نظم پر قابل لحاظ اثر پڑتا ہے۔ اس کی تشکیل، رکنیت کے لیے مطلوبہ صفات، مدت کارکردگی، اجلاس، حاضری کا نصاب، کاروائی، فیصلے کا طریقہ اور غیر ارکان شوریٰ کی شرکت پر بحث کی گئی ہے۔ قیم جماعت کا تقرر امیر جماعت کرے گا اور اس کی تقرری کے سلسلے میں امیر جماعت مجلس شوریٰ کے ارکان کی رایوں کو بھی مد نظر رکھے گا۔ قیم جماعت کے لیے مطلوبہ صفات اور اس کے فرائض کی دستور میں نشاندہی کر دی گئی ہے۔

3.4.4 جماعت اسلامی ہند کی تعلیمی خدمات

جماعت اسلامی نے تعلیم اور نصاب پر بہت زیادہ کوشش کی ہے۔ جماعت اسلامی نے شروعاتی دور سے ہی ایک تھنک ٹینک کو تشکیل دے رکھا ہے جو مسلمانوں کی صورتحال کا جائزہ لیتا رہتا ہے اور اس کے مطابق لائحہ عمل تیار کرتا ہے۔ مولانا مودودی نے جماعت اسلامی ہند کے ذریعہ لوگوں کو اسلامی تعلیمات کی طرف متوجہ کیا، سید مودودی نے ہر اس موضوع پر کھل کر بحث کی جو مذہبی طبقہ کی نظر میں

بحث کا موضوع نہیں تھا، سیاسی اسلام، سماجی اسلام، معاشی اسلام، اسلامی تہذیب وثقافت، وغیرہ۔ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات کا نام ہے ۔مولانا مودودی نے سیاسی اور مذہبی لیڈروں کے درمیان مساوات قائم کرنے کی کوشش کی ۔ جماعت اسلامی کی سب سے بڑی خدمات موجودہ اسلامی وسائل کو مقامی زبانوں میں منتقل کرنا۔ ہندوستان ایک ایسا تکثیریت والا ملک ہے جہاں زبانوں کی بھرمار ہے۔ اسٹیٹ کے تبدیل ہوتے ہی بسا اوقات اسٹیٹ کے اندر ہی یہ تبدیلی آپ محسوس کرسکتے ہیں۔ اسی کے مد نظر جماعت اسلامی نے بنیادی اسلامی لٹریچر کو مقامی زبانوں میں منتقل کرنے کا بیڑہ جو اٹھایا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ شعبہ علمی وتعلیمی کے نام سے جو شعبہ قائم کیا گیا اس کی ذمہ داری یہ تھی کہ:

”اسلام کے نظام فکر اور نظام حیات کا اس کے مختلف فلسفیانہ علمی اور تاریخی پہلو میں گہرا تفصیلی مطالعہ کرے۔ دوسرے نظام فکر وعمل پر بھی وسیع تنقیدی وتحقیقی نظر ڈالے اور اس کے نتیجے میں ایسا لٹریچر تیار کرے جو صرف اسلامی اصولوں پر ذہنی وفکری انقلاب برپا کرنے والا ہو۔“

جماعت اسلامی ہند اپنی تشکیل کے ساتھ ہی نئے نظام تعلیم وتربیت کے لیے بھی کوشاں ہوگئی اور شروع سے ہی اس پر توجہ دی۔ اس کے لیے ملک کے مختلف مقامات پر درس گاہیں قائم کی گئیں، اسی کے تحت 1949 میں رام پور میں درس گاہ قائم کی گئی۔ حالات کے تناظر میں نصاب کو تشکیل دیا گیا۔ جماعت نے اداروں کے قیام اور درسیات کی تیاری میں قابل قدر کوششیں کیں۔ 1972ء میں مرکزی درس گاہ کے انتظام کو جماعت اسلامی ہند نے ”اشاعت اسلام ٹرسٹ دہلی“ کے ماتحت کردیا۔ 1981ء میں اس ”درس گاہ“ کا نام ”مرکزی درس گاہ اسلامی“ قرار دیا گیا۔ 1988ء میں اشاعت اسلام ٹرسٹ نے مقامی مجلس منتظمہ بنائی اور اس کے پہلے صدر جناب توسل حسین صدیقی (و:1993ء) بنائے گیے۔ اس کے بعد مولانا محمد یوسف اصلاحی (و:2021) کو یہ ذمہ داری سونپی گئی۔

جماعت نے جہاں تعلیم وتربیت اور درسی کتابوں کی تیاری پر اپنی توجہ مرکوز کی وہیں دوسری طرف اساتذہ کی دینی، فکری اور فنی رہنمائی کی طرف بھی خصوصی توجہ دی۔ شروعاتی دور میں اساتذہ کے لیے تین مہینے کی ٹریننگ رکھی گئی لیکن بعد میں اسے ایک مہینے میں تبدیل کردیا گیا۔ 1990ء میں مرکز میں شعبہ تعلیم کا ڈیپارٹمنٹ قائم کیا گیا تو یہ کام اور بہتر طریقے سے انجام پانے لگا۔ ان لوگوں کی مصروفیات کا خیال کرتے ہوئے جن کے لیے ایک مہینہ کی ٹریننگ کرنا مشکل تھا تو دس روزہ، ہفت روزہ، اور کم از کم سہ روزہ ٹریننگ کا خاکہ تیار کیا گیا۔ 2019ء میں جماعت نے تعلیمی میدان کے کاموں میں وسعت لانے کے لیے ”مرکزی تعلیمی بورڈ“ قائم کیا ہے۔ جو درسیات پر نظر ثانی، تعلیمی اداروں کی رہنمائی اور حکومت کی تعلیمی پالیسی پر نظر جیسے اہم کام انجام دے رہی ہے۔ اس کے علاوہ جماعت اسلامی ہند نے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اخبارات ورسائل نکالے جو آج تک پابندی سے شائع ہو رہے ہیں۔

جماعت اسلامی ہند کی ایک اچھی پہل یہ ہے کہ اس نے اسلامک اسٹڈیز کا ایک انسٹی ٹیوشین قائم کیا ہے جو ”انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز اینڈ ریسرچ سینٹر“ کے نام سے مشہور ومعروف ہے یہ شعبہ 2016ء میں قائم کیا گیا اس کا مقصد مدارس اور کالجز کے جو باصلاحیت لوگ ہیں ان کے اندر ایک معیاری تعلیم کا بیج بویا جائے جو بیک وقت دینی وعصری دونوں علوم میں رہنمائی کرسکیں۔ مسلم سماج

کے اندر تعلیم کے معیار کو بلند کیا جائے اور جو بھی امکانات ہوسکتے ہیں اس کو بہتر بنایا جائے۔ اس اکیڈمی کا مقصد ہندوستانی معاشرے، مذاہب، ثقافت، روایات، تاریخ اور تقابلی ادیان کی سمجھ طلباء کے اندر ابھاری جائے۔ اس میں انگریزی زبان کے ساتھ عصری علوم سیاسیات، معاشیات، لسانیات اور نفسیات جیسے علوم کو مدارس کے طلبہ کے درمیان فروغ دیا جائے۔ اردو، ہندی اور انگریزی میں صلاحیت کو پروان چڑھانے کے لیے ہفتہ واری پروگرام، گروپ ڈسکشن، سیلف اسٹڈی وغیرہ۔ اس انسٹی ٹیوشن کے تحت تین کورس فی الحال چل رہے ہیں۔(1) دوسالہ ایڈوانسڈ ڈپلومہ تقابل ادیان وتہذیب(2) دوسالہ پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ ان اسلامک تھاٹ اینڈ سینٹر(3) ایک سالہ ڈپلومہ ان اسلامک ڈسکورس۔ اس میں اسلامی مفکرین کے ساتھ مغربی مفکرین کی آراء سے بھی روشناس کرایا جاتا ہے۔

3.4.5 جماعت اسلامی ہند کی رفاہی خدمات

جماعت اسلامی ہند نے اپنے رکن کو اس بات کی ہدایت دی ہے کہ وہ اپنے پاس پڑوس کے محتاج، کمزور اور لاچار لوگوں کی امداد کریں۔ جیسا کہ اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے۔ اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ انسان وہ ہے جو اللہ کی مخلوقات کے ساتھ حسن سلوک کا رویہ اختیار کرے۔ خدمت خلق اور رفاہ عامہ کے کاموں میں جماعت کے کارکن بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ جماعت کے رفقا نے زلزلہ، سیلاب اور فسادات جیسے رونماہونے والے حادثات پر بڑے پیمانے پر امداد کا کام کیا ہے۔ ان کارکنوں نے بلا تفریق مذہب وملت مصیبت زدہ لوگوں کی خدمات کی ہیں۔ عام چندہ کے ذریعے رقم اور ضرورت کا سامان اکٹھا کر کے ایک بہتر طریقے سے ریلیف کا کام کرتی ہے۔ 1948ء میں ملک کے اکثر وبیشتر علاقوں میں بارش کے قہر کی وجہ سے کافی نقصان ہوا جس میں بالخصوص اترپردیش کا علاقہ زیادہ متاثر ہوا اور لاکھوں افراد بے گھر ہوگیے۔ جماعت اسلامی نے اس نازک موقع پر حتی الامکان ریلیف کی خدمات انجام دی۔

1967ء میں خشک سالی کے سبب بہار، مشرقی یوپی اور مدھیہ پردیش کے وسیع علاقوں میں شدید قحط پڑ گیا تھا۔ اس عام مصیبت میں خلق خدا کے ساتھ مواساۃ وتعاون کے جذبہ کے تحت جماعت اسلامی نے پورے ملک میں مہم چلا کر ڈھائی لاکھ روپے نقد اور بڑی تعداد میں دوائیں، کپڑے اور غلہ جمع کیا۔ چندہ دینے والوں میں غیر مسلم حضرات بھی شامل تھے۔ اس رقم کے ذریعہ جماعت نے ان علاقوں میں امدادی کیمپ قائم کر کے بلا تفریق مذہب وملت قحط زدگان کی امداد کا کام انجام دیا۔

3.4.6 ملکی وملی مسائل میں جماعت اسلامی ہند کا موقف

ہندوستان میں اسلام کی دعوت کو قبولیت ملنے کا دارومدار بڑی حد تک اس پر ہے کہ مسلمان بذات خود فکر وعمل سے اسلامی تعلیمات کا نمونہ بن جائیں۔ اپنی معاشرتی زندگی، باہمی معاملات اور دوسرے گروپوں کے سامنے اپنے مراسم کو اسلام کے بتائے ہوئے راستے کے مطابق ڈھال لیں اور اسلام کا قولی و عملی نمونہ پیش کریں تو اس ملک کے اجتماعی حالات پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔ جماعت اسلامی ہند اس بات کے لیے کوشاں ہے کہ دعوت، اصلاح اور تربیت کے ذریعہ ملت اسلامیہ ہند کو اس موقف پر لاکھڑا کرے، جہاں سماج کی صورت حال میں تبدیلی واقع ہو۔ اس ملک میں مسلمانوں کے تئیں کچھ مسائل جن کا تدراک جماعت اسلامی ہند چاہتی ہے اور اس کی نشاندہی بھی کی ہے۔

پہلا مسئلہ تحفظ جان ومال جس کے بارے میں جماعت اسلامی ہند اپنے کارکنوں کو ہدایت دیتی ہے کہ فرقہ وارانہ فساد سے دور رہیں اور سماج میں امن وامان قائم رکھنے کے لیے غیر مسلم عوام سے رابطہ رکھیں۔ غلط فہمیوں کا سدباب کریں اور افواہوں کا بازار گرم نہ ہونے دیں۔ اگر ماحول خراب ہو جائے تو کوشش کریں کہ ہر گروہ کے امن پسند لوگوں کی مدد سے امن کو قائم کیا جائے اور مظلوموں کا سہارا بنا جائے۔ اس کے حصول کے لیے جماعت اسلامی نے نظم و اتحاد پر زور دیا ہے۔ وقت کا سب سے اہم اور سنگین مسئلہ ہے۔ ہندوستان میں آزادی کے بعد سے نہ جانے کتنے فسادات ہوئے اور اس میں امت مسلمہ کو کافی زیادہ جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔

دوسرا مسئلہ مسلمانوں کو اسلامی تعلیم حاصل کرنا اور اپنی آئندہ نسلوں کی اسلامی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرنا۔ جماعت اسلامی ہند کا موقف یہ رہا ہے کہ ابتدائی دینی تعلیم ملت اسلامیہ کو خود کرنا ہے۔

تیسرا مسئلہ اردو زبان کا ہے کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کو اس زبان سے محروم ہونا پڑے تو وہ اسلامی تعلیمات کے اس سرمایے سے بے گانہ ہو جائیں گے کیوں کہ ملک کی ایک کثیر آبادی کی ثقافتی اور تعلیمی مفادات اس زبان سے جڑے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے جماعت اسلامی ان کوششوں کی تائید وحمایت کرتی ہے جو اردو کو جائز مقام دلوانے کے لیے سرگرم ہیں۔

چوتھا اہم مسئلہ مسلم پرسنل لاء اور اس کا تحفظ ہے۔ ہندوستانی دستور میں اسلامی قوانین پر جو آسانی دستور کی روح سے ملی ہے۔ حکومت یا کوئی گروپ اس میں مداخلت کر کے ترمیم کرنا چاہتی ہے تو جماعت اسلامی اس کی مخالفت کرتی ہے اور مسلم پرسنل لا کی بقا کی کوشش کرتی ہے۔ مسلم پرسنل لا کے تحفظ اور حکومت کی دخل اندازیوں سے بچانے کے لیے تحریک اسلامی برابر چوکنی رہتی ہے اور اس کے مخالف کسی بھی سرگرمی کو دیکھا یا نوٹس کیا تو فوراً تحریک اسلامی اس پر اپنے احتجاجات درج کرواتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سارے مسائل سے امت مسلمہ دوچار ہے جس میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے۔

دعوتی مشن کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ امت مسلمہ اسلامی بنیادوں اور اس کے مقاصد کے لئے یکجا ہو کر کوشش کریں۔ جتنے مسائل کا ذکر کیا گیا ہے اس کے حل اور تجاویز کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کی جتنی بھی جماعتیں اور گروہ ہیں وہ باہمی تعاون سے مناسب تدابیر عمل میں لائیں۔ 1964ء میں لکھنو کنونشن نے اس سلسلے میں ایک قدم اٹھایا اور مسلم مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آیا۔ اس مجلس کے ساتھ جماعت اسلامی پوری سرگرمی کے ساتھ شریک رہی۔

3.5 کلیدی الفاظ

ادارت : اخبار یا رسالے کی ترتیب، تصحیح کرنا، ایڈیٹری

لائحہ عمل : کام کرنے کا پروگرام

استفسارات : سوال وجواب، پوچھ گچھ

ہیچ : معمولی، ادنی، کم حیثیت

اساس : بنیاد، مدار، انحصار

مواساۃ : مدد کرنا، دکھ درد میں شریک ہونا

3.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- 25/اگست 1941ء کو محلہ اسلامیہ پارک لاہور میں جماعت اسلامی کی بنیاد ڈالی گئی۔ باہمی صلاح و مشورے کے بعد سید ابوالاعلیٰ مودودی کو اس جماعت کا امیر منتخب کیا گیا۔ جماعت کے قائم ہونے کے بعد ایک تحریری دستور منظور ہوا اور دستور کے بموجب شوریٰ کا انتخاب عمل میں آیا اور شوریٰ کے اجلاس میں جماعت کے لائحہ عمل پر غور و خوص اور بحث مذاکرے کے بعد جماعت کے کاموں کو متعدد شعبوں کے تحت منظم کیا گیا۔۔
- جماعت اسلامی ہند اور جماعت اسلامی پاکستان۔ جماعت اسلامی ہند نے اپنا راستہ الگ کر لیا اور جماعت کے لوگوں نے اتفاق رائے سے الہ آباد کے اجتماع میں 1948ء کو مولانا ابو اللیث اصلاحی کو جماعت اسلامی ہند کا امیر منتخب کیا۔
- جماعت اسلامی ہند کا نظام شورائیت پر مبنی ہے اور تمام کام باہم صلاح و مشورے سے انجام پاتے ہیں۔ مرکزی نظام ان اجزا پر مشتمل ہو گا۔ مجلس نمائندگان، امیر جماعت، مرکزی مجلس شوریٰ، قیم جماعت۔ دستور میں مجلس نمائندگان اور دیگر ذمہ داریوں کے لیے کن صفات کا حامل ہونا ہے اس کی کارکردگی، اختیارات، فیصلے کے طریقے اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔
- جماعت اسلامی کی سب سے بڑی خدمات موجودہ اسلامی وسائل کو مقامی زبانوں میں منتقل کرنا۔ ہندوستان ایک ایسا تکثیریت والا ملک ہے جہاں زبانوں کی بھرمار ہے۔ اسٹیٹ کے تبدیل ہوتے ہی بسا اوقات اسٹیٹ کے اندر ہی یہ تبدیلی آپ محسوس کر سکتے ہیں۔ اسی کے مد نظر جماعت اسلامی نے بنیادی اسلامی لٹریچر کو مقامی زبانوں میں منتقل کرنے کا بیڑہ جو اٹھایا ہے وہ قابل تعریف ہے۔
- جماعت اسلامی ہند کی ایک اچھی پہل یہ ہے کہ اس نے اسلامک اسٹڈیز کا ایک انسٹی ٹیوشین قائم کیا ہے جو "انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈ اینڈیز ریسرچ سینٹر" کے نام سے مشہور و معروف ہے یہ شعبہ 2016ء میں قائم کیا گیا اس کا مقصد مدارس اور کالجز کے جو باصلاحیت لوگ ہیں ان کے اندر ایک معیاری تعلیم کا بیج بویا جائے جو بیک وقت دینی و عصری دونوں علوم میں رہنمائی کر سکیں۔
- جماعت اسلامی ہند نے اپنے رکن کو اس بات کی ہدایت دی ہے کہ وہ اپنے پاس پڑوس کے محتاج، کمزور اور لاچار لوگوں کی امداد کریں۔ جیسا کہ اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے۔ اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ انسان وہ ہے جو اللہ کی مخلوقات کے ساتھ حسن سلوک کا رویہ اختیار کرے۔ خدمت خلق اور رفاہ عامہ کے کاموں جماعت کے کارکن بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

3.7 نمونہ امتحانی سوالات

3.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. جماعت اسلامی کی بنیاد کب ڈالی گئی؟

(a).1941ء (b).1947ء (c).1992ء (d).1841ء

2. جماعت اسلامی کے بانی کون ہیں؟

(a).سید ابوالاعلیٰ مودودی (b).حسین احمد مدنی (c).حاجی شریعت اللہ (d).ابوالحسن علی ندوی

3. جماعت اسلامی ہند کے پہلے امیر کون تھے؟

(a).مولانا ابواللیث ندوی (b).سید جلال الدین عمری (c).صدرالدین اصلاحی (d).ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی

4. جماعت اسلامی کے موجودہ امیر کا نام بتائیں؟

(a).مولانا ابواللیث ندوی (b).سید جلال الدین عمری (c).صدرالدین اصلاحی (d).سید سعادت اللہ حسینی

5. مسلم مجلس مشاورت کا قیام کب عمل میں آیا؟

(a).1964ء (b).1952ء (c).1950ء (d).1991ء

6. انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز اینڈ ریسرچ سینٹر کب قائم کیا گیا؟

(a).2016ء (b).2020ء (c).2008ء (d).2005ء

7. اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن کا قیام کب ہوا؟

(a).1984ء (b).1982ء (c).1972ء (d).سب غلط

8. جماعت کا مرکزی دفتر اوکھلا میں کب شفٹ کیا گیا؟

(a).1991ء (b).2016ء (c).1981ء (d).1948ء

9. کیا جماعت اسلامی ہند کے امیر کی حیثیت "امیر المومنین" کی ہوگی؟

(a).ہاں (b).نہیں (c).پتہ نہیں (d).سب غلط

10. مولانا ابواللیث ندوی کتنے سال تک امیر رہے؟

(a).تقریباً34 (b).تقریباً22 (c).تقریباً10 (d).تقریباً15

3.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. آزادی کے بعد جماعت اسلامی پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔
2. جماعت اسلامی ہند کے نظم جماعت کے بارے میں گفتگو کیجیے۔
3. جماعت اسلامی ہند کے نصب العین پر روشنی ڈالیے۔
4. جماعت اسلامی ہند کی رفاہی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
5. بانی جماعت اسلامی کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔

3.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. جماعت اسلامی کے قیام اور اس کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالیے۔
2. جماعت اسلامی ہند کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
3. جماعت اسلامی ہند کی تعلیمی خدمات پر مضمون قلم بند کیجیے۔

3.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

---

1. 1947ء کے بعد ہندوستان میں اسلامی تحریکیں، ڈاکٹر اقتدار محمد خاں، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی 1995
2. دستور جماعت اسلامی ہند، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی 2013
3. جماعت اسلامی کی تعلیمی خدمات، محمد اشفاق احمد، دہلی، 2018
4. جماعت اسلامی ہند ایک تعارف، جمال پرنٹنگ پریس، دہلی، 1967
5. تحریک اسلامی ہند، مولانا صدرالدین اصلاحی، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، دہلی 1970
6. مختصر تاریخ جماعت اسلامی ہند، محمد شفیع مونس، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، 2010ء

اکائی 4: سنی بریلوی جماعت

اکائی کے اجزا:

4.0 تمہید

4.1 مقاصد

4.2 سنی بریلوی جماعت

4.3 مولانا احمد رضا خان

4.4 مولانا احمد رضا خاں کا علمی مقام

4.5 سنی بریلوی جماعت کے نظریات

4.5.1 نظریہ توحید و شرک

4.5.2 تقدیسِ شانِ الوہیت و حفاظتِ ناموسِ رسالت

4.5.3 تردید امکانِ کذب باری تعالی

4.5.4 عشق رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم

4.5.5 علم غیب مصطفی

4.5.6 نظریہ نور و بشر

4.5.7 نظریہ شاہد و ناظر

4.5.8 مختار کل

4.5.9 نظریہ توسل

4.5.10 بدعت کے بارے میں نقطہ نظر

4.6 بریلوی مکتب فکر کی اہم کتابیں

4.7 سنی بریلوی جماعت کی تبلیغی خدمات

4.8 سنی بریلوی جماعت کے ممتاز ادارے

4.9 اکتسابی نتائج

4.10 نمونہ امتحانی سوالات

4.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

4.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

4.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

4.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

4.0 تمہید

ہندوستانی مسلمانوں کا مذہب و مسلک شروع سے سنی حنفی رہا ہے البتہ کیرالا کے کچھ خطوں میں امام شافعیؒ کے پیروکار آباد ہیں اسی طرح کچھ تعداد اہل تشیع کی بھی ہے۔ انیسویں صدی کے دو دہائی کے بعد ائمہ اربعہ امام اعظم ابو حنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی فقہی تقلید کو خصوصاً اور تصوف و طریقت کو عموماً موضوع بحث بنایا گیا اور اسے بدعت و ضلالت سے تعبیر کیا گیا۔ انہیں اختلافات کی وجہ سے کئی مسالک وجود میں آئے۔

ہندوستانی مسلمانوں میں جماعت بندی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (1703ء-1762ء) کے صاحبزادے شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (1746ء-1823ء) کے آخری زمانے میں شروع ہوئی۔ ان کے تلامذہ اور متبعین میں ایک گروہ تو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے مسلک پر گامزن تھا اور شرعی مسائل میں ان سے سر مو انحراف پسند نہیں کرتا تھا مگر دوسرا گروہ ظاہری نصوص پر عمل آوری اور عدم تقلید کا رجحان رکھتا تھا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ان گروہوں میں مختلف مسائل میں اختلاف رونما ہونے لگا۔ اس اختلاف کی وجہ سے جو جماعتیں وجود میں آئیں وہ دو طرح کی ہیں:

ایک جماعت کے نزدیک مسائل فقہیہ میں کسی امام کی تقلید ناجائز و حرام ہے اور ان کے نزدیک کتاب و سنت سے جو احکام صراحتاً معلوم ہوں انہیں کی اتباع کرنی چاہیے۔ یہ لوگ تقلید کو حرام سمجھتے ہیں اور مسائل فقہ میں اجماع امت اور قیاس کو حجت شرعی نہیں مانتے اور ائمہ اربعہ میں سے کسی کی تقلید کرنے والے کو اہل بدعت اور گمراہ بتاتے ہیں۔ اس جماعت کے لوگ نواب صدیق حسن خان بھوپالی (1832ء-1890ء)، شیخ نذیر حسین دہلوی (1805ء-1902ء) اور مولانا فاخر الہ آبادی (1875ء-1930ء) کے تلامذہ و متبعین ہیں۔

دوسری جماعت ان لوگوں کی ہے جو امام اعظم ابو حنیفہؒ کی تقلید کرتے ہیں۔ اس جماعت کے لوگ بحر العلوم ملا عبد العلی بن ملا نظام الدین (1731ء-1820ء)، مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلی (1848ء-1886ء) اور مولانا شیخ فضل رسول بدایونی (1798ء-1872ء) کے تلامذہ و متبعین ہیں۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ کی تقلید کرنے والوں میں عقائد و نظریات کی وجہ سے دو جماعتیں وجود میں آئیں: دیوبندی اور بریلوی۔

اس اکائی میں ہم سنی حنفی بریلوی جماعت کے بارے میں پڑھیں گے۔ یہ جماعت اہل سنت والجماعت اور بریلوی جماعت سے بھی جانی جاتی ہے اور اسی جماعت کو اکیسویں صدی میں مسلک اعلی حضرت کے نام سے بھی موسوم کیا جانے لگا۔

4.1 مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ سنی بریلوی جماعت کے تعارف و تاریخ، اس جماعت کے اہم نظریات، اس جماعت کی تبلیغی خدمات و ممتاز علمائے کرام اور اہم اداروں کے بارے میں واقفیت حاصل کر سکیں گے۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ جماعت کے ترجمان کی سوانح حیات اوران کی اہم تصانیف، ان کی اہمیت اور انفرادیت کے حوالے سے بھی معلومات حاصل کر سکیں گے۔

4.2 سنی بریلوی جماعت

برصغیر ہند وپاک میں اکثریت حنفی مسلمانوں کی ہے جو امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالی کی تقلید کرتے ہیں اور خود کو اہل سنت والجماعت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ جماعت امام اعظم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہیں اور قادری، چشتی، نقشبندی و سہروردی وغیرہ سلاسل تصوف میں منقسم ہے۔ عقائد و نظریات کے اعتبار سے ان کی دو جماعت ہیں: دیوبندی اور بریلی۔ چونکہ یہ اکائی بریلی جماعت کے لیے خاص ہے اس لیے ہم یہاں اس کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔

بریلوی جماعت کا تعارف:

بریلوی جماعت کے مقتدر علما کے مطابق یہ جماعت آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کی تعلیمات پر عمل کرنے والی جماعت ہے اور عقائد میں ابو منصور ماتریدی اور فقہ میں امام اعظم ابو حنیفہ کی تقلید کرتی ہے۔ یہ جماعت اسی عقائد و نظریات کو مانتی ہے جسے مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (1564ء-1624ء) اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (1703ء-1764ء) نے پیش کیا۔

بریلوی جماعت کا تعارف پیش کرتے ہوئے مفسر قرآن مولانا نعیم الدین مرادآبادی (1887ء-1948ء) خلیفہ امام احمد رضا محدث بریلوی (1856ء-1921ء) لکھتے ہیں کہ سنی وہ ہے جو "ما أنا عليه وأصحابي" کا مصداق ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خلفائے راشدین، ائمہ دین، مسلم مشائخ طریقت اور متأخر علمائے کرام میں سے حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی (1551ء-1642ء)، ملک العلما حضرت بحر العلوم مولانا عبد العلی فرنگی محلی (1731ء-1820ء)، حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی (1797ء-1861ء)، حضرت مولانا شاہ فضل رسول بدایونی (1798ء-1872ء)، حضرت مفتی ارشاد حسین رام پوری (1832ء-1897ء) اور حضرت مولانا مفتی شاہ احمد رضا بریلوی (1856ء-1921ء) کے مسلک پر ہوں۔

مشہور بریلوی عالم مولانا یس اختر مصباحی (1953ء-2023ء) اس جماعت کا تعارف کراتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ متوارث طور پر عہد رسالت و دور صحابہ و تابعین سے منقول و معمول جو عقائد و اعمال، قدیم کتب تفسیر و حدیث و فقہ و تصوف و سیرت و تاریخ میں موجود ہیں وہی اہل سنت و جماعت کے عقائد و اعمال ہیں۔ علمائے فرنگی محل لکھنؤ و خیر آباد و بدایوں و بریلی نے تحریر و تقریر کے ذریعے ہمیشہ

انہیں اعمال کی دعوت دی ہے۔ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی (و1025ھ) اور حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (و1239ھ) کی تعلیمات و نظریات کے صحیح داعی و ترجمان بھی یہی ہیں جو اسلام کے وارث وامین ہیں۔ جو کسی دخیل فکر یا جدید نظریہ اور غیر اسلامی خیال کو ایک لمحہ کے لیے بھی قبول بلکہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اپنی قدیم وراثت کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور اسے ہی اپنے اور دیگر مسلمانان عالم کے لیے سرمایۂ سعادت و ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں۔

بریلوی جماعت کا آغاز وارتقا:

1825ء تک ہندوستان میں زیادہ تر سنی حنفی مسلمان تھے اور بہت کم تعداد میں شیعہ تھے، البتہ کیرالا میں کچھ سنی شافعی مسلمان بھی تھے۔ سنی مسلمان جن کی تعداد تقریباً نوے فیصد تھی سید شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے صاحبزادے امام شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے پیروکار اور متبع تھے۔ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی تک مسلمانوں میں فرقہ بندی نہیں پائی جاتی تھی۔ ان کے آخری دور میں ولی اللہی تعلیمات سے انحراف شروع ہوا اور عقائد واعمال اہل سنت کے خلاف ایک نیا نظریہ پیش کیا گیا جس کی رو سے تقدس شان الوہیت وعظمت ناموس رسالت کے مجروح ہونے کا خطرہ لاحق ہوا، ساتھ ہی مسئلۂ تقلید اور تقلید ائمہ کے خلاف مہم شروع ہوگئی یہاں تک کہ عقائد و معمولات اہل سنت والجماعت کو بدعت و گمراہی سے تعبیر کیا جانے لگا۔

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (1746ء-1823ء) کے شاگردوں نے اس نئے نظریے کی مخالفت کی اور اسے تقدس ذات باری تعالیٰ اور ناموس رسالت ﷺ کے خلاف بتایا اور اس کی مذہبی خرابیوں کو بیان کرتے ہوئے لوگوں کو اس سے باز رکھنے کی کوششیں کیں اور اپنے عقائد و معمولات کو کتاب سنت اور اقوال علمائے اسلاف سے مبرہن کر کے پیش کیا۔

بریلوی جماعت کے مشہور عالم علامہ یٰس اختر مصباحی نے اس دور کے حامیان عقائد و معمولات اہل سنت میں ان علما کا نام پیش کیا ہے: حضرت علامہ عبد العلی فرنگی محلی لکھنوی (1144ھ-1235ھ)، حضرت شاہ محمد اجمل الہ آبادی (1160ھ-1236ھ)، حضرت شاہ انوار الحق فرنگی محلی (1167ھ-1236ھ)، حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (1159ھ-1239ھ)، حضرت شاہ ابو سعید مجددی رام پوری (1196ھ-1236ھ)، حضرت شاہ آل احمد اچھے میاں برکاتی مارہروی (1160ھ-1262ھ)، حضرت شاہ ابو الحسن فرد پھلواروی (1191ھ-1265ھ)، حضرت شاہ احمد سعید مجددی رام پوری (1217ھ-1277ھ)، حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی (1212ھ-1278ھ) حضرت علامہ عبد الحلیم فرنگی محلی لکھنوی (1209ھ-1285ھ)، حضرت علامہ فضل رسول بدایونی (1213ھ-1289ھ)، حضرت سید شاہ آل رسول احمدی برکاتی مارہروی (1209ھ-1296ھ)، حضرت مولانا نقی علی بریلوی (1246ھ-1297ھ) وغیرہم۔

اسی طرح انہوں نے چودھویں صدی ہجری کے مشہور علمائے اہل سنت میں ان علما کا ذکر کیا ہے: مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلی لکھنوی (1246ھ-1304ھ)، حضرت مفتی ارشاد حسین رام پوری (1248ھ-1311ھ)، حضرت مولانا فضل رحمن گنج مرادآبادی (1208ھ-1313ھ)، حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری لاہوری (و1315ھ)، حضرت مولانا عبد القادر بدایونی (1253ھ-1319ھ)، حضرت مولانا ہدایت اللہ رام پوری ثم جون پوری (و1326ھ)، حضرت مولانا خیر الدین دہلوی (و1326ھ)، حضرت مولانا

احمد رضا بریلوی (1272ھ-1340ھ)، حضرت شاہ علی حسین اشرفی کچھوچھوی (1266ھ-1355ھ)، حضرت شاہ مہر علی گولڑوی پنجابی (1274ھ-1356ھ) وغیرہ۔

چودہوی صدی ہجری میں اس تحریک میں مولانا احمد رضا بریلوی نے قائدانہ رول ادا کیا اس لیے پوری جماعت کو انہیں کی طرف منسوب کر دیا گیا اور اسے بریلوی جماعت کہا جانے لگا۔ اس تحریک میں ان کا ساتھ دینے والے مشہور علما میں حضرت مولانا وصی احمد محدث سورتی (1836ء-1916ء)، مولانا محمد امجد علی اعظمی (1842ء-1948ء)، حضرت مولانا نعیم الدین مرادآبادی (1878ء-1948ء)، حضرت سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری (1834ء-1951ء)، حضرت سید دیدار علی الوری (1856ء-1935ء)۔ حضرت مولانا حامد رضا قادری (1875ء-1943ء)، حضرت مولانا مصطفی رضا نوری (1893ء-1981ء)، حضرت مولانا عبد المقتدر بدایونی (1867ء-1916ء)، حضرت عبد القدیر بدایونی (1894ء-1960ء)، حضرت مولانا عبد العلیم صدیقی میرٹھی (1892ء-1954ء)، حضرت سید محمد اشرفی کچھوچھوی (1864ء-1961ء)، حضرت مولانا ظفر الدین قادری بہاری (1880ء-1968ء)، حضرت مفتی محمد عبد الباقی برہان الحق جبل پوری (1892ء-1985ء)، حضرت مولانا حشمت علی لکھنوی (1901ء-1960ء)، حضرت مولانا کرامت اللہ دہلوی (1800ء-1873ء)، حضرت مولانا حسنین رضا بریلوی (1892ء-1980ء) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

چونکہ مولانا احمد رضا بریلوی اس جماعت کے ممتاز قائدین میں سے ہیں اور بعد کے زمانے میں انہیں سے اس جماعت کو منسوب بھی کر دیا گیا ہے اس لیے ہمیں ان کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ ذیل میں ان کی حیات و خدمات پیش کی جارہی ہے۔

4.3 مولانا احمد رضا خان

مولانا احمد رضا خان علیہ الرحمہ 10 شوال 1272ھ مطابق 14 جون 1856ء کو ہندوستان کی ریاست اتر پردیش کے شہر بریلی میں پیدا ہوئے اور 1921ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ نسبتاً پٹھان مسلکاً حنفی اور مشرباً قادری تھے۔ آپ کے والد ماجد مولوی نقی علی خاں (متوفی 1880ء) اور جد امجد مولوی رضا علی خاں (متوفی 1866ء) اپنے وقت کے ممتاز علماء میں شمار کیے جاتے تھے۔ مولانا احمد رضا خان نے اپنے والد ماجد اور دوسرے اساتذہ سے علوم منقولہ و معقولہ کی تعلیم حاصل کی۔ اساتذہ اور ذاتی مطالعہ سے جن علوم و فنون کی تحصیل کی ان کی تعداد 55 تک پہنچتی ہے اور بعض حضرات نے ان کی تعداد 120 بھی لکھی ہے۔ مولانا اپنی فطری ذکاوت و ذہانت کی وجہ سے علوم عقلیہ و نقلیہ میں بہت کم عمری میں ہی ماہر ہو گئے تھے۔

4.4 مولانا احمد رضا خاں کا علمی مقام

مولانا احمد رضا بریلوی علم قرآن، تفسیر، حدیث، اصول حدیث، اسماء الرجال، فقہ اربعہ، اصول فقہ، جدل، عقائد و کلام، عربی زبان وادب، منطق و فلسفہ وغیرہ کے ماہر اور اردو، عربی اور فارسی کے بہترین طبع زاد شاعر تھے۔ مولانا کو بہت سے علوم و فنون میں تبحر حاصل تھا جس کی تعداد تقریباً 54 بتائی جاتی ہے۔ اس کا اندازہ ان علوم فنون میں ان کی بکثرت مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف سے ہوتا ہے۔

علم قرآن میں ان کا اردو ترجمہ امتیازی شان رکھتا ہے، جو کنزالایمان فی ترجمۃ القران کے نام سے 1330ھ / 1911ء میں منظر عام پر آیا۔ پھر اس پر ان کے خلیفہ مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی نے خزائن العرفان فی تفسیر القرآن کے عنوان سے تفسیری حواشی لکھے۔ اس ترجمہ و تفسیر کے بہت سے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

مولانا نے ترجمہ قرآن کے علاوہ تفسیر کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے سورہ ضحی کی بعض آیات کی تفسیر 80 جز تک لکھی، مگر دوسرے دینی و علمی مشاغل کی وجہ سے قرآن پاک کی مبسوط تفسیر نہیں لکھ سکے۔ یہ کام ان کے تلامذہ و خلفاء اور تلامذہ کے تلامذہ نے انجام دیا۔ مثلا تفسیر خزائن العرفان، تفسیر حسنات، تفسیر نعیمی، تفسیر ضیاء القران، تفسیر ازہری، تفسیر تنویر القرآن وغیرہ ان کے شاگردوں کی تفاسیر ہیں۔

صاحب نزہۃ الخواطر نے مولانا کے علمی تبحر، کثرت مطالعہ اور کثرت معلومات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اللہ نے آپ کو سیال قلم اور معلومات سے بھرپور فکر عطا کیا تھا۔ انہوں نے خاص کر آپ کی فقہی بصیرت اور علم فقہ میں آپ کے تبحر کا دل کھول کر اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ وہ مولانا کی فقہی مہارت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فقہ حنفی اور اس کی جزئیات پر ان کو جو عبور حاصل ہے اس کی نظیر شاید کہیں ملے اور اس دعوی پر ان کا مجموعہ فتاوی شاہد ہے، نیز ان کی کتاب "كفل الفقيه الفاهم في أحكام قرطاس الدراهم" بھی اس پر گواہ ہے جو انہوں نے 1323ھ میں مکہ معظمہ میں لکھی تھی۔ انہیں فقہ کے جزئیات پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ مثلا وہ پانی جس سے وضو جائز ہے مولانا نے اس پانی کی 160 قسمیں بیان کی ہیں اور وہ پانی جس سے وضو نا جائز ہے اس کی 146 قسمیں بیان کی ہیں۔ اسی طرح پانی کے استعمال سے عجز کی 155 صورتیں بیان کی ہیں اور اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا جس کا عنوان ہے "سمع النداء في ما يورث عن العجز عن الماء"۔ مائے مطلق اور مائے مقید کی تعریف میں ایک رسالہ لکھا جس کا عنوان ہے "النور والنورق لإسفار ماء مطلق"۔ وہ اشیاء جن سے تیمم جائز ہے ان کی 181 قسمیں بیان کیں جن میں سے 74 تو منصوصات ہیں لیکن 107 زیادات (یعنی قیاسی) ہے۔ اور وہ اشیاء جن سے تیمم جائز نہیں، ان کی 130 قسمیں بیان کیں جن میں 58 منصوصات اور 72 زیادات ہیں۔"

جزئیاتِ فقہ کے علاوہ متونِ فقہ پر مولانا کو جو قدرت حاصل تھی وہ اہل علم کے لیے حیرت انگیز تھی، چنانچہ صاحب "نزہۃ الخواطر" لکھتے ہیں:

"حرمین شریفین کے قیام کے زمانے میں بعض رسائل بھی لکھے اور علمائے حرمین نے بعض سوالات کیے تو ان کے جوابات بھی تحریر کیے۔ متونِ فقہیہ اور اختلافی مسائل پر ان کی ہمہ گیر معلومات، سرعتِ تحریر اور ذہانت کو دیکھ کر سب کے سب حیران اور ششدر رہ گئے۔ متون فقہیہ پر استحضار کی یہ کیفیت تھی کہ بعض اوقات وہ بغیر دیکھے عبارات کی عبارات لکھتے جاتے تھے۔ چنانچہ قیام مکہ معظمہ کے زمانے میں بھی اس قسم کے مظاہر سامنے آئے۔ آخری ایام میں علالت کی وجہ سے بریلی سے بھوالی چلے گئے تھے، کوئی کتاب پاس نہ تھی۔ اس زمانے میں ایک استفتاء کا جواب دیا تو اس میں کتبِ فقہ و حدیث کے 31 حوالے موجود ہیں۔"

فتاوی رضویہ کے مطالعے سے مولانا کے تبحر علمی کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علم فقہ کتنا وسیع علم ہے اور ایک باکمال

فقیہ ہونے کے لیے کس قدر علوم وفنون سے واقفیت ضروری ہے ۔ مولانا کے دارالافتاء میں ہندوستان، برما، چین، امریکہ، افغانستان، افریقہ، حجاز مقدس اور بلاد اسلامیہ سے بکثرت فتوے معلوم کیے جاتے تھے۔ اور فتوی نویسی کے فرائض بغیر کسی ادنی معاوضے کے للّٰہیت وخلوص کے ساتھ انجام دیتے تھے۔(حیات امام اہل سنت)

فتاوی رضویہ کے علاوہ ان کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتب وحواشی وملفوظات ومکتوبات وغیرہ کی تعداد ایک ہزار تک بتائی جاتی ہے۔ان میں تمہید ایمان، جد الممتار علی الدر المختار، المعتمد المستند، حسام الحرمین، احکام شریعت، الملفوظ، حدائق بخشش (نعتیہ مجموعہ) وغیرہ مشہور ہیں۔اس کے علاوہ بھی ان کی متعدد علوم وفنون پر سینکڑوں کتابیں ہیں جن سے ان کی تبحر علمی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

4.5 سنی بریلوی جماعت کے نظریات

بریلوی جماعت کے نظریات اس جماعت کے علما کے مطابق متوارث اسلامی تعلیمات ہیں جس کی تبلیغ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے تلامذہ نے کیا۔ انیسویں صدی عیسوی میں ان نظریات کے خلاف نئے نظریات ظاہر ہوئے جن کی وجہ سے ہندوستانی مسلمان چند فرقوں اور جماعتوں میں تقسیم ہوگئے۔

بریلوی نقطہ نظر کے مطابق سنی بریلوی جماعت حقیقی طور پر تمام صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین، صالحین، علمائے امت اور بزرگانِ دین کے مسلک پر ہے۔ بریلوی مسلک کی تشریحات کے مطابق عقائد میں شان الوہیت کا تقدس اور ناموسِ رسالت کی عظمت سب سے اہم ہے چنانچہ وہ ذات باری تعالی کے لیے کسی ایسے لفظ یا تعبیر کے استعمال کو درست نہیں مانتے جو اللہ تعالی کی شایانِ شان نہ ہو، اسی طرح عظمت مصطفی ﷺ کے خلاف ہو۔ معمولات میں بدعت کو بدعت حسنہ وسیئہ میں تقسیم کرتے ہیں اور بدعت حسنہ پر عمل کے قائل ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ میلاد وقیام، صلوٰۃ وسلام، ایصال ثواب، عرس یہ سب معمولات صدیوں سے اہل سنت والجماعت میں رائج ہیں اور علمائے امت نے انہیں باعث ثواب قرار دیا ہے۔ان معمولات کو بعد کی پیداوار قرار دینا، انہیں رسومات وبدعات کہنا ضلالت وگمراہی ہے۔

بریلوی جماعت کے اہم نظریات حسب ذیل ہیں:

4.5.1 نظریہ توحید وشرک

بریلوی نقطۂ نظر کے مطابق حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی ذاتِ مبارکہ کا ادب وتعظیم اور آپ علیہ الصلاۃ والسلام کی تعریف وتوصیف باعثِ سعادت ہے، اسے شرک پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔اس مسلک کے مطابق قرآن مجید کے سورہ اخلاص کی روشنی میں شرک کی تین صورتیں ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی صادر ہو تو شرک ہوگا ورنہ نہیں، وہ تین صورتیں درج ذیل ہیں:

- کسی مخلوق کو رب قرار دینا یا اللہ تعالٰی پر حاکم قرار دینا۔
- کسی کو اللہ کی اولاد قرار دینا یا اللہ کو کسی کی اولاد قرار دینا۔
- کسی مخلوق میں کوئی صفت ازلی (ہمیشہ سے)، ذاتی (از خود بغیر اللہ کی عطا کے) کا عقیدہ رکھنا، یا اللہ تعالٰی کی کسی صفت کے

ہمسر قرار دینا۔ لہذا اگر حد درجہ مبالغہ آرائی اور غلو کے باوجود اللہ تعالیٰ سے کمتر سمجھا تو شرک نہیں۔

لہذا ان تین شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضور علیہ الصلاۃ والسلام کو اللہ کا بندہ اور رسول اور مخلوق میں افضل ترین سمجھتے ہوئے ان کی حد درجہ تعریف وتوصیف اور ادب وتعظیم کرنا شرک کے دائرہ میں نہیں آتا۔

4.5.2 تقدیسِ شانِ الوہیت وحفاظتِ ناموسِ رسالت

بریلوی جماعت کے ترجمان مولانا احمد رضا بریلوی شانِ الوہیت وشانِ رسالت میں ایسے کلمات کا استعمال خلاف ادب خیال کرتے ہیں جو بظاہر حق معلوم ہوتے ہوں مگر ساتھ ہی ان تعبیرات میں کسرِ شان کا بھی پہلو ہو اور بسا اوقات گستاخی تک بھی لے جاتے ہوں۔ وہ اس امر کے قائل ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے محامد ومحاسن جو قرآن وحدیث میں بیان کیے گئے ہیں وہ من وعن بیان کیے جائیں تاکہ آپ ﷺ کی شخصیت ابھر کر سامنے آئے اور مسلمانوں کے دلوں میں آپ ﷺ کی عزت وعظمت قائم ہو۔ وہ اس امر کے قائل ہیں کہ نبی اکرم ﷺ تمام کائنات میں سب سے افضل ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں کوئی بھی ان کے جیسا نہیں اس لیے انہیں اپنے جیسا بشر بایں طور کہنا کہ اس میں تنقیص شان رسالت ہو یا کوئی ایسا جملہ یا فقرہ استعمال کرنا جو تنقیص شان نبوی کا سبب بنے کفر ہے۔

4.5.3 تردید امکانِ کذب باری تعالیٰ

امکانِ کذب باری تعالیٰ یعنی اللہ تعالیٰ جس طرح جملہ ممکنات پر قادر ہے اسی طرح جھوٹ پر بھی قادر ہے یا نہیں؟ برصغیر میں ایک جماعت باری تعالیٰ کی طرف امکانِ کذب کو اس طور پر جائز سمجھتی ہے کہ اس کا صدور اللہ سے نہیں ہوا، جب کہ بریلوی جماعت اس طرح کے عقیدہ کو شانِ الوہیت کے خلاف سمجھتی ہے اور کہتی ہے کہ جھوٹ ایک قبیح عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کے صفاتِ کمالیہ کے خلاف ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے اس کو ممکن ماننا خواہ اس کا صدور ہو یا نہ ہو اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں اور اس میں اس کی عظمت ورفعت کی تخفیف وتوہین ہے۔

4.5.4 عشق رسول ﷺ

بریلوی جماعت کی بنیاد عشق رسول ﷺ پر ہے۔ یہ حضور اکرم ﷺ کے محامد ومحاسن کو خوب خوب بیان کرتے ہیں تاکہ لوگوں کے دلوں میں آپ ﷺ کی عزت وعظمت بیٹھ جائے اور آپ ﷺ سے عشق ومحبت ہو جائے اور آپ ﷺ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگے۔ یہ جماعت یہ بھی مانتی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی شان میں بے ادبی وگستاخی سنگین جرم اور کھلا ہوا کفر ہے جس کی تصریحات قرآن وحدیث اور اقوال صحابہ وتابعین میں موجود ہیں۔

4.5.5 علم غیب مصطفیٰ

علمائے بریلی کے مطابق اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو جمیع ماکان ومایکون کا علم عطا فرمایا تھا یعنی وہ تمام چیزیں جو ہو چکی اور ہوں گی آپ ﷺ کو ان تمام چیزوں کا علم اللہ نے عطا فرمایا اور اسی کو وہ علم غیب سے تعبیر کرتے ہیں اور اس پر متعدد قرآنی آیات واحادیث

نبوی سے استدلال کرتے ہیں۔

4.5.6 نظریہ نور و بشر

سنی بریلوی جماعت رسول اللہ ﷺ کی نورانیت کے قائل ہیں اور رسول اللہ ﷺ کو بشر کے ساتھ ہی ایک نورانی مخلوق بھی مانتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ قرآنی آیات اور احادیث سے استدلال کرتی ہے، جن میں سے ایک وہ حدیث بھی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا: یَا جَابِرُ، اِنَّ اللّٰہ تَعَالٰی قَدْ خَلَقَ قَبْلَ الْاَشْیَاءِ نُوْرَ نَبِیِّکَ مِنْ نُوْرِہٖ۔ اے جابر اللہ تعالیٰ نے ہر تخلیق سے پہلے تیرے نبی کے نور کو اپنے نور سے پیدا کیا۔

4.5.7 نظریہ شاہد و ناظر

سنی بریلوی جماعت کا ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمہ جہت شاہد و ناظر ہیں۔ وہ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے دنیا میں عالم غیب کو دیکھ کر اطلاع دی اور اسی طرح بعد از وصال بھی آپ علیہ الصلوۃ والسلام تمام احوال سے باخبر ہیں۔ اس سلسلے میں وہ مختلف آیات قرآنی واحادیث نبوی سے استدلال کرتے ہیں۔ جن میں سے ایک آیت یہ ہے: یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّا اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا- اے نبی ہم نے آپ (ﷺ) کو شاہد بنا کر بھیجا۔ مولانا احمد یار خان نعیمی (و:) اپنی کتاب جاء الحق میں نظریہ حاضر و ناظر کے متعلق رقم طراز ہیں:

"حاضِر و ناظر ہونے کا معنیٰ یہ ہے کہ قُدسی (یعنی اللہ کی دی ہوئی) قوت والا ایک ہی جگہ رہ کر تمام عالم (یعنی سارے جہان، زمین و آسمان، عرش و کرسی، لوح و قلم، ملک وملکوت) کو اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح دیکھے اور دُور و قریب کی آوازیں سُنے یا ایک آن (لمحہ بھر) میں تمام عالم کی سیر کرے اور سینکڑوں مِیل دُور حاجت مندوں کی حاجت رَوائی کرے۔ یہ رفتار خواہ رُوحانی ہو یا جسمِ مثالی کے ساتھ ہو یا اسی مبارک جسم سے ہو جو قبرؔ میں مَدفون ہے۔"

4.5.8 مختار کل

بریلوی مسلک کا نظریہ ہے کہ اللہ تعالی نے انبیائے کرام اور اولیائے عظام کو بہت سے اختیارات سے نوازا ہے، بالخصوص نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفی ﷺ کو اللہ تعالی نے مختار کل بنایا ہے۔ اس جماعت کے مطابق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دائرہ ماذونیت میں مختار کل ہیں۔ دائرہ ماذونیت سے مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالی کی طرف سے اذن اور اختیار دیا گیا ہے۔

بعض کلمات کا اطلاق بعض مقامات میں مختلف معنی دیتا ہے۔ مثلاً لفظ کل جب اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہو گا تو حقیقی معنی میں ہو گا مگر جب یہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی مقرب بندہ کے لیے استعمال ہو گا تو اضافی معنی میں ہو گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے مختار کل کا لفظ اسی معنی میں مراد لیا جاتا ہے۔ جب یہی لفظ کل مخلوق کے لیے ہو تو اس کے اطلاقات درجہ بدرجہ بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً ایک چیز کسی دوسری چیز کے مقابلے میں کل ہے تو وہی چیز کسی دوسرے کے مقابلے میں جزو بھی ہو سکتی ہے۔

انسانی علم جتنا بھی لامحدود اور وسیع ہو جائے وہ ماکان اور ومایکون کی حدود کے اندر ہی رہتا ہے، اس سے آگے اس کی حدیں ختم ہو

جاتی ہے۔ یہی کل انسانی علم جب حضور تاجدار کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلے میں رکھا جائے گا تو مخلوق کا سارا علم حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے مقابلے میں جزو ہو گا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم تمام مخلوق کے مقابلے میں کل ہو گا۔ مگر جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کل علم معبود الٰہی کے مقابلے میں لایا جائے گا تو یہ جزو ہو گا۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے سارے اختیارات آپ علیہ السلام کے دائرہ ماذونیت میں ہیں، جس میں آپ مختار کل ہیں۔

4.5.9 نظریۂ توسل

بریلوی حضرات نہ صرف رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے توسل کے قائل ہیں بلکہ آپ ﷺ سے منسلک اشیاء مثلاً آپ کے موئے مبارک اور آپ کی نعلین شریفین کو اللہ کی بارگاہ میں وسیلہ بنانے کے قائل ہیں اور اسے شریعت کے مطابق قرار دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر صحابہ کرام بشمول اہل بیت اطہار اور بزرگان دین سے توسل کو بھی جائز قرار دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے وسیلہ سے بارگاہ الٰہی میں دعا کرنا ان کے نزدیک مستحسن ہے۔ اس کے لیے مختلف الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جیسے توسل، استغاثہ، تشفع، توجہ وغیرہ۔

4.5.10 بدعت کے بارے میں نقطہ نظر

اس مسلک کے نقطہ نظر کے مطابق بدعت کی دو اقسام ہیں: ایک بدعتِ حسنہ یعنی اچھی بدعت اور دوسری بدعتِ سیئہ یعنی بری بدعت جیسا کہ ذیل کی حدیثِ نبوی میں منقول ہے۔

من سن في الإسلام سنة حسنة كان له أجرها وأجر من عمل بها من بعده لا ينقص ذلك من أجورهم شيئا، ومن سن في الإسلام سنة سيئة كان عليه وزرها ووزر من عمل بها من بعده لا ينقص ذلك من أوزارهم شيئا(أخرجه مسلم في صححيه) ترجمہ :-جو آدمی اسلام میں کوئی اچھا طریقہ رائج کرے گا تو اسے اس کا اجر ملے گا اور اس اچھے طریقے پر عمل کرنے والوں کا بھی اجر ملے گا بغیر اس کے کہ اس کے متبعین کے اجر میں کچھ کمی کی جائے، اور اسلام میں کوئی برا طریقہ رائج کرے گا اسے اس کا گناہ ملے گا اور اس برے طریقے پر عمل کرنے والوں کا بھی گناہ بغیر اس کے کہ اس کے متبعین کے گناہ میں کچھ کمی کی جائے۔

صحیح مسلم کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے اس مکتب فکر کے مطابق دین میں کوئی نیا اچھا عمل جاری کرنا جو شریعت کے بنیادی اصولوں کے مخالف نہ ہو، نہ صرف جائز بلکہ مستحب عمل ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رمضان المبارک میں باجماعت نمازِ تراویح شروع کرنے کے اپنے عمل کو نِعْمَ الْبِدْعَةُ هَذِه (یہ اچھی بدعت ہے، بخاری) فرما کر نبی کریم ﷺ کی حدیثِ مبارکہ کی عملی تشریح کی۔ اسی طرح بہت سے ایسے افعال جو حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں نہیں تھے اور صحابہ کرام یا ان کے بعد امتِ مسلمہ میں رائج ہوئے وہ بدعت کے زمرے میں نہیں آتے۔ جیسے قرآنِ مجید کو خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں کتابی شکل میں جمع کرنا یا بعد ازاں حجاج بن یوسف کے دور میں قرآنِ پاک پر اعراب لگانا، فقہ کی تدوین، نحو کی ایجاد، ایمانِ مفصل و ایمانِ مجمل، چھ کلمے، مساجد میں مینار گنبد و محراب وغیرہ ایسے افعال ہیں جو امت میں بعد میں رائج ہوئے اور کسی شرعی حکم سے ٹکراؤ نہ رکھنے کے باعث، یہ افعال حدیثِ نبوی ﷺ کی روشنی میں بدعتِ حسنہ کے ضمن میں آتے ہیں۔ اسی طرح عید میلاد النبی، قیام و سلام،

سوم، چہلم، ختم، عرس اور گیارہویں شریف وغیرہ بھی بدعت حسنہ کے ضمن میں آتے ہیں۔

4.6 بریلوی مکتب فکر کی اہم کتابیں

ذیل میں بریلوی مکتب فکر کی چند اہم کتابوں کا تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

1. کنزالایمان فی ترجمۃ القران

مولانا احمد رضا خان کا اردو ترجمہ قرآن 1911ء میں مکمل ہوا۔ یہ اردو تراجم قرآن میں ایک مشہور ترجمہ ہے، اس اردو ترجمہ کا ترجمہ ہندی، سندھی، انگریزی، ڈچ، گجراتی، پشتو اور بنگلہ میں ہو چکا ہے۔

2. العطايا النبوية في الفتاوى الرضوية

یہ کتاب مولانا احمد رضا خان کے جاری کردہ ہزاروں فتاوی کا مجموعہ ہے، اس علمی ذخیرے کو فقہ حنفی کا انسائیکلوپیڈیا کہا جا سکتا ہے۔ اس کا پورا نام "العطايا النبوية في الفتاوى الرضوية" ہے جسے مختصر طور پر فتاویٰ رضویہ کہا جاتا ہے۔ تخریج شدہ تینتیس جلدوں میں شائع ہوئی ہے، جن میں کل 6847 سوالات کے جوابات ہیں، جن میں مولانا احمد رضا خان کے 206 رسائل بھی شامل ہیں۔

3. تمہید ایمان

یہ کتاب مولانا احمد رضا خان نے عوام الناس کے عقائد کی حفاظت وصیانت کے لیے تحریر کی۔ اس کتاب میں انہوں نے اہل سنت والجماعت کے عقائد کو قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان فرمایا ہے اور ان عقائد کے خلاف جن عقائد کو عوام میں رائج کیا جارہا تھا اس کی تردید کی اور عام مسلمانوں کو اس سے بچنے کی تاکید کی۔

4. ضیاءالنبی

پیر محمد کرم شاہ الازہری کی سیرت نبوی پر لکھی ہوئی ایک علمی کتاب ہے جو 7 جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو حکومت پاکستان وزارت مذہبی امور کی طرف سے اردو مقابلہ سیرت 1994ء میں پہلے انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ محمد قیوم اعوان نے اس کتاب کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے، اور یہ ترجمہ بھی سات جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری کی 'ضیاء النبی' عصر حاضر کی کتب سیرت میں نمایاں مقام ومرتبہ رکھتی ہے۔ اس کتاب میں قدیم وجدید سیرت کے تمام ماخذوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ صاحب کتاب کا انداز بیاں سادہ، منطقی اور مدلل ہے کتاب میں مغربی مفکرین کی کتب سے بھی اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے حوالے درج کیے گئے ہیں۔

5. تفسیر ضیاءالقرآن

مولانا پیر محمد کرم شاہ الازہری کی تفسیر قرآن جو 3500 صفحات اور پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ تفسیر آپ نے 19 سال کے طویل عرصہ میں مکمل کی۔ یہ تفسیر قدرے مفصل اور معانی قرآن کے بیان میں بہت ہی واضح ہے، مصنف موصوف کی تفہیم کا انداز بڑا اچھوتا ہے۔

6. بہار شریعت

بہار شریعت مولانا محمد امجد علی اعظمی کی معرکہ آرا تصنیف ہے، اس کتاب کے سبب وہ زندہ جاوید ہوئے اس کتاب میں انہوں نے

فقہ حنفی کو اردو قالب میں ڈھال کر وقت کی اہم ضرورت کو پورا کیا ہے اس سے فائدہ حاصل کرنے والوں میں علما و عوام دونوں شامل ہیں۔ بہار شریعت کو اردو زبان میں کتب فقہ میں وہی مقام حاصل ہے جو عربی زبان میں فتاوی شامیہ اور فتاوی ہندیہ کو حاصل ہے۔ فقہ اسلامی اور مسائل شرعیہ کو مولانا امجد علی مکمل طور پر بیس جلدوں میں سمیٹنا چاہتے تھے، مگر عمر نے ساتھ نہ دیا اور سترہ حصے لکھنے کے بعد دنیائے فانی سے کوچ کر گئے اور وصیت کر گئے کہ میری اولاد یا تلامذہ یا علمائے اہل سنت میں سے کوئی اس کو پورا کر دیں۔ چنانچہ ان کے شاگرد اور دیگر علماء نے بہار شریعت کے باقی تین حصے 18، 19، 20 ضبط تحریر میں لا کر اس کی تکمیل کی ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ جاء الحق، سنی بہشتی زیور، فیضان سنت، تفسیر نعیمی، کتاب العقائد، جامع الرضوی المعروف بہ: صحیح البھاری، سیرت مصطفی وغیرہ بھی بریلوی مسلک کی اہم کتابیں شمار کی جاتی ہیں۔

4.7 سنی بریلوی جماعت کی تبلیغی خدمات

ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط و قبضہ کے بعد ہندوستانی مسلمان مختلف النوع داخلی و خارجی مسائل سے دوچار ہوئے۔ بیسویں صدی عیسوی میں یہ پریشانی مزید بڑھ گئی اور عیسائی مشنریز، آریہ سماج اور شدھی تحریک بڑی تیزی سے مسلمانوں کے عقائد و نظریات کو متزلزل کرنے لگے اور مسلمانوں کی بڑی تعداد ارتداد کا شکار ہونے لگی۔

پنڈت سر دھانند نے ہندو مذہب میں اصلاح اور اس کے ماننے والوں کو منظم کرنے کے لیے 1875ء میں ''آریہ سماج'' کی بنیاد رکھی، اس نے اسلام، سکھ، عیسائی، جین اور بودھ تمام ہندوستانی مذاہب کو نشانہ بنایا۔ اس نے ''ستیارتھ پرکاش'' نامی کتاب کے چودھویں باب میں قرآن مقدس پر کئی طرح کے اعتراضات کیے اور اس سے مسلمانوں کے عقیدہ کو متزلزل کرنے کی کوشش کی۔

پنڈت سر دھانند کی طرح پنڈت دیانند نے 1920ء میں شدھی تحریک کی بنیاد رکھی اور مسلمانوں کو شدھ کر کے ہندو مذہب میں داخل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ جگہ جگہ محفلیں منعقد کرتا، اسلام اور قرآن پر اعتراض کرتا، مناظرہ کے لیے چیلنج کرتا اور مسلمانوں میں بد دینی پھیلا کر انہیں ہندو مذہب میں داخل کرنے کی کوشش کرتا۔

ان تحریکوں کے خلاف متعدد انفرادی و اجتماعی کوششیں اور تحریکیں سرگرم عمل تھیں۔ انہیں تحریکوں میں ایک تحریک مولانا احمد رضا خان کا قائم کردہ جماعت رضائے مصطفی بھی ہے جو صرف تقدیس ذات باری تعالی و عظمت ناموس رسالت کے لیے ہی کھل کر میدان میں نہیں آئی بلکہ اس نے عیسائی مشنریز، آریہ سماج اور شدھی تحریک کا بھی زبردست مقابلہ کیا اور ارتداد کے شکار مسلمانوں کے دلوں میں عظمت اسلام و قرآن کو جاگزیں کیا اور اسلام پر قائم و دائم رہنے میں ان کی مدد کی۔

اس دور میں عیسائی مقررین و مبلغین سوال و جواب کے لیے حاضرین مجلس کو اجازت دیتے تھے، اور دیگر جماعتیں مناظرہ کا چیلنج کرتی تھی۔ جماعت رضائے مصطفی کے کارکنان ہر اس جگہ جاتے جہاں سوال و جواب کا موقع دیا جاتا یا مناظرہ کے لیے بلایا جاتا اور ان لوگوں سے مناقشہ و مناظرہ کرتے اسلام اور قرآن پر کیے گئے اعتراضات کا اطمینان بخش جواب دیتے، مسلمانوں کے دلوں میں اسلام اور قرآن کی

عظمت جاگزیں کرتے اور مسلمانوں کو ارتداد کا شکار ہونے سے بچاتے۔

ذیل میں جماعت رضائے مصطفی سے منسلک چند مبلغین کی مختصر خدمات پیش کی جارہی ہیں:

مولانا ہدایت رسول قادری لکھنوی (1860ء-1915ء): یہ ایک بہترین خطیب اور عمدہ مناظر تھے۔ مولانا احمد رضا بریلوی ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر مجھ جیسا لکھنے والا اور ہدایت رسول جیسا بولنے والا ہندوستان میں اور ہوتا تو بدمذہبیت کا نام ونشان نہیں ہوتا۔ یہ اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لیے ہندوستان کے طول عرض میں عیسائی پادریوں، آریہ سماج والوں، نیچریوں، قادیانیوں اور رافضیوں وغیرہ سے مناظرے کیے۔ ان کی تقاریر اور مناظروں کی وجہ سے بہت سارے لوگ تائب ہوئے اور راہ حق پر گامزن ہوگئے۔

مولانا قطب الدین برہم چاری (و1932ء): یہ ایک غیر مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے، سنسکرت کی تعلیم حاصل کی اور چاروں ویدیوں کے ماہر بن گئے۔ عین جوانی کے عالم میں اسلام لائے اور اسلامی علوم وفنون حاصل کیے۔ یہ طب وحکمت میں بھی ماہر تھے۔ یہ جماعت رضائے مصطفی کی شاخ اشاعت الحق کے ناظم اعلی بنائے گئے۔ ان کی تبلیغ کا طریقہ جداگانہ تھا۔ یہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کے لوگوں کے ساتھ گھل مل کر اسلام کی دعوت وتبلیغ کیا کرتے تھے، لوگوں کو اسلام کی اچھائیاں بتاتے تھے اور اتدادی پروپیگنڈہ سے ان کے ذہنوں کو صاف کرتے تھے اوران کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرتے تھے۔

مولانا سید سلیمان اشرف بہاری (1878ء-1939ء): یہ مصنف، محقق اور ماہر تعلیم تھے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کے پروفیسر اور صدر شعبہ بھی رہے۔ ان کی مشہور کتاب "المبین" ہے۔ علوم اسلامیہ کی نشرواشاعت میں ان کی گراں قدر خدمات ہیں۔ ان کی دعوت وتبلیغ زیادہ تر علمی اور شخصی نوعیت کی تھی۔

حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خان بریلوی (1875ء-1943ء): یہ مولانا احمد رضا خان کے بیٹے تھے۔ یہ بہترین ادیب، مایہ ناز خطیب اور عالم وفاضل تھے۔ دین اسلام کی خدمت، ناموس رسالت کی حفاظت اور قوم کی فلاح وبہبود ان کی زندگی کا مقصد تھا جس کے لیے وہ برصغیر کے مختلف علاقوں کا دورہ کرتے رہتے تھے۔ شدھی تحریک کے خلاف جی توڑ کوشش کی۔ جے پور، چتوڑ گڑھ، اودے پور اور گوالیار کے راجگان ان کے معتقدین تھے۔ ان کی دعوت وتبلیغ سے گمشتگان ومتلاشیان راہ حق کو بہت مدد ملی اور بہت سے سارے لوگ تائب ہوئے۔

مفسر قرآن سید محمد نعیم الدین مرادآبادی (1878ء-1948ء): یہ مولانا احمد رضا خان کے شاگرد ومرید نہیں تھے بلکہ صرف خلیفہ تھے۔ ان کی مشہور کتابیں تفسیر "خزائن العرفان"، "تفسیر نعیمی" اور "سوانح کربلا" ہیں۔ انہوں نے رام چندر دہلوی اور دیانند سرسوتی کے دعوت مناظرہ کو قبول کیا اور ان سے کئی بار مناظرہ کیا۔ انہوں نے اکوڑہ، نینی تال اور ہلدوانی وغیرہ سواحلی علاقوں میں بھی قیام کیا اور وہاں دعوت وتبلیغ کے لیے ایک رسالہ "پراچین کال" لکھا۔

مبلغ اسلام مولانا عبد العلیم صدیقی میرٹھی (1892ء-1954ء): مولانا عبد العلیم نے درس نظامیہ کی تکمیل کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے جرمن، جاپانی، انڈونیشین اور سواحلی زبانیں سیکھی۔ یہ عربی، فارسی، اردو، ہندی، انگریزی وغیرہ تقریبا پندرہ زبانیں بولتے

تھے۔ انہوں نے عرب، افریقی، امریکی، یورپی ممالک بشمول چین وجاپان تقریبا پچاس سے زائد ملکوں کا تبلیغی دورہ کیا۔ انہوں نے بیرون ممالک کئی ساری مسجدیں تعمیر کروائی، اسپتال بنوائے، مدارس ومکاتب قائم کیے۔ ان کی تبلیغ سے ایک بڑی تعداد میں یہودی، عیسائی اور دیگر مذاہب کے ماننے والے مشرف بہ اسلام ہوئے جن میں ماریشش کے گورنر مسٹر مروات اور سنگاپور کے مسٹر سچند رناتھ بھی ہیں۔ انہوں نے ساؤتھ افریقہ میں مشہور ڈرامہ نگار جارج برنارڈ شا سے مناظرہ کیا اور اسے اسلام کی طرف راغب کیا۔ اسی طرح جنوبی امریکہ کے ٹرینیداد میں کولمبو یونیورسٹی کے پروفیسر اور سیلون حکومت کے سابق وزیر "ریوٹڈلنگ لیری" جو بیس سال سے عیسائیت کی تبلیغ کر رہے تھے ان کی تقریر سے متأثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے۔

مولانا حشمت علی خان قادری (1901ء-1960ء): یہ ایک کامیاب مدرس، مصنف، مبلغ اور مناظر تھے۔ ان کی تصنیفات میں "تذکرہ حسنین" اور "اسوہ حسنہ" بھی ہے۔ یہ تحفظ ناموس رسالت ﷺ کے لیے کمربستہ رہتے اور حسب ضرورت تحریر وتقریر ومناظرہ کرتے رہتے تھے۔ یہ جماعت رضائے مصطفی کی طرف سے آگرہ، متھرا، بھرت پور وغیرہ میں پنڈت شردھانند کی شدھی تحریک کی طرف مناظرہ کی دعوت پر گئے تھے جہاں انہوں نے اسلام پر ہو رہے اعتراضات کا جواب دیا اور مسلمانوں کو اسلام کی طرف راغب کیا۔

محدث اعظم ہند مولانا سید محمد اشرفی جیلانی کچھوچھوی (1864ء-1961ء): یہ محدث، مفسر، مترجم قرآن، بہترین خطیب اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کا دیوان "فرش پر عرش" ہے۔ یہ ہمیشہ مذہبی، قومی اور علمی خدمات میں مصروف رہتے۔ یہ رمضان المبارک کے علاوہ پورے سال ہندوستان کے طول وعرض میں لوگوں کی رشد وہدایت میں سرگرم رہتے۔ بیرون ممالک میں عراق، فلسطین، سیریا، مصر، ساؤتھ افریقہ، برما، پاکستان اور بنگلہ دیش کا دورہ کرتے تھے۔ ان کی سرپرستی میں متعدد مدارس ومکاتب جاری تھے۔ ان کی دعوت وتبلیغ سے بہت سارے لوگ تائب ہو کر راہ حق پر گامزن ہوئے۔ ان کے مریدین کی تعداد لاکھوں میں ہے۔

ملک العلما مفتی محمد ظفر الدین بہاری (1880ء-1968ء): یہ بہترین مصنف، کہنہ مشق مفتی، لاجواب مناظر، ماہر علم توقیت اور باعمل داعی تھے۔ ان کی مشہور کتابوں میں "صحیح البہاری" اور "حیات اعلی حضرت" ہے۔ بریلی میں پنڈت جوالا پرشاد جو پہلے ہندو تھے پھر عیسائی ہو گئے اور ہر اتوار کو گرجاگھر میں تقریر کرتے تھے اور سامعین کے سوالوں کا جواب تھے۔ ملک العلما ان کی محفل میں جاتے اور اسلام پر ان کے اعتراضات کا جواب دیتے اور ان کے بیان پر سوالات کرتے۔ اسی طرح یہ آریہ سماج کی محفلوں میں بھی جاتے اور سوال جواب کے سیشن میں اسلام کے خلاف وارد اعتراضات کا جواب دیتے تھے۔ اسی طرح ناموس رسالت اور عظمت رسول ﷺ کی حفاظت وصیانت میں سرگرم رہتے۔ انہوں نے عیسائی، آریا سماج، قادیانی، مرجیہ اور اتحاد الوجود وغیرہ سے منسلک افراد سے مناظرے کیے جس کی وجہ سے سینکڑوں راہ حق سے بھٹکے ہوئے لوگ تائب ہوئے۔

مفتی اعظم ہند مولانا مصطفی رضا نوری (1893ء-1981ء): یہ مولانا احمد رضا کے بیٹے ہیں۔ یہ ایک اچھے مصنف، مفتی، فقیہ، محدث، مفسر قرآن، خطیب اور مبلغ تھے۔ "فتاوی مصطفویہ" ان کا مجموعہ فتاوی ہے۔ 1923-1924 میں آریہ سماج اور شردھانند کی شدھی تحریک کی وجہ سے علی گڑھ، متھرا، راجستھان، میرٹھ، بلند شہر اور بھرت پور وغیرہ میں بڑی تیزی سے مسلمان مرتد ہو رہے

تھے۔ انہوں نے وعظ و نصیحت اور تقریر کے ذریعے مسلمانوں کے دلوں میں اسلام اور قرآن کی حقانیت کو جاگزیں کیا اور انہیں ارتداد کا شکار ہونے سے بچایا۔ ان کی کوششوں سے راہ حق سے بھٹکے ہوئے تائبین اور مریدین کی تعداد پانچ لاکھ بتائی جاتی ہے۔

4.8 سنی بریلوی جماعت کے ممتاز ادارے

مسلمانوں کی مذہبی و ملکی سربراہی کے لیے سنی بریلوی جماعت نے مختلف تعلیمی و نشریاتی و رفاہی ادرے قائم کیے جو حسب ذیل ہیں:

ممتاز مدارس اسلامیہ:

منظر اسلام بریلی، مظہر اسلام بریلی، الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور، مدرسہ قادریہ بدایوں، جامعہ نعیمیہ مراد آباد، مدرسہ شمس العلوم گھوسی مئو، دار العلوم امجدیہ گھوسی مئو، دارالعلوم اسحاقیہ جودھ پور، جامع اشرف کچھوچھہ، دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف، جامعۃ الرضا بریلی، دار العلوم امجدیہ کراچی، جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور، جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء نئی دہلی، دارالعلوم امجدیہ ناگپور، جامعہ حمیدیہ رضویہ بنارس، الجامعۃ الاسلامیہ روناہی فیض آباد، دارالعلوم علیمیہ جمدہ شاہی بستی، دارالعلوم محمدیہ بمبئی، فیض العلوم جمشید پور، ضیاء الاسلام ہوڑہ بنگال، دارالعلوم غریب نواز الہ آباد، احسن المدارس کانپور، دارالعلوم وارثیہ لکھنو وغیرہ۔

ان میں بریلوی مسلک کا سب سے بڑا اور مرکزی ادارہ فی الوقت الجامعۃ الاشرفیہ ہے جو ۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء میں مصباح العلوم کے نام سے مبارکپور میں قائم ہوا۔ یہ ادارہ پرائمری، درجہ حفظ و قرأت، درس نظامی اور تخصص فی الفقہ و تقابل ادیان وغیرہ جیسے کئی ایک شعبوں پر مشتمل ہے۔ اس کی اپنی لائبریری، اسکول و کالج و اسپتال ہے۔

اہم نشریاتی و اشاعتی ادارے

اس جماعت کے اہم نشریاتی ادارے ہیں جن میں المجمع الاسلامی مبارکپور، مجلس برکات مبارک پور اور مکتبۃ المدینہ کراچی درسی و غیر درسی کتب کی جدید تحقیق و تخریج اور حواشی کے ساتھ شائع کرنے میں پیش پیش ہے۔ مکتبۃ المدینہ دنیا کی متعدد زبانوں میں عوامی رسائل شائع کرتا ہے۔ ان دونوں کے علاوہ مشہور بریلوی نشریاتی ادارے یہ ہیں: سنی دار الاشاعت مبارکپور، مرکزی مجلس رضا لاہور، رضا اکیڈمی لاہور، رضا اکیڈمی ممبئی، ادارۂ تحققات امام احمد رضا کراچی، ادارۂ معارف نعمانیہ لاہور، مکتبہ نبویہ لاہور، دار القلم دہلی، امام احمد رضا اکیڈمی بریلی، مکتبہ جام نور دہلی، فاروقیہ بک ڈپو دہلی، رضوی کتاب گھر دہلی، مکتبہ نعیمیہ دہلی، خواجہ بک ڈپو دہلی، کتب خانہ امجدیہ دہلی، قادری کتاب گھر بریلی، مکتبہ رحمانیہ رضویہ بریلی۔

مشہور رسائل و مجلات

بریلوی جماعت کی طرف سے نکلنے والے رسالوں کی ایک بڑی تعداد ہے جن میں زیادہ تر اردو زبان میں شائع ہوتے ہیں۔ ان میں چند مشہور رسالے یہ ہیں: ماہنامہ کنز الایمان دہلی، ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور، ماہنامہ جام نور دہلی، ماہنامہ جہان رضا لاہور، ماہنامہ سنی دنیا بریلی، ماہنامہ اعلی حضرت بریلی، ماہنامہ طیبہ احمد آباد، ماہنامہ یس کوٹہ، ماہنامہ صراط مستقیم اودے پور، ماہنامہ طیبہ جودھ پور، سالنامہ معارف رضا کراچی، ماہنامہ ضیائے حرم لاہور، ماہنامہ بطحا حیدرآباد، ماہنامہ سنی دعوت اسلامی بمبئی، سالنامہ اہل سنت کی آواز مارہرہ، ماہنامہ خضر راہ اردو

وہندی وسالنامہ الاحسان اردو و عربی کوشامبی یوپی، سالنامہ کاروان رئیس القلم دہلی۔

قابل ذکر دینی ورفاہی تنظیمیں

علمی، سماجی، رفاہی اور دینی و دنیوی خدمات انجام دینے والی بریلوی تنظیموں میں جماعت رضائے مصطفی بریلی، سنی دعوت اسلامی ممبئی، مجمع مدینۃ الاسلامی کرناٹک، ورلڈ اسلامک مشن مانچسٹر انگلینڈ قابل ذکر ہیں۔

4.9 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- برصغیر پاک وہند میں حنفی اہل سنت والجماعت کی ایک جماعت سنی بریلوی جماعت ہے۔
- مولانا احمد رضا خان 14 جون 1856ء کو اتر پردیش کے شہر بریلی میں پیدا ہوئے۔ اور 1921ء میں آپ کا انتقال ہوا۔
- مولانا احمد رضا کو کئی علوم وفنون میں تبحر حاصل تھا۔ انہوں نے قرآن کریم کا اردو ترجمہ کنزالایمان فی ترجمۃ القران کے نام سے کیا۔
- فقہ حنفی اور اس کی جزئیات پر مولانا احمد رضا خان کو جو عبور حاصل تھا، اس کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔ ان کا مجموعہ فتاوی ”فتاوی رضویہ“ ایک اہم شاہکار ہے۔
- سنی بریلوی جماعت کے نظریات بعض چیزوں میں علمائے دیوبند اور علمائے اہل حدیث سے مختلف ہیں۔ مثلاً ”نظریہ نور و بشر“ بریلوی مسلک کے حامل افراد رسول اللہ ﷺ کی جسمانیت ونورانیت دونوں کے قائل ہیں۔
- مولانا احمد رضا کا مجموعہ فتاوی ”العطایا النبویۃ فی الفتاوی الرضویہ“ اور مفتی امجد علی اعظمی کی ”بہار شریعت“ فقہ حنفی کی انسائکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔
- پیر محمد کرم شاہ الازہری کی سیرت نبوی پر لکھی ہوئی دلنشیں کتاب ”ضیاء النبی“، اور تفسیر کے موضوع پر تصنیف کردہ ”تفسیر ضیاء القرآن“ بھی بڑی شہرت کی حامل ہیں۔
- مجلس برکات مبارک پور، المجمع الاسلامی مبارکپور اور مکتبۃ المدینہ کراچی درسی وغیر درسی کتب کی جدید تحقیق وتخریج اور حواشی کے ساتھ شائع کرنے میں پیش پیش ہے۔

4.10 نمونہ امتحانی سوالات

4.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. مولانا احمد رضا کی ولادت کس سن عیسوی میں ہوئی؟

(a). 1888ء   (b). 1877ء   (c). 1856ء   (d). 1857

2. امام احمد رضا کس شہر میں پیدا ہوئے؟

(a). بدایوں (b). میرٹھ (c). دہلی (d). بریلی

3. امام احمد رضا کا سن وفات کیا ہے؟

(a).1920 (b).1921 (c).1924 (d).1925

4. کتاب "دوام العیش فی ائمۃ من قریش" امام احمد رضا کی کس فکر کو بیان کرتی ہے؟

(a). سیاسی (b). سماجی (c). اصلاحی (d). علمی

5. بریلوی مکتب فکر کے مطابق حضور ﷺ کا علم غیب کیسا ہے؟

(a). ذاتی (b). عطائی (c). دونوں (d). ان میں سے کوئی نہیں

6. بریلوی مکتب فکر تقدیس شان الوہیت کو کیا قرار دیتے ہیں؟

(a). ایمان کا مدار (b). کفر کا مدار (c). دونوں (d). ان میں سے کچھ بھی نہیں

7. بزرگان دین کے مزارات کی زیارت اور عروس کا انعقاد سنی بریلوی جماعت کے نزدیک کیا ہے؟

(a). فرض (b). واجب (c). سنت (d). باعث اجر وثواب

8. بہار شریعت کس کی تصنیف ہے؟

(a). پیر کرم شاہ ازہری (b). مفتی امجد علی (c). مولانا احمد رضا (d). علامہ ارشد القادری

9. بریلوی مسلک کا سب سے بڑا مدرسہ کون سا ہے؟

(a) جامعہ اشرفیہ مبارک (b) جامعہ نعیمیہ مراد آباد (c) دارالعلوم امجدیہ ناگپور (d) جامعہ حمیدیہ رضویہ بنارس

10. تفسیر ضیاء القران کس کی تصنیف ہے؟

(a) مولانا محمد اختر رضا قادری ازہری (b) علامہ ارشد القادری (c) پیر کرم شاہ ازہری (d) مولانا ضیاء المصطفی قادری

4.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. ہندوستان میں فرقہ بندی کی شروعات کیسے ہوئی؟
2. کن مسائل کی وجہ سے سنی علما کا اختلاف شروع ہوا؟
3. کیا شاہ ولی اللہ دہلوی تمام سنی فرقوں میں مرکزی مقام رکھتے ہیں؟
4. فقہ میں مولانا احمد رضا کا علمی مقام بیان کیجیے۔
5. نظریہ نور وبشر واضح کیجیے۔

4.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. بریلوی جماعت کے نظریات کو تفصیل سے قلم بند کیجیے۔
2. مولانا احمد رضا کی سوانح حیات پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔
3. کتاب حسام الحرمین کا تفصیلی جائزہ پیش کیجیے۔

4.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.	تعارف اہل سنت	:	یسین اختر مصباحی
2.	عقائد اہل سنت	:	مولانا محمد عبد الحامد قادری بدایونی
3.	عقائد اہل سنت	:	مولانا منور حسین عثمانی رضوی
4.	حیات امام اہل سنت	:	پروفیسر محمد مسعود احمد
5.	مطالعہ بریلویت	:	ڈاکٹر خالد محمود

6. امام احمد رضا نمبر، ماہ نامہ "المیزان" بمبئی، 1976ء

اکائی 5: وہابی تحریک

اکائی کے اجزا:

5.0 تمہید

5.1 مقصد

5.2 وہابی تحریک کا پس منظر

5.3 بانی تحریک

5.3.1 دعوت و تبلیغ

5.3.2 1744ء میں عینیہ آمد

5.3.3 درعیہ آمد

5.3.4 تبلیغ عام

5.3.5 وفات اور دعوت کا اثر

5.3.6 تصنیفات

5.4 وہابی تحریک

5.5 کلیدی الفاظ

5.6 اکتسابی نتائج

5.7 نمونہ امتحانی سوالات

5.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

5.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

5.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

5.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

5.0 تمہید

وہابی تحریک کی شروعات سعودیہ عرب میں ہوئی۔ اس تحریک کے بانی محمد بن عبدالوہاب ہیں۔ جنہوں نے 18ویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں اپنی تعلیمات کی ابتدا کی۔ ان کی تعلیمات کا مرکز توحید ہے اور وہ اسلامی تصور کو پاک وصاف کرنے اور اسلامی تعلیمات کو شریعت کی روح کے مطابق عمل پیرا ہونے کی بات کرتے ہیں۔ آپ جب عرب میں پیدا ہوئے اس وقت عرب کی مذہبی اور سیاسی حالات دونوں ابتر تھے۔ خانہ جنگی اور بدحالی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ محمد بن عبدالوہاب نے اپنی تعلیمات سے لوگوں کو متاثر کیا اور اس تحریک سے لوگ وابستہ ہوئے اور آپ کی تحریک نے مسلمانوں کی سیاسی، مذہبی وسماجی زندگی پر بھی اثرات مرتب کیے۔ اس تحریک کے عالم اسلام کے خطوں میں ان کی پیروکاروں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ وہابی تحریک سعودی اور خلیجی ممالک کی سیاست میں اپنا اثر رکھتی ہے۔ بظاہر یہ تحریک مذہبی ہے لیکن روز اول سے ان جگہوں کی سیاست سے گہرا تعلق رہا ہے۔

5.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ عالم اسلام کی مشہور تحریک وہابی سے روشناس ہو سکیں۔ اس اکائی میں آپ وہابی تحریک کا پس منظر، بانی تحریک، دعوت کی شروعات، تصنیفات اور وہابی تحریک کے بارے میں جانیں گے۔

5.2 وہابی تحریک کا پس منظر

شیخ محمد بن عبدالوہاب جب نجد میں پیدا ہوئے تو اس وقت نجد میں کوئی متحدہ حکومت نہیں تھی بلکہ یہ علاقہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا اور خود مختار ریاستوں والا رہا۔ ہر ریاست ایک دوسرے سے آزاد تھی۔ عینیہ کا خاندان معمر کے ہاتھوں میں تھا، درعیہ آل سعود کے پاس، ریاض آل دواس اور حائل آل علی کے ماتحت وغیرہ۔ ان آزاد حکومتوں میں وقتاً فوقتاً ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کے لیے لڑائی جھگڑے اور جنگیں بھی ہوتی رہتی تھی۔ مذہبی واخلاقی حالتوں کا معائنہ کریں تو وہ بھی بہت بہتر نہ تھی بلکہ اس میدان میں بھی مسلمان حد درجہ گمراہی میں مبتلا تھے۔ امریکی مصنف اسٹاڈرڈ نے اپنی کتاب "The New World of Islam" میں اس کی عکاسی کی ہے:

"مذہب بھی دیگر امور کی طرح پستی میں تھا۔ تصوف کے طفلانہ توہمات کی کثرت نے خالص اسلامی توحید کو ڈھک لیا تھا۔ مسجدیں ویران اور سنسان پڑی تھیں۔ جاہل عوام ان سے بھاگتے تھے اور تعویذ گنڈے اور مالا میں پھنس کر گندے فقیروں اور دیوانے درویشوں پر اعتقاد رکھتے اور بزرگوں کے مزاروں پر زیارت کو جاتے، جن کی پرستش بارگاہ ایزدی کے شفیع اور ولی کے طور کی جاتی تھی، کیوں کہ ان جاہلوں کا خیال تھا کہ خدا کی برتری کے باعث وہ اس کی طاقت بلاواسطہ ادا نہیں کرسکتے۔ قرآن کریم کی تعلیم نہ صرف پس پشت ڈال دی گئی تھی بلکہ اس کی خلاف ورزی بھی کی جاتی تھی۔۔ یہاں تک کہ مکہ ومدینہ بداعمالیوں کا مرکز بن گیے تھے اور حج جس کو رسول اللہ نے فرائض

میں داخل کیا تھا بدعات کی وجہ سے حقیر ہو گیا تھا۔ فی الجملہ اسلام کی جان نکل چکی تھی۔۔۔۔ اگر محمد ﷺ پھر دنیا میں تشریف لائیں تو وہ اپنے ماننے والوں کے ارتداد اور بت پرستی پر بے زاری کا اظہار فرماتے۔"

بارہویں صدی کے ابتدائی دور میں اسلامی دنیا اور مقامات مقدسہ کا جو حال تھا اس اقتباس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ جزیرۃ العرب کے دل نجد کی حالت اور بدتر تھی، ان کی اخلاقی حالت بھی خستہ تھی، اچھائی اور برائی کا کوئی اصول باقی نہیں تھا۔ شرکیہ عقائد اس طرح دلوں میں رچ بس چکے تھے کہ اچھی خاصی تعداد ان برائیوں کو دین کا صحیح طریقہ تصور کرتی اور اس پر عمل کرتی تھی۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب نے مشاہدہ کیا کہ اہل نجد کی حالت ایسی تھی کہ شاید ہی کوئی غیرت مند مسلمان اس کو پسند کرتا۔ ان کے اندر کئی برائیاں پھیل چکی تھی مثلاً درختوں، پتھروں، غاروں اور قبوں کی عبادت کی جاتی تھی۔ ساحروں اور کاہنوں کا جلوہ تھا ہر معاملے میں ان سے رائے لی جاتی اور ان کا قول حتمی ہوتا۔ غرض حرمین شریفین کی بھی یہی حالت تھی۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب نے جب ہوش سنبھالا اور اپنے اطراف کا جائزہ لیا تو صورت حال دیکھ کر بے چین ہو گیے۔ تعلیمی سفر مکمل کرنے کے بعد آپ اس صورت حال کو بدلنے کے لیے فکر مند ہوئے۔ آپ نے اعلائے کلمۃ اللہ، تبلیغ دین، اشاعت توحید و سنت اور اللہ کی راہ جہاد کے لیے کمر بستہ ہو گیے اور اس مشکل سفر میں آپ کو وہ ساری تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں اور ان ساری آزمائشیں کا سامنا کرنا پڑا جو اہل حق کو کرنا پڑتا ہے۔ آپ نے ان تمام آزمائشوں میں اصحاب تجدید دین کے طرز پر صبر کا مظاہرہ کیا۔ آپ نے درعیہ میں اپنی دعوت کا مرکز بنایا۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب ہی تھے جنہوں نے اس تاریکی بھرے دور میں حق کی روشنی جلائی اور سرزمین نجد کے لوگوں کی زندگی و عقائد اور اخلاقی صورت میں غیر معمولی انقلاب برپا کر دیا۔ آپ نے مسلمانوں کی شان و شوکت لوٹانے کے لیے دن رات ایک کر دیا۔ حجاز کے سعودی خاندان کو حکومت کی ذمہ داری بتائی۔

5.3 بانی تحریک

محمد بن عبدالوہاب 1703ء میں شہر عینیہ کے قبیلہ بنو تمیم میں پیدا ہوئے۔ آپ کے خاندان کو اس علاقے میں مقبولیت حاصل تھی کیوں کہ علماء وصلحاء کا خاندان شمار کیا جاتا تھا۔ آپ کے دادا سلیمان بن علی اس علاقے کے بڑے عالم شمار کیے جاتے تھے اور عینیہ شہر کے قضاۃ کی ذمہ داری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ عینیہ کی عوام یا علما کے درمیان کسی مسئلے پر اختلاف ہوتا تو لوگ انہی کے پاس آتے۔ آپ کے والد عبدالوہاب بھی شہر عینیہ اور حریملا کے قاضی رہے۔ فقہ کے بڑے ماہرین میں آپ کا شمار ہوتا ہے فقہ کے مختلف مسائل پر کتابیں بھی لکھیں۔ لیکن ان کو وہ شہرت نہ حاصل ہو سکی جو ان کے والد کو حاصل تھی۔ شیخ محمد نے دس سال کی عمر میں پورا قرآن حفظ کر لیا۔ اپنے والد کے ساتھ آپ بھی مطالعہ کرتے رہتے۔ آپ کی ذہانت کے قائل والد محترم بھی تھے۔ اپنے والد سے ہی فقہ حنبلی کی تعلیم مکمل کی اور اس کے علاوہ تفسیر، حدیث اور فقہ کی کتابوں کا بھی علم حاصل کیا۔ امام ابن تیمیہ اور ابن القیم کی کتابوں نے آپ کو کافی متاثر کیا۔ بلوغت کے بعد حج کی سعادت حاصل کی اور حرم شریف کے بعض شیوخ سے استفادہ کیا۔ پھر مدینہ میں آپ کو علمی ماحول دستیاب ہوا تو وہاں ٹھہرے اور

علمی پیاس بجھائی۔ مدینہ میں پوری دنیا کے طلبا استفادہ کے لیے آتے تھے اس لیے اس کا علمی ماحول عینیہ سے مختلف تھا اور مدینہ میں فقہی مسائل کے علاوہ دیگر اسلامی علوم کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ مزید تعلیم کے حصول کے لیے آپ نے بصرہ کا ارادہ کیا اور شیخ محمد المجموعی سے فقہ وحدیث کا درس حاصل کیا۔

5.3.1 دعوت و تبلیغ

شیخ محمد بن عبدالوہاب بچپن سے ہی بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو کی طرف راغب تھے۔ جب وہ اپنے شہر عینیہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے تو وہ اعمال ان کی نظروں میں کھٹکنے لگتا جو دین کے اصول کے خلاف ہوتا۔ آپ اس برائی کو روکنے کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ مدینہ میں جب علم حاصل کیا اور چاروں طرف نظر گھمائی تو پوری دنیا انہیں گمراہی کی طرف گامزن دکھائی دی۔ سب سے پہلے آپ نے "استغاثہ" کے خلاف علم بلند کیا۔ بصرہ میں پہنچے تو وہاں کے لوگوں کو بھی ان برائیوں میں ملوث پایا تو آپ نے بلا خوف و خطر اس برائی کے خاتمے کی کوششیں کرنے لگے۔ اس سلسلے میں وہاں کے علمائے کرام سے مباحثے اور مناقشے بھی ہوئے۔ بصرہ کے علما ان کے خلاف سینہ سپر ہو گیے۔ ان کو اور ان کے شیخ محمد مجموع کو بھی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کیوں کہ شیخ مجموع کی پشت پناہی آپ کے کاموں کو حاصل تھی۔ غرض مخالفین کی تعداد موافقین سے زیادہ ہو گئی اور مخالفت اتنی بڑھی کہ بصرہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے آپ نے بصرہ چھوڑ کر شام جانے کا ارادہ کیا لیکن اخراجات کی قلت کے سبب زبیر کے لیے نکل گیے۔ دوران سفر آپ پیاس کی شدت سے بے حال ہو گیے تو ایک شخص ابو حمیدان نامی نے آپ کو پانی پلایا اور منزل مقام تک پہنچایا۔ وہاں سے احساء کا رخ کیا اور علمائے کرام سے ملاقات کر کے آپ نے حریملا کا رخ کیا جہاں آپ کے والد منتقل ہو چکے تھے۔

یہ سب دعوت کی ابتدائی اور تمہیدی کوششیں تھیں۔ حریملا آنے کے بعد آپ نے بدعات کا خاتمہ اور توحید کی تعلیم کو عام کرنے کا ارادہ کیا۔ دعوت کی بنیاد توحید پر رکھی اور ساری عبادتوں کو صرف اللہ کی ذات سے مخصوص کرنے پر زور دیا۔ آپ نے مسجد میں درس دینا شروع کیا اور دن بہ دن لوگ آپ کی تعلیمات سے متاثر ہونے لگے۔ آپ نے چوری، ڈاکہ زانی، مکاری اور لوٹ مار جیسی بری عادتوں کو چھڑوانا اور ان میں سچائی و ہمدردی پیدا کرنا تھا۔ غرض اخلاقی گراوٹ جو لوگوں کے دلوں کو اسلامی تعلیمات سے منحرف کر چکی تھی اس کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔ مشرکانہ طور طریقے اور آبائی رسم ورواج کی اصلاح ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ اس راہ میں شیخ محمد کو تکلیفوں کا بھی سامنا کرنا پڑا لیکن ان مصیبتوں کو آپ نے خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا۔ توحید کی دعوت دی، غیر اللہ کے آگے سر جھکانے اور قبروں کی زیارت میں مسنون جو طریقہ تھا اس کے خلاف جو عمل لوگوں نے شروع کر لیے تھے ان کو مٹانے کے لیے عملی اقدام شروع کیے تو پھر دوست، اعزا و اقربا سب جان کے دشمن بن گیے۔ خود والد محترم نے بھی اس عمل کو ناپسند فرمایا۔ آپ نے باپ کے ادب اور بحیثیت استاد ان کے احترام کو ملحوظ رکھا لیکن جو قدم آگے بڑھا چکے تھے اسے پیچھے نہ ہٹایا۔ تمام مشکلات کے باوجود آپ نے اپنی دعوتی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری وساری رکھا اور حریملا، عینیہ، درعیہ اور ریاض وغیرہ کے علاقوں میں آپ کی شہرت پھیل چکی تھی۔ والد محترم جب تک باحیات رہے ان کے رتبے کا پاس ولحاظ رکھتے ہوئے دعوتی سرگرمیوں کی رفتار مدھم ہی رہی۔ لیکن 1740ء میں والد کی وفات کے بعد اس دعوت کے

مشن میں پوری طرح لگ گیے اور کھلم کھلا دعوت دینی شروع کی۔ سنت اور بدعات کو چھوڑنے کا درس دینے لگے جس سے حریملا کے چند افراد متاثر ہوئے اور آپ کے مشن کے معاون بن گیے۔ آپ کی مشہور تالیف "کتاب التوحید" اسی دوران تالیف ہوئی۔

5.3.2 1744ء میں عینیہ آمد

عینیہ منتقل ہونے کے فیصلے کے پیچھے کئی وجوہات تھیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ وہاں کے امیر آپ کی دعوت و تبلیغ سے پہلے سے ہی متاثر تھے اور ان کی حمایت آپ کی دعوت کے لیے مددگار ثابت ہو سکتی تھی۔ دوسرے یہ کہ حریملا میں دو خاندان سرداری کے لیے آپس میں الجھے ہوئے تھے۔ شیخ محمد کا یہ ماننا تھا کہ بغیر کسی امیر کی حمایت کے دعوت کو دور تک لے جانا آسان نہیں۔ اسی مناسبت سے آپ نے امیر عثمان بن معمر جو عینیہ کے امیر تھے ان سے خط و کتابت کی اور امیر کو اپنے ہم خیال پایا تو آپ نے وہاں منتقل ہو جانا مناسب سمجھا۔ شیخ کی آمد پر امیر عینیہ نے خوش آمدید کہا اور ان کو سر آنکھوں پر بٹھایا اور فرمایا کہ آپ دعوت و تبلیغ میں مشغول ہو جائیں ہم آپ کے ساتھ ہیں اور ہر طریقے سے آپ کی مدد کریں گے۔ آپ نے امیر عینیہ اور عوام کے سامنے توحید کا مفہوم واضح کیا، اس دعوتی مہم میں ان لوگوں سے امداد و تعاون کی درخواست کی۔ انہی کی مدد سے آپ نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی دعوت پورے زور و شور سے شروع کر دی۔ دھیرے دھیرے عینیہ کے لوگ جڑنے لگے۔ اس دور میں شیخ بدعات کے بعض اڈوں کو اکھاڑ پھینکنے کا ذمہ لیا جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ اس علاقے میں بعض پیڑوں کو عزت و عظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا، اس کے علاوہ زید بن خطاب (جو جنگ یمامہ میں شہید ہوئے تھے) کے نام سے موسوم ایک قبر تھی اس کا خاتمہ کیا۔ شیخ محمد نے امیر عینیہ کو باجماعت نماز قائم کرنے کی تاکید کی اور چھوڑنے والوں کی سزائیں تجویز کی، شیخ کی آمد سے پہلے یہاں کے حکام طرح طرح کے ٹیکس حاصل کرتے تھے شیخ نے سب کو بند کروادیا اور زکوۃ کا نفاذ کروایا۔ امیر عثمان زیادہ دنوں تک اپنے قول پر قائم نہ رہ سکا جس کی وجہ سے شیخ کو بعد میں درعیہ منتقل ہونا پڑا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ عینیہ میں آپ کا قافلہ دن بہ دن بڑھتا جارہا تھا کہ ایک واقعہ ہوا جس نے عینیہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ "ایک عورت شادی شدہ گناہ کی مرتکب ہوئی اور اس نے شیخ کے سامنے گناہ کا اعتراف بھی کر لیا۔ بار بار جرح کرنے پر بھی وہ اپنے اقرار سے نہ پھری۔ مجبوراً شیخ نے سنگ باری کا حکم دیا۔ عثمان بن معمر نے مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ یہ فرائض انجام دیے، سب سے پہلا شخص جس کا ہاتھ پتھر کی طرف بڑھا وہ عثمان تھا۔" (محمد بن عبد الوہاب، ایک مظلوم اور بدنام مصلح، مسعود عالم ندوی، ص38)

یہ خبر پورے علاقے میں پھیل گئی تو ان لوگوں کو زیادہ پریشانی ہوئی جو اس طرح کی برائیوں میں ملوث تھے۔ یہ لوگ حاکم احسا وقطیف سلیمان بن محمد عزیز الحمیدی کے پاس پہنچے اور اسے شیخ کے خلاف آمادہ کیا۔ کیوں کہ وہ بذات خود ان برائیوں میں شریک تھا۔ رجم کے واقعے سے اس کا پریشان ہونا بنتا بھی تھا۔ لوگوں نے یہ بھی کہا کہ یہ شخص تمہاری آزادی میں رکاوٹ بننا چاہتا ہے۔ اس نے فوراً امیر عینیہ عثمان بن معمر کو دھمکی بھرا خط لکھا۔ اس شخص کی کارکردگی ایسی ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے ورنہ تم کو جو کچھ ملتا ہے وہ روک دیا جائے گا۔ یہ رقم اتنی زیادہ تھی کہ امیر عینیہ شش و پنج میں مبتلا ہو گیا اور دنیا کی دولت توحید کی دولت پر حاوی ہو گئی۔ اس نے یہ ساری باتیں شیخ کے گوش گزار کیں تو شیخ نے اس کو سمجھایا اور وہ راضی ہو گیا لیکن دوسری بار شیخ کو اس نے اپنے علاقے سے نکل جانے کے لیے کہا تو شیخ عینیہ سے نکل

کر درعیہ کا رخ کیا۔

5.3.3 درعیہ آمد

درعیہ میں آپ نے عبداللہ بن عبدالرحمن بن سویلم العزینی کے گھر پر قیام کیا، پھر ایک شاگرد احمد بن سویلم کے گھر منتقل ہو گیے۔ امیر درعیہ محمد بن سعود کو خبر ملتے ہی اپنے بھائیوں کے ساتھ حاضر ہوا اور ان کو مدد کی یقین دہانی کرائی۔ شیخ نے اس کے جواب میں اپنی دعوت پر روشنی ڈالی اور اصلاح کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ امیر محمد بن سعود پر آپ کی دعوت اثر کر گئی اور بے ساختہ بول اٹھا:

"اے شیخ! یہ تو بلا شبہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا دین ہے۔ میں آپ کی امداد واطاعت اور مخالفین توحید سے جہاد کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن میری دو شرطیں ہیں:

1. اگر ہم نے آپ کی مدد کی اور اللہ نے ہمیں فتح دی تو آپ ہمارا ساتھ نہ چھوڑیں۔
2. اہل درعیہ سے فصل کے وقت میں کچھ مقررہ محصول لیتا ہوں آپ مجھے اس سے نہ روکیں۔

شیخ نے جواب دیا: "پہلی شرط بسر وچشم منظور ہے، ہاتھ لاؤ۔ دوسری شرط تو ان شاء اللہ تمہیں فتوحات اور غنیمتوں میں اتنا کچھ مل جائے گا کہ اس خراج کا خیال بھی دل میں نہ آئے گا۔" (ایضاً ص 42)

امیر درعیہ نے بھی ان شرطوں پر رضامندی ظاہر کی اور شیخ کے ہاتھوں بیعت کی۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا وعدہ کیا۔ قرآن اور نبی کریم ﷺ کی سنت پر چلنے کا ارادہ کیا۔ امیر کے بیعت کرنے سے سماج پر اس کا کافی اثر پڑا اور لوگ آپ کی دعوت میں شامل ہونے لگے۔ عینیہ کے لوگ جو شیخ کی تعلیمات سے متاثر ہو چکے تھے وہ بھی درعیہ منتقل ہو گیے۔ امیر درعیہ کی بیعت کی وجہ سے دعوت کے لیے ہموار زمین تیار ہو گئی۔ امیر درعیہ کے تین بھائیوں نے بھی اس تبلیغ میں شامل ہوئے اور پوری امداد کا وعدہ کیا۔ شیخ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھ امیر عینیہ کو افسوس ہونے لگا تو وہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی مانگی اور واپس عینیہ چلنے کی گزارش کی۔ شیخ نے جواب میں کہا کہ "اب یہ امیر ابن سعود کے اختیار میں ہے، ان کی اجازت ہو تو میں تیار ہوں، ورنہ انہیں چھوڑ کر اب کسی دوسرے کی رفاقت منظور نہیں۔" (ایضاً ص 44) اس جواب کو سن کر امیر عینیہ نے خود امیر سعود سے ملاقات کر کے شیخ کو لے جانے کی اجازت مانگی، لیکن امیر سعود کسی قیمت پر ان کو دور کرنے کے لیے راضی نہ ہوئے۔

شیخ کی آمد سے پہلے درعیہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، جہاں کتاب وسنت کی تعلیمات کو بھلا کر عبادت کے نت نئے طریقے اختراع کر لیے گیے تھے۔ شیخ نے وعظ ودروس کا اہتمام کیا اور صبح سے شام تک کتاب وسنت کی تعلیمات عام کرتے رہے۔ شیخ اپنی دعوت میں توحید و اخلاص کی ضروری باتیں یاد کروانے کی کوشش کرتے۔ شیخ کی دعوت کا اثر بہت جلدی لوگوں پر ہونے لگا اور وعظ وتذکیر کا یہ فائدہ ہوا کہ رسم ورواج کو لوگ قرآن وحدیث کی روشنی میں دیکھنے لگے۔ غرض دور دور سے لوگ اس دعوت میں شامل ہونے لگے۔ درعیہ کے لوگ تو پہلے ہی دن سے آپ پر سب کچھ نچھاور کر چکے تھے لیکن شیخ نے اپنی دعوت کو وسعت دی۔ نجد کے مختلف گوشوں اور ان علاقوں کے امراء کو دعوت دی۔ اس امر میں مخالفت بھی ہوئی لیکن دھیرے دھیرے اس کے اثرات نظر آنے لگے۔ درعیہ میں آنے کے دوسرے سال ہی امیر

عینیہ نے آکر بیعت کی اور حریملا کے لوگ بھی آپ کی دعوت سے متاثر ہوئے۔امیر درعیہ کی مدد کا یہ حال تھا کہ خمس اور زکوۃ کی جو بھی رقمیں آتیں ان کو شیخ کے ہاتھوں میں دے دیا جاتا۔ جس کو شیخ بلاجھجک اللہ کی راہ میں خرچ کرتے۔ ریاض کے فتح ہونے تک شیخ نے بیت المال اور دیگر امور میں دلچسپی دکھائی تھی لیکن جب ان کی دعوت کو ایک مقام حاصل ہو گیا تو انہوں نے امیر عبدالعزیز کو حکومت کا کلی طور پر مالک بنا کر اپنے آپ کو الگ کر لیا۔ اپنی پوری توجہ تعلیم و تدریس پر لگادی حالانکہ امیر عبدالعزیز ہر کام میں شیخ سے مشورہ کرتے اور ان کی رائے کا احترام کرتے۔

5.3.4 تبلیغ عام

جب درعیہ اور آس پاس کے علاقوں میں آپ کی دعوت کا چرچا ہر سو ہو گیا تو لوگ جوق درجوق آپ کی دعوت سے استفادہ کرنے لگے۔ اب تک شیخ کی دعوت نجد کے علاقوں تک محدود رہی اور یہ دعوت تو سبھی لوگوں کے لیے تھی، اصلاح کی شروعات آپ نے اپنے گھر سے ہی کی تھی اور عینیہ، حریملا اور درعیہ دعوت کے مرکز بنے۔ شیخ نے اپنی دعوت کا حلقہ وسیع کیا اور دوسرے شہروں کے علماء اور قاضیوں کے پاس تبلیغی خطوط روانہ کیے۔ چنندہ لوگوں نے ہی شروع میں اس دعوت کو قبول کیا باقی لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا۔ شیخ کے بھائی سلیمان بن عبدالوہاب جو اپنے والد کی جگہ پر حریملا میں قاضی تھے، شروعاتی دور میں انہوں نے بھی مخالفت کی اور ان کے رد میں رسالے بھی لکھے۔ حالانکہ بعد میں انہوں نے رجوع کر کے بیعت کی۔ شیخ کے تبلیغی رسالے اور ہدایت نامے چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ جیسے جیسے شیخ کی دعوت کو قبولیت حاصل ہوتی رہی، اسی طرح امیر بن سعود کا سیاسی قد بھی بڑھتا رہا۔ اہل نجد اور شیخ کی طاقت میں اضافہ دیکھ کر لوگوں نے الزامات لگانا شروع کیے لیکن آپ نے ان تمام طاقتوں کا جواب بڑی خوش اسلوبی سے دیا۔ ان سب کے باوجود شیخ کی دعوت کے دائرے میں اضافہ ہوتا رہا اور یہ دعوت درعیہ سے نکل کر تمام علاقوں میں پھیل گئی۔

5.3.5 وفات اور دعوت کا اثر

پچاس سال دعوتی کوشش کے بعد 1792ء میں شیخ محمد کی وفات ہوئی۔ آپ کی پوری زندگی دعوت و تبلیغ، جدوجہد اور رسول اللہ کی شریعت کی طرف رہنمائی میں گزری۔ آپ کی ہی کوششوں سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ماحول قائم ہوا۔ عوام آباءواجداد کی اندھی اتباع کو چھوڑ کر راہ حق کی طرف واپس آئے۔ مساجد پھر سے آباد ہو گئیں، گاؤں اور محلوں میں امن وسکون قائم ہو گیا اور لوگوں نے غلط عادتوں کو ترک کر دیا۔ شیخ نے صحرا اور دیہاتوں میں بھی اپنے مبلغین بھیجے اور پورے نجد کی صورتحال تبدیل ہو گئی۔ آپ کی وفات کے بعد ان کے بیٹوں اور شاگردوں نے اس تحریک کو آگے بڑھایا۔ شیخ کی وفات کے بعد دونوں خاندان کے لوگوں نے اس بات پر معاہدہ کیا کہ وہ اس بات کے پابند رہیں گے جو ان کے بزرگوں کے درمیان ہوا۔ اس وقت سے آج تک سعودی حکومت اور وہابی تحریک دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ وہابی تحریک کو سیاسی قوت کے ذریعہ محمد بن سعود آگے بڑھائیں گے اور ضرورت پڑے تو فوجی طاقت کا استعمال کرنے سے اجتناب نہیں کریں گے۔ اس کے عوض میں محمد بن عبدالوہاب نہ صرف ان کو مذہبی قدر و منزلت دلائیں گے بلکہ اپنی دعوت سے ان کی توسیع حکومت میں بھی ان کے حامی ہوں گے۔

5.3.6 تصنیفات

شیخ کی کتابوں میں سب سے زیادہ شہرت "کتاب التوحید" کو حاصل ہے۔ اس کتاب کا پورا نام "کتاب التوحید الذی هو حق الله علی العباد" ہے۔ اس میں صاحب مصنف نے توحید کی حقیقت، اس کے حدود، شرک اور اس کی برائیاں اور اس مصیبت کے تمام راستوں کو واضح کر دیا ہے۔ ہر باب میں قرآن وحدیث سی مثالیں پیش کی ہیں۔ اس کتاب کے کئی زبانوں میں ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔ اس کی کئی ساری شرحیں بھی لکھی گئی۔ دوسری کتاب "کشف الشبہات من التوحید" یہ کتاب التوحید کا ہی حصہ ہے۔ اصول الایمان: ایمان کے مختلف ابواب کی احادیث سے تشریح کی گئی ہے۔ کتاب فضل الاسلام: اسلام کے شرائط کی توضیح کے ساتھ ساتھ بدعت و شرک کی برائیاں واضح کی ہیں۔ ستته مواضع من السیرة: سیرت طیبہ کے چھ مقامات کی توضیح اور ان کے نکات پر ایک چھوٹا سا رسالہ ہے۔ مسائل الجاہلیۃ: اس رسالے میں شیخ الاسلام نے ایسے ایک سو اکتیس مسئلے بیان کیے ہیں۔ جن میں رسول ﷺ نے اہل جاہلیت اور ان کے معتقدات کی مخالفت کی ہے۔ کتاب السیرۃ: یہ سیرت ابن ہشام کا خلاصہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی آپ کی کتابیں اور رسالے ہیں۔

5.4 وہابی تحریک

شیخ محمد بن عبد الوہاب کی دعوت جسے عرف عام میں وہابیت کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ یہ لوگ کتاب وسنت کی صحیح تعلیمات کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن سیاسی وجوہات کی بنا پر اس گروپ کو وہابیت کے نام سے موسوم کیا گیا اور ان کو اس طرح سے دکھایا گیا کہ گویا اسلام کے علاوہ کوئی نئی چیز پیش کر رہے ہوں۔ وہابیت لفظ کا استعمال زیادہ تر ان کے مخالفین کرتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی جب سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی نے اپنی تحریک شروع کی تو اس تحریک کو بھی وہابیت کے نام سے موسوم کر دیا گیا۔

فقہی مسالک کا جائزہ لیں تو شیخ محمد بن عبد الوہاب اور ان کے ہمنوا عقائد و اعمال میں سلف کی پیروی کرتے ہیں اور مسلک کے اعتبار سے امام احمد بن حنبل کی اتباع کرتے ہیں۔ حنبلی مسلک کے خلاف بھی کوئی حدیث مل جائے تو اس کو قبول کرنے میں ذرا بھی نہیں جھجکتے اور کسی کو حنبلی مسلک کو ماننے کے لیے مجبور نہیں کرتے بلکہ اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ حنفی اور شافعی رہتے ہوئے بھی بدعات اور بے ہودہ رسموں کو ختم کریں۔ عقائد کی بابت وہ سلف کے مسلک پر ہیں۔ شیخ نے اپنے وعظ اور کتابوں میں توحید پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ آپ نے علی الاعلان توحید کی دعوت دی اور شرک جیسی برائیوں سے متنبہ کیا۔ اب ہم شیخ کی رائے اور عقیدہ میں توحید سے دوری اور شرک سے قریب کرنے والی باتوں کا جائزہ لیں گے۔

1. مصیبتوں میں غیر اللہ کو پکارنا یا اللہ کے ساتھ غیر کو بھی پکارنا
2. استغاثہ: یعنی غیر اللہ سے فریاد چاہنا۔
3. توسل: یہ تین معنوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ الف۔ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا وسیلہ تو فرض ہے۔ ب۔ نبی کریم ﷺ کی دعا اور شفاعت کو وسیلہ بنانا۔ ج۔ وہ توسل جس میں اللہ کو انبیا و صالحین کی ذات کا واسطہ دلایا جاتا ہے۔

4. استغاذہ: توحید کا اقتضا یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ، اس کے اسماء اور صفات کے سوا کسی مخلوق کی پناہ بھی نہ ڈھونڈی جائے۔

5. الحلف بغیر اللہ: غیر اللہ کی قسم کھانا بھی توحید کی روح کے خلاف ہے۔

6. زیارت قبور: زیارت قبور کے منکر نہیں بلکہ وہ ان بدعات کے سخت مخالف ہیں جو قبروں کے پاس روا رکھی جاتی ہیں۔ (ایضاً ص 133-138)

شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت کی شروعات شہر عینیہ سے ہوئی لیکن حالات موافق نہ ہونے کی وجہ سے آپ کو یہ شہر چھوڑنا پڑا اور درعیہ منتقل ہو گیے جہاں کے امیر محمد بن سعود نے آپ کی مدد کی۔ دونوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس سے اس دعوت کو وسیع کرنے کے زیادہ مواقع نصیب ہو گیے۔ اس معاہدے کی وجہ سے اس تحریک کو سلطنت و حکومت ایمانی قوت بھی نصیب ہوئی۔ بعد میں جب سعودی حکومت کی وسعت ہوئی تو اس تحریک نے بھی فائدہ اٹھایا، سرزمین حجاز فتح ہونے کے بعد مکہ و مدینہ میں اپنی دعوت کو فروغ دینے کا موقع ملا۔ پھر ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ حج کے موقع پر دنیا کے مختلف گوشوں سے لوگ تشریف لاتے ان کے درمیان اپنے افکار و نظریات اور تعلیم کی نشرواشاعت کا خوب موقع ملا۔

5.5 کلیدی الفاظ

ابتر : خستہ تباہ و برباد

روشناس : جان پہچان، واقفیت

شجر و حجر : درخت اور پتھر

درویش : سائل، فقیر، راھب

جدوجہد : سعی، کوشش، سرگرمی

مبلغین : تبلیغ کرنے والا

5.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- بارہویں صدی کے ابتدائی دور میں اسلامی دنیا اور مقامات مقدسہ کا حال بہت افسوس ناک تھا۔ جزیرۃ العرب کے دل نجد کی حالت اور بدتر تھی، ان کی اخلاقی حالت بھی خستہ تھی، اچھائی اور برائی کا کوئی اصول باقی نہیں تھا۔ شیخ کے مطابق شرکیہ عقائد اس طرح دلوں میں رچ بس چکے تھے کہ اچھی خاصی تعداد ان برائیوں کو دین کا صحیح طریقہ تصور کرتا تھا اور اس پر عمل کرتا تھا۔ شیخ محمد کی دعوت سے پہلے اہل نجد کی حالت ایسی تھی کہ شاید ہی کوئی غیرت مند مسلمان اس کو پسند کرتا۔

- محمد بن عبد الوہاب 1703ء میں شہر عینیہ کے قبیلہ بنو تمیم میں پیدا ہوئے۔ آپ کے خاندان کو اس علاقے میں مقبولیت حاصل تھی کیوں کہ علماء وصلحاء کا خاندان شمار کیا جاتا تھا۔ آپ کے دادا سلیمان بن علی اس علاقے کے بڑے عالم شمار کیے جاتے تھے اور عینیہ شہر کے قضاۃ کی ذمہ داری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ عینیہ کی عوام یا علما کے درمیان کسی مسئلے پر اختلاف ہوتا تو لوگ انہی کے پاس آتے۔ آپ کے والد عبد الوہاب بھی شہر عینیہ اور حریملا کے قاضی رہے۔
- تعلیمی سفر مکمل کرنے کے بعد آپ اس صورت حال کو بدلنے کے لیے فکر مند ہوئے۔ آپ نے اعلائے کلمۃ اللہ، تبلیغ دین، اشاعت توحید و سنت اور اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے کمربستہ ہوگیے اور اس مشکل سفر میں آپ کو وہ ساری تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں اور ان ساری آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا جو اہل حق کو کرنا پڑتا ہے۔ آپ نے ان تمام آزمائشوں میں اصحاب تجدید دین کے طرز پر صبر کا مظاہرہ کیا۔ آپ نے درعیہ میں اپنی دعوت کا مرکز بنایا۔
- پچاس سال دعوتی کوشش کے بعد 1792ء میں شیخ محمد کی وفات ہوئی۔ آپ کی پوری زندگی دعوت و تبلیغ، جدوجہد اور رسول اللہ کی شریعت کی طرف رہنمائی میں گزری۔ آپ کی ہی کوششوں سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ماحول قائم ہوا۔ عوام آباءواجداد کی اندھی اتباع کو چھوڑ کر راہ حق کی طرف واپس آئے۔ مساجد پھر سے آباد ہوگئیں، گاؤں اور محلوں میں امن وسکون قائم ہوگیا اور لوگوں نے غلط عادتوں کو ترک کر دیا۔ شیخ نے صحرا اور دیہاتوں میں بھی اپنے مبلغین بھیجے اور پورے نجد کی صورتحال تبدیل ہوگئی۔
- شیخ محمد بن عبد الوہاب کی دعوت جسے عرف عام میں وہابیت کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ یہ لوگ کتاب و سنت کی صحیح تعلیمات کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن سیاسی وجوہات کی بنا پر اس گروپ کو وہابیت کے نام سے موسوم کیا گیا اور ان کو اس طرح سے دکھایا گیا کہ گویا اسلام کے علاوہ کوئی نئی چیز پیش کر رہے ہوں۔ وہابیت لفظ کا استعمال زیادہ تر ان کے مخالفین کرتے ہیں۔

5.7 نمونہ امتحانی سوالات

5.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. محمد بن عبد الوہاب کب پیدا ہوئے؟

(a). 1703ء　(b). 1705ء　(c). 1803ء　(d). 1805ء

2. "کتاب التوحید" کے مصنف کا نام بتائیں؟

(a). محمد بن عبد الوہاب　(b). شیخ صفی الرحمن　(c). علامہ ابن بازؒ　(d). سب صحیح

3. شیخ محمد بن عبد الوہاب کس قبیلہ میں پیدا ہوئے؟

(a). بنو تمیم　(b). ہاشم　(c). مطیر　(d). بنی حنیفہ

4. شیخ محمد بن عبد الوہاب کی وفات کب ہوئی؟

(a).1792ء (b).1850 (c).1947 (d).1857

5. کس امیر نے آپ کی دعوت کو قبول کیا اور کلی طور سے آپ کے مشن کو قوت پہنچائی؟

(a). محمد بن سعود (b). امیر عبد الوہاب (c). سلیمان بن علی (d). سید اسماعیل شہید

6. وہابی تحریک کا مرکز بتائیں؟

(a). درعیہ (b). دمشق (c). بغداد (d). سب غلط

7. وہابی تحریک کی شروعات کس ملک سے ہوئی؟

(a). سعودی عرب (b). ایران (c). افغانستان (d). سری لنکا

8. شیخ محمد بن عبد الوہاب کی دعوت کی شروعات کس شہر سے ہوئی؟

(a). شہر عینیہ (b). شہر درعیہ (c). ریاض (d). حائل

9. "اصول الایمان" کے مصنف کا نام بتائیں۔

(a). محمد بن سعود (b). محمد بن عبد الوہاب (c). سلیمان بن علی (d). علامہ بن بازؒ

10. محمد بن عبد الوہاب نے کس سے فقہ و حدیث کا درس حاصل کیا؟

(a). شیخ محمد المجموعی (b). شیخ امیر سعود (c). شیخ سلیمان بن علی (d). سب غلط

5.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. درعیہ میں آپ کی دعوتی کوششوں کے بارے میں مختصراً بیان کیجیے۔
2. عینیہ منتقل ہونے کے پیچھے کی وجوہات پر روشنی ڈالیے۔
3. شیخ محمد بن عبد الوہاب کی وفات اور دعوت کے اثرات کا جائزہ لیجیے۔
4. محمد بن عبد الوہاب کی تصنیفات پر نوٹ لکھیے۔
5. شیخ محمد بن عبد الوہاب کی تبلیغ کا جائزہ لیجیے۔

5.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. وہابی تحریک کا پس منظر بیان کیجیے۔
2. وہابی تحریک پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. بانی تحریک کے ابتدائی حالات اور ان کی دعوت و تبلیغ پر مضمون لکھیے۔

5.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. محمد بن عبد الوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح، مولانا مسعود عالم ندوی، اردو ڈائجسٹ پرنٹر، 1975
2. شیخ محمد بن عبد الوہاب اور ان کی دعوت، شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز، مترجم مولانا عبد العلیم بستوی، ادارہ احیاء السنہ النبویہ، سرگودھا، 1973
3. وہابی تحریک، ڈاکٹر محمد خلیل ہراس، مترجم، محمد خالد سیف اللہ، طارق اکیڈمی، لاہور، 2000
4. شیخ محمد بن عبد الوہاب کی سیرت، دعوت اور اثرات، جمال الدین زرابوزو، ترجمہ اسد اللہ مدنی، شعبہ مطبوعات وعلمی تحقیقات، وزارت برائے اسلامی امور واوقاف ودعوت وارشاد، 1433ھ
5. شیخ محمد بن عبد الوہاب اور ان کی دعوت، ابو المکارم ازہری، شعبہ دعوت وتبلیغ مدرسہ اسلامیہ، مظفرپور، 1983

اکائی 6: سنوسی تحریک

اکائی کے اجزا:

6.0 تمہید
6.1 مقاصد
6.2 سنوسی تحریک: ایک نظر میں
6.3 سنوسی تحریک کے قائدین
6.3.1 محمد بن علی سنوسی
6.3.2 سید محمد مہدی سنوسی
6.3.3 سید احمد شریف سنوسی
6.3.4 سید محمد ادریس سنوسی
6.3.5 شیخ عمر بن مختار شہید
6.4 سنوسی تحریک کے مقاصد
6.5 سنوسی تحریک کے زاویے
6.5.1 زاویوں کے تحت انجام پانے والے کام
6.5.2 زاویوں کا تنظیمی ڈھانچہ
6.6 اکتسابی نتائج
6.7 نمونہ امتحانی سوالات
6.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
6.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
6.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

6.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

6.0 تمہید

سنوسی تحریک عالم اسلام کی ایک ایسی تحریک ہے جس نے مسلمانوں میں اسلامی تعلیمات کا بڑے پیمانہ پر احیاء کیا۔ یہ تحریک دیگر تحریکات میں اس اعتبار سے ایک نمایاں مقام رکھتی ہے کہ اس نے مسلمانوں میں محض اسلامی تعلیمات کو پھیلانے اور انہیں ان پر عمل کرنے کے لئے راغب ہی نہیں کیا، بلکہ ان کی فلاح وبہبودی کے لئے انہیں مختلف ہنر اور پیشوں کی تعلیم دی۔ ان کے ضرورت مندوں کی امداد کی۔ غیروں کی استبدادی طاقتوں کے خلاف انہیں تیار کیا، ان کی تربیت کی، اسلحوں سے آراستہ کیا۔ اس تحریک کے ان حالات و واقعات کو آپ اس اکائی میں تفصیلی طور پر جانیں گے۔

6.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ سنوسی تحریک سے واقف ہوا جائے۔ سنوسی کا آغاز مکہ مکرمہ سے ہوا، پھر لیبیا میں اس نے بڑے پیمانے پر اصلاحی ودعوتی کام انجام دیئے۔ اس اکائی کے پیش نظر یہ بات ہے کہ اس تحریک کے آغاز وارتقاء اور پھر زوال سے آگاہی حاصل ہو۔ اس تحریک نے لیبیا کے صحراؤں میں جو چوروں اور ڈاکوؤں کا اڈہ تھا کس طرح ان کی اصلاح کی، اور ان مقامات کو امن وسکون کا گہوارہ بنا دیا۔ اسی طرح ان کے زاویے جو ان کی تمام تر سرگرمیوں کے مراکز تھے وہ کس طرح کام کرتے تھے، اور ان میں کیا کام انجام پاتے تھے۔ ان کے قائدین کون کون رہے، انہوں نے اس تحریک کے لئے کیا خدمات انجام دیں۔ اس تحریک کے مرکزی مقامات کون کون رہے، اور کس طرح ان میں تبدیلی واقع ہوتی رہی۔ اس تحریک کے ان تمام گوشوں اور پہلوؤں سے واقف ہونا اس اکائی کے مقاصد میں شامل ہے۔

6.2 سنوسی تحریک: ایک نظر میں

سنوسی تحریک ایک اصلاحی اور تبلیغی تحریک کے طور پر جانی جاتی ہے۔ اس تحریک کا آغاز محمد بن علی سنوسی نے مکہ مکرمہ میں کیا تھا۔ یہ تحریک اس بنیادی سوچ اور فکر کے ساتھ شروع ہوئی تھی کہ مسلمانوں کے قبائلی اور علاقائی اختلافات کو ختم کرتے ہوئے ان کے درمیان آپسی اتحاد واتفاق اور یکجہتی کو فروغ دیا جائے۔ مذہب اور سیاست کو ہم آہنگ کیا جائے۔ اس کا پہلا مرکز 'زاویہ' 1253ھ مطابق 1837ء میں انہوں نے 'جبل ابو قبیس' میں قائم کیا تھا۔ اس کے بعد مصر، لیبیا، سوڈان، اور الجزائر میں بھی یہ زاویے بڑی تعداد میں قائم ہوئے۔ یہ زاویے اس تحریک کی سرگرمیوں کے مراکز تھے۔ ان میں لوگوں کو تعلیم وتعلم سے آراستہ کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں مختلف قسم کے ہنر بھی سکھائے جاتے تھے، تاکہ ان کی اجتماعی زندگی کامیاب ہو۔ اسی طرح جنگی داؤ پیچ کی بھی عملی تربیت ہوتی تھی۔ ان میں لوگوں

کے شرعی مسائل حل کرنے کے علاوہ ان کے باہمی نزاعی اور اختلافی معاملات بھی فیصل کئے جاتے تھے۔ یہ تحریک اپنے قائد ثانی 'شیخ محمد مہدی سنوسی' کے زمانہ میں اپنے عروج کو پہنچ گئی تھی، اس کی شہرت یورپی استعماری طاقتوں اور عثمانی سلطنت کے سامنے ایک طاقتور حریف کے طور پر ہونے لگی تھی، اور سنوسی تحریک کے حاملین اس تحریک کو ہی اپنی سلطنت اور اس کے قائد کو اپنا سلطان خیال کرنے لگے تھے۔ لیکن پھر محمد مہدی سنوسی کے بعد یہ عروج باقی نہ رہا۔ ان کی وفات کے بعد یورپی ممالک فرانس اور اٹلی وغیرہ کے خلاف مسلسل جنگیں ہوتی رہیں، جس سے نہ صرف ان کی گرفت اپنے علاقوں پر کمزور ہوئی بلکہ بہت سے علاقے ان کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ چوتھے قائد محمد ادریس کے عہد میں یہ سلسلہ جاری رہا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد لیبیا کو جب ایک آزاد ملک مان لیا گیا تو اس کے پہلے بادشاہ کے طور پر محمد ادریس کو ہی تخت سلطنت پر بیٹھنے کا فخر حاصل ہوا۔ پھر 1968ء میں لیبیا پر کرنل قذافی کے قبضہ کر لینے کے بعد اس تحریک کا خاتمہ ہو گیا۔

6.3 سنوسی تحریک کے قائدین

6.3.1 محمد بن علی سنوسی

اس تحریک کے بانی محمد بن علی السنوسی جو کہ 'سنوسی الکبیر کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں، آپ کی پیدائش 'الجزائر' کے مستغانم نامی شہر میں 1202ھ مطابق 1787ء میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم آپ نے وطن میں حاصل کی، پھر آپ 1223ھ مطابق 1808ء میں مراکش تشریف لے گئے، جہاں شہر فاس کی مشہور درسگاہ جامع قزوین میں سات سالوں تک اعلیٰ شرعی تعلیم حاصل کرتے رہے، ساتھ ہی آپ وہاں تصوف وسلوک کے منازل بھی طے کرتے رہے۔ آپ کو شیخ ابو العباس احمد بن محمد تجانی سے جن کی جانب 'سلسلہ تجانیہ' منسوب ہے، اجازت وخلافت بھی حاصل ہوئی۔

1230ھ میں آپ نے حج کیا، بعد ازاں مختلف ممالک مثلاً الجیریا، تونس، طرابلس، مصر وغیرہ کے دورے کرتے رہے۔ اس پورے دورے میں آپ مسلمانوں کو اسلامی طرز زندگی، آپسی اتحاد واتفاق اور مذہب وسیاست کی یگانگت کی تعلیم دیتے رہے۔ لیکن اختلاف نقطہ نظر کی وجہ سے قاہرہ (مصر) کے بعض علماء نے آپ کے خلاف فتوے جاری کئے، دیگر علاقوں میں بھی آپ کو مخالفتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ بالآخر 1241ھ مطابق 1826ء میں آپ واپس حجاز مقدس چلے گئے۔ مکہ مکرمہ میں آپ نے مختلف اکابر علماء بالخصوص شیخ سید احمد بن ادریس سے کسب فیض کیا۔ 1246ھ مطابق 1830ء میں جب فرانس نے آپ کے وطن الجزائر پر قبضہ کر لیا تو آپ نے وطن کو خیرباد کہہ کر اپنے شیخ سید احمد کی مصاحبت اختیار کر لی، پھر جب 1837ء میں شیخ کا انتقال یمن میں ہو گیا تو آپ مکہ مکرمہ میں مقیم ہو گئے، اور وہیں دعوتی سرگرمیوں کو جاری کیا۔ پھر اسی سال یعنی 1253ھ مطابق 1837ء میں آپ نے اپنی سرگرمیوں کا ایک مرکز، ایک خانقاہ کی شکل میں قائم کیا، جو اس 'سنوسی تحریک' کا اولین مرکز تھا۔ یہ خانقاہ مسجد حرام کے پہلو میں واقع پہاڑی 'جبل ابی قبیس' پر قائم کیا گیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد آپ اسکندریہ چلے گئے اور وہاں ایک زاویہ قائم کیا، لیکن جلد ہی اسے بھی خیرباد کہہ دینا پڑا۔ پھر 1255ھ مطابق 1840ء میں حج کے بعد آپ مدینہ منورہ کے راستہ سے مصر ہوتے ہوئے لیبیا پہنچے، اور 1256ھ مطابق 1840ء کو وہاں کے برقہ نامی مقام کے جبل الاخضر میں ایک

دوسری خانقاہ قائم کی۔

پھر 1246ھ مطابق 1846ء میں آپ دوبارہ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، اور وہاں تقریباً چھ سالوں تک اپنی سرگرمیوں کو بڑے پیمانے پر انجام دیتے رہے۔ وہاں آپ کا خصوصی حلقہ درس منعقد ہوتا تھا، جس سے طلبہ کی بڑی تعداد مستفید ہوتی تھی۔ 1266ھ میں آپ نے ایک زاویہ مدینہ منورہ میں قائم کیا، جہاں تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ دیگر اصلاحی و تبلیغی سرگرمیوں کو بھی بڑے پیمانے پر انجام دینا شروع کیا گیا۔ مکہ مکرمہ میں آپ کی سرگرمیاں بہتر طریقہ پر انجام پارہی تھیں لیکن حالات نے دفعتاً ایسی کروٹ لئے کہ انہیں مکہ مکرمہ چھوڑنا پڑا۔ شریف مکہ عبد المطلب نے کسی وجہ سے سلطنت عثمانیہ سے بغاوت کر دی، اور عثمانی حکمراں کو یہ اطلاع دی گئی کہ اس بغاوت میں شیخ سنوسی کا بڑا ہاتھ ہے۔ چنانچہ وہاں سے قاہرہ ہوتے ہوئے مقام جیزہ (مصر) کے کرداستہ نامی مقام پر قیام فرمایا اور اپنی دعوتی واصلاحی سرگرمیوں کو جاری کیا، بڑی تعداد میں لوگ آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے، لیکن جلد ہی آپ کو یہ علاقہ بھی چھوڑنا پڑا۔ جس کے بعد آپ واپس برقہ (جبل الاخضر) آگئے۔ جہاں آپ کو اپنے کام کے لئے کافی پر سکون ماحول ہاتھ آیا۔ آپ کی تحریک میں دن بدن لوگوں کا اضافہ ہونے لگا، لیکن شریف مکہ مکرمہ کی بغاوت کے سلسلہ میں آپ پر جو جھوٹا الزام لگا تھا، اس کی وجہ سے حکومت عثمانیہ کی جانب سے آپ کی گرفتاری کی کوششیں مسلسل جاری تھیں، جس سے آپ کو کبھی اطمینان حاصل نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ آپ نے اپنے مریدین کے مشورے سے جغبوب کے نخلستان میں قیام کرنے کا فیصلہ کیا اور 1273ھ میں وہاں منتقل ہوگئے۔ وہاں ایک بڑا زاویہ قائم کیا اور بہت ہی آزادی کے ساتھ اپنی فکر کو لوگوں میں پھیلایا۔ بہت بڑی تعداد میں لوگ اس فکر اور تحریک سے جڑے، یہاں تک کہ وسطی سوڈان کا سلطان دوائی محمد شریف بھی آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوگیا، جو اس مشن میں آپ کی پشت پناہی کرتا رہا تھا۔ بالآخر 1276ھ مطابق 1859ء میں اسی مقام پر آپ نے وفات پائی اور وہاں کی مسجد کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

آپ نے اپنے پیچھے جو علمی یادگار چھوڑیں ان میں درج ذیل کتابیں خاص قابل ذکر ہیں:

1. كتاب إيقاظ الوسنان في العمل بالحديث والقرآن۔
2. السلسبيل المعين في الطرائق الأربعين۔
3. كتاب المنهل الروي الرائق في أسانيد العلوم وأصول الطرائق۔
4. الشموس الشارقة في أسانيد بعض شيوخنا المغاربة والمشارقة۔

6.3.2 سید محمد مہدی سنوسی

سید محمد مہدی سنوسی والد صاحب محمد بن علی سنوسی کے بعد اس تحریک کے قائد ہوئے، اور چونکہ آپ نے کم عمری یعنی محض 16 سال کی عمر میں قیادت سنبھال لی تھی اس لئے معاملات اور انتظام وانصرام کی دیکھ بھال کے لئے دس شیوخ پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی، پھر جب آپ بالغ اور باشعور ہوگئے تو سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔

ان کے دور میں سنوسی تحریک نے اور بھی زیادہ ترقی کی۔ ان کی تعلیم وتدریس کی شہرت طرابلس، تونس، الجزائر، مراکش، مصر

اور حجاز وغیرہ سے نکل کر صحرائے اعظم اور جنوبی علاقوں میں پھیل گئی اور بہت بڑی تعداد میں لوگ آکر آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہونے لگے۔ جس کے نتیجہ میں ان علاقوں میں بہت ہی تھوڑے عرصہ میں سینکڑوں زاویے قائم ہو گئے۔ بتدریج ان مریدین کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہوا کہ لوگوں میں یہ خیال عام ہونے لگا کہ وہی ان کے سلطان اور بادشاہ ہیں۔ عثمانی سلطنت جو اس وقت روبہ زوال تھی، اس وقت کے سلطان عبد الحمید ثانی نے سنوسی تحریک کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھتے ہوئے چاہا کہ انہیں اپنے حامیان میں شامل کر لیں، لیکن محمد مہدی سنوسی نے ان کی اس رائے سے اتفاق نہ کیا، اور اسی کے بعد 1895ء میں مرکزی مقام جغبوب سے مقام 'کفرہ' منتقل ہو گیا تھا، تاکہ وہ سلطان عبد الحمید کی پہنچ سے دور سے دور تر ہو جائیں۔ کفرہ ایک اہم تجارتی مرکز تھا، جہاں افریقہ کے دور دراز علاقوں سے تجارتی قافلے آتے تھے، جس کی وجہ سے اسلامی تعلیمات اور سنوسی تحریک کو اس مقام سے پھلنے پھولنے میں بڑی مدد ملی۔ کفرہ میں سنوسی تحریک کا مرکزی مقام 'تاج' نامی مقام تھا۔ اس دور میں یہ تحریک اپنے عروج کو پہنچ گئی تھی۔

اس وقت ایک بڑا غلط خیال لوگوں میں یہ گردش کرنے لگا کہ آپ ہی حضرت مہدی موعود ہیں، حالانکہ خود آپ اس خیال کے حامل نہ تھے۔ بلکہ جب ایک شخص محمد احمد سوڈانی نے مہدویت کا دعویٰ کیا تو آپ نے اس کی سخت ترین مخالفت کی، اور لوگوں کو اس کے اثرات سے بچانے کی بھرپور کوششیں کیں۔ آپ کی وفات مئی 1902ء میں ہوئی۔

اس دور کی علمی یادگار میں کفرہ کی لائبریری بہت اہم ہے۔ جسے جغبوب سے کفرہ صدر مقام منتقل ہونے کے بعد قائم کیا گیا تھا۔ اس میں ہزاروں کی تعداد میں نایاب کتابوں کے نسخے موجود تھے۔ لیکن بدقسمتی سے 1931ء میں اطالوی جنگی طیاروں کے ذریعہ کی گئی بمباری نے اور پھر ان کی افواج نے اس لائبریری کو پوری طرح تباہ کر دیا۔

6.3.3 سید احمد شریف سنوسی

محمد مہدی کی وفات کے بعد سید احمد شریف سنوسی 1902ء میں اس تحریک کے تیسرے رہنماء ہوئے۔ آپ بانی تحریک کے پوتے، اور محمد شریف کے صاحبزادہ تھے۔ آپ مسلسل یورپی استعمار کے خلاف برسرپیکار رہے۔ شیخ احمد شریف 1902ء سے تقریباً دس سالوں تک چاڈ میں فرانسیسی افواج کے خلاف برسرپیکار رہے۔ لیکن فرانسیسیوں کے خلاف اس فوج کشی سے الٹا سنوسی تحریک ہی کو نقصان اٹھانا پڑا، اور صحرائے اعظم کے جنوبی علاقوں میں ان کی پکڑ کمزور ہو گئی۔ ابھی فرانس کے خلاف یہ جنگ ختم ہونے بھی نہ پائی تھی کہ ستمبر 1911ء میں اٹلی نے لیبیا پر شمالی جانب سے حملہ کر دیا، اور اکتوبر میں طرابلس پر قابض ہو گیا۔ اس وقت لیبیا سلطنت عثمانیہ کے تحت آتا تھا۔ لہٰذا ابتداءاً جب اٹلی نے لیبیا پر حملہ کیا تو عثمانی فوج ان کے خلاف نبرد آزما ہوئی، لیکن پھر انہوں نے اکتوبر 1912ء میں ان سے صلح کر لیا، اور 1914ء تک رفتہ رفتہ اپنی ساری فوج انہوں نے بلالی۔ جس کی وجہ سے سنوسی اب ان کے مقابلہ میں تنہا رہ گئے۔ پھر جنگ عظیم اول کا بھی آغاز ہو گیا تھا، چنانچہ اٹلی کا ساتھ دینے برطانوی فوج آگئی، اور پھر ان کی متحدہ فوج نے فروری 1916ء میں سنوسیوں کو شکست دے دی۔ جس کے بعد سید احمد شریف مصر میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے، اور پھر وہاں سے ترکی چلے گئے، اور پھر بالآخر سعودی عرب تشریف لے گئے، جہاں مدینہ منورہ میں 10/مارچ 1933ء کو آپ مالک حقیقی سے جا ملے۔

ان مسلسل جنگوں کا بڑا نقصان ہوا۔ ان کی وجہ سے تحریک کا بڑا مقصد فوت ہونے لگا کہ مسلمانوں کو اسلامی ضابطہ حیات اور اتحاد واتفاق کی دعوت دی جائے۔ جس کی وجہ سے اسی دور میں یہ تحریک روبہ زوال ہونی شروع ہوئی، اور ان کا اصل مقصد محض لیبیا کی آزادی تک محدود ہو کر رہ گیا۔ انہی جنگوں کے دوران شیخ حمد بن سیف النصر اور شیخ عمر المختار جیسے ممتاز قائدین اور جنگجو ابھر کر سامنے آئے۔

شیخ سید احمد شریف کے علمی آثار چند درج ذیل ہیں:

1. الأنوار القدسية في مقدمة الطريقة السنوسية۔
2. الشموس الاشراقية في ذكر مشايخ ساداتنا السنوسية الإدريسية۔
3. فيوضات نفحات المواهب الرحمانية في الطريقة السنوسية۔
4. السراج الوهاج في رحلة السيد المهدي من الجغبوب إلى التاج۔
5. المساعد في أحكام المجاهد۔
6. الدر النضيد من كلام ساداتنا المفيد۔
7. رسالة في فضل الجهاد والحث عليه۔

6.3.4 سید محمد ادریس سنوسی

سید احمد شریف کے لیبیا چھوڑنے کے بعد آپ سنوسی تحریک کے شیخ مقرر ہوئے۔ اٹلی کے ساتھ آپ نے صلح کر لیا اور اٹلی نے آپ کو صحرائی علاقوں میں سنوسی تحریک کا قائد تسلیم کر لیا۔ لیکن جلد ہی اٹلی نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور ان دونوں کے درمیان دوبارہ فوج کشی شروع ہو گئی، اور مجبوراً محمد ادریس کو مصر میں پناہ گزیں ہو جانا پڑا۔ یہ دسمبر 1922ء کا واقعہ ہے۔ اس دوران سنوسی تحریک کے منظر نامہ پر ایک بہت ہی جانباز جنگجو شیخ عمر بن مختار ابھر کر سامنے آچکے تھے۔ (اِن کے احوال آپ آگے پڑھیں گے) 1931ء میں اٹلی کے ذریعہ انہیں پھانسی دیئے جانے کے بعد سنوسی تحریک کی مسلح مزاحمت بھی ختم ہو گئی۔ اٹلی نے لیبیا میں قابض ہونے کے بعد ان کے زاویوں کو تباہ کر دیا، ان کی عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر سخت ترین ظلم وزیادتیوں کا مظاہرہ کیا۔ ساتھ ہی اٹلی کے ذریعہ لیبیا کو اپنے لوگوں سے آباد کرنے اور اس پر قبضہ قائم رکھنے کی کوششیں بھی جاری رہیں اور یہ کوششیں دوسری جنگ عظیم تک چلتی رہیں۔

1941ء میں دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا تو برطانیہ جو پہلی جنگ عظیم میں اٹلی کا حلیف تھا دوسری میں اس کا حریف بن کر سامنے آیا۔ محمد ادریس نے برطانیہ کو اپنی حمایت پیش کر دی۔ لیبیا میں جب ان کے درمیان جنگ ہوئی تو برطانیہ کو اس میں کامیابی حاصل ہوئی۔ پھر بعد میں لمبی گفت وشنید کے بعد لیبیا کو 24/ دسمبر 1951ء میں ایک آزاد اور خود مختار ملک تسلیم کر لیا گیا، اور اس کے پہلے حکمراں سنوسی قائد شیخ سید محمد ادریس سنوسی مقرر ہوئے، اور شاہ ادریس کے طور پر جانے گئے۔ لیکن اس حکومت پر یورپی تہذیب کا غلبہ رہا۔ پھر 1968ء میں کرنل معمر قذافی نے لیبیا پر قبضہ کر لیا اور سنوسی خاندان اور تحریک کا نام ونشان ختم ہو گیا۔

آپ کی علمی یادگار "إجازة الطريقة السنوسية" قابل ذکر ہے۔ اس کتاب میں آپ نے اپنی اسناد کا تذکرہ کیا ہے، اجازت وخلافت عطا فرمائی ہے۔

6.3.5 شیخ عمر بن مختار شہید

شیخ عمر بن مختار سنوسی تحریک کے ان قائدین میں سے ہیں جنہوں نے بیس سالوں تک استعماری طاقتوں کے خلاف لوگوں کی قیادت کی اور دشمنوں کو زبردست مقابلوں کا سامنا کرنا پڑا۔

آپ کی پیدائش طرابلس لیبیا کے مقام بطنان میں 1277ھ مطابق 1860ء میں ہوئی۔ حفظ قرآن کریم اور ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے جغبوب میں سنوسی زاویہ کے تحت واقع تعلیمی ادارہ میں آپ داخل ہوگئے۔ یہاں آپ نے سنوسی تحریک کے شیخ ثانی سید محمد مہدی سنوسی سے کسب فیض کیا۔ تعلیم سے فراغت کے استاذ شیخ محمد مہدی نے 1895ء میں برقہ کے مقام القصور میں واقع زاویہ کے انتظامات کا ذمہ دار آپ کو بنادیا تھا۔ اسی سال آپ کو سید محمد مہدی کے ساتھ سوڈان تشریف لے جانے کا موقع ملا جہاں آپ کو کلک نامی مقام کا ذمہ دار بنادیا گیا۔ پھر 1903ء میں آپ القصور واپس آگئے۔

1911ء میں اٹلی کی فوج نے بن غازی شہر اور اس کے اطراف کے علاقوں پر حملہ کر کے جب انہیں اپنے قبضہ میں لے لیا تو آپ ان کے خلاف کمربستہ ہوگئے۔ آپ کو صحرائی جنگوں میں مہارت حاصل تھی، صحرائی علاقوں سے اچھی طرح واقف تھے اور جنگ کی باریک بینیوں اور جغرافیائی امور کی بھی اچھی سمجھ رکھتے تھے، انہوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی فوجی ٹکڑیوں کے ساتھ اٹلی کی افواج پر کامیاب حملے کیے، انہوں نے بڑی مہارت کے ساتھ دشمنوں کے ٹھکانوں کو نشانہ بنایا، گوریلا جنگ کے زبردست حربے استعمال کر کے انہیں بھاری نقصان سے دوچار کیا، اور ان کے لئے ایک بڑی مشکل اور رکاوٹ بن گئے تھے۔ بیس سالوں تک ان کے خلاف جنگ وجدال جاری رہا۔ بالآخر 1350ھ مطابق 1931ء کو آپ زخمی حالت میں اطالوی فوج کے ذریعہ گرفتار کر لئے گئے۔ آپ پر اٹلی کی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا، جہاں محض پانچ دنوں کے اندر آپ کو پھانسی کی سزا سنادی گئی، اور شہر بن غازی کے مقام سلوق میں آپ کو تقریباً بیس ہزار کے مجمع میں پھانسی دے دی گئی۔

6.4 سنوسی تحریک کے مقاصد

سنوسی تحریک کا آغاز جن مقاصد کے پیش نظر ہوا تھا انہیں ہم درج ذیل چند حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

سنوسی تحریک کا پہلا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے اندر اتحاد واتفاق پیدا کیا جائے، اور انہیں ایک اسلام کے پرچم تلے جمع کیا جائے۔ یہ تحریک کسی خاص ملک یا کسی خاص قوم تک محدود نہ تھی، بلکہ یہ سارے مسلمانوں کے لئے تھی۔ چنانچہ انہوں نے حجاز، لیبیا، مصر، سوڈان، الجزائر وغیرہ تمام جگہوں پر کام کیا اور انہیں ایک پرچم تلے جمع ہونے کی دعوت دی۔ ساتھ ہی انہوں نے لیبیا میں پھیلے قبائلی تعصب کی بنیاد پر جھگڑوں کو ختم کرنے، اور ان میں مذہبی حساسیت بیدار کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اسی طرح ان کے زاویوں میں عوام کے مسائل کو حل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے باہمی اختلاف اور نزاع کو بھی حل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی، جس کے لئے ان میں ایک مفتی اور قاضی مقرر تھے۔

مسلمانوں میں اتحاد واتفاق کے قیام کے ساتھ ساتھ ان کے پیش نظر یہ بات بھی تھی کہ مسلمانوں سے ان غلط باتوں کو بھی ختم

کیا جائے جو اسلامی تعلیمات کا حصہ نہیں ہیں۔ مثلاً مذہب اور سیاست کا اختلاف وافتراق۔ سنوسی تحریک کی شروع سے یہ کوشش رہی کہ مذہب اور سیاست کا اجتماع ہو، اور ان کے درمیان اتحاد واتفاق اور یگانگت پیدا ہو۔

ایک مقصد سنوسی تحریک کے قیام کا یہ تھا کہ لوگوں میں شرعی علوم کا فروغ ہو، جس کے لئے انہوں نے اپنے ہر زاویہ میں تعلیم کا انتظام کیا تھا۔ ان میں اساتذہ مقرر تھے، جنہیں تحریک کی جانب سے مشاہرے دیئے جاتے تھے۔ ان میں حفظ قرآن کریم کے ساتھ شرعی علوم کی تعلیم ہوتی تھی۔ اس زاویہ سے وابستہ ہر شہری کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنے بچے کی تعلیم انہی مدارس میں دے۔ کسی کو اس بات کا اختیار حاصل نہ تھا کہ وہ بغیر کسی وجہ کے اپنے بچے کو وہاں سے نکال لے۔ پھر جب طالب علم اپنے علاقائی زاویہ میں تعلیم مکمل کرلیتا تو اس کے لئے مرکزی زاویہ میں اعلیٰ تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ چنانچہ لیبیا میں زاویہ جغبوب میں جو تعلیمی ادارہ قائم تھا اسے جامع ازہر کے طرز پر ڈھالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ یہاں ایک عظیم الشان لائبریری بھی قائم کی گئی تھی، جس میں تقریباً دس ہزار نادر ونایاب کتابوں اور مخطوطات کا ذخیرہ موجود تھا۔ اسی طرح ہر شخص کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ پانچوں اوقات کی نمازیں اسی زاویہ کی مسجد میں ادا کریں، جن میں وقتاً فوقتاً مختلف شرعی مسائل واحکام بیان کئے جاتے رہتے تھے۔

سنوسی تحریک کے پیش نظر ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ استعماری طاقتوں کے خلاف ہمیشہ کھڑا رہا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تبلیغی واصلاحی تعلیمات کے ذریعہ لوگوں کے اندر خوابیدہ جذبہ جہاد کو بیدار کرنے کی بھرپور کوششیں کیں۔ انہوں نے اپنے زاویوں میں اس کی عملی مشق کرائی، نیزہ بازی کی تربیت دی اور بڑے پیمانہ پر مالی تعاون کیا، ہتھیار بھی فراہم کئے۔ جس کے نتیجہ میں مجاہدین تیار ہو کر نکلے، جنہوں نے برطانیہ، اٹلی، فرانس جیسی اہم استعماری طاقتوں سے لیبیا، چاڈ، سوڈان ومصر کو آزاد کرانے میں تاریخ ساز کردار ادا کیا۔

اس تحریک کے مقاصد میں یہ بات بھی شامل تھی کہ مسلمانوں میں اجتماعی اور رفاہی کاموں کو بھی فروغ ملے اور ان کی بہبودی کا انتظام ہو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا نظام بنایا کہ جہاں ان کی تعلیم وتعلم کا مناسب انتظام کیا، ان کے درمیان اتحاد واتفاق قائم کرنے اور ان کے مسائل حل کرنے کا اہتمام کیا، وہیں انہوں نے غریبوں اور فقراء کو کھانا کھلانے، اور مصیبت زدہ لوگوں کی امداد کرنے کا التزام کیا، مہاجرین کے لئے ٹھکانوں کا بندوبست کیا، ان کے مسائل ومشکلات حل کرنے کے لئے مستقل کمیٹی تشکیل دی، انہیں مختلف قسم کی حرفتوں مثلاً زراعت، باغبانی، پارچہ بافی، معماری اور نجاری سے آراستہ کرنے کا بھی انتظام کیا۔

چنانچہ اخیر میں ہم دیکھتے ہیں کہ سوڈان، صحرائے اعظم اور مغربی افریقہ میں بہت بڑی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ عام مسلمان جو اخلاقی ابتری کے شکار تھے، ان کی خاطر خواہ اصلاح ہوئی۔ اسی طرح وہ مقامات جو جرائم پیشہ لوگوں کے مراکز تھے، اور ان سے گذرنا یا ان میں ٹھہرنا عام لوگوں کے لئے کسی طرح محفوظ ومامون تصور نہ کیا جاتا تھا، وہ امن وسلامتی کا گہوارہ بن گئے۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ سنوسی تحریک اپنے پیروکاروں کے دِلوں میں احیائے اسلام کا جذبہ، عالمگیر اخوتِ اسلامیہ کا داعیہ اور ملک کی عزت وآبرو کے لیے جان قربان کرنے کا حوصلہ پیدا کردینے میں کامیاب رہی۔

6.5 سنوسی تحریک کے زاویے

سنوسی تحریک کے زاویے ان کے مراکز تھے، جنہیں بہت سے لوگوں نے خانقاہوں سے بھی تعبیر کیا ہے۔ یہ زاویے اُن تمام علاقوں میں قائم تھے، جن میں سنوسی تحریک کی سرگرمیاں انجام پارہی تھیں، مثلاً حجاز، لیبیا، مصر، سوڈان، الجزائر وغیرہ۔ یہ بہت بڑی تعداد میں قائم ہوئے۔ اولین زاویہ مکہ مکرمہ میں جبل ابو قبیس پر 1837 میں قائم ہوا تھا، جس سے تمام علاقائی زاویے ملحق تھے۔ مکہ مکرمہ میں اس زاویہ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ دنیا کے کونے کونے سے مسلمان موسم حج میں حج کی ادائیگی کے لئے آتے تھے۔ اس موقع پر مختلف طبقات کے لوگوں اور ان کے علاقوں کے صحیح حالات کا علم ہوتا تھا، پھر ان سے ملاقاتیں کرنے، گفتگو کرنے اور اصلاحی، تبلیغی اور تعلیمی کاموں کو آگے بڑھانے میں آسانی ہوتی تھی۔ زاویہ ابو قبیس کے بعد طائف، مدینہ منورہ، جدہ، بدر وغیرہ میں اسی قسم کے زاویے قائم کئے گئے، اور انہیں زاویہ ابی قبیس سے ملحق کر دیا گیا، تاکہ تحریک کے کاموں میں مزید تیزی لائی جا سکے۔ چنانچہ ان زاویوں کے اثر سے حج کے دوران آنے والے حاجیوں اور علاقائی افراد کی ایک معتدبہ تعداد اس تحریک سے وابستہ ہوئی اور اس کے کاموں میں حصہ لینے لگی۔

پھر جب لیبیا میں طرابلس کے مقام پر دوسرا زاویہ قائم کیا گیا تو ان کی تمام تر سرگرمیوں کا مرکز یہی بن گیا۔ یہ زاویہ 'زاویہ بیضاء' کے طور پر معروف ہوا۔ بانی تحریک شیخ محمد سنوسی نے اپنے وطن میں خاص طور پر یہ کوشش کی کہ ہر قبیلہ میں یا کم از کم ہر دو قبائل میں ایک زاویہ قائم ہو جائے، اور ان کا کوئی شیخ مقرر ہو، تاکہ ان میں اصلاحی، تعلیمی اور تبلیغی کاموں کو تیزی سے انجام دیا جا سکے۔ پھر ان تمام زاویوں کو زاویہ بیضاء سے ملحق کر دیا گیا، تاکہ ان تمام شیوخ پر ایک شیخ الشیوخ رہے، جو ان کے کاموں کی نگرانی کرے۔ لیبیا کے قبائل جو اس وقت اکثر و بیشتر ذاتی مفادات اور قبائلی مفاخر کی خاطر آپس میں الجھتے اور جھگڑتے رہتے تھے، ان زاویوں کے اثر سے وہ اپنے چھوٹے چھوٹے مقاصد کو پس پشت کرنے لگے، قبائل سے متعلق ان کے جذبات رفتہ رفتہ سرد پڑنے لگے اور ان کی جگہ مذہبی جذبات، باہمی اتحاد و اتفاق اور امن و آشتی نے لے لیا۔

بعد ازاں جغبوب کو مرکز بنایا گیا۔ یہ جگہ آب و ہوا اور امن و امان کسی بھی اعتبار سے مناسب نہ تھا۔ یہاں محض کانٹے دار درخت تھے، کچھ کھجور کے درخت تھے، چٹانیں اور صحراء تھی۔ یہ جگہ چوروں اور ڈاکوؤں کا اڈہ تھا۔ لیکن جب یہاں زاویہ قائم کیا گیا اور اس کے تحت سنوسی تحریک کے حاملین نے کام کرنا شروع کیا تو بہت جلد ہی تبدیلی بھی آنی شروع ہو گئی، بلکہ بہت جلد ہی یہ ایک مثالی جگہ بن گئی۔ اس جگہ پہلے لوگ آنے جانے سے ڈرتے تھے، اب یہاں اطمینان و سکون کے ساتھ آباد ہونے لگے تھے۔ اب یہاں کتب خانے، مسجدیں، مدرسے اور حوض وغیرہ تیار ہونے لگے تھے۔ میٹھے پانی کا بھی انتظام کر لیا گیا تھا، حالانکہ پہلے یہاں صرف کھارا پانی ہی تھا۔

سید احتشام احمد ندوی اس شہر کی آبادکاری سے متعلق تحریر کرتے ہیں:

> "شیخ محمد سنوسی نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اس مقام پر ایک ایسی دعوتی اور مرکزی بستی بسا کر رہیں گے جو تحریکی دعوت کا صحیح نمونہ بن سکے۔ چنانچہ تمام ضروری سامان جمع کیا گیا۔ کھانے پینے اور عمارتوں کی تعمیر کے لئے مزدوروں وغیرہ کو وہاں بھیجا گیا۔ وہاں کثرت سے کنوئیں بنوائے گئے۔ بارش کے پانی کو روکنے کے لئے حوض تیار کئے گئے۔ ایک عظیم الشان مسجد، امام کا گھر

اور مدرسہ کی عمارت تعمیر کی گئی۔ پانی کی صفائی کا انتظام کیا گیا۔ تیلی، راج، لوہار، جلد ساز، موچی، جولاہے، بڑھئی، اسلحہ ساز، اور شیشہ کا کام کرنے والے ہر قسم کے لوگوں کی بستیاں وہاں بسائی گئیں۔ غلہ کی منڈیاں قائم کی گئیں۔ اسلحوں کے لئے بڑے بڑے مخزن بنائے گئے۔ جغبوب کی مٹی میں بارود بننے کی بہت صلاحیت تھی، چنانچہ بارود کے کارخانے قائم کئے گئے، اور اسلحہ بڑی مقدار میں اکٹھا کئے گئے۔ اس کے علاوہ ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی قائم کیا گیا، جس میں بہت سی نایاب اور مخطوط کتابیں شامل تھیں۔ علماء اور اصحاب علم کی ایک پوری جماعت تھی۔ طلباء واساتذہ کے اوقات مقرر تھے۔ زندگی ایک پورے نظام کے ماتحت چل رہی تھی۔ یہ مرکز خود ایک الگ دنیا بن گیا تھا، ایک ایسی دنیا جہاں زندگی اپنی اصلی شکل میں جلوہ گر تھی۔ تجارت، سیاست، علم اور اخلاق سب میں ایک ہم آہنگی کی کیفیت تھی۔ جغبوب لوگوں کا مرجع بن گیا تھا"۔ (معارف، اپریل 1960ء، ص:301-300)

اس زاویہ کے تحت ایک مرکزی تعلیمی ادارہ قائم کیا گیا تھا، جہاں مختلف ذیلی زاویوں کے فارغ طلباء آکر اختصاص کی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ اس کا نصاب جامع ازہر کے نصاب کے مطابق رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔

جغبوب کی مرکزیت کے بعد شیخ محمد سنوسی کے عہد میں 'زاویہ التاج' کو مرکز بنایا گیا تھا۔ پھر قرو اور کفرہ کو یہ حیثیت دی گئی۔ بالآخر جغبوب کو یہ مرکزیت دوبارہ حاصل ہوئی اور آخر تک یہی رہی۔

6.5.1 زاویوں کے تحت انجام پانے والے کام

ان زاویوں میں مختلف سرگرمیاں انجام دی جاتی تھیں۔ یہاں مسلمانوں کو تعلیم وتربیت سے تو آراستہ کیا ہی جاتا تھا، ان میں انہیں مختلف پیشوں اور حرفتوں کی بھی تعلیم دی جاتی تھی، مثلاً زراعت، باغبانی، پارچہ بافی، معماری اور نجاری وغیرہ۔ اس کے ساتھ ہی انہیں جنگی داؤ پیچ بھی سکھائے جاتے تھے، نیزہ بازی کی عملی طور پر تعلیم دی جاتی تھی۔ مزید یہ کہ ان میں مسلمانوں کے مختلف مقدمات آتے تھے، جن کے فیصلے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ ان میں اس تحریک سے متعلق مختلف سرگرمیاں زیر بحث آتیں، تجاویز پاس ہوتیں، پھر ان پر عمل آوری کی کوششیں ہوتی تھیں۔ سید احتشام احمد ندوی ان زاویوں کے تحت انجام پانے والے کاموں پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"اس علمی وتعلیمی خدمت کے علاوہ ان تمام مراکز کے ذریعہ بہت سے اجتماعی اور رفاہ عام کے کام بھی ہوتے تھے، جو عوام الناس کی زندگی پر براہ راست اثر ڈالتے تھے، ان میں فقیروں کو کھانا ملتا تھا، مصیبت زدوں کی امداد کی جاتی تھی، ان ہی میں اجتماعی وانفرادی تمام قسم کی مشکلات کے حل پر غور وخوض ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں آپس کے مابہ النزاع مسائل کو حل کرنا بھی انہی مراکز کے ذمہ تھا۔ ان میں بچوں کی تعلیم کا پورا انتظام ہوتا تھا، اور یہیں سے مسلمانوں کی عام تبلیغ واصلاح کا کام بھی انجام دیا جاتا تھا۔ یہ مراکز اپنا پورا ایک نظام رکھتے تھے"۔ (معارف، مارچ 1960ء، ص:227)

6.5.2 زاویوں کا تنظیمی ڈھانچہ

ہر زاویہ کا سربراہ ایک شیخ ہوتا تھا جس کی نگرانی اور سرکردگی میں یہ ساری سرگرمیاں انجام پاتی تھیں، اور یہی شیخ وہاں کا مفتی، مصلح اور قاضی ہوتا تھا۔ ان زاویوں کے تنظیمی ڈھانچہ پر روشنی ڈالتے ہوئے سید احتشام احمد رقم طراز ہیں:

"ہر زاویہ میں جیسا کہ پہلے تذکرہ ہو چکا ہے، ایک شیخ ہوتا تھا، اور زاویہ میں اس کے لئے ایک مکان خاص ہوتا تھا، ایک مہمان خانہ ہوتا تھا جس میں مہمان آکر ٹھہرتے تھے، منتظمین مرکز کے مکان علاحدہ اور معلمین کے مکان علاحدہ ہوتے تھے۔ ہر زاویہ میں ایک مسجد ہوتی تھی۔ ایک مدرسہ قرآنیہ ہوتا تھا جس کی اپنی عمارت ہوتی تھی۔ ایک منتظم مرکز ہوتا تھا، جس کا مکان بھی وہیں بنایا جاتا تھا۔ سامان کے لئے مخزن یا مخازن ہوتے تھے۔ فقراء اور بے خانماں لوگوں کے لئے الگ کمرے ہوتے تھے۔ ہر زاویہ میں ایک اصطبل اور ایک باغ ہوتا تھا۔

شیخ زاویہ تمام معاملات میں مسئول اول ہوتا تھا۔ ہر زاویہ میں ایک 'مجلس' یا کمیٹی ہوتی تھی، جس میں شیخ زاویہ، وکیل (ناظم) اور تمام اعیان زاویہ و اعیان قبیلہ اور زاویہ کے قرب وجوار کے اہم اشخاص اس کے ممبر ہوتے تھے۔ اس مجلس کا کام قرب وجوار کے باشندوں کے تمام مابہ النزاع مسائل کا حل کرنا، اس کی جانچ پڑتال اور انہیں طے کرنا ہوتا تھا۔ اس سلسلہ میں اگر شرعی قسم کے مسائل پیش آتے تھے تو شیخ زاویہ انہیں حل کرتا تھا"۔ (معارف، مارچ 1960ء، ص: 227-228)

ان کے علاوہ ہر زاویہ سے وابستہ اصحاب خیر افراد زاویہ کے قریب میں ایسی عمارتیں بنواتے تھے جن میں وہ اپنا سامان بھی رکھتے تھے اور گرمی کے موسم میں وہ خود بھی وہاں آکر رہتے تھے۔ ایسے مکانات بھی ہوتے تھے جن میں مہاجرین اقامت اختیار کرتے تھے۔ زاویہ سے وابستہ لوگوں کے لئے ضروری ہوتا تھا کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے انہی مدرسہ قرآنیہ میں بھیجیں، اور نمازوں کے لئے انہی مسجدوں میں جایا کریں۔ ہر زاویہ ایک مضبوط پناہ گاہ رکھتا تھا۔ اس کے نام سے بہت سی زمینیں وقف تھیں، کنوئیں تھے۔ زاویہ کے شیخ کے تمام اخراجات زاویہ کی آمدنی سے پورے کئے جاتے تھے۔ زاویہ کو جو آمدنی ہوتی تھی، سالانہ خرچ کے بعد ان میں سے بچی ہوئی آمدنی مرکزی زاویہ کو بھیج دی جاتی تھی۔

ایک روایت کے مطابق جس وقت سنوسی تحریک کے دوسرے قائد محمد مہدی سنوسی کا انتقال (1902ء) ہوا، اس وقت زاویوں کی مجموعی تعداد 102 تک پہنچی ہوئی تھی۔ جن میں حجاز میں 12، لیبیا میں 65، مصر میں 17، سوڈان میں 6، الجزائر میں 1، اور تونس میں 1 زاویے تھے۔

6.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- اس تحریک کے بانی محمد بن علی السنوسی ہیں، جنہوں نے مکہ مکرمہ میں 1253ھ مطابق 1837ء میں اپنی سرگرمیوں کا ایک مرکز

’جبل ابو قبیس‘ پر قائم کر کے اس کی بنیاد رکھی تھی۔

- بانی تحریک نے اپنے دعوتی واصلاحی کاموں کو انجام دینے کے لئے مختلف علاقوں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، قاہرہ، اسکندریہ اور جغبوب وغیرہ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور ان میں زاویے قائم کئے۔
- سنوسی تحریک کے قائدین میں سب سے اول اس کے بانی محمد بن علی السنوسی ہیں۔ ان کے بعد سید محمد مہدی سنوسی، سید احمد شریف سنوسی، سید محمد ادریس سنوسی بالترتیب اس کے قائد ہوئے۔
- اس تحریک نے جن بنیادوں پر مسلمانوں میں اصلاحی و دعوتی کام کئے ان میں چند نمایاں بنیادیں درج ذیل ہیں:
  - مسلمانوں میں جو قومی وملکی تعصبات ہیں انہیں ختم کر کے ان کے اندر اتحاد واتفاق پیدا کیا جائے، اور اسلام کے پرچم تلے انہیں اکٹھا کیا جائے۔ جس کے لئے انہوں نے نہ صرف ان کے شرعی مسائل حل کئے بلکہ ان کے باہمی نزاعات واختلافات کو فیصل کرنے کے لئے ایک قاضی مقرر کیا اور اس کی معاونت کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی۔
  - مسلمانوں میں شرعی علوم کو فروغ دیا جائے۔ جس کے لئے انہوں نے اپنے ہر زاویہ میں مدرسہ قرآنیہ قائم کیا، اور مرکزی زاویہ میں اعلیٰ واختصاص کی تعلیم کا انتظام کیا۔
  - مسلمانوں کو استعماری طاقتوں کے خلاف کھڑا کیا جائے۔ جس کے لئے انہوں نے لوگوں کی جنگ کی عملی مشق کرائی، نیزہ بازی سکھائی، جنگی داؤ پیچ کی تعلیم دی۔ انہیں اسلحہ فراہم کرایا۔
  - مسلمانوں کی اجتماعی ورفاہی بہبودی ہو۔ چنانچہ انہوں نے تعلیم و تعلم کے ساتھ ساتھ لوگوں کو مختلف قسم کی حرفت اور پیشوں کی تعلیم دی۔ مثلاً زراعت، باغبانی، پارچہ بافی، معماری، نجاری وغیرہ۔
- زاویے جو سنوسی تحریک کی سرگرمیوں کے مراکز تھے، بہت بڑی تعداد میں حجاز، لیبیا، مصر، سوڈان اور الجزائر وغیرہ کے مختلف مقامات پر قائم تھے۔ ان زاویوں میں وہ تمام کام انجام دیئے جاتے تھے جو ان کے مقاصد میں داخل اور شامل تھے۔
- پہلا مرکزی زاویہ مکہ مکرمہ میں جبل ابو قبیس پر قائم ہوا تھا۔ اس کے بعد طرابلس میں دوسرا مرکزی زاویہ قائم ہوا تھا، جو زاویہ بیضاء کے طور پر جانا گیا۔ پھر جغبوب کو مرکز بنایا گیا جو سب سے اہم اور مستحکم مرکز تھا۔ جغبوب کے بعد زاویہ تاج، قرو اور کفرہ کو بھی مرکزی مقام بنایا گیا لیکن بالآخر جغبوب کو یہ مرکزیت دوبارہ حاصل ہوئی اور آخر تک قائم رہی۔

6.7 نمونہ امتحانی سوالات

6.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. سنوسی تحریک کا آغاز کہاں ہوا تھا؟

(a). مکہ مکرمہ   (b). مصر   (c). سوڈان   (d). لیبیا

2. سنوسی تحریک کا پہلا زاویہ کون ہے؟

(a). زاویہ بیضاء (b). زاویہ جبل ابو قبیس (c). زاویہ جغبوب (d). زاویہ التاج

3. سنوسی تحریک کے آخری قائد کا نام بتائیے؟

(a). سید محمد مہدی سنوسی (b). سید احمد شریف سنوسی (c). سید محمد ادریس سنوسی (d). محمد بن علی سنوسی

4. اٹلی نے لیبیا پر کب حملہ کیا تھا؟

(a). 1902ء (b). 1911ء (c). 1916ء (d). 1895ء

5. کس عثمانی سلطان نے سنوسی تحریک سے ہاتھ ملانے کی کوشش کی تھی؟

(a). سلطان عبد الحمید (b). سلطان عبد المجید (c). سلطان عبد العزیز (d). سلطان مراد پنجم

6. زاویہ جغبوب کہاں واقع تھا؟

(a). مکہ مکرمہ (b). مصر (c). سوڈان (d). لیبیا

7. شیخ عمر بن مختار کو کس نے پھانسی دی تھی؟

(a). برطانیہ (b). اٹلی (c). فرانس (d). جرمنی

8. 'زاویہ التاج' کو کس کے عہد میں مرکزی زاویہ بنایا گیا تھا؟

(a). سید محمد مہدی سنوسی (b). سید احمد شریف سنوسی (c). سید محمد ادریس سنوسی (d). محمد بن علی سنوسی

9. لیبیا کو ایک آزاد اور خود مختار ملک کب تسلیم کیا گیا؟

(a). 1968ء (b). 1941ء (c). 1960ء (d). 1951ء

10. لیبیا کو آزاد ملک تسلیم کرنے کے بعد اس کا پہلا سلطان کون ہوا؟

(a). شیخ حمد بن سیف النصر (b). سید احمد شریف سنوسی (c). سید محمد ادریس سنوسی (d). شیخ عمر بن مختار

6.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. سنوسی تحریک کے آغاز وارتقاء کا تاریخی تجزیہ کیجیے۔
2. سنوسی تحریک کے قائدین میں سے کسی دو پر تعارفی نوٹ لکھیے۔
3. سنوسی تحریک کے مقاصد پر روشنی ڈالیے۔
4. زاویوں کے تنظیمی ڈھانچہ اور ان کے کاموں پر تبصرہ کیجیے۔
5. سنوسی تحریک کے دور زوال پر گفتگو کیجیے۔

6.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. سنوسی تحریک پر ایک جامع نوٹ تحریر کیجیے۔
2. سنوسی تحریک کے قائدین پر ایک تجزیاتی مضمون قلم بند کیجیے۔
3. سنوسی تحریک کے زاویوں کا جائزہ لیجیے۔

6.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تذکرہ سنوسی مشائخ : عابد حسین شاہ پیرزادہ
2. شیخ سنوسی : ملک محمد الدین
3. اسلام کی احیائی تحریکیں اور عالم اسلام : سید قاسم محمود
4. معاصر اسلامی تحریکات اور فکر اقبال : ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی
5. السنوسی الکبیر (عربی) : محمد طیب بن ادریس اشہب
6. The Sanusi of Cyrenaica : E. E. Evans-Pritchard

اکائی 7: اخوان المسلمون (حصہ اول)

اکائی کے اجزا:

7.0 تمہید

7.1 مقاصد

7.2 اخوان المسلمون کا تعارف

7.2.1 وژن

7.2.2 تاریخی پس منظر

7.2.3 آغاز وارتقاء

7.3 تحریک اخوان المسلمون کی فکری بنیادیں

7.4 دین وسیاست کا سنگم

7.4.1 اخوان المسلمون کا میدان عمل

7.4.2 فکر وعقیدہ

7.4.3 اسلامی عقیدہ کے عناصر

7.4.4 فکری انقلاب

7.4.5 عصری تقاضوں کے مطابق نظام تعلیم کی اصلاح

7.4.6 افراد سازی

7.4.7 صحافت

7.4.8 اقتصادیات

7.5 اکتسابی نتائج

7.6 نمونہ امتحانی سوالات

7.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

7.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
7.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
7.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

7.0 تمہید

بیسویں صدی میں عالم اسلام میں جو اسلامی تحریکات اٹھیں، ان میں ایک اہم تحریک ''اخوان المسلمون'' کی ہے۔ خلافت اسلامیہ کے زوال کے بعد ہی سے ذہنوں میں یہ خیال راسخ کیا جانے لگا کہ اللہ کے رسول ﷺ جو اسلام لے کر آئے تھے، وہ صرف انسان کی انفرادی زندگی سے بحث کرتا ہے، اس کا تعلق اجتماعی زندگی سے نہیں ہے۔ نیز دور جدید کی چکا چوند ترقیوں کے میدان میں اگر مسلمان اپنی شراکت داری ثابت کرنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے ضروری ہے کہ مغربی نظام زندگی کی پیروی کریں۔ اخوان المسلمون نے اس نظریہ کے خلاف زبردست محاذ آرائی کی اور مغربی نظام زندگی کو چیلنج کرتے ہوئے قرآن وسنت ہی کی روشنی میں یہ ثابت کیا کہ اسلام انسانی زندگی کے تمام گوشوں میں رہنمائی کے لیے آیا ہے، لہٰذا انفرادی زندگی کے ساتھ اجتماعی زندگی اور نظام سیاست بھی اس کا موضوع ہے، بلکہ اسلام کی مکمل تنفیذ کے لیے نظام سیاست کو اس کا اہم حصہ سمجھنا ضروری ہے۔

اس اکائی میں ''اخوان المسلمون'' کا تاریخی پس منظر، مقاصد، فکری بنیادیں اور زندگی کے مختلف میدانوں: فکر وعقیدہ، نظام تعلیم، افراد سازی، سیاست، صحافت اور اقتصادیات میں اس تحریک نے جو کارنامے انجام دیے ہیں، ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

7.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو عالم اسلام کی اہم تحریک ''اخوان المسلمون'' سے روشناس کرانا ہے کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے مقصد سے اٹھنے والی یہ تحریک کن حالات میں منظر عام پر آئی، اس کی فکری بنیادیں کیا تھیں، اس نے زندگی کے کن محاذ میں اپنے دوررس اثرات مرتب کیے ہیں اور اس کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کیے۔

7.2 اخوان المسلمون کا تعارف

بیسویں صدی کے آغاز میں اخوان المسلمون شرق اوسط کی سب سے بڑی اسلامی تحریک کے طور پر سامنے آئی۔ اس کے بانی امام حسن البنا شہیدؒ ہیں۔ اس تحریک کا مقصد اسلامی نظام حکومت کا قیام، نئی نسل کی اسلامی نہج پر تربیت، عالم اسلام اور مسلمانوں کو مغرب کی غلامی سے آزاد کرانا، مسلمانوں کی انفرادی واجتماعی زندگی کو درست نہج پر لانا، انسانوں تک انسانیت کا پیغام پہونچانا اور حقوق انسانی کا تحفظ تھا۔

7.2.1 وژن

پوری زندگی کو خدائی رنگ (صبغۃ اللہ) میں رنگنا۔

7.2.2 تاریخی پس منظر

خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد عالم عرب خاص طور پر مصر میں ایسے اسباب رونما ہوئے، جو بیداری کے نام پر مسلمانوں کو جاہلیت کی طرف لے جارہے تھے اور جن کی وجہ سے ان کی زندگی سے تمام اسلامی تشخصات مٹتے جارہے تھے۔ زوال خلافت کے فوراً بعد عربوں میں قومیت اور وطنیت کے نعرے بلند ہوئے۔ خلیل احمد حامدی کے الفاظ میں "وطنی تحریک نے وطن پرستی کی آڑ میں اور ترکوں کی تنسیخ خلافت کو بہانہ بناکر الحاد، زندقہ، آوارہ خیالی اور مغرب پرستی کو ہوا دی۔" (اخوان المسلمون: تاریخ، دعوت، خدمات، ص 7) آزاد خیالی، ترقی پسندی اور تحریک نسواں نے اپنا سر اٹھانا شروع کر دیا تھا؛ چنانچہ مصر میں ایسے اہل قلم کی ایک کھیپ تیار ہوگئی، جو کھلم کھلا اس بات کا دعویٰ کرتے تھے کہ اسلام کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ علی عبد الرزاق کی کتاب "الإسلام وأصول الحکم" (اسلام اور اصول حکم رانی) اسی مکتب فکر کی ترجمان تھی، جس میں یہ دکھایا گیا کہ اسلام کا سیاسی امور سے کوئی تعلق نہیں ہے، دین صرف انسان کی روحانیت پر زور دیتا ہے۔ عورتوں کی آزادی اور فکر و نظر کی وسعت کے نام پر مغرب زدہ مفکرین کھلے عام اسلامی تعلیمات پر حملے کرنے لگے۔ اس فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے قاسم امین نے "تحریر المرأة" (عورت کی آزادی) تیار کی۔ طٰہٰ حسین نے "مستقبل الثقافة فی مصر" (مصر میں ثقافت کا مستقبل) لکھ کر لوگوں کو یہ باور کرایا کہ عالم اسلام کی ترقی کا راز اسی میں چھپا ہے کہ مغرب کی مکمل پیروی کی جائے۔

7.2.3 آغاز وارتقاء

ان حالات میں امام حسن البناؒ نے زندگی کے میدان میں قدم رکھا اور نہایت پامردی کے ساتھ دعوت واصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے حسن البنا کی سرگرمیوں کا ایک اہم حصہ سماجی برائیوں کی روک تھام تھا۔ بلوغت سے قبل ہی جب وہ مدرسۃ الرشاد الدینیہ کے طالب علم تھے، انہوں نے چند طلبہ کے ساتھ مل کر "جمعیة منع المحرمات" (انجمن انسداد محرمات) کی بنیاد ڈالی۔ اس انجمن کے ممبر کو جس شخص کے بارے میں معلوم ہوتا کہ وہ کسی برائی کا ارتکاب کرتا ہے، ناپ تول میں کمی کرتا ہے، یا کسی دوسرے اخلاقی جرائم میں مبتلا ہے، اس کو خط لکھ کر تنبیہ کی جاتی اور خوف خدا کی یاددہانی کرائی جاتی۔ اسی طرح جب اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے آپ قاہرہ گئے تو وہاں "جمعیت مکارم اخلاق" کے ممبر کی حیثیت سے اصلاحی سرگرمیوں میں شریک ہوئے۔ چند دنوں کے بعد انہوں نے ازہر کے چند طلبہ کے ساتھ بازاروں اور قہوہ خانوں میں وعظ وارشاد اور درس وتدریس کی ذمہ داری انجام دینے کا کام شروع کیا۔ مارچ 1928ء میں جب حسن البنا کی عمر صرف 21 سال تھی، چھ افراد پر مشتمل ایک وفد انہی کے گھر (اسماعیلیہ) میں جمع ہوا اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے آپسی عہد وپیمان کے بعد تحریک "الاخوان المسلمون" (مسلمان بھائی) کی بنیاد ڈالی۔ پانچ سال تک اخوان المسلمون نے اپنی کوششوں کا دائرہ مساجد میں وعظ وتلقین، علاقائی سطح پر اصلاحی سینٹرز کا قیام، گاؤں اور قصبات کے لوگوں کو دین کی دعوت تک محدود رکھا۔ اس کے بعد 1933ء میں یہ ایک عالم گیر تحریک کی حیثیت سے منظر عام پر آئی۔

7.3 تحریک اخوان المسلمون کی فکری بنیادیں

اخوان کی فکری بنیادوں کو سمجھنے کے لیے ذیل میں اس کے بانی شیخ حسن البناؒ کا ایک اقتباس نقل کیا جارہا ہے، جس سے اس تحریک کی فکری بنیادوں، اس کے مقاصد وعزائم اور شعبہ ہائے حیات سے اس کی وابستگی کا پتہ چلتا ہے:

> ''یہ ایک ہمہ گیر تحریک ہے، جس میں اصلاح کے تمام پہلو موجود ہیں۔ یہ سلفی دعوت ہے؛ کیوں کہ اخوان کی دعوت ہے کہ کتاب وسنت کو مرکز نظر بنایا جائے۔ یہ سنی مذہب ہے؛ کیوں کہ اخوان کی کوشش ہے کہ ہر شئے میں سنت مطہرہ پر عمل کریں۔ یہ ایک صوفیانہ حقیقت ہے؛ کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ خیر وصلاح کی بنیاد، پاکیزگی نفس، صفائی قلب، للہی محبت اور تعاون علی الخیر ہے۔ یہ ایک سیاسی جماعت ہے، کیوں کہ اخوان حکومت کی داخلی وخارجی اصلاح اور باعزت خوددارانہ قومی تربیت وزندگی کے داعی ہیں، وہ ایک ورزشی جماعت ہے، کیوں کہ وہ اپنے ورزشی گروپوں کے ذریعے جسمانی ورزش کا خاص اہتمام کرتی ہے۔ اور اس میں وہ کسی ورزشی جماعت یا کلب سے کم نہیں۔ وہ ایک علمی وثقافتی انجمن ہے، کیوں کہ اخوانی تربیت گاہیں درحقیقت تعلیم وتہذیب کے مدرسے اور عقل وروح کی جلا ونمو کے مراکز ہیں۔ وہ ایک اقتصادی ادارہ ہے؛ کیوں کہ اسلامی معاملات پر خاص توجہ دیتا ہے۔ اخوان نے اپنی اسلامی طرز کی لمیٹیڈ کمپنیوں سے قومی اقتصادی حالت کو مضبوط تر بنانے میں بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ وہ ایک سماجی تحریک ہے؛ کیوں کہ اخوان معاشرے کے امراض پر خاص توجہ دیتے، ان کے علاج پر غور وفکر کرتے اور امت کو سماجی امراض سے پاک کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔(تحریک اخوان المسلمین: ماضی وحال۔ محمد شوقی ذکی۔ اردو ترجمہ: ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی، ص:68)

7.4 دین وسیاست کا سنگم

اخوان کی فکری بنیادوں میں ایک اہم فکر یہ تھی کہ دین اور سیاست دو الگ چیزیں نہیں ہیں، دونوں لازم وملزوم ہیں، ان کے درمیان تفریق کا تصور اسلام کو تحریف کرنے کی ناکام کوشش ہے۔ اخوان کے خاص نشان (Logo) میں اوپر کے حصہ میں قرآن مجید، بیچ میں تلوار کی تصویر اور سب سے نیچے قرآن کریم کی آیت ''وَأَعِدُّوا'' کندہ ہے۔ جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اسلام بیک وقت روحانی اور سیاسی دونوں قوت سے تعبیر ہے اور شریعت اسلامیہ کا مکمل نفاذ اسی وقت ممکن ہے، جب دین وسیاست کا حسین سنگم ہو۔ اخوان کے بانی امام حسن البنانے اس فکر کو اپنی کتابوں اور مضامین میں جگہ جگہ واضح کیا ہے۔ ان کے رسائل کو ان کی اہم تحریروں میں شمار کیا جاتا ہے، جن سے اخوانی تحریک کی بنیادی فکر اور فلسفہ ومقاصد کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، ان میں سے کچھ اہم رسائل کا اردو ترجمہ مولانا عنایت اللہ اسد سبحانی نے ''مجاہد کی اذاں'' کے نام سے کیا ہے۔ اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اسلام جہاں ایک سچا عقیدہ ہے، ایک عبادت ہے، وہیں وہ ایک ہمہ گیر نظام بھی ہے، جس کے دائرے سے زندگی کا کوئی گوشہ خارج نہیں؛ چنانچہ وہ حکومت وریاست کی باگ ڈور بھی سنبھالتا ہے اور تعمیر وطن اور تشکیل امت کے لیے بھی جدوجہد کرتا ہے۔ وہ اخلاق اور رأفت ورحمت کا بھی مظاہرہ کرتا ہے اور قوت اور قانون عدل کا تازیانہ بھی اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ وہ علم وثقافت کے گیسو بھی سنوارتا ہے اور فصل وقضا کی کرسی پر بھی نظر آتا ہے۔ وہ حصول رزق اور کسب مال کی راہیں بھی نکالتا ہے اور دولت وثروت کے خزانے بھی فراہم کرتا ہے۔ وہ ایک دعوت اور ایک نظریہ بھی ہے اور ایک جہاد اور ایک لشکر بھی۔" (مجاہد کی اذاں۔ حسن البنا، ترجمہ: عنایت اللہ اسد سبحانی، ص46،47)

دین وسیاست کی جامعیت کا یہ نظریہ دراصل اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے مأخوذ ہے: وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ ۖ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا ۖ وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۖ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ (القصص77) [جو مال تجھے اللہ نے دیا ہے، اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔ احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر، اللہ تعالیٰ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا] جیسا کہ اس آیت میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ آخرت کے حصول کی کوشش کے ساتھ دنیوی زندگی سے بھی فائدہ اٹھانے کی تلقین کی گئی ہے، پھر اسلام کے بارے میں یہ تصور کیسے ممکن ہو گیا کہ آخرت کی دعوت تو دیتا ہے؛ لیکن دنیا کو اپنی بحث کا حصہ نہیں سمجھتا اور اس بارے میں کوئی رہ نمائی فراہم نہیں کرتا ہے۔

اخوان کے سیاسی نظریات کے خلاف جب چرچا شروع ہوا تو معترضین اور اسلام مخالف عناصر نے ایک سوال یہ بھی رکھا کہ اگر اخوان المسلمون اسلامی نظام حکومت قائم کرتی ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ اس نظام حکومت میں غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کی پامالی ہو گی، ان کا وجود محال ہو جائے گا؛ کیوں کہ اخوان خالص قرآنی بنیادوں پر حکومت اسلامیہ کا قیام چاہتی ہے۔ اس موقع پر اخوان کے بانی حسن البنا نے یہ واضح کیا کہ اسلام کا پر حکمت دستور مقدس (قرآن کریم) اقلیتوں کی حفاظت اور حقوق کی ایک بہت واضح اور بین دفعہ لے کر آیا ہے: لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ" (الممتحنۃ:8) [جن لوگوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کیا ہے اور نہ تمہیں اپنے گھروں سے نکالا ہے، ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور عدل وانصاف کا معاملہ کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہیں نہیں روکتا ہے، بلکہ وہ تو انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے] یہ صریح حکم اقلیات کی حفاظت ہی پر دلالت نہیں کرتا، بلکہ ان کے ساتھ سلوک واحسان کی بھی تلقین کرتا ہے۔

7.4.1 اخوان المسلمون کا میدان عمل

جیسا کہ اوپر کے اقتباس سے معلوم ہوا، اس تحریک نے زندگی کے ہر میدان کو اپنی سرگرمیوں کا محور بنایا اور ان میں بڑی بڑی خدمات انجام دی ہیں، ان میں سے کچھ میدانوں کا تذکرہ نیچے کیا جا رہا ہے:

7.4.2 فکر وعقیدہ

فکر وعقیدہ اس تحریک کی سرگرمیوں کا سب سے اہم میدان ہے۔ حسن البنا نے شروع ہی سے اس پر توجہ دی کہ قرآن کریم کی آیات، سیرت رسول اکرم ﷺ، احادیث اور صحابہ کرام کے ایمان وعمل کے واقعات سنا کر عوام الناس کے ذہن ودماغ کو جلا بخشی جائے۔ ان کا یہ خیال بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کو سمجھنے کے لیے فلسفیانہ نظریات اور منطقی قیاس آرائیوں سے تعرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ کائنات کے اندر ذات باری کی عظمت وکبریائی کی جو بے شمار نشانیاں ہیں، مخلوق کے اندر صفات خداوندی کی جو جلوہ آرائیاں ہیں، لوگوں کے ذہن کو ان چیزوں کی طرف متوجہ کرنا چاہیے۔ اسی سے وہ خالق حقیقی کو مکمل طور پر پہچان سکتے ہیں۔ حسن البنا کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب تک وہ ذہنوں میں صحیح اور صالح عقیدہ تعمیر نہ کر دیتے، تب تک کسی فاسد اور غلط عقیدہ کو پاش پاش نہ کرتے؛ کیوں کہ تعمیر کے بعد انہدام جتنا آسان تر ہے، تعمیر سے پہلے اتنا ہی دشوار تر۔ عصر جدید کے عظیم اسلامی مفکر اور اخوان المسلمون کے فکری رہنما لکھتے ہیں:

> ”وہ (امام حسن البنا) پوری توجہ اس بات پر صرف کرتے تھے کہ دلوں میں اللہ کی معرفت جڑ پکڑے، وہ اپنے رب کی رحمتوں سے متوقع، اس کی انعامات کا امیدوار اور اس کے غضب اور اس کی سزاؤں سے خائف رہے؛ اس کا دست سوال اسی کی طرف اٹھے، بھروسہ اسی پر کرے۔ محبت ہو تو اسی سے، خوشنودی کی طلب ہو تو اس کی، اسی کے قرب سے سکون وطمانیت حاصل کرے، اسی کی یاد میں اسے لذت وفرحت کا احساس ہو: أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (سورہ رعد: 28) سن لو! اللہ ہی کی یاد سے دلوں کو سکون ملتا ہے۔“ (اخوان المسلمون کا تربیتی نظام۔ علامہ یوسف القرضاوی، ترجمہ عبید اللہ فہد فلاحی، ص: 23)

7.4.3 اسلامی عقیدہ کے عناصر

حسن البنا کے نزدیک اسلامی عقیدہ میں پختگی اور مضبوطی کے لیے درج ذیل 6 / عناصر کا پایا جانا ضروری ہے، جس کا تفصیلی تذکرہ انہوں نے اپنے رسالہ ” اللہ فی العقیدۃ الإسلامیۃ“ میں کیا ہے:

- اس بات کا اعتقاد رکھنا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات واجب الوجود ہے، وہ ہر طرح کے صفات کمال سے متصف ہے۔ اپنی ذات وصفات میں وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔
- اس کی ذات سے ان تمام صفات کی نفی کرنا جس میں کسی قسم کا تشبہ، یا جن صفات سے اس کی ذات میں کسی قسم کا نقص محسوس ہو، مثال کے طور پر اس کا کوئی جسم نہیں، کیوں کہ جسم میں تبدیلی ماہیت کی صفت ہوتی ہے، اور یہ تبدیلی مادہ کی خصوصیت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے منزہ ہے۔ اسی طرح اس کی ذات سے تعدد کو منسوب کرنا بھی جائز نہیں ہے، کیوں کہ خدا ایک ہے جب کہ تعدد میں مختلف عناصر کی شمولیت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (سورہ شوریٰ: 11)
- اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی حقیقت وماہیت کے پیچھے نہ پڑنا کہ اس کی ذات کیسی ہے، یا اس کی صورت کیسی ہے وغیرہ۔ کیوں کہ

انسانی حواس سے اس کا ادراک نہیں کیا جاسکتا۔ جیسا کہ حدیث میں اس سے منع کیا گیا ہے کہ: اللہ کی مخلوق میں غور و فکر کر کے اس کی عظمت کا اعتراف کرو؛ لیکن خود اس کی ذات میں غور نہ کرو۔ خدا کی ذات کے ادراک کے سلسلے میں انسانی حواس کی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد ہے: لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ ۖ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (سورہ انعام :103)
[نگاہیں اس کو نہیں پاسکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے، وہ نہایت باریک بین اور باخبر ہے]

- موروثی اور آبائی رسم ورواج کے بندھن سے آزاد ہو کر کائنات کے اسرار ورموز پر عقل سلیم کے ساتھ غور وخوض کرنا۔
- انسانی شعور ووجدان اور خالق کائنات کے درمیان کے رشتہ کو مضبوط کرنا، جو کہ خدا کی روحانی معرفت کا سب سے بہترین ذریعہ ہے۔ فکر و عقل کے مقابلہ انسان کے شعور ووجدان میں اس بات کی زیادہ صلاحیت ہے کہ وہ ان اسرار ورموز تک پہونچ سکے، جن تک نہ انسانی نگاہیں جاسکتی ہیں اور نہ انسان کی عقل وحواس۔
- مومن سے یہ مطالبہ ہے کہ اس کا قول وعمل خدائی صفات پر یقین کامل کا مظہر ہو، مثال کے طور پر ایک مومن کا یہ ایمان ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے تو پھر ہر پریشانی اور مصیبت کے وقت اس کی نظر اسی کی ذات پر ہو، اسی پر توکل کرے اور اسی سے پناہ چاہے۔ اسی طرح مومن کو یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے تو اس علم کا تقاضا ہے کہ بندۂ مومن صرف اسی کے سامنے دست سوال دراز کرے۔

7.4.4 فکری انقلاب

عقیدہ کی اصلاح کے ساتھ انہوں نے الحاد، دہریت، وطنیت، قومیت اور مغرب کی تقلید کے خلاف آواز اٹھائی، ان کے دلائل کی کمزوری کو واضح کیا۔ تجدد پسندی اور فکر و نظر کی وسعت کے نام پر نوجوانوں کا جو گروہ مغرب ہی کی پیروی میں اپنی نجات اور ترقی کا سامان سمجھتا تھا، ان کے سامنے اسلام کی جامعیت، اس کی شمولیت اور اس کی آفاقیت کو واضح کیا۔ اس راہ میں جان توڑ کوششیں کیں، اخوان کے متعدد فکری قائدین: سید قطب شہید، ڈاکٹر طٰہٰ جابر علوانی، مصطفیٰ محمد الطحان، ڈاکٹر سعید رمضان، شیخ محمد غزالی، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی، عبد الفتاح ابوغدہ، ڈاکٹر یوسف القرضاوی، محمود محمد الصواف اور ڈاکٹر نجیب کیلانی جیسے درجنوں اصحاب فکر و قلم نے فکری میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اخوان کی اس فکری انقلاب کا اثر پوری دنیا میں دیکھا گیا اور ہر گوشے سے داد و تحسین کی صدائیں بلند ہوئیں۔

فکری میدان میں اخوان یا عام پبلک کی ذہن سازی کے لیے جو کتابیں تیار کی گئیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

- نظام الاسر (خاندانوں کا نظام) اس کتاب کو اخوان کے مرکز نے شائع کیا ہے۔ اس میں مصری سیاست کے عام پہلوؤں کو واضح کرتے ہوئے ان داخلی عوامل کی نشاندہی کی گئی ہے، جو تحریک اخوان کی تعمیر میں شروع سے کارفرما ہیں۔ ساتھ میں خاندانی نظام کو ظاہری و باطنی طور پر مستحکم کرنے کے لیے جن اصولوں کی ضرورت ہے، ان کی نشاندہی کی گئی ہے۔
- المرأة بين البيت والمجتمع (سوسائٹی اور گھر میں عورت کا مقام) تصنیف: ڈاکٹر بہی خولی۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ قدیم تمدنوں میں عورت کا کیا مقام تھا اور پھر اسلام نے ان کو کیا مقام دیا۔ خاندان کے حقوق، شادی، ازدواجی تعلقات، طلاق، ایک سے

زائد بیویاں، ضبط ولادت، عورت کی زیب وزینت، اولاد کے حقوق، گھر کا حق، عورت اور سوسائٹی، عورت اور کام، عورت کے سیاسی حقوق، ان تمام موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

- عقيدة المسلم (مسلمانوں کا عقیدہ) مصنف: محمد الغزالی۔ یہ عقیدہ پر ایک جامع تحقیقی کتاب ہے، جس میں الوہیت و توحید، صفات خداوندی، قضاو قدر، ایمان کی بنیادیں، گناہ و توبہ، رسالت وخلود وغیرہ پر جامع انداز میں بحث کی گئی ہے۔
- الاسلام وأوضاعنا القانونية (اسلام اور ہمارے قانونی احوال) مصنف: عبد القادر عودہ۔ اس کتاب میں مصنف نے یورپین سول قوانین اور ان کے بارے میں اسلام کی رائے کو پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ سماجی نظام کے لیے کس حد تک ضرر رساں ہے۔ بحث میں انہوں نے تقابلی طرز اختیار کیا ہے اور اسلام کی امتیازی حیثیت ثابت کرتے ہوئے رفاہ عام کے لیے اس کے قوانین کو اختیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔
- السياسة العامة للتربية والتعليم (تعلیم وتربیت کی عام پالیسی) اس میں تعلیم وتربیت۔ مراحل تعلیم اور نصاب تعلیم، امتحانات کے طریقوں اور ایک صالح استاد کی ٹریننگ جیسے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ (تحریک اخوان المسلمون، ماضی وحال، ص242-240)

7.4.5 عصری تقاضوں کے مطابق نظام تعلیم کی اصلاح

مدارس و جامعات نسل نو کی تربیت اور ان کی فکری نشو ونما کا اہم ذریعہ ہیں، اس لیے اس تحریک کے بانی اور اس کے وابستگان نے نظام تعلیم کو اپنی توجہات کا بنیادی مرکز سمجھا۔ تحریک کے نزدیک تعلیم کے درج ذیل مقاصد ہیں:

1. صالح نظریہ کی اشاعت
2. اخلاق فاضلہ کا فروغ
3. ماضی کے ساتھ وابستگی
4. علمی بنیادوں پر مختلف پہلوؤں میں ماہرین کی تیاری

تعلیم کے میدان میں خدمت انجام دینے کے لیے انہوں نے دو طریقے اپنائے:

1. پہلے مرحلہ میں حکومتوں تک اپنی تعلیمی اسکیم کو پہونچانے کا کام کیا گیا، ارباب اقتدار کو دعوتی خطوط لکھے گئے، ملکی قانون کو اسلامی قالب میں ڈھالنے کا مشورہ دیا گیا اور ان سے توقع ظاہر کی کہ مسلم بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے اسلامی ثقافت پر مبنی لٹریچر تیار کیا جائے۔ اس سلسلے میں خود اخوان نے تعلیمی اسکیم تیار کی، جس کا خلاصہ یہ ہے:
   - ایسی مضبوط پالیسی وضع کی جائے اور ایسا تعلیمی مواد فراہم کیا جائے جو اوپر ذکر کردہ مقاصد سے ہم آہنگ ہوں۔
   - اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب وتمدن کی تاریخ پر خصوصی توجہ دی جائے۔

- دینی تعلیم کو تمام تعلیمی مراحل میں بنیادی مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جائے۔
- لڑکیوں کے تعلیمی نظام اور نصاب پر نظر ثانی کی جائے اور ہر ہر مرحلے میں لڑکے اور لڑکیوں کے نصاب میں فرق کیا جائے۔
- ہر ایسے شخص کو تعلیم گاہوں سے دور رکھا جائے جو فساد عقیدہ اور فساد اخلاق میں مبتلا ہو۔
- سائنسی علوم پر توجہ دی جائے اور مغربی فلسفہ اور مغربی سائنس کا امتیاز واضح کیا جائے۔(اخوان المسلمون: تاریخ، دعوت، خدمات۔ خلیل حامدی، ص101-100)

2. دوسرے مرحلہ میں اخوان نے استطاعت بھر اپنی ایجوکیشن پالیسی کو نافذ کرنے کی کوشش کی اور اس کا سب سے آسان راستہ یہ تھا کہ اپنے زیر انتظام مکاتب، مدارس، اسکول اور تعلیمی سینٹرز قائم کیے جائیں۔ چنانچہ ملک میں اخوان کی جتنی شاخیں تھیں، ان تمام کے تحت مختلف تعلیمی سینٹرز قائم کیے گئے۔ لڑکے اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ ابتدائی وثانوی درس گاہیں قائم کیں، عوام الناس کو دین سے آشنا کرنے کے لیے عوامی مدارس کھولے، جو طلبہ کسی حکومتی یونیورسٹی امتحان میں ناکام ہو جاتے، ان کی کوچنگ کے انتظامات کیے گئے۔ لڑکیوں کے لیے مدارس امہات المؤمنین اور جو طلبہ مدارس میں مستقل نہیں رہ سکتے، ان کے لیے "مدارس جمعہ" کے نام سے قائم مدرسوں میں ہر جمعہ کی نماز سے پہلے تین گھنٹے حلقۂ درس لگائے جاتے۔

تعلیمی اسکیم کے عملی نفاذ کے ساتھ اخوان نے اسلامی ثقافت پر مبنی لٹریچر کی تیاری اور اس کی نشرواشاعت پر بھرپوری توجہ دی ہے۔اس کے لیے اخوان کے مرکز میں ایک شعبہ "اشاعت دعوت" کے نام سے قائم ہے، جو مختلف موضوعات پر لٹریچر کی تیاری کا کام انجام دیتا ہے۔ اخوان کے بانی رہ نما نے اس موضوع پر جو لٹریچر تیار کیا ہے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

- دعوتنا(ہماری دعوت) — حسن البنا
- هل نحن قوم عمليون(کیا ہم عملی لوگ ہیں) — حسن البنا
- الاخوان المسلمون تحت رأية القرآن(اخوان پرچم قرآن کے نیچے) — حسن البنا
- بين الأمس واليوم(کل اور آج) — حسن البنا
- المنهج الدراسي الاسلامي لاخوان الأسر (اخوانیوں کے اسلامی مطالعہ کا نصاب) — شعبۂ اشاعت دعوت

7.4.6 افراد سازی

افراد سازی کو اخوان کی تعلیمی اور تربیتی پالیسی کا مقصود اصلی کہا جا سکتا ہے۔ تعلیم کے میدان میں انہوں نے جو جدوجہد کی ہے، اس کے پیچھے یہی راز کارفرما تھا کہ ہماری تربیت کے نتیجے میں ایک ایسی نسل وجود میں آئے، جس کے ایک ہاتھ میں قرآن ہو، جس سے وہ زندگی کے ہر موڑ پر رہ نمائی حاصل کرتا ہو تو اس کے دوسرے ہاتھ میں دنیا کی باگ ڈور ہو، قوموں اور ملکوں کی قیادت کے لیے جو صلاحیتیں درکار ہیں، وہ ان تمام سے لیس ہو۔

افراد سازی کے لیے خاص طور پر امام حسن البنا نے ایک رسالہ "رسالة التعالیم" لکھا اور اس میں دس عناصر پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بتایا کہ دس ایسی خصوصیات یا عناصر ہیں جو اسلام کے ذریعہ پیدا ہوتی ہیں اور ایک مثالی شخصیت بننے کے لیے ان کا پایا جانا ضروری ہیں۔ وہ دس عناصر یہ ہیں:

1۔ فہم 2۔ اخلاص 3۔ عمل 4۔ جہاد 5۔ قربانی

6۔ اطاعت گزاری 7۔ ثابت قدمی 8۔ یکسوئی 9۔ بھائی چارگی 10۔ باہمی اعتماد

ان دس عناصر کو پیدا کرنے کے لیے اخوان نے ایک پالیسی پروگرام بھی تیار کیا، جس میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ کسی بھی فرد کی تربیت کے تین قسم کے وسائل کا پایا جانا نہایت ہی ضروری ہے:

1۔ مربی 2۔ صالح ماحول 3۔ مناسب دستور العمل

اسی طرح عورتوں اور بچوں کے لیے مناسب تعلیمی مواد فراہم کیا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ ہر شعبہ کی دو شاخیں ہوں گی: ایک نسوانی کام کے لیے اور دوسری بچوں کی صفوں میں کام کرنے کے لیے، ہر ایک کے حلقے ہوں گے، ہر ایک کی خاص رعایت ہوگی، ہر ایک کی مناسب کتابیں ہوں گی اور اس طرح کے ماحول میں کام کرنے سے جو فتنے پیدا ہو سکتے ہیں، ان سے بچنے کے لیے لازمی اور احتیاطی اقدامات کرنے چاہئیں۔ بچوں کی اس طرح تربیت کی جائے کہ وہ جسمانی، عقلی، قلبی، روحانی، عملی اور معاشی ہر طرح سے تیار ہو سکیں۔ بہادری کے کام اور بہادرانہ اخلاق کی ان کے اندر آبیاری ہو، ان کے لیے کھیل کود اور ورزش کا اہتمام کیا جائے۔ بچپن میں چوں کہ حافظہ تیز ہوتا ہے، اس لیے اسی عمر میں قرآن پاک، احادیث اور زیادہ سے زیادہ قواعد و آداب یاد کرادیں۔ مزید یہ کہ عورتوں کو ان کے خاص مسائل کے بارے میں بھی مکمل واقفیت ہو۔ (اخوان المسلمون: مقصد، مراحل، طریق کار۔ پروفیسر سعید حویٰ۔ ترجمہ عبید اللہ فہد فلاحی، ص104-103)

علامہ یوسف القرضاوی نے اپنی کتاب "اخوان المسلمون کا تربیتی نظام" میں اخوان کے تربیتی نظام کی مفصل وضاحت کی ہے۔ انہوں نے پانچ اہم نکات کا ذکر کیا ہے، جن پر اخوانی تربیت اپنی توجہ مرکوز کرتی ہے:

1. ربانیت: یعنی انسان نفس پرستی کے بجائے خدا پرستی کی طرف مکمل طور پر یکسو ہو جائے۔ اس سے ملاقات اور حساب و کتاب پر یقین کامل ہو، اسی کی رحمت کا طلب گار، اس کی سزاؤں سے خائف، دنیا کی بے جا محبت سے دوری، فرائض کا اہتمام، سنت کا التزام، نماز باجماعت کی پابندی، نوافل کا شوق اور ذکر الٰہی سے رغبت ہو۔
2. جامعیت: اس میں اعتقادی، فکری، اخلاقی، جسمانی، مجاہدانہ، اجتماعی اور سیاسی ہر طرح کی تربیت شامل ہے۔ اسی طرح مومن کی تربیت اس نہج پر ہو کہ مصائب و مشکلات پر صبر اور خوش حالی میں جذبۂ شکر بندۂ مومن کا وطیرہ بن جائے۔

3. تعمیر وایجابیت: اخوان کے بانی کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے فضول باتوں، بے کار مشغلوں اور دوسروں کے عیوب تلاش کرنے پر انہوں نے کبھی اپنی توجہ صرف نہیں کی۔ انہوں نے خود اپنی اور اخوان کے دوسرے نوجوانوں کی صلاحیتوں کا استعمال صرف تعمیری کام میں لگایا۔ ساتھ میں وہ گفتار کے نہیں بلکہ کردار کے غازی تھے، انہوں نے دوسروں کو ہمیشہ اسی کی دعوت دی۔ ایجابیت سے مراد یہ ہے کہ انفرادی عبادات کی لذت میں محصور ہو کر نہ رہا جائے، بلکہ سماجی برائیوں اور عوام کی مشکلات کی طرف بھی پوری توجہ کی جائے۔

4. اعتدال وتوازن: اخوان کے تربیتی نظام کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اعتدال وتوازن کا دامن کبھی بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ عقل وجذبات، مادہ وروح، نظریہ اور عمل، فرد اور معاشرہ، شوریٰ اور اطاعت اولی الامر، حقوق وواجبات اور قدیم وجدید کے درمیان ہمیشہ توازن برقرار رکھا۔

5. اخوت واجتماعیت: اخوت وبھائی چارگی اخوان کی تحریک کا سب سے نمایاں عنصر ہے۔ اس تحریک کے نام ہی میں یہ عنصر نمایاں ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان، چاہے ان کا تعلق کسی بھی نسل ورنگ اور خطے سے ہوں، بحیثیت مجموعی وہ بھائی ہیں۔ بانی تحریک نے اس عنصر کو اس لیے بھی نمایاں کیا کہ دنیا میں وحدت سے بڑی کوئی طاقت نہیں ہوتی۔ کسی بھی تحریک کی کامیابی کی پہلی شرط اس کے افراد کا باہم متحد (رحماء بينهم) ہو جانا ہے۔

7.4.7 صحافت

بیسویں صدی میں عالم اسلام میں جو انقلابات رونما ہوئے ہیں، ان میں سب سے مؤثر کردار صحافت کا رہا۔ 1884ء میں سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کی کوشش سے پہلا عربی مجلہ ”العروۃ الوثقیٰ“ کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے بعد عالم عرب بالخصوص مصر میں مجلات ورسائل کا تانتا بندھ گیا، اس کے بعد ہر طرح کے سماجی، سیاسی اور ادبی معرکہ کا سب سے بڑا میدان صحافت ہی کو تصور کیا جانے لگا۔ امام حسن البنا نے تحریک کے آغاز ہی میں اس کی ضرورت محسوس کرلی تھی، لیکن ان کے پاس اپنا مخصوص مجلہ نہ ہونے کی وجہ سے دیگر رسائل کی مدد سے اپنے افکار ونظریات کی اشاعت جاری رکھی؛ لیکن تحریک کے بڑھتے اثرات نے تقاضا کیا کہ اخوان کے دفتر سے بھی ایک مجلہ جاری کیا جائے، چنانچہ مجلس شوریٰ کے اتفاق سے 15/جون 1933ء میں ”مجلة الاخوان المسلمين“ کے نام سے پہلا شمارہ منظر عام پر آیا، جس کے ایڈیٹر شیخ طنطاوی جوھری منتخب ہوئے۔ جنوری 1938ء تک یہ مجلہ اخوان کے دفتر سے نکلتا رہا؛ لیکن چند اسباب کی وجہ سے یہ مجلہ اخوان کے ہاتھ سے نکل گیا۔

دوبارہ اخوان نے ”مجلة النذير“ کے نام سے مئی 1938ء میں دوسرا مجلہ جاری کیا، جس کے ایڈیٹر استاذ محمود ابوزید اور چیف ایڈیٹر استاذ صالح عشماوی منتخب ہوئے۔ اس مجلہ کے فرنٹ پر یہ الفاظ آویزاں تھے ”سیاسیة إسلامیة تصدر علیٰ مبادئ الاخوان المسلمین“۔ اس مجلہ میں دینی، سیاسی، معاشرتی مسائل، جیسے نوجوان، مسلم خواتین، تعلیم اور سماجی اصلاحات پر مبنی مضامین شائع ہوتے تھے؛ بالخصوص عالم عرب اس وقت جن چیلنجز کا سامنا کر رہا تھا، جسے عیسائی مشنریز، قادیانیت، بہائیت، استشراق، صہیونیت، ان تمام میں

اسلام کے پر وزور وکیل کی حیثیت سے اس نے اپنی خدمات انجام دیں۔ اور پھر جب طٰہ حسین کی کتاب "مستقبل الثقافة فی مصر" (مصر کا ثقافتی مستقبل) منظر عام پر آئی اور انہوں نے کھلے عام مغرب کی اندھی تقلید کا نظریہ پیش کیا تو اخوانی رہ نماؤں نے اس نظریہ کے بطلان کو واضح کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بقول خلیل حامدی "اخوان نے اپنی زوردار صحافت کے ذریعے مصر کی صحافتی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ لوگ فحش قصوں اور سنسنی خیز خبروں میں دل چسپی لینے کے بجائے ٹھوس مسائل میں دل چسپی لینے لگے۔(اخوان المسلمون: تاریخ، دعوت، خدمات۔ خلیل حامدی100-99)

دوسری عالمی جنگ کے اثر سے 2سال کی مدت تک یہ تحریک کوئی مجلہ شائع نہ کر سکی، 1942ء میں دوبارہ موقع ہاتھ آیا اور پھر "مجلۃ الاخوان المسلمون" ہی کے نام سے پندرہ روزہ رسالہ جاری ہوا۔ کچھ مہینے بعد ہفتہ واری نکلنے لگا اور پھر 1946ء میں یہ رسالہ، یومیہ جریدہ کی شکل میں بدل گیا۔ اس کے بعد مختلف حالات کی بنا پر ناموں کی تبدیلی کے ساتھ اخوان کے دفتر سے مختلف رسائل و جرائد نکلتے رہے، اخیر میں 28/ اکتوبر 2011ء میں "صحیفۃ الحریۃ والعدالۃ" کے نام سے ایک رسالہ منظر عام پر آیا؛ لیکن 2013ء میں اس پر بھی مکمل پابندی لگا دی گئی۔

مخصوص رسائل و جرائد کے علاوہ کچھ ایسے رسائل بھی تھے جن کی اشاعت کا سلسلہ دوسرے لوگوں نے شروع کیا تھا لیکن بوجوہ بند ہو گئے، ان رسائل کو اخوان نے عارضی مدت کے لیے اپنی تحویل میں لے لیا، جیسے "مجلة التعارف"، "مجلة المنار"، "مجلة المباحث القضائية"، "مجلة لواء الاسلام" اورصحيفة آفاق عربية"۔

7.4.8 اقتصادیات

اخوان نے شروع ہی سے اس ضرورت کا ادراک کر لیا تھا کہ جو تحریک شعبہ ہائے حیات میں قیادت کی علم بردار اور اس کی دعوے دار ہو، اس کے لیے عملی طور پر شعبہ ہائے حیات میں رہ نمائی اور مادی ضروریات کی تکمیل کے لیے اقدامات کرنا بھی ضروری ہے۔ اس ضرورت کی تکمیل کے لیے اس نے اقتصادی قوت کو بڑھانے پر بھرپور توجہ دی، ملک کے اندر متعدد تجارتی کمپنیاں قائم کی گئیں، جن کا منافع مضاربت کے اصولوں پر تقسیم ہوتا تھا۔

1. **اسلامی معاملات کمپنی:**

یہ کمپنی 1939ء میں قائم ہوئی۔ اس کمپنی نے ٹرانسپورٹ سروسیں کھولیں، پیتل کی ایک بہت بڑی فیکٹری قائم کی، جو مکمل اسٹو (گیس چولھے) اور اس کے مختلف پرزے بناتی تھی۔ اس کمپنی نے سیمنٹ کی ایک فیکٹری بھی قائم کی۔

2. **شرکت عربیہ:**

یہ کمپنی سنگ تراشی کے جدید ترین آلات درآمد کرتی تھی۔

3. **شرکت پارچہ بافی:**

1948ء میں اس کمپنی نے کپڑے بنانے کا کارخانہ کھولا۔ یہ کارخانہ بہترین پاپلین، ریشمی کپڑا، گبرڈین اور دوسرے پارچات تیار

کرتا تھا، جو بازار میں کم داموں میں فروخت ہوتے تھے۔

4. ٹریڈنگ اینجیز کمپنی

اس کمپنی نے پہلے سویز کے شہر میں اپنی تجارتی اسکیم شروع کی اور اس کا کام ترقی کر کے تجارت، باربرداری(موٹر) اور فن اشتہار(ایڈورٹائزنگ) تک پہونچ گیا۔ اس کا ہیڈکوارٹر قاہرہ میں قائم کیا گیا۔ ملک کے طول وعرض میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں۔

اس کے علاوہ شرکت مطبعہ اسلامیہ، شرکت جریدۂ یومیہ، شرکت تجارت واعمال ہندسہ اور شرکت تجاریہ کے نام سے مصر کے الگ الگ شہروں میں کمپنیاں قائم کی گئیں۔ ان کمپنیوں میں تجارت کے اصول خالص اسلامی تھے، سود سے پاک اس نظام کی طرف لوگ تیزی سے مائل ہوئے اور ایک بڑی تعداد اس میں شریک ہوگئی۔ ان کمپنیوں سے کثیر منافع کی وجہ سے بہت جلد اخوانیوں کی معاشی پوزیشن بہت ہی زیادہ مضبوط ہوگئی۔

7.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- اخوان المسلمون کا مقصد اسلامی نظام خلافت کا احیاء اور مسلمانوں کو مغرب کی غلامی سے نجات دلانا ہے۔
- یہ ایک ہمہ گیر تحریک ہے، جس میں اصلاح کے تمام پہلو موجود ہیں۔
- یہ تحریک اس بات کی قائل ہے کہ سیاست اسلام کا بنیادی حصہ ہے، اس کے بغیر دین کا ناقص تصور رہ جاتا ہے۔
- اس تحریک نے فکر وعقیدہ، نظام تعلیم وتربیت، سیاست، صحافت اور معیشت کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔
- سادگی، تلاوت، نماز، سپہ گری، حسن اخلاق جیسے اہم عناصر پر توجہ مرکوز کے بعد ہی کسی کی شخصیت لائق تقلید شخصیت ہوتی ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اسلامی نظام زندگی کا لائق اتباع ماڈل لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

7.6 نمونہ امتحانی سوالات

7.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. اخوان المسلمون کا قیام کب ہوا؟

(a). مارچ 1927 (b). مارچ 1928 (c). جولائی 1928 (d). اگست 1929

2. اخوان المسلمون کے بانی کون ہیں؟

(a). یوسف القرضاوی (b). محمد الغزالی (c). حسن البنا (d). سید قطب شہید

3. اخوان المسلمون کے دفتر سے جاری ہونے والے پہلا رسالہ کون سا ہے؟

(a). مجلہ اخوان المسلمین (b). مجلہ المنار (c). مجلۃ النذیر (d). مجلۃ الفتح

4. اخوان المسلمون کی تشکیل میں کل کتنے افراد شریک تھے؟

10.(a) 8.(b) 4.(c) 6.(d)

5. الاسلام وأوضاعنا القانونية (اسلام اور ہمارے قانونی احوال) کے مصنف کون ہیں؟

(a). محمد الغزالی (b). حسن البنا (c). عبد القادر عودۃ (d). ابو الحسن علی ندوی

7.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. اخوان المسلمون کے قیام کے مقصد پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالیے۔
2. امام حسن البنا کے اس قول: الله غايتنا والرسول قدوتنا والقرآن شرعتنا والجهاد سبيلنا والشهادة أمنيتنا کی مختصر تشریح کیجیے۔
3. حسن البنا کے نزدیک مثالی شخصیت بننے کے لیے کن دس عناصر کا پایا جانا ضروری ہے؟ لکھیے۔
4. اخوان المسلمون کی فکری بنیادوں پر مختصر نوٹ لکھیے۔
5. فکری انقلاب کے میدان میں اخوان کی خدمت پر روشنی ڈالیے۔

7.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. اخوان المسلمون نے افراد سازی کے لیے کیا پالیسی بنائی؟ تفصیل سے روشنی ڈالیے۔
2. حسن البنا کے نزدیک اسلامی عقیدہ کے عناصر کیا ہیں؟ مضمون لکھیے۔
3. اقتصادیات کے میدان میں اخوان کی کیا خدمات ہیں؟ بیان کیجیے۔

7.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تحریک اخوان المسلمین: ماضی وحال۔ محمد شوقی ذکی۔ اردو ترجمہ: ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی۔ مجلس نشریات اسلام، طبع دوم 1999ء
2. اخوان المسلمون کا تربیتی نظام۔ علامہ یوسف القرضاوی، ترجمہ عبید اللہ فہد فلاحی۔ ہندوستان پبلی کیشنز، دہلی 1982ء
3. اخوان المسلمون: تزکیہ، ادب، شہادت، عبید اللہ فہد فلاحی۔ القلم پبلی کیشنز، کشمیر 2011ء
4. اخوان المسلمون: تاریخ، دعوت، خدمات۔ خلیل احمد حامدی۔ مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی 1981ء
5. اخوان المسلمون: مقصد، مراحل، طریق کار۔ پروفیسر سعید حویٰ۔ ترجمہ عبید اللہ فہد فلاحی۔ ہندوستان پبلی کیشنز، دہلی 1982ء

اکائی 8: اخوان المسلمون (حصہ دوم)

اکائی کے اجزا:

8.0 تمہید

8.1 مقاصد

8.2 اخوان المسلمون آزمائشوں کے نرغے میں

8.2.1 عالم اسلام کو متحد کرنے کی کوشش

8.2.2 اخوان کے خلاف کریک ڈاؤن

8.2.3 اخوان پر مکمل پابندی اور حسن البنا کی شہادت

8.3 اخوان المسلمون کے مختلف رہ نما اور ان کے کارنامے

8.3.1 حسن بن اسماعیل الھضیبی

8.3.2 سید عمر تلسمانی

8.3.3 محمد حامد ابوالنصر

8.3.4 مصطفیٰ مشہور

8.3.5 شیخ مامون الھضیبی

8.3.6 محمد مہدی عاکف

8.4 اخوان المسلمون میں خواتین کی شراکت داری

8.4.1 اخوات مسلمات کی کارکردگی

8.4.2 صبر واستقامت کی انوکھی مثال: زینب الغزالی

8.5 اخوان المسلمون کی ایک سالہ حکومت

8.6 اخوان المسلمون کے عالمی اثرات

8.7 اکتسابی نتائج

8.8 نمونہ امتحانی سوالات
8.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
8.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
8.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
8.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

8.0 تمہید

اس اکائی میں یہ بتایا گیا ہے کہ اخوان المسلمون نے جب میدان سیاست میں قدم رکھا، حکومت کی غلط پالیسیوں پر تنقید کی اور ظالم وجابر حکومت کی جگہ ایک متبادل اور اسلامی خصوصیات کی حامل نظام حکومت کے قیام کا منصوبہ پیش کیا تو استعماری طاقتوں کی نیندیں اڑ گئیں اور پھر اس کے بعد تحریک آزمائشوں میں گھر گئی، اس کے رہ نماؤں کو قید وبند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں، یہاں تک کہ بانی تحریک کی شہادت کا سانحہ پیش آیا۔ اس کے بعد لگاتار آزمائشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس درمیان متعدد قائدین نے اس کی باگ ڈور سنبھالی اور راہ حق پر گامزن رہے۔ خواتین اسلام بھی اس معاملے میں کسی سے پیچھے نہ رہیں، تحریک اسلامی کی راہ میں ان کا نمایاں کردار بھی تاریخ کے صفحات میں درج ہے۔ دہائیوں کی کوشش کے بعد جب اس تحریک کو تخت سلطنت پر متمکن ہونے کا موقع ملا تو اس نے وقت کو غنیمت سمجھتے ہوئے وہ سب کچھ کر دکھایا جس کا اس نے برسوں سے وعدہ کیا تھا۔ ان تمام باتوں کا تفصیلی تذکرہ اس اکائی میں موجود ہے۔

8.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو یہ باور کرانا ہے کہ اخوان المسلمون نے جس راہ پر چلنے کی ٹھانی تھی، وہ کوئی آسان راہ نہیں تھی، بلکہ وہ کانٹوں سے بھری اور آزمائش ومشکلات سے پُر تھی۔ اس درمیان اس کے جیالوں نے قربانی کی جو انوکھی مثالیں پیش کیں، اور راستہ کی تنگی کے باوجود جس طرح اپنے مقصد پر گامزن رہے، وہ صبر واستقلال کی عظیم تاریخ ہے۔ اسی طرح یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ اخوات مسلمات کے تحت اسلام کی سربلندی کا خواب دیکھنے والی خواتین کی اس راہ میں کیا قربانیاں رہی ہیں اور اخوان نے اپنی ایک سالہ دور حکومت میں کیا کارنمایاں انجام دیے۔

8.2 اخوان المسلمون آزمائشوں کے نرغے میں

8.2.1 عالم اسلام کو متحد کرنے کی کوشش

گزشتہ اکائی میں یہ بتایا گیا تھا کہ اخوان المسلمون نے سیاست کو اپنی سرگرمی کا اہم حصہ بنایا اور پختہ دلائل کی روشنی میں اس بات کو ثابت کیا کہ اسلام کا سیاست سے بہت گہرا تعلق ہے۔ سیاست کے بغیر دین کا تصور ناقص اور بے مقصد ہو جاتا ہے۔ پانچ سال خاموش دعوت کے بعد 1933ء تا 1939 اسلامی نظریۂ سیاست کو پیش کرنے اور لوگوں میں سیاسی بیداری لانے کے لیے عام جلسوں، تقریروں اور کتابچوں کا سہارا لیا گیا۔ اس درمیان مسلم وزارتوں کو خطوط لکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ان خطوط میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل چالیس صفحات پر مشتمل حسن البنا کا وہ خط مانا جاتا ہے، جو انہوں نے 1936ء میں شاہ مصر فاروق، مصر کے وزیر اعظم مصطفیٰ نحاس پاشا، عرب اور دیگر مسلمان ملکوں کے سربراہان کے نام لکھا۔ حسن البنا نے اس خط کو "نحو النور" (روشنی کا پیغام) کا نام دیا۔ اس خط کا بنیادی مقصد استعماری طاقتوں کے خلاف عالم اسلام کو متحد کرنا تھا۔ اس میں انہوں نے مسلم حکمرانوں کو ان کے منصب کی اہمیت اور ذمہ داری کی طرف توجہ دلاتے ہوئے تین اہم شعبوں میں اصلاح کی طرف توجہ دلائی:

1. **سیاسی، عدالتی اور انتظامی شعبوں میں درج ذیل اصلاحات ہونی چاہئیں**

- گروہ بندیوں اور سیاسی جماعت بازیوں کا خاتمہ کیا جائے۔ امت کی تمام سیاسی توانائیوں کو ایک رخ پر لگایا جائے اور سب ایک پلیٹ فارم پر نظر آئیں۔
- قانون کی اصلاح کی جائے، یہاں تک کہ وہ تمام شکلوں میں شریعت اسلامی سے ہم آہنگ ہو جائے۔
- فوجی قوت مضبوط کی جائے، نوجوانوں کی زیادہ سے زیادہ ٹیمیں بنائی جائیں اور ان کے اندر جہاد کی اسپرٹ پیدا کی جائے۔
- خلافت اسلامیہ کی بازیابی کے لیے تمام عرب ممالک سے تعلقات استوار کیے جائیں۔
- سرکاری دفاتر میں اسلامی روح عام کی جائے۔ افسروں اور ملازموں کے شخصی معاملات کی نگرانی کی جائے، اگر ان میں سے کوئی رشوت لیتے ہوئے پکڑا جائے تو اسے سخت تعزیری سزا دی جائے۔

2. **تعلیمی اور اجتماعی شعبہ میں**

- عوام کو اسلامی آداب کا خوگر بنایا جائے۔
- عورت کے مسئلے کو اس طرح حل کیا جائے کہ وہ بھی ترقی کی دوڑ میں حصہ لے سکیں اور اس کے دامن عصمت پر کوئی چھینٹ تک نہ آسکے۔
- کھلی چھپی عصمت فروشی کا سدباب کیا جائے۔ زنا کو انتہائی گھناؤنا اور سنگین جرم تصور کیا جائے۔
- مخلوط تعلیم پر مکمل پابندی عائد کی جائے اور اس کے بالمقابل لڑکے اور لڑکیوں دونوں کے لیے علیٰحدہ تعلیم گاہیں بنائی جائیں اور ان

کے لیے ایسے معلمین اور معلمات کا انتخاب کیا جائے، جو کسی قسم کے فسق و فجور میں ملوث نہ ہوں۔

3. **معاشی میدان میں**

- زکوٰۃ کا اجتماعی نظام قائم کیا جائے اور اس سے ضرورت مندوں کی کفالت کی جائے۔

سود کا مکمل سد باب کیا جائے۔ غیر سودی بنک قائم کرے۔ تجارت کے فروغ اور امت کی معاشی پوزیشن بحال کرنے کے لیے لوگوں کو صنعتی قرضے دیے جائیں۔ جو لوگ معاشی اسکیم کا حصہ بنا چاہیں، ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

- بے روزگاروں کو روزگار فراہم کیا جائے۔ جو اسکیمیں غیروں کے ہاتھوں میں ہیں، اس سے ان کو بے دخل کیا جائے۔
- ذخیرہ اندوز کمپنیوں کی زیادتیوں پر روک لگائی جائے۔
- مزدوروں کی صنعتی و معاشرتی ضروریات پر توجہ دی جائے اور ان کا معیار زندگی کچھ اور بہتر بنایا جائے۔

اس طویل خط میں اور بھی بہت سے مشورے دیے گئے، سب سے اہم بات یہ کہ حسن البنا نے مسلم حکومتوں کے سامنے یہ پیش کش نہیں رکھی کہ اقتدار ہمارے حوالے کر دیا جائے، صرف اصلاحات کا مطالبہ کیا، مزید یہ امید بھی دلائی کہ اگر کوئی حکومت ان اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے آگے بڑھے تو ہم تن من دھن سے اس کے ساتھ کھڑے ہیں:

"ہم اپنی جانیں اور صلاحیتیں اور تمام چیزیں، ہر ایسی انجمن یا حکومت کے حوالے کرتے ہیں جو امت اسلامیہ کی ترقی کے لیے فکر مند ہو، ہم اس کی پکار پر لبیک کہیں گے اور تن من دھن سے اس پر قربان ہوں گے" (مجاہد کی اذاں، ص277)

خطوط کا سلسلہ جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ حسن البناؒ نے 1938ء کے پانچویں کانفرنس میں ایک جامع اور پُر مغز خطبہ پیش کیا، اس میں انہوں ایک تاریخی حقیقت لوگوں کے سامنے رکھی کہ جس سعادت کی تلاش ہم مسلمانوں کو ہے، اس کے چشمے خود ہمارے اندرون سے ابلتے ہیں۔ جس شقاوت و بدبختی سے ہم دوچار ہیں، اس کا سرچشمہ بھی ہمارا اندرون ہی ہے: إِنَّ اللَّهَ لاَ يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُواْ مَا بِأَنْفُسِهِمْ (سورہ رعد: 11) مزید انہوں نے اخوان المسلمون کی فکری بنیادوں کو آشکارا کرتے ہوئے استعماری طاقتوں کے خلاف کھل کر جہاد کی دعوت دی۔

اخوان کی اس واضح دوٹوک دعوت اور عملی میدان میں ان کے بے شمار اصلاحی اور تعمیراتی کام نے یونیورسٹی کے اساتذہ و طلبہ کو بے حد متأثر کیا۔ ان کے علاوہ تاجر، صنعت کار، انجینئر، ڈاکٹر اور وکلاء کی غیر معمولی تعداد اخوان سے قریب ہوگئی۔ زمینی سطح پر اخوان کے بڑھتے اثرات ہی وہ چنگاری تھی جس نے بے غیرت مسلم حکمرانوں اور اتحادی طاقتوں کی نیندیں اڑا دیں۔

8.2.2 اخوان کے خلاف کریک ڈاؤن

اخوان کے خلاف پہلا کریک ڈاؤن حسین سرّی کی وزارت میں ہوا، جو برطانوی سفارت خانہ کے دباؤ کی وجہ سے ہوا۔ اس مرحلہ میں اخوانی سربراہوں کو الگ الگ شہروں میں منتقل کر دیا گیا، ان کے ماہناموں، کتابچوں اور رسائل کی اشاعت یکسر روک دی گئی۔ لیکن جب

محسوس ہوا کہ ساری پابندیوں کے باوجود عوام کے درمیان ان کی مقبولیت میں کچھ کمی نہ آئی تو حسن البنا اور اخوان کے جنرل سکریٹری کو گرفتار کر لیا گیا، لیکن پھر عوامی دباؤ میں چند ہی دنوں میں رہا کر دیے گئے۔ حسین سرّی کے بعد مصطفیٰ نحاس کی وفد پارٹی کے اقتدار میں آجانے کے بعد حسن البنا نے "اسماعیلیہ" حلقۂ انتخاب سے پارلیمنٹ کا الیکشن لڑنا چاہا، لیکن وزیر اعظم نحاس نے حسن البنا کو نامزدگی واپس لینے کا مطالبہ کیا، مصلحت کے تحت حسن البنا نے اس مطالبہ کو تسلیم کر لیا، اس کا فوری اثر یہ ہوا کہ اس سے پہلے حکومت نے اخوان پر جو پابندیاں لگائی تھی، ان میں تخفیف کر دی گئی۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں جاری نہ رہ سکا۔ نحاس کے بعد احمد ماہر کی وزارت میں پہلے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تشدد کا معاملہ کیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران مصری حکومت نے اتحادی طاقتوں کے دباؤ میں آکر جرمنی اور اٹلی کے خلاف اعلان جنگ کیا، اخوانی تحریک کی جانب سے اس کی پرزور مخالفت ہوئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1945ء میں جنگ کے خاتمہ کے بعد اخوانیوں پر ابتلاء وآزمائش کا سب سے شدید ترین مرحلہ شروع ہو گیا۔

ایک طرف آزمائشوں میں شدت آئی تو دوسری طرف تحریک اخوان کی صدائے بازگشت مصر کے باہر بھی سنائی دینے لگی۔ تجارتی کمپنیوں کے قیام کے بعد مالی پوزیشن بھی مضبوط ہو گئی۔ اب یہ منصوبہ بنایا گیا کہ امت مسلمہ کے ہر فرد کی روحانی تربیت کے ساتھ اس کی جسمانی ٹریننگ بھی کی جائے، اس کے لیے فوجی دستے قائم کیے، ٹریننگ کے لیے جگہیں خاص کی گئیں۔ ممبران کو مستقل ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ اخوان کے بڑھتے اثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان حالات کے عینی شاہد محمد شوقی ذکی لکھتے ہیں:

"صرف مصر میں اس کے باقاعدہ ممبروں کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ تھی۔ تنہا مصر میں اس کے شعبوں کی تعداد دو ہزار ہے اور سوڈان میں پچاس شعبے، وہ شاخیں الگ ہیں جو بہت سے عربی ممالک اور اسلامی ممالک میں قائم ہیں۔ اسی طرح وہ مؤیدین بھی الگ ہیں، جو تمام اسلامی ممالک اور یورپ وامریکہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جماعت کا یہ حیرت انگیز پھیلاؤ، قبولیت اور دقیق عصری تنظیم یہی وہ چیزیں تھیں، جو دوسری جنگ عظیم کے بعد آنے والی مصری حکومتوں کی طرف سے اس کے مقابلے اور اس پر سخت گیری کا سبب بنیں۔" (تحریک اخوان المسلمون، ماضی وحال۔ محمد شوقی ذکی، ص:74-75)

8.2.3 اخوان پر مکمل پابندی اور حسن البنا کی شہادت

1948ء میں تحریک اخوان پر حکومت کی طرف سے مکمل پابندی لگا دی گئی، تحریک کے تمام کاغذات، عہد نامے، رسالے، مطبوعات، املاک وجائداد اور سرمایوں پر قبضہ کر لیا گیا، اس کے دو بڑے اسباب بتائے جاتے ہیں:

1. اخوان کے سربراہ نے برطانوی حکومت سے مصالحت کے بجائے کھلے عام جہاد کا نعرہ لگایا، اخبار ورسائل میں اس پر مضامین لکھے۔
2. اخوانیوں نے عرب لیگ کے ساتھ مل کر فلسطین کی جنگ میں حصہ لیا تھا۔
3. چند مہینوں کے بعد 12 / فروری 1949ء کی شام اخوان کے سربراہ امام حسن البنا پر ایک حکومتی افسر نے گولی چلا دی اور وہ شہید کر دیے گئے۔

8.3 اخوان المسلمون کے مختلف رہ نما اور ان کے کارنامے

حسن البنا کو مزاحمت کے راستہ سے ہٹا دیے جانے کے بعد اب استعماری طاقتوں کے لیے راستہ بالکل آسان ہو گیا، چنانچہ فوری طور پر ملک بھر میں پھیلے ہوئے اخوان کے نمائندوں اور کارندوں کی گرفتاری کا عمل شروع ہو گیا۔ ان کی شہادت گویا اس بات کا اعلان تھی کہ اب آزمائشوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ لیکن تحریک کے افراد نے ہمت نہ ہاری، بلکہ اپنے مشن پر پہلے سے زیادہ مستعدی کے ساتھ لگ گئے۔ اس درمیان اخوان کے مختلف رہ نماؤں نے تحریک کی باگ ڈور سنبھالی اور تن من دھن سے تحریک کی آبیاری کرتے رہے۔ ذیل میں چند رہنماؤں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے، جنھوں نے اپنی قربانیوں سے اسلامی تاریخ میں انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

8.3.1 حسن بن اسماعیل الہضیبی

17 / اکتوبر 1951ء کو اخوان نے شیخ حسن بن اسماعیل الہضیبی کو اپنا دوسرا مرشد عام منتخب کیا۔ انہوں نے یہ کوشش کی کہ اخوان حکومت سے کوئی تصادم مول نہ لیں اور ان کے اندر جبر و تشدد در نہ آنے پائے۔ اس سلسلہ میں انہیں اخوانی نوجوانوں کے ایک گروہ کی مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ چنانچہ آپ نے اخوان کی فکر پر مشتمل ایک ضخیم کتاب لکھی، جس کا نام تھا "دعاة لا قضاة" (ہم داعی ہیں، داروغہ نہیں) اس کی گیارہ فصلوں میں آپ نے یہ واضح کیا کہ افراد و اقوام کو زبردستی اور قوت کا استعمال کر کے راہ راست پر لانا ہمارا کام نہیں ہے۔ اسی طرح بعض اخوانی نوجوانوں کی طرف سے قوت کے استعمال یا دیگر مسائل میں سوالات پوچھے گئے، ان کا بھی قرآن و سنت کی روشنی میں تشفی بخش جواب دیا۔

اسی درمیان 1954ء کو جمال عبد الناصر پر قاتلانہ حملہ ہوا، جس کا الزام اخوان پر لگایا گیا اور چند ہفتوں میں اس کے پچاس ہزار کارکن گرفتار کر لیے گئے۔ فوجی عدالت نے 7 / نومبر کو چھ ممتاز اخوانی رہ نماؤں کے خلاف سزائے موت کا فیصلہ سنایا۔ ان میں ساتواں نام شیخ حسن ہضیبی کا تھا؛ لیکن درازی عمر کی وجہ سے ان کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ 1964ء میں تمام سیاسی قیدی رہا کر دیے گئے، ان میں شیخ بھی تھے۔ ایک سال کے اندر ہی جولائی 1965ء میں حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں تقریباً پچاس ہزار اخوانی پھر سے گرفتار کر لیے گئے، ان میں مرشد عام شیخ حسن الہضیبی، سید قطب، ان کے بھائی محمد قطب، ان کی دو بہنیں حمیدہ قطب اور امینہ قطب بھی شامل تھیں۔ تین سال کی قید بامشقت کے بعد شیخ ہضیبی رہا ہوئے؛ لیکن ان کے ساتھ جو زیادتی اور ناروا سلوک کیا گیا، تعذیب کے جن مراحل سے گزرنا پڑا، ان سب کی وجہ سے وہ پہلے کی طرح مستعد اور فعال نہ رہ سکے۔ پھر اسی حالت میں 1972ء میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

شیخ ہضیبی کا یہ جملہ مشہور تھا کہ "أقيموا دولة القرآن فى أنفسكم تقم في أرضكم" (قرآن کی حکومت اپنے دلوں میں قائم کر لو، زمین پر خود بہ خود قائم ہو جائے گی۔)

8.3.2 سید عمر تلسمانی

سید عمر تلسمانی کی امام حسن البنا سے پہلی ملاقات 1933ء میں ہوئی، جس کے بعد وہ اس تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ دوسرے اخوانی

رہنماؤں کے ساتھ انہوں نے بھی قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ مرشد دوم کی شہادت کے بعد وہ بالاتفاق مرشد عام (سوم) منتخب ہوئے۔ قیادت کا باگ ڈور سنبھالتے ہی انہوں نے سب سے پہلے حکومت کی پر تشدد پالیسی کے پس منظر میں حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے اپنی ساری توجہ تعلیمی اور تربیتی امور پر صرف کی۔ سید عمر تلسمانی نے زندگی بھر اسرائیلی ریاست کے قیام اور یہودیوں سے دوستانہ تعلقات رکھنے کی مخالفت کی۔ ان کا دور امارت 13/ برس پر محیط ہے۔

8.3.3 محمد حامد ابوالنصر

سید عمر تلسمانی کی وفات کے بعد شیخ محمد حامد ابوالنصر اخوان کے چوتھے مرشد عام منتخب ہوئے۔ ان کے دور میں تحریک اخوان کو پھر سے داخلی استحکام نصیب ہوا۔ لوگوں میں احساس ذمہ داری اور باہمی تعاون کے جذبے کو فروغ ملا۔ عصر حاضر میں عالمی تحریکات پر گہری نظر رکھنے والے مبصر ونقاد پروفیسر عبید اللہ فہد، اس عہد کی کامیابیوں اور اخوان کی سیاسی پوزیشن کا خلاصہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"استاد محمد حامد ابوالنصر کے دس سالہ دور قیادت میں اخوان نے سیاسی سطح پر غیر معمولی کامیابیاں حاصل کیں۔ گرچہ تنظیمی سطح پر وہ اب بھی خلاف قانون رہیں، مگر عوام میں اس کی جڑیں پھر گہری ہوئیں اور اس کے وجود کو برابر تسلیم کیا گیا۔ ملک کی پیشہ ورانہ تنظیموں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تدریسی انجمنوں پر اخوان کے کارکن اور رہنما حاوی رہے۔ ان کے تمام انتخابات میں اسلام پسندوں کو فتح حاصل ہوئی۔ اپریل 1987ء کے پارلیمانی انتخابات میں حزب العمل اور حزب الأحرار سے مفاہمت کرکے اخوانی کارکنوں نے حصہ لیا اور پہلی بار جماعت کی تاریخ میں مصری پارلیمنٹ میں 36/ اخوان امیدوار کامیاب ہوکر پہونچے اور کامیاب حزب اختلاف کا کردار ادا کیا۔ 1989ء کی مجلس شوریٰ کے وسط مدتی انتخابات میں بھی اخوان نے حصہ لیا۔ 1990ء کے پارلیمانی انتخابات کے مقاطعہ میں بھی اخوانی کارکنوں نے قائدانہ رول ادا کیا، بعد میں دوسری سیاسی پارٹیوں کو بھی اس مقاطعہ میں شامل ہونا پڑا۔ اخوان نے بائیکاٹ کا یہ فیصلہ ایمرجنسی کے قانون کی توسیع کے خلاف کیا تھا۔ 1992ء کے مقامی انتخابات میں بھی اخوان شامل رہے۔" (اخوان المسلمون: تزکیہ، ادب، شہادت، عبید اللہ فہد فلاحی۔ ص26-27)

8.3.4 مصطفیٰ مشہور

اخوان کے پانچویں مرشد عام مصطفیٰ مشہور کی شخصیت کئی اعتبار سے اہم ہے۔ 1996ء میں مرشد عام منتخب ہونے کے بعد سے انہوں نے اخوان کی پالیسی اور منہج عمل میں بہت کچھ تبدیلیاں کیں۔

حکومت کے سخت رد عمل اور مخصوص حالات (جن میں خاص طور پر مصر پر اتحادی طاقتوں کا وجود تھا) کے پس منظر میں بعض اخوان سے منسوب افراد کی جانب سے تشدد کے واقعات بھی سامنے آئے۔ لیکن مصطفیٰ مشہور نے اپنے پہلے خطاب میں یہ صراحت کی کہ تشدد کو کبھی بھی ہماری جانب سے اچھا نہیں سمجھا گیا۔ استاد مصطفیٰ مشہور کی شخصیت ایک ادیب، مصنف، خطیب اور مفکر کی حیثیت سے مشہور ہے۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ قضیہ تکفیر کا تجزیہ اور فکری انحراف کا محاکمہ ہے۔ قضیہ تکفیر کے سلسلے میں انہوں نے یہ موقف واضح کیا کہ:

- دوسرے کے ایمان واسلام کے بارے میں فیصلہ دیناکسی مسلمان پر واجب نہیں۔
- ہر مسلمان کی جان ومال اور عزت وآبرو محترم ہے۔اسے داغدار کرنے کا کسی کو حق نہیں۔
- راہ حق کی آزمائشیں انسانی غلطیوں کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ سنت الہی کا حصہ ہیں۔(اخوان المسلمون: تزکیہ، ادب، شہادت، عبید اللہ فہد فلاحی۔ ص:39)

پروفیسر خورشید احمد کی رائے میں ان کے تین کارنامے ایسے ہیں جو عرب دنیامیں تحریک کی تاریخ میں نمایاں ہیں:

- انہوں نے بڑے پُر آشوب دور میں تحریک کے پیغام ہی نہیں، اس کے پیغام کو عالمی بنیادوں پر استوار کیا اور وہ ہزاروں اخوان جو ہجرت کرکے دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ گئے تھے، ان کو پھر تحریک کے شیرازے سے منسلک کیا۔
- دوسری عظیم خدمت وہ حکمت عملی اور طریق کار کی تبدیلی ہے، جو ان کی قیادت میں آخری 30/ سال میں واقع ہوئی۔

نوجوانوں سے ان کی محبت، انہیں اپنی طرف کھینچنے اور تحریک میں سمو دینے کی ان کے اندر بھرپور صلاحیت تھی۔(اخوان المسلمون: تزکیہ، ادب، شہادت، عبید اللہ فہد فلاحی۔ ص:43)

8.3.5 شیخ مامون الھضیبی

مصطفیٰ مشہور 2002ء تک مرشد عام کی حیثیت سے اپنے فرائض ادا کرتے رہے، اس کے بعد شیخ مامون الھضیبی کا انتخاب عمل میں آیا۔ انہوں نے نوجوانوں کے فعال کردار کو خوب سراہا۔ مصطفیٰ مشہور کے دور میں اخوان کی پالیسی اور منہج عمل میں جو تبدیلی ہوئی اس کو عملی جامہ پہنانے کا انہوں نے کام کیا۔ صرف 14/ مہینے خدمت انجام دینے کے بعد اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔

8.3.6 محمد مہدی عاکف

ان کے بعد شیخ محمد مہدی عاکف مرشد عام منتخب ہوئے، انہوں نے 2004ء سے 2010ء تک اس ذمہ داری کو نبھایا۔ ان کے زمانے کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ان کی قیادت میں اخوانی رہ نماؤں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے 8/ دسمبر 2005ء کے پارلیمانی انتخابات میں حصہ لیا اور اپنی حیران کن جیت سے عرب دنیا اور مغربی میڈیا کو ششدر کردیا۔

شیخ محمد مہدی کے بعد شیخ محمد بدیع کا انتخاب ہوا، جو 2010ء سے 2013 تک اس منصب پر فائز رہے۔ پھر شیخ محمود عزت ابراہیم کو قائم مقام مرشد عام کے عہدہ پر سرفراز کیا گیا، وہ 2020ء تک اپنی ذمہ داری ادا کرتے رہے۔ ان کے قید میں جانے کے بعد ابراہیم منیر کو قائم مقام کا عہدہ دیا گیا، ایک سال تک اس منصب پر فائز رہنے کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔

اس وقت مرشد عام یا قائم مقام مرشد عام کی جگہ ایک کمیٹی قائم ہے، جو مرشد عام کے امور کو انجام دیتی ہے۔ اس کمیٹی کے سربراہ مصطفیٰ فہمی طلبہ حسن ہیں۔

8.4 اخوان المسلمون میں خواتین کی شراکت داری

اسلام کے نزدیک خواتین معاشرہ کی اہم یونٹ ہیں۔ سماج کی تعمیر وترقی میں ان کا بنیادی رول ہوتا ہے۔ ان کے تعاون اور فعال مشارکت کے بغیر کوئی بڑا انقلاب نہیں لایا جاسکتا ہے۔ تحریک اخوان المسلمون نے اس اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کو اپنی تحریک کا حصہ بنایا اور انہیں بھی ذمہ داریاں سونپی گئی۔ اخوان کی تاسیس کے 5 سال بعد 26/اپریل 1933ء میں حسن البنا نے 'اسماعیلیہ' میں "شعبۂ خواتین" کی بنیاد رکھی اور اس کی پہلی سربراہ مصر کی بہت ہی متحرک، فعال، باصلاحیت اور نیک سیرت خاتون سیدہ لبیبہ احمد منتخب ہوئیں۔

اس حلقہ کے تحت اسماعیلیہ کی پُرجوش، دینی غیرت وحمیت رکھنے والی خواتین نے نمایاں سرگرمی انجام دیں۔ ان کے عمل کا دائرہ گھر، خاندان اور محلہ کی خواتین اور بچیوں کی تعلیم وتربیت تک محدود تھا۔ اس کے لیے یومیہ اور ہفتہ واری دروس کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ 1937ء تک اپنی پوری سرگرمی کے ساتھ جاری رہا؛ لیکن اسی سال سیدہ لبیبہ کے حج پر جانے اور وہیں قیام پذیر ہوجانے کی وجہ سے دعوت وارشاد کے اس شعبہ میں وہ جوش باقی نہ رہا۔ چنانچہ 1944ء میں خواتین نے پھر سے اپنے شعبہ کو منظم کرنے کی ٹھانی۔ سربراہی کے لیے سیدہ نفیسہ حسین منتخب ہوئیں۔ تنظیم نو کے ساتھ "لجنة إرشاد عامة للأخوات" (جنرل گائڈینس کمیٹی برائے اخوات) بھی قائم کی گئی، اس کے ممبران میں سیدہ آمال عشماوی، سیدہ فاطمہ عبد الہادی، سیدہ امینہ علی اور سیدہ فاطمہ توفیق شامل تھیں۔ شعبہ کی بڑھتی سرگرمی کا نتیجہ تھا کہ 1948ء تک اس کی 50/شاخیں قائم ہوگئیں، جن سے پانچ ہزار خواتین منسلک تھیں۔

1948ء میں جب اخوان کو غیر قانونی جماعت قرار دیا گیا تو اخوات مسلمات کی سرگرمیاں بھی رک گئیں، لیکن اس دور ابتلا میں انہوں نے گرفتار اور قیدی اخوان کے خاندانوں کی نگہ داشت، ان کے یہاں آمد ورفت، ان کی دل بستگی اور ہمت افزائی میں بہت اہم رول ادا کیا۔ انہوں نے ایسے خاندانوں کو "کفالت باہمی" کی روح سے آشنا کیا، جس کا اسلام حکم دیتا ہے۔ (تحریک اخوان المسلمون، ماضی وحال۔ محمد شوقی ذکی، ص:244)

8.4.1 اخوات مسلمات کی کارکردگی

شعبہ اخوات مسلمات نے جن میدانوں میں نمایاں اثرات مرتب کیے، ان میں چند یہ ہیں:

1. اسلامی لباس

کہا جاتا ہے کہ جس وقت اخوات مسلمات نے اسلامی طرز لباس کو اختیار کرنے کی کوشش کی اور اپنے سر کو ڈھانپنے کے لیے ایک مخصوص کپڑے منتخب کیا، سماج بالخصوص عورتوں کی طرف سے ان کا مذاق اڑایا جاتا۔ اس کی دو وجہ تھی:

- اس وقت مصر مغربی تہذیب کا بہت زیادہ دلدادہ ہوچکا تھا، اس سماج میں اسلامی لباس کا اختیار کرنا خود ایک چیلنج تھا۔
- دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ سر کو ڈھانپنے کے لیے انہوں نے جس کپڑے کو منتخب کیا تھا، اس کا رنگ کالا تھا، اور کالے لباس کو غم کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ان دونوں وجوہات کی وجہ سے ان پر انگلیاں اٹھائی جاتیں۔

انہوں نے اس مشکل کا حل یہ نکالا کہ کالے کپڑے کے بجائے سفید چادر استعمال کی جائے، جس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ ان کا استہزا بند ہوا، بلکہ ملک میں مقبول بھی ہو گیا اور دوسری معزز خواتین نے بھی اس کا استعمال شروع کر دیا۔

2. خواتین کی دینی و روحانی تربیت

شعبہ اخوات نے شروع میں خواتین کی تعلیم و تربیت کے لیے خطابات کا نظام بنایا تھا، جس کے تحت اخوانی خطباء کی ان کے درمیان تقریر رکھی جاتی۔ لیکن بعد میں یہ احساس ہوا کہ یہ طریقہ زیادہ کارگر اور مفید نہیں ہے۔ چنانچہ پالیسی میں تبدیلی لاتے ہوئے سب سے پہلے عمر کے اعتبار سے خواتین کے الگ الگ گروپ بنائے گئے اور ہر گروپ کو "اُسَر" (خاندان) کا نام دیا گیا۔ پھر ان کی ذہنیت کے مطابق انہیں قرآن، حدیث، فقہ اور اخوانی لٹریچر سے آشنا کرایا جاتا۔

3. تربیت گاہ بنات

اس تربیت گاہ میں پہلے 42 لڑکیوں کو رکھا جاتا تھا، جن کی عمر 15 / سال سے زائد نہ ہو۔ اس میں دو درجے تھے، ان میں سے ہر ایک میں قرآن کریم اور دین کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ سلائی، کشیدہ کاری، دستکاری اور عملی طور پر گھر چلانے کی ٹریننگ دی جاتی تھی۔ 1949ء کے بعد اس کا دائرہ وسیع ہو گیا، اب 42 کے بجائے 124 بچیوں کا انتظام کیا گیا۔

4. طبقۂ نسواں میں اسلامی نظریۂ حیات کی اشاعت

اس کے لیے رسالے و پمفلٹ چھاپنا اور ان کو مختلف نسوانی حلقوں میں تقسیم کرنا، مکانوں پر پہنچانا، اسکولوں اور یونیورسٹی کی طالبات میں تقسیم کرنا، وغیرہ شامل ہے۔ (تحریک اخوان المسلمون، ماضی وحال۔ محمد شوقی ذکی، ص:255)

8.4.2 صبر واستقامت کی انوکھی مثال: زینب الغزالی

اخوات مسلمات کی کارکردگی کی داستان نامکمل رہ جاتی ہے، اگر مصر کی باہمت، پُرعزم اور صبر واستقامت کی انوکھی مثال سیدہ زینب غزالی کا تذکرہ نہ ہو۔ 1937ء میں انہوں نے "سیدات مسلمات" کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی، جس کا مقصد دعوت حق کی اشاعت اور ایک ایسی مسلم امت تیار کرنا تھا، جو اسلام کی عزت وآبرو اور اسلام کی حکمرانی بحال کرے۔ ایک سال بعد ہی ان کا تعارف اخوان المسلمون سے ہوا۔ امام حسن البنا نے ان سے "اخوات مسلمات" میں شامل ہونے کی خواہش ظاہر کی؛ لیکن پہلے مرحلہ میں انہوں نے تنظیم میں براہ راست شامل ہونے کے بجائے باہمی تعاون کا عہد کیا اور یہ سلسلہ شروع بھی ہو گیا۔ 1948ء میں خود انہوں نے اپنی تنظیم کو "اخوات مسلمات" میں ضم ہونے کی خواہش کی؛ لیکن حالات نامساعد تھے، اس لیے امام حسن البنا نے مشورہ دیا کہ مصلحتاً "سیدات مسلمات" کو اخوان میں ضم نہ کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور پھر وہ ایک متحرک اور فعال سربراہ کی حیثیت سے اس تحریک کی سرگرمیوں سے وابستہ ہو گئیں۔

حسن البنا کی شہادت کے بعد دوسرے اخوانی رہ نماؤں کی قیادت وسرپرستی میں زینب الغزالی کا کام پورے زور وشور سے جاری رہا۔ اس درمیان جو اخوانی گرفتار ہوتے، ان کے بچوں کی کفالت ونگہ داشت، کھانے پینے کا انتظام، ان کی حوصلہ افزائی جیسے امور کو انجام

دینے میں سرگرم رہتیں۔ ساتھ ہی نئی نسل کے اندر درس وتدریس کے ذریعے اسلام کی تبلیغ بھی کرتی تھیں۔ یہ وہی زمانہ تھا جس میں جمال عبدالناصر کا طوطی بول رہا تھا، اخوانیوں کی طرف نظر کرم اٹھا کر دیکھنا بھی سنگین جرم تھا۔ بالآخر 20/ اگست 1965ء کو ایک سورج ایسا طلوع ہوا، جس میں دوسرے قائدین کے ساتھ انہیں بھی گرفتار کرلیا گیا۔ زینب الغزالی اور دوسرے اخوانی قائدین وکارکنان کے ساتھ جیل میں جو کچھ پیش آتا ہے، اس کی تفصیلی روداد خود زینب غزالی نے "أيام من حياتي" کے نام سے مرتب کی ہے، اس کا اردو ترجمہ "زنداں کے شب وروز" کے نام سے خلیل احمد حامدی نے کیا ہے۔ جب انہیں پہلی مرتبہ جیل کی کال کوٹھری میں بند کیا گیا اور ان کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کیا گیا، اس کو بیان کرتی ہوئی لکھتی ہیں:

"کوٹھری داخل کیا ہوئی، گویا کوٹھری نے مجھے نگل لیا۔ میں نے قدم رکھتے ہی کہا: بسم اللہ، السلام علیکم "۔ دروازہ بند کر دیا گیا اور نہایت شدید و تیز روشنیاں جلادی گئیں۔ یہ بھی تعذیب کی ایک شکل تھی۔ کوٹھری کتوں سے بھری ہوئی تھی۔ نجانے کتنے کتے تھے!

میں نے آنکھیں موندلیں۔ شدت خوف سے ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔ کوٹھری کا دروازہ زنجیروں اور تالوں سے مسدود کر دیا گیا اور کتے مجھے چمٹ گئے۔ میرا سارا جسم ان کی زد میں آگیا؛ میرا سر، میرے ہاتھ، میری چھاتی، میری پشت۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میرے جسم کے ہر حصے میں کتوں کے دانت پیوست ہو رہے ہیں۔ گھبرا کر پھر میں نے آنکھیں کھول لیں، مگر وحشتناک کیفیت دیکھ کر جلدی سے بند کر لیں۔ ہاتھ بغلوں میں دے لیے اور اسمائے حسنیٰ کا ورد شروع کر دیا۔" (زنداں کے شب وروز، ترجمہ: خلیل احمد حامدی، ص74)

زینب غزالی کی طرح اخوان المسلمون کے رہ نماؤں کی مجاہد بیویاں بھی مردوں کے شانہ بہ شانہ اس کار عزیمت میں مصروف تھیں۔ حسن البنا، شیخ اسماعیل ہضیبی اور دیگر قائدین کی شریک حیات کے تذکرہ میں یہ بات ملتی ہے کہ تحریک کے مشکل ترین حالات میں بھی انہوں نے ایک نیک بیوی کے ساتھ بہترین مربی کا کردار نبھایا۔

8.5 اخوان المسلمون کی ایک سالہ حکومت

اخوان المسلمون نے تقریباً سات دہائی سے زیادہ عرصہ تک اسلامی نظام حکومت کو قائم کرنے کی لگاتار کوششیں کیں؛ لیکن یہ زریں موقع ان کے ہاتھ 24/ جون 2012ء کو آیا جب مشہور اخوانی رہ نما ڈاکٹر محمد مرسی مصری عوام کی بھرپور تائید کے بعد باقاعدہ صدر منتخب ہوئے۔ یہ حکومت 3/ جولائی 2013ء تک رہی۔ اس درمیان مصری سیاست میں جو تبدیلیاں آئیں اور جو کارنامے اس حکومت کے ذریعے انجام دیے گئے، اس کی فہرست طویل ہے۔ اختصار کے ساتھ چند چیزیں ذکر کی جاتی ہیں:

1. **داخلی محاذ میں کی گئی اصلاحات**

- **فوجی راج کا خاتمہ اور اجتماعی نظام عدل کا قیام:** 60 برس تک اقتدار پر قابض رہنے والی سیاہ وسفید کی مالک فوج کو حکومت کے ساتھ بیرک میں پہونچا کر عدل وانصاف پر مبنی نئے نظام حکمرانی کو متعارف کرایا اور ملک کو خود مختاری، تعمیر وترقی، خوش حالی اور کامیابی کی طرف لے جانے والا نیا دستور عطا کیا۔
- **صدارتی کونسل کی تشکیل:** صدر کی من مانی کو کنٹرول کرنے کے لیے صدارتی کونسل کی تشکیل کی جن میں مختلف میدانوں کے

ماہرین کو داخلی، خارجی اور سیاسی امور کی ذمہ داریاں دی گئیں۔

- **عوامی نمائندہ حکومت کا قیام:** ڈاکٹر ہشام قندیل کی سربراہی میں ایسی حکومت قائم کی جس میں جماعتی وسیاسی وابستگی سے اوپر اٹھ کر فنی مہارت اور قومی نمائندگی کو ترجیح دی گئی۔ 135 / افراد کی کابینہ میں صرف 5 / افراد اخوان کیڈر کے شامل کیے گئے، باقی افراد حریف جماعتوں کے نمائندے یا فنی ماہرین تھے۔
- **اداروں کی تشکیل جدید:** انتظامی اداروں سے بدعنوان افسر کو برطرف کرکے لائق اور ایماندار افسران کی تقرری کی اور جدید آلات کے تناظر میں نئی منصوبہ بندی کی تاکہ ارتقاء کے عمل میں تیزی لائی جاسکے۔
- **سیاسی قیدیوں کی رہائی:** حسنی مبارک کے ظالمانہ نظام میں ہزاروں افراد بلا کسی جرم یا سلطان جائر کے سامنے کلمہ حق بلند کرنے کے جرم میں جیلوں میں بند تھے۔ ڈاکٹر مرسی نے ایسے ہزاروں معصوموں کو قانونی طریقے سے رہائی دلائی۔

2. **خارجی محاذ پر انجام دیے گیے کارنامے**

- **مسئلہ فلسطین:** ڈاکٹر مرسی نے مسئلہ فلسطین کو حل کرنے کے لیے سنجیدہ کوششیں کیں۔ حماس کو خاطر خواہ اہمیت دی، ان کے لیے سہولیات بہم پہونچائیں۔ رفاہ کے دروازے کھول دیے، جس سے 16 / لاکھ فلسطینیوں کو راحت ملی۔ اپنے وزیر اعظم کو فلسطینیوں کی حمایت کا اعلان کرنے کے لیے عین جنگ کے دوران فلسطین بھیجا اور اسرائیل کو دوٹوک انداز میں معاہدات کی پاسداری کی تلقین کی۔ اس کے علاوہ سعودی عرب، افریقی یونین، ایران، چین اور ہندوستان سے روابط مضبوط کیے۔
- **معاشی اصلاحات:** پائیدار معاشی استحکام کے لیے 'النہضہ' پروجیکٹ کا تفصیلی خاکہ پیش کیا، جو بیس سالہ طویل المیعاد منصوبہ تھا اور جس کے ذریعے توقع تھی کہ سماجی اور معاشی استحکام کی طرف ملک زبردست پیش رفت کرے گا۔ اسی طرح توانائی، زراعت اور تعمیر نو کے کئی منصوبوں کے لیے ترکی۔ قطر، چین اور سعودی عرب سے اربوں ڈالی کی سرمایہ کاری کی، وغیرہ۔
- **تعلیم:** اقتدار سنبھالتے ہی ڈاکٹر مرسی نے پرائمری اور ثانوی درجات کے اسکولوں کی تعداد میں اضافہ کیا، اس کے نصاب تعلیم کو اخلاقیات سے آراستہ کرنے کے لیے انقلابی تبدیلیاں کیں۔ جامع ازہر کو مذہبی پیشوائی کا مقام دلایا، ملکی جامعات کی اسناد کا بیرون ممالک کی جامعات سے معادلہ کرایا۔ سائنس وٹکنالوجی کے میدان میں اعلیٰ سطح کے اداروں کے قیام کے لیے کئی نئے پروجیکٹ شروع کرائے۔ اساتذہ کی تنخواہ میں اضافہ کروایا۔

8.6 اخوان المسلمون کے عالمی اثرات

اخوان المسلمون کے عزائم ومقاصد، عظیم کارناموں اور اس کے قائدین کی قربانیوں نے بہت ہی جلد اس تحریک کو ایک عالمی تحریک کی شکل دے دی۔ وادئ نیل سے اٹھنے والی یہ لہر دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ گئی۔ اس تحریک کی برکت سے تمام عربی ممالک میں ذہنی، اخلاقی اور تہذیبی حرکت کا رخ بدل گیا۔ قوم پرستی، الحاد اور مغربی تقلید کا زور ٹوٹ گیا۔

شاید ہی دنیا کا کوئی ملک ہو، جہاں کی اسلامی تحریکات اور اسلام پسند افراد اخوان المسلمون کی فکر سے متاثر نہ ہو۔ سرفہرست ممالک

میں :فلسطین، شام، عراق، اردن، لبنان، سوڈان، کویت، ایران، بحرین، متحدہ عرب امارات، جزائر، افغانستان، سعودی عرب، پاکستان، مراکش اور الجزائر۔ ان تمام ممالک میں بڑی تعداد میں اخوان سے وابستہ افراد موجود ہیں۔ لیبیا، مغرب اور تیونس میں بھی اس کے اراکین کی ایک تعداد ہے۔ ملائیشیا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں اسلام پسند لوگوں کی ایک بڑی تعداد اگرچہ پہلے سے موجود تھی اور وہ تبدیلی کے خواہاں بھی تھے؛ لیکن ان کے ساتھ کوئی مستحکم اور منصوبہ بند پالیسی نہیں تھی۔ البتہ جب اخوان المسلمون سے ان کی آشنائی بڑھی تو پھر اسی طرز پر وہاں بھی 1951ء میں ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی گئی۔

یورپ وامریکہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں موجود اکثر اسلامی تحریکات اخوان المسلمون کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ چنانچہ جو لوگ مصری حکومت کی ظلم وزیادتی کی وجہ سے یورپین ممالک منتقل ہوئے، انہوں نے باضابطہ وہاں اخوان کے طرز پر تحریکیں قائم کیں، جو اسی روح کے ساتھ کار فرما ہیں۔ 2020 کے جائزہ کے مطابق صرف فرانس میں 147 / مساجد اور 18 / اسلامی مدارس اخوان کے تحت چلتے ہیں، جب کہ اخوانی کارکنوں کی تعداد پچاس ہزار ہے۔ اٹلی میں 1990ء میں ایک اسلامی تنظیم Ucoii کا قیام ہوا۔ اٹلی کی 500 / مساجد میں سے 150 اسی کے تحت ہیں۔ اسی طرح امریکہ میں بھی 1992ء میں Muslim American Society کے نام سے ایک اسلامی تنظیم اخوان کے طرز پر اپنی خدمات انجام دے رہی ہے۔

8.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- اخوان المسلمون نے جب سیاست کے میدان میں قدم رکھا، تبھی سے ان پر مشکلات کی بارش شروع ہوگئی، بار بار انہیں قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں، وہ ایک بڑی تعداد میں شہید کیے گئے، لیکن کبھی بھی اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹے۔
- بانی تحریک کی طرح دوسرے قائدین نے بھی ہر طرح کی قربانیاں پیش کیں، اور حسب ضرورت منہج کار میں تبدیلی لاتے رہے۔
- دینی غیرت وحمیت رکھنے والی خواتین ہمیشہ سے اس تحریک کا حصہ رہیں، اور امور خانہ داری کے ساتھ مردوں کے شانہ بہ شانہ انہوں نے بھی مجاہدانہ زندگی گزاریں۔
- اخوان کی ایک سالہ حکومت میں جو انقلابات اور اصلاحات ہوئیں، وہ پچھلے ساٹھ سال میں بھی نہیں ہوئیں۔
- اخوان المسلمون کا قیام اگرچہ مصر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوا، لیکن اس وقت یہ دنیا کی بڑی اسلامی تحریک ہے۔ دنیا کے ہر گوشے میں ان کے کارکن موجود ہیں۔

8.8 نمونہ امتحانی سوالات

8.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. زنداں کے شب وروز کس کی تصنیف ہے؟

(a). سیدہ لبیبہ احمد (b). زینب الغزالی (c). حمیدہ قطب (d). سیدہ فاطمہ توفیق

2. اخوان کی ایک سالہ حکومت کب قائم کوئی اور اس کے صدر کون تھے؟

(a). جولائی 2010۔ڈاکٹر محمد عمارہ (b). جون 2013 مہدی عاکف

(c). اگست 2012 مامون الھضیبی (d). جون 2012 ڈاکٹر محمد مرسی

3. امام حسن البنا کی شہادت کب ہوئی؟

(a). 12 فروری 1949 (b). 14 جولائی 1948 (c). 10 فروری 1950 (d). 26 دسمبر 1948

4. شعبۂ خواتین کی پہلی سربراہ کون تھیں؟

(a). حمیدہ قطب (b). سیدہ فاطمہ توفیق (c). سیدہ لبیبہ احمد (d). زینب الغزالی

5. حسن البنا کی شہادت کے بعد کون سب سے پہلے اخوان کے مرشد عام منتخب ہوئے؟

(a). سید عمر تلسمانی (b). حسن بن اسماعیل الھضیبی (c). مصطفیٰ مشہور (d). محمد حامد ابوالنصر

8.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. زنداں کے شب وروز میں کس چیز کی روداد بیان کی گئی ہے؟ تحریر کیجیے۔
2. پروفیسر خورشید کی رائے میں مصطفیٰ مشہور کے کون سے تین کارنامے ایسے ہیں، جو عرب دنیا میں تحریک کی تاریخ میں نمایاں ہیں؟
3. تنظیم "سیدات مسلمات" کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ مختصراً تحریر کریں۔
4. اخوان پر مکمل پابندی کے دو بڑے اسباب بیان کیجیے۔
5. اسلامی لباس کے سلسلے میں اخوانی خواتین کو کیا مشکل درپیش آئی؟ جائزہ لیجیے۔

8.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. اخوان المسلمون کی ایک سالہ حکومت میں انجام دی گئیں خدمات پر روشنی ڈالیے۔
2. حسن البنانے عالم اسلام کو متحد کرنے کے لیے کون سا طریقہ اپنایا؟ بیان کیجیے۔
3. شعبۂ خواتین "اخوات مسلمات" کی سرگرمیوں پر نوٹ لکھیے۔

8.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. اخوان المسلمون: تزکیہ، ادب، شہادت۔ پروفیسر عبید اللہ فہد فلاحی۔ القلم پبلی کیشنز، کشمیر 2011ء
2. تحریک اخوان المسلمین: ماضی و حال۔ محمد شوقی ذکی۔ اردو ترجمہ: ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی۔ مجلس نشریات اسلام، طبع
3. اخوان المسلمون: تاریخ، دعوت، خدمات۔ خلیل احمد حامدی۔ مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی 1981ء دوم 1999ء
4. زنداں کے شب وروز، زینب الغزالی۔ ترجمہ: خلیل احمد حامدی۔ ہندوستان پبلی کیشنز، دہلی

اکائی 9: نہضۃ العلماء

اکائی کے اجزا:

9.0 تمہید

9.1 مقاصد

9.2 نہضۃ العلماء کا تعارف

9.3 تاریخی پس منظر

9.3.1 مذہبی

9.4 تنظیمی ڈھانچہ

9.4.1 نہضۃ العلماء کی روایتی (پیری مریدی) تعلیم پر ایک نظر

9.5 مذہبی و سماجی مسائل

9.6 سیاسی سرگرمیاں

9.7 سو سالہ جلسہ اور قرارداد

9.8 اکتسابی نتائج

9.9 نمونہ امتحانی سوالات

9.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

9.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

9.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

9.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

9.0 تمہید

عالم اسلام میں استعماریت اور اس کے مابعد اثرات کی بنا پر مسلم دنیا کے تمام خطوں میں حالات یکساں نہیں رہے۔ اسی لیے اسلام کی بقا اور مسلمانوں کی اصلاح، فلاح و بہبود کے لیے رونما ہونے والی تحریکیں بھی ہر ملک میں مختلف تناظر کے ساتھ وجود پذیر ہوئیں۔ اور عالم اسلام کی یہ تحریکات باہم ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہوئے بھی مسلم دنیا کی تعمیر جدید میں اہم کردار کی حامل رہیں اور ان میں سے ہر جماعت اور تحریک اپنی اپنی سطح پر اپنے مفوضہ کردار کو ادا کر رہی ہیں اور اثرات کے اعتبار سے بھی اپنے اپنے علاقے میں نہایت موثر ہیں۔ اس اکائی میں آپ مشرق بعید کے ایک ملک انڈونیشیا کے ملک میں رونما ہونے والی ایک تحریک نہضۃ العلماء کے بارے میں جانیں گے کہ کس پس منظر میں اس تحریک کا آغاز ہوا اور آج یہ کن عوامل اور کارناموں کی بنیاد پر مسلم دنیا کی سب سے بااثر غیر سرکاری تنظیم کے طور پر جانی جاتی ہے۔

9.1 مقاصد

اس اکائی کا بنیادی مقصد ہے کہ انڈونیشیا کی سماجی، مذہبی اور سیاسی صورت حال کا ایک جائزہ لیا جائے اور نہضۃ العلماء کے قیام کے اغراض و مقاصد بیان کیے جائیں تاکہ طلبہ نہضۃ العلماء کا مذہبی رجحانات، اس کا نشان، تنظیمی ڈھانچہ، طرز تعلیم، مذہبی و سماجی مسائل سے وابستگی، سیاسی سرگرمیاں اور اس کے صد سالہ جلسہ میں لیے گیے فیصلوں سے واقف ہو سکیں۔

9.2 نہضۃ العلماء کا تعارف

نہضۃ العلماء کے مرکزی بورڈ Pengurus Besar Nahdatul Ulama(PBNU) کا دعویٰ ہے کہ انڈونیشیا میں 60 ملین اراکین ہیں اور پوری دنیا میں تقریباً 30 ملین مزید ہیں۔ یہ نہضۃ العلماء کو پوری دنیا کی سب سے بڑی آزاد اسلامی تنظیم بناتا ہے۔ عوام سے رابطہ اور ان کی بنیادی ضروریات و خدمات کو پورا کرنے کے لئے نہضۃ العلماء نے جکارتہ میں مرکزی بورڈ (Pengurus Besar)، صوبوں میں علاقائی بورڈ (Pengurus Wilayah)، قصبوں یا اضلاع میں برانچ بورڈ (Pengurus Cabang)، ذیلی اضلاع میں مجلیس وکیل (CabangMajelis Wakil) اور دیہات میں برانچ بورڈ (Pengurus Ranting) وغیرہ پورے انڈونیشیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اسی طرح بیرون ملک میں مقیم ممبران کے لیے، نہضۃ العلماء نے کئی ممالک میں خصوصی برانچ بورڈز (IstimewaPengurus Cabang) کا آغاز کیا ہے۔ اس کے علاوہ نہضۃ العلماء میں خواتین، یونیورسٹی کی طالبات، اسکولوں یا مدارس کی طالبات، علماء، کاروباری افراد اور دیگر لوگوں کے لیے نیم خود مختار تنظیمیں ہیں، جو مرکزی بورڈ سے لے کر برانچ بورڈ تک پھیلی ہوئی ہیں، قائم کی گئی ہیں۔

اس کے اراکین اور کمیونٹیز کے ذمہ داریوں میں سطحی تنظیموں کو تشکیل دینا، ان کی نگرانی کرنا، تمام سطحوں پر قیادت کرنا، نظر ثانی کرنا، مختلف مقاموں کے دورے کرنا اور دیگر تنظیمی ضروریات کو پورا کرنا شامل ہیں۔ ان کے خدمات میں تنظیمی ورکشاپس اور عوام کی تربیت شامل ہیں تاکہ نہضۃ العلماء کی تاریخ، تھیولوجی، سرگرمیاں، مصنوعات، نیٹ ورکس، سیاسی پالیسیوں اور حکمت عملیوں اور مستقبل کے

متعلق معلومات فراہم کی جاسکے۔ علاوہ بریں نہضۃ العلماء ہسپتال اور صحت کی خدمات، اسکولوں سے لے کر یونیورسٹیوں تک کے تعلیمی ادارے، زرعی گروپس کو بہت سی سہولیات بھی فراہم کرتا ہے۔ علاوہ بریں نہضۃ العلماء غیر اراکین کے لیے بھی خدمات فراہم کرتا ہے کیونکہ اس کے رہنما احمد صدیق اور عبد الرحمٰن واحد نے 1984 میں تحریک کی نیشنل کانگریس میں باضابطہ طور پر "پنج سیلا (Pancasila) کے سرکاری نظریے کو اس کی 'واحد بنیاد' کے طور پر قبول کیا تھا"۔

9.3 تاریخی پس منظر

نہضۃ العلماء کی تاریخ کو چار مراحل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

1. ابتدائی مرحلہ میں نہضۃ العلماء نے سماجی مذہبی تنظیم کے طور پر خدمات انجام دیں۔
2. 1930 کی دہائی کے آخر سے 1984 تک یہ سیاسی سرگرمیوں میں شامل رہا۔ 1952-1971 تک اس کی اپنی سیاسی جماعت تھی اور اس نے قومی کابینہ میں حصہ لیا۔
3. جب سہارتو حکومت نے اپنے جابرانہ ضوابط سے تمام سیاسی جماعتوں کو غیر موثر کر دیا تو نہضۃ العلماء نے سیاست چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا اظہار 1984 میں کیا گیا جسے 'کمبلی کے کھٹہ' (Kembali ke khittah) کہا جاتا ہے، جو 1926 کے اصل چارٹر کی طرف واپسی ہے۔
4. 1998 میں سہارتو کے خاتمے کے بعد نہضۃ العلماء دوبارہ قومی سیاست میں شامل ہو گئی۔ اس نے نیشنل اویکننگ پارٹی (PKB) کا آغاز کیا جبکہ اس کے قومی سربراہ عبد الرحمن واحد کو مختصر مدت (1999-2001) کے لیے انڈونیشیا کا چوتھا صدر منتخب کیا گیا۔

نہضۃ العلماء باضابطہ طور پر 31 جنوری 1926 (16 رجب 1344 ہجری) میں قائم کیا گیا۔ نہضۃ العلماء (The Revival of Ulama') انڈونیشیا کے جزیرہ نما یا جنوب مشرقی ایشیا کی تاریخ میں یکایک ظاہر نہیں ہوا۔ مورخین اس تحریک کی ابتدا 1926 کے اوائل میں بتاتے ہیں تاہم اس کا سراغ بیسویں صدی سے پہلے بھی ملتا ہے۔ اس کے علمی اور نظریاتی آثار اس جزیرہ نما میں اسلام کی آمد سے ہی ملتے ہیں۔ نہضۃ العلماء کی بنیاد میں ہاشم اشعری اور عبد الوہاب حسب اللہ کے کارنامے قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں کا آپسی تعلق استاذ اور طالب علم کا ہے۔ ہاشم اشعری (1871-1947) نے عبد الوہاب حسب اللہ (1888-1971) کو مشورہ دیا کہ وہ 1908 میں Tebuireng، Jombang میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مکہ میں تعلیم جاری رکھیں۔ مکہ میں عبد الوہاب حسب اللہ اور ان کے ہم عصر جن میں عبد الحلیم، احمد سنوسی اور ماس منصور شامل ہیں جنہوں نے سریکت اسلام (Sarekat Islam) کی مکہ شاخ کی مشترکہ بنیاد رکھی۔ عبد الوہاب حسب اللہ اس کے آرگنائزر تھے۔ اس طرح ہاشم اشعری کے علاوہ عبد الوہاب حسب اللہ اس روایتی تنظیم کے موجدوں میں سے ایک تھے۔ 1914 میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد عبد الوہاب حسب اللہ سورابایا، انڈونیشیا لوٹے اور نھضۃ الوطن (The Revival of Homeland) قائم کیا، جسے جزیرہ نما انڈونیشیا میں ایک قومی اور اعتدال پسند کردار کا پہلا مذہبی ادارہ قرار دیا گیا ہے۔ نھضۃ الوطن نے دو منزلہ عمارت میں مدرسہ شروع کیا جو تیزی سے ترقی کرتا گیا اور دو سال کے اندر ہی سورابایا میں مشہور و معروف ہوا۔ اس کی شاخیں مشرقی

اور وسطی جاوا میں خوب پھیلی جن میں ملنگ، گریسک، جومبنگ، سیمارنگ اور دیگر مقامات شامل ہیں۔ نھضۃ الوطن نے تعلیمی اور فکری ترقی کو فروغ دیا۔ عبدالوہاب حسب اللہ نے سیوبن الوطن (Youth of Homeland) اور نھضۃ التجار (Revival of Tradesmen) کی بنیاد بھی رکھی جس کے اراکین زیادہ تر جاوانی علماء (کیاء) تھے۔ عبدالوہاب حسب اللہ کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے نھضۃ الفکر (فکر کا احیاء) بھی قائم کیا تھا۔

انڈونیشیا میں پہلے 'تحریک محمدیہ' کی داغ بیل رکھی گئی، جس کی بنیاد احمد دہلان (1868–1923) نے 18 نومبر 1912 کو یوگیاکارتا (Yogyakarta) میں رکھی۔ تحریک محمدیہ کی بنیاد ایک اصلاح پسند اور جدید سماجی مذہبی تحریک کے طور پر رکھی گئی تھی۔ اس کا مقصد اسلام کو مقامی ہم آہنگی کے طریقوں سے پاک کرنا تھا مثلاً تخیل پسندی، بدعت (مذہبی اختراع) اور توہم پرستی۔ احمد دہلان مصری مصلح محمد عبدہ (متوفی 1905ء) سے بہت متاثر تھے، اور اسلام کی اصلاح کو ایک بنیادی فریضہ سمجھتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے تقلید کی مخالفت کی اور اجتہاد کی وکالت کی۔ نہضۃ العلماء انڈونیشیا میں تحریک محمدیہ کے بعد دوسری سب سے بڑی اسلامی تحریک ہے۔ اور یہ دونوں تنظیمیں اپنی اجتماعی تاریخ میں، سیاسی سرگرمیوں کو چھوڑ کر، ایک دوسرے کی حریف ہیں۔

بیسویں صدی کے شروع میں اسلامی دنیا کی سیاسی تغیر نے بھی نہضۃ العلماء کے قیام پر زور دیا۔ 1926 کے اوائل میں جب ابن سعود نے حجاز میں اقتدار سنبھالا اور سعودی عرب کی ریاست قائم کی تو جنوب مشرق ایشاء کے جزیرہ نما میں مسلم تنظیموں کے درمیان ایک بحث و مباحثہ کا مدعا بنا کہ شاہ ابن سعود سے ملاقات کے لیے ایلچی بھیجا جائے یا نہیں۔ اصلاح پسند اور جدید تنظیموں نے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ نتیجتاً روایت پسند مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ بادشاہ سے ملاقات کے لیے اپنا ایلچی بھیجا جائے۔ ایلچی (جسے 'حجاز کمیٹی' کہا جاتا ہے) نے بادشاہ کو تین درخواست پیش کئے: پہلا حجاز میں ہر فرقہ کے مسلمانوں کو مذہبی آزادی ملے؛ دوسرا یہ کہ وہ پیغمبر اسلام سے جڑے تاریخی مقامات بشمول ان کی بیٹیوں کے مقبرے تک رسائی کھولیں اور تیسرا یہ کہ وہ حج کے اخراجات کو عام کریں۔ یہ ایلچی نہضۃ العلماء کے قیام کے پہلے روانہ ہوا اور مئی 1928 کو مکہ پہنچا۔

9.3.1 مذہبی

نہضۃ العلماء ایک سنی مسلم تنظیم ہے۔ انڈونیشیائی سیاق وسباق میں، 'سنی' اہل سنت والجماعت کے مترادف ہے، جسے عام طور پر انڈونیشیائی زبان میں 'اسوجا' کہا جاتا ہے۔ نہضۃ العلماء مذہبی طور پر عقلیت پسندی اور سخت گیر صحیفہ پرستی کے درمیان ایک درمیانی راستہ ('اعتدال') ہے۔ نہضۃ العلماء کے لیے اسلامی قانون کا ماخذ نہ صرف قرآن اور احادیث ہیں، بلکہ تجرباتی حقائق کو سمجھنے کے لیے انسانی عقل کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ نہضۃ العلماء اپنے فقہ کے اعتبار سے اہل سنت والجماعت کے چار بڑے مذاہب (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) میں سے شافعی مذہب کا پیروکار ہے اور کلام کے میدان میں ابوالحسن اشعری (874-936) اور ابو منصور الماتریدی (853-944) کی پیروی کرتا ہے۔ اسی طرح تصوف میں ابو حامد الغزالی (1058-1111) اور جنید البغدادی (830-910) کے طریقہ کو اپناتا ہے۔ اس کا واضح ثبوت نہضۃ العلماء کے مقدّمہ سے ملتا ہے، جو کہ نہضۃ العلماء کا ایک بنیادی آئین ہے۔ نہضۃ العلماء کے بنیادی عقائد میں ایمان، اسلام (عبادت و

رسومات) اور احسان (اچھا ہونا) تینوں کا سنگم ہونا لازمی ہے۔ نہضۃ العلماء مسلمانوں کو اشعری اور الماتریدی کے کلام کی تعلیمات کے ذریعہ ایمان میں مضبوطی پیدا کرتے ہیں۔ چار بڑے مذاہب (خصوصاً شافعیہ) میں سے کسی ایک کی پیروی نہضۃ العلماء کے لیے اسلام کا بنیادی جزو ہے۔ اسی طرح ان کی روحانیت کو الغزالی اور البغدادی کی تعلیمات پر مبذول کرنا نہضۃ العلماء کے نزدیک حسن کی علامت ہے۔ صوفی عناصر کا یہ اعتراف نہضۃ العلماء کو روایت پسند کے طور پر نشان زد کرتا ہے، جب کہ جدیدیت پسند محمدیہ نے اسلام کو مقامی اور علاقائی تاثرات، صوفی عقائد اور طریقوں سے نجات دلانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

21 مئی 1998 کو انڈونیشیا صدر سہارتو کے استعفیٰ کے بعد انڈونیشیا میں اصلاحی اور جمہوری تغیر کے نتیجے میں، انڈونیشیا میں بین الاقوامی اسلامی تحریکوں جیسے وہابیت، سلفیت، حزب التحریر، اور دیگر چھوٹے چھوٹے گروہوں کے اثرات دکھائی دینے لگے۔ یہ سبھی تحریکیں سنی یا 'اسوجا' تھیں۔ ان کو جب بھی موقع ملتا عوام میں سنی 'اسواجا' تعلیم کی تبلیغ کرنے لگتے۔ اس کی وجہ سے انڈونیشیا میں سنی گروہوں میں مقابلہ شروع ہوا۔ نہضۃ العلماء ان بین الاقوامی اسلامی تنظیموں سے مختلف ہے۔ اس لئے نہضۃ العلماء ان غیر مقامی اسلامی تنظیموں سے امتیاز پیدا کرنے کے لیے اپنے آپ کو 'اہل سنت والجماعت النہضۃ' کے طور پر متعارف کراتی ہے۔ اس مذہبی رجحان کی بنا پر نہضۃ العلماء نے مختصر مدت میں طویل مدتی مقاصد کے حصول کے لیے چاروں سنی فقہی مسالک کے اصولوں پر اسلام کو ترقی دینے اور متحد کرنے میں کامیاب ہے۔ نہضۃ العلماء چاروں سنی فقہی مسالک پر مبنی اسلامی تعلیمات کو عام کرتا ہے۔ وہ مساجد، مدارس، اسلامک بورڈنگ اسکولوں (پیسنترین) کی تعمیر کر کے عوام کی فلاح و بہبود اور ان کی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

نہضۃ العلماء کا لوگو (logo)

نہضۃ العلماء کا لوگو کچھ خاص علامتوں پر مشتمل ہے، جو اس کے دینیات، کرداروں اور نظریات کی نمائندگی کرتا ہے۔ لوگو کے مختلف عناصر قرآن کی آیات کا حوالہ دیتے ہیں۔ (قران: 20:55) (اس زمین میں سے ہم نے تمہیں پیدا کیا اور اسی میں واپس لوٹائیں گے اور اسی سے پھر دوبارہ تم سب کو نکال کھڑا کریں گے) کی بنیاد پر نہضۃ العلماء دنیا کی اس جگہ کی نشاندہی کرتی ہے جہاں انسان رہتے ہیں اور آئندہ رہیں گے، اس کا مطلب ہے کہ نہضۃ العلماء کا مقصد موجودہ اور آنے والی نسلوں کی خوشحالی کے لیے زمین کے تحفظ کو برقرار رکھنا ہے۔ نہضۃ العلماء کا یہ آفاقی آئیڈیل اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ نہضۃ العلماء نہ صرف اپنے اراکین اور عوام کے لیے بلکہ عام طور پر بنی نوع انسان کے لیے بھی کام کرتا ہے۔ لوگو میں دنیا کے گرد گھومنے والی رسیوں کا مطلب ہے کہ نہضۃ العلماء کے پاس ایسے نظریات ہیں جو زمین کی آبادی کو انسانیت کے لحاظ سے (قران 3:103) (اللہ تعالیٰ کی رسی کو سب مل کر مضبوط تھام لو اور پھوٹ نہ ڈالو، اور اللہ تعالیٰ کی اس وقت کی

نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی، پس تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے۔) کی بنیاد پر باندھتے ہیں، رسی پر لکیروں کی تعداد اللہ کے 99 خوبصورت ناموں کی نمائندگی کرتی ہے۔ انڈونیشیا کے نقشے اور رسی کے حوالے سے نہضۃ العلماء نے بنی نوع انسان کو تین قسم کے تعلقات سے جوڑنے اور متحد کرنے کی کوشش کی ہے: اخوہ بشریہ (انسانی بھائی چارہ)، اخوہ وطنیہ (قومی بھائی چارہ)، اور اخوۃ اسلامیہ (اسلامی بھائی چارہ)۔

لوگو پر نو ستارے ہیں جو تاریخ اسلام کی عظیم شخصیات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اوپر کا سب سے بڑا ستارہ آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس بڑے ستارے کے دائیں اور بائیں دو دو ستارے ہیں جو چار خلفائے راشدین، حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی علامت ہیں۔ نیچے کے چار ستارے چار عظیم ائمہ مذھب: امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ نو ستارے اس لیے بھی اہم ہیں کہ نہضۃ العلماء ان عظیم ہستیوں کی پیروی کرتا ہے، یا دوسرے لفظوں میں نہضۃ العلماء اہل سنت والجماعت کا وفادار ہے۔ مقامی سیاق وسباق میں یہ نو ستارے چودھویں صدی کے جزیرہ نما کے نو بزرگوں کی بھی نشاندہی کرتے ہیں جو نہضۃ العلماء کے فکر کے مطابق ایک ہی روایت پسند اسلامی نظریے کا اشتراک کرتے ہیں۔

لوگو میں دو رنگ ہیں: سبز اور سفید۔ سبز جزیرہ نما کی زرخیز اور پر تعیش زمین کی علامت ہے جہاں نہضۃ العلماء پیدا ہوا اور قائم ہوا۔ سفید رنگ نہضۃ العلماء کے کرداروں کی عفت اور پاکیزگی کی علامت ہے۔ عربی تحریر میں 'نہضۃ العلماء' پڑھا جاتا ہے، جبکہ رومن متن 'NU' مخفف ہے۔ یہ لوگو کیائی رضوان عبد اللہ نے ڈیزائن کیا تھا، جو ہاشم اشعری اور عبد الوہاب حسب اللہ کے ہم عصر تھے۔ یہ نشان نہضۃ العلماء کی کہانیوں، اسلامی نظریات، الہیات، اس کے نظریات اور مقاصد کو مجسم کرتا ہے۔

9.4 تنظیمی ڈھانچہ

نہضۃ العلماء کے مرکزی بورڈ (PBNU)(Pengurus Besar Nahdhatul Ulama) کے قیادت اور تنظیمی ڈھانچہ کا نظام جس میں مشاورتی بورڈ (Mustasyar)، سپریم کونسل (Syuriyah)، اعوان (Expert Board) اور ایگزیکٹو کونسل (Tanfidziyah) شامل ہیں۔ اس تنظیم کا اعلیٰ ترین عہدے دار سپریم کونسل کا صدر ہوتا ہے جسے رئیس عام، اس کے نائب کو نائب رئیس اور سیکرٹری کو کاتب کہا جاتا ہے۔

ایگزیکٹو بورڈ کی قیادت جنرل چیئرپرسن (Ketua Umam) اور سیکرٹری جنرل کرتے ہیں۔ سپریم کونسل کے رئیس عام اور ایگزیکٹو کونسل کے چیئرپرسن کا انتخاب ہر پانچ سال بعد کانفرنس (Muktamar) کے ذریعے ہوتا ہے۔ ایک اور ادارہ جو دونوں کونسلوں کو مشورہ فراہم کرتا ہے مشاورتی بورڈ (Mustasyar) ہے جو جید علماء اور دیگر اراکین پر مشتمل ہوتا ہے۔

تنظیم کو چلانے کے لیے نہضۃ العلماء کے کئی چھوٹے بڑے محکمے (lembaga) بنائے گئے ہیں۔ لیمباگا محکمہ جاتی اداروں کے طور پر کام کرتے ہیں اور معاشرے کو تربیت کرنے اور اسے اپنے عقیدے کے مطابق راہ راست پر لانے کی مسلسل کوشش کرتے رہتے ہیں۔ نہضۃ العلماء کئی اہم پروگراموں کو منعقد کرتا ہے اور ذیلی ادارے (lajnah) کے ذریعہ ان کی نگرانی بھی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ نہضۃ

العلماء کے پاس متعدد نیم خود مختار تنظیمیں بھی ہیں جو مخصوص کمیونٹی کے مذہبی مفادات کی خدمت کرتی ہیں۔ نہضۃ العلماء کے کئی محکمے ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

1. اسلامی تبلیغ کے لیے Lembaga Dakwah Nahdhatul Ulama
2. تعلیم کے لیے Pendidikan Ma᾿arif Nahdhatul Ulama
3. صحت کی خدمات کے لیے Pelayanan Kesehatan Nahdhatul Ulama
4. معاشیات کے لیے Lembaga Perekonomian Nahdhatul Ulama
5. زراعت کے لیے Lembaga Pengembangan Pertanian Nahdhatul Ulama
6. اسلامی بورڈنگ اسکولوں کے لیے Rabithah Ma'ahid Islamiyah Nahdhatul Ulama
7. برائے خاندان Lembaga KemaslahatanKeluarga Nahdhatul Ulama
8. مساجد کی فلاح و بہبود کے لیے Lembaga Takmir Masjid Nahdhatul Ulama
9. انسانی وسائل کے لیے Lembaga Kajian dan Pengembangan Sumberdaya Manusia Nahdhatul Ulama
10. قانونی مسائل کے لیے Lembaga Penyuluhan dan Hukum Nahdhatul Ulama Bantuan
11. حلال کے لیے Lembaga Badan Halal Nahdhatul Ulama
12. کارکنوں کے لیے Sarikat Buruh Muslimin Indonesia

اس کے علاوہ نہضۃ العلماء کے مرکزی بورڈ (Pengurus Besar Nahdhatul Ulama) کے کئی ادارے یا بورڈز (lajnah) ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

- اسلامی مذہبی معاملات کے لیے Lajnah Bahtsul Masail Nahdhatul Ulama
- فلکیات کے لئے Lajnah Falakiyah Nahdhatul Ulama
- اشاعتوں کے لیے Lajnah Ta'lif wan Nasyr Nahdhatul Ulama
- اوقاف کے لئے Lajnah Auqaf Nahdhatul Ulama
- صدقہ کے لیے Lajnah Zakat, Infaq, dan Shadaqah Nahdhatul Ulama

علاوہ بریں نہضۃ العلماء کے خود مختار بورڈز بھی ہیں؛

- صوفی گروپوں کے لیے Jam᾿iyyah Ahli Thariqah Al-Mu᾿tabarah An-Nahdhliyah

- خواتین کے لیے Muslimat Nahdhatul Ulama
- نوجوانوں کے لیے Gerakan Pemuda Ansor Nahdhatul Ulama
- خواتین نوجوانوں کے لیے Ulama Fatayat Nahdhatul
- یونیورسٹی کے طلبہ کے لیے Keluarga Mahasiswa Nahdhatul Ulama
- مرد طلبہ کے لیے Ikatan Pelajar Nahdhatul Ulama
- طالبات کے لیے Ikatan Sarjana Nahdhatul Ulama
- قاری اور حفاظ کے لئے Jami'iyyatul Qurrowal Huffadz Nahdhatul Ulama
- اساتذہ اکرام کے لئے Persatuan Guru Nahdhatul Ulama

اس طرح نہضۃ العلماء کا مرکزی بورڈ صوبائی و ضلعی سطح تک پھیلا ہوا ہے۔ صوبائی سطح پر ولایہ نہضۃ العلماء، ضلعی سطح کے لیے Pengurus Cabang Nahdhatul Ulama، ذیلی ضلعی سطح کے لئے مجلس وکیل کبانگ (Majelis Wakil Cabang)، اور Pengurus Anak Ranting Nahdhatul Ulama سب سے چھوٹے علاقائی بورڈ کے طور پر کام کرتے ہیں۔ نہضۃ العلماء ایک منظم تحریک ہے، جس میں کیائی اور بورڈنگ اسکول کے طلبہ بنیادی عملے اور ادارے ہیں۔

9.4.1 نہضۃ العلماء کی روایتی (پیری مریدی) تعلیم پر ایک نظر

نہضۃ العلماء کی روایتی تعلیم انڈونیشیا میں کیائی (مذہبی علماء) کے ذریعہ قائم کیا گیا، جو عام طور پر دیہی آبادیوں اور مدارس کے طلبہ پر مشتمل ہے۔ روایتی اور ثقافتی طور پر انڈونیشیا کی دیہی آبادی نہضۃ العلماء کے کیاؤں کی پیروکار ہیں۔ وہ مقامی کیاؤں کے تجویز کردہ اسلامی طریقوں کا تحفظ کرتے ہیں اور انہیں انجام دیتے ہیں، مثال کے طور پر اولیاء کی قبروں کی زیارت، وسیلہ (شفاعت)، میلاد (پیغمبر کی سالگرہ)، صلوات (پیغمبر کی حمد)، بیس رکعت تراویح نماز، قرآنی آیات، ذکر، اور دعائیں کرنا اور آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی حکایات بیان کرنا، سلوک یا طریقت کے معمولات وغیرہ۔ یہ رسمیں بہت عام ہیں اور دیہی انڈونیشیا میں لوگوں کی زندگی کا حصہ بن چکی ہیں۔ کیائی کے ذریعے ادا کیے جانے والے کلیدی کردار کا مطلب یہ بھی ہے کہ اراکین کی ایک بڑی تعداد روایتی اور قدامت پسند اسلامی رجحانات سے آتی ہے۔ وہ روایت کو مضبوطی سے پکڑے رہتے ہیں۔ یہ روایتیں مدارس کے طلبہ اور صوفیوں کی کاوشوں سے انڈونیشیا کے تہذیب و ثقافت اور اسلامی تعلیمات کا حسین امتزاج ہے۔

انڈونیشیا میں بورڈنگ اسکول اور اس سے ملتے جلتے اسکولوں کی موجودہ تعداد تقریباً 30,000 ہیں، جس میں بورڈنگ اسکول کے طلباء (پیسنٹرین سنتری) اور فارغ التحصیل سابق طلباء پر مشتمل ایک تنظیم ہے جو اس روایتی درس وتدریس کی پیروی کرتی ہے جہاں نہ صرف عامل علماء ہیں بلکہ وہ مذہبی استدلال کو واضح کرنے کی قابلیت بھی رکھتے ہیں۔ بورڈنگ اسکول کے طلبہ ہونے کے ناطے وہ علمی اور عملی

طور پر باشعور ہیں۔ ان کے درس و تدریس میں عربی نحو (گرامر)، صرف (مورفولوجی)، بالاغہ (بیانات) اور ادب شامل ہیں۔ روایتی تعلیم کی اہم خصوصیات یہ ہے کہ طلبہ قرآن اور احادیث کو حفظ کرنے کے ساتھ ساتھ عربی گرامر کے کتابچے جو مختصر متن جیسے 'متن الاجرومیہ' یا 'الامرتی' سے لے کر 'الفیہ ابن مالک' جیسی وسیع متن جو ایک ہزار سے زیادہ عربی اشعار پر مشتمل ہے کو حفظ کرتے ہیں۔

مزید بر آں، طلبہ (سنتری) جو بورڈنگ اسکول میں رہتے ہیں وہ روایتی طور پر کیائی (صوفی پیر) کی اتباع واطاعت کرتے ہیں۔ کیائی اور سنتری دونوں استاذ اور شاگرد، نگراں اور نگرانی جس طرح والدین اور بچوں میں ایک خاص رشتہ ہوتا ہے اسی طرح رہتے ہیں۔ سنتری کو تعظیماً کیائی کی مصافحہ کے دوران ہاتھ کا بوسہ لینا، مشورہ سننا اور اس پر عمل کرنا، وفادار رہنا ہوتا ہے۔ بورڈنگ اسکول کے طلبہ کی چھ سے نو سال تک بہت سخت تربیت کی جاتی ہے۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد کیائی سند (علم کی ترسیل کا سلسلہ) عطا کرتا ہے۔ اس کے بعد، طلبہ اکثر اپنے گاؤں واپس آجاتے ہیں اور اسی نہج کے نئے بورڈنگ اسکول کو قائم کرکے اسی تربیت و تعلیم کی پیروی کرتے ہوئے نئے سنتری تیار کرتے ہیں اور اس طرح انڈونیشیا میں روایتی تعلیم اور اقدار کو فروغ دینے کا کام کرتے ہیں۔

9.5 مذہبی وسماجی مسائل

جیسا کہ ہم نے دیکھا، نہضۃ العلماء کے بورڈز مکڑی کے جالے کی طرح پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں، جو انڈونیشیا میں مسلم معاشروں میں پیدا ہونے والے مذہبی وسماجی معاملات پر نظر رکھتے ہیں اور 'بحث لیلۃ الاجتماع نہضۃ العلماء' کے نام سے منعقد مجلس میں ہر سوال کا اسلامی رو سے جواب تلاش کرتے ہیں۔ مذہبی معاملات کو قانونی حیثیت دینے کے لیے یہ ایک فکری میدان ہے۔ بحث لیلۃ الاجتماع نہضۃ العلماء باقاعدہ طور پر جلسہ منعقد کرتا ہے جہاں کیاؤں کے ذریعہ علاقائی بورڈز کے اراکین کے سامنے اسلامی تعلیمات کی رو سے سماجی و مذہبی معاملات کو پیش کرتا ہے اور اس پر بحث کرتا ہے۔

اس طرح 'بحثۃ المسائل نہضۃ العلماء' اجتہاد اور فتویٰ کے میدان میں ایک تخلیقی اور اہم اسکیم پر کام کر رہا ہے۔ یہ کام کم از کم دو وجوہات کی بنا پر اہم اور اختراعی ہے۔ سب سے پہلے، عرب ممالک سے باہر کے مسلمان اپنے آبائی ممالک میں مذہبی مسائل پر مشرق وسطیٰ کے علماء سے مشورہ اور فتویٰ حاصل کرتے تھے۔ بحثۃ المسائل نہضۃ العلماء نے مذہبی اسلامی معاملات کے جوابات دے کر کامیابی سے اس پریکٹس کو ختم کر دیا ہے۔ دوسرا، بحثۃ المسائل نہضۃ العلماء کے قیام سے پہلے، اسلامی حکام و علماء اپنی آزاد اور انفرادی قانونی رائے، یا اجتہاد، یا مسلم کمیونٹیز کے درپیش مختلف مذہبی مسائل سے متعلق فتویٰ پیش کرتے تھے۔ بحثۃ المسائل نہضۃ العلماء نے اجتماعی اجتہاد یا اجتہاد اجماعی کی شکل دے کر اس کام کو مزید تقویت بخشی ہے۔

'بحثۃ المسائل نہضۃ العلماء' بڑے اور چھوٹے علماء یا فارغ التحصیل طلبہ پر مشتمل ہوتا ہے جنہیں اسلامی معاملات کا مستند عالم سمجھا جاتا ہے، یہ علماء عربی گرامر، تفسیر اور حدیث، اسلامی قانون، اسلامی تاریخ اور دیگر معاون علم کے ماہر ہوتے ہیں۔ خاص طور پر وہ فقیہ النفس، فقہ اور اس کے اطلاق میں تجربہ کار، اور فقہ اور اس کی دلیلیں پیش کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔

9.6 سیاسی سرگرمیاں

نہضۃ العلماء بنیادی طور پر ایک سماجی مذہبی تنظیم ہے۔ نہضۃ العلماء کے آئین میں بھی سیاست یا سیاسی معاملات کے متعلق ذکر نہیں ہے۔ تاہم، اسلامی عقائد اور رسومات کی وجہ سے اس کے ممبران سیاست سے اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ پائے۔ چونکہ فقہ کے اصول ہمیشہ سیاست سے متعلق ہوتے ہیں جیسے امامت کا معاملہ، قضا (جج سے متعلق موضوعات)، بغاوت، حدود و تعزیرات (سزا اور بدلہ)، قصاص اور عدل۔ یہ تمام مسائل فقہاء کے یہاں ابتدائی طور پر بیان کی جاتی ہیں۔

روایتی پیروکاروں کی بہت بڑی تعداد کی وجہ سے نہضۃ العلماء، خاص طور پر انڈونیشیا میں، ایک سیاسی طاقت کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ نہضۃ العلماء ابتدائی طور پر اس وقت سیاست سے جڑا جب اس نے 1935 میں زمینی دفاع پر ایک حکم نامہ جاری کیا، اس میں کہا گیا کہ جزیرہ نما مسلمانوں کی سرزمین ہے۔ ایک اور موقع پر نہضۃ العلماء نے یہ بھی کہا کہ بحرالکاہل (Pacific Ocean) کی جنگ میں جاپان کا ساتھ دینا مسلمانوں کے لیے، یا عام طور پر جزیرہ نما میں رہنے والے لوگوں کے لیے نہ واجب ہے اور نہ ہی فرض۔ 1938 کے کانفرنس میں ایک تجویز رکھی گئی کہ نہضۃ العلماء کو اپنے نمائندوں کو 'عوامی کونسل'، جو ابتدائی طور پر ایسٹ انڈیز (انڈونیشیا) میں ڈچ انتظامیہ کے ذریعہ 1916 میں تشکیل دی گئی تھی، میں بھیجنا چاہیے۔ لیکن کانفرنس کے شرکاء کی اکثریت نے اس خیال کو مسترد کر دیا اور وہ نہضۃ العلماء کو ایک سماجی و مذہبی تنظیم کے طور پر رکھنا چاہئے کا مشورہ دیا۔

نہضۃ العلماء اور محمدیہ کے درمیان کچھ بنیادی اور اصولی اختلافات کے باوجود، ان دونوں اسلامی تنظیموں نے 1937 میں 'مجلس اسلام اعلیٰ انڈونیشیا' (سپریم اسلامک کونسل آف انڈونیشیا) قائم کی تاکہ جزیرہ نما میں تمام اسلامی گروہوں کے لیے ایک وفاقی تنظیم کا افتتاح کیا جا سکے۔ اس وفاقی تنظیم نے انڈونیشیا میں مسلمانوں کی آواز کو متحد اور مربوط کیا تاکہ ڈچ پالیسیوں، خاص کہ مسلمانوں کے لیے شادی کا آرڈیننس اور فوجی خدمات، کے خلاف آواز اٹھائی جا سکے۔ انڈونیشیا میں جاپانی قبضے نے سیاسی ماحول کو تبدیل کر دیا اور 1945 میں جب ہاشم اشعری قومی چیئرپرسن بنے تو انڈونیشین مسلمانوں کی مشاورتی کونسل کی بنیاد رکھی۔

انڈونیشین مسلمانوں کی مشاورتی کونسل میں نہضۃ العلماء کے بنیادی کردار کی وجہ سے نہضۃ العلماء ایک سیاسی تحریک بننا شروع ہوئی۔ نہضۃ العلماء کے سالانہ کانفرنس، 28 اپریل تا یکم مئی 1952، میں نہضۃ العلماء کو ایک سیاسی جماعت بنانے کی سفارش کی گئی۔ اس کے بعد نہضۃ العلماء نے 30 اگست 1952 کو انڈونیشین مسلم لیگ کی بنیاد رکھی، جس میں کئی پارٹیاں شامل تھیں مثلا ایسوسی ایشن آف انڈونیشین ایجوکیشن، اسلامک ایسوسی ایشن پارٹی آف انڈونیشیا، جنوبی سولاویسی پر مبنی درود دعوت وارشاد اور انڈونیشین چینی مسلم ایسوسی ایشن وغیرہ۔

نہضۃ العلماء کی پارٹی نے 1955 کے انتخابات میں حصہ لیا اور الیکشن میں 45 نشستیں حاصل کیں۔ آئینی اسمبلی کے اگلے انتخابات میں، نہضۃ العلماء پارٹی نے 91 نشستیں حاصل کیں۔ 1973 میں نیو آرڈر پالیسی کے تحت، نہضۃ العلماء پارٹی نے 'یونائیٹڈ ڈویلپمنٹ پارٹی' کے ساتھ الحاق کیا، جس نے 1977 اور 1982 کے انتخابات میں دوسری سب سے بڑی تعداد میں نشستیں حاصل کیں۔ لیکن یونائیٹڈ

ڈویلپمنٹ پارٹی کے ساتھ یہ الحاق زیادہ دن نہیں چل سکا اور عدم اطمینان کی وجہ سے، نہضۃ العلماء کے چیئرمین، عبد الرحمن واحد نے یونائیٹڈ ڈویلپمنٹ پارٹی سے علیحدگی اختیار کی، جس کی وجہ سے یونائیٹڈ ڈویلپمنٹ پارٹی کے ووٹوں کی تعداد 1982 میں 28 فیصد سے کم ہو کر 1987 کے انتخابات میں 16 فیصد رہ گئی۔ تب سے نہضۃ العلماء نے اپنے آپ کو سیاست سے الگ کر اپنے بنیادی مقاصد یعنی ایک سماجی اور مذہبی تنظیم کی طرح کام کرتی ہے۔

9.7 سو سالہ جلسہ اور قرارداد

7 فروری 2023 (16 رجب 1444 ہجری) کو نہضۃ العلماء نے اسلامی ہجری کیلنڈر کے مطابق اپنے قیام کی 100 ویں سالگرہ انڈونیشیا کے شہر Sidoarjo میں منائی۔ اس تاریخی تقریب میں ہزاروں ممبران اور مہمانوں نے شرکت کی جن میں سرکاری افسران، مذہبی رہنما اور کمیونٹی کے سرکردہ افراد شامل تھے۔ 1926 میں قائم ہونے والی نہضۃ العلماء دنیا کی سب سے بڑی اسلامی تنظیموں میں سے ایک ہے اور اس نے انڈونیشیائی معاشرے اور ثقافت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ امن، رواداری، اور سماجی انصاف کو فروغ دینے کی اس کی ایک طویل اور قابل فخر تاریخ ہے۔

سو سال پورے ہونے پر نہضۃ العلماء کے ارکان نے اس کی کامیابیوں اور کارناموں کے ساتھ ساتھ گزشتہ سالوں میں درپیش چیلنجوں پر بھی غور و فکر کیا۔ نہضۃ العلماء کے سکریٹری جنرل Robikin Emhas نے اپنی تقریر میں تنظیم کے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں گفتگو کی۔ انہوں نے روایتی اسلامی اقدار کے تحفظ کی اہمیت پر زور دیا، جیسے ہمدردی، خیرات، بلا تفریق مذہب و رنگ سب کا احترام۔ اس کے ساتھ ہی تعلیمی اور سماجی بہبود کے اقدامات کے لئے نہضۃ العلماء کے عزم اور انڈونیشی معاشرے میں امن اور ہم آہنگی کے فروغ کے لئے اس کی کوششوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان اقدامات کے لئے تنظیم کی وابستگی نے انڈونیشیا میں لاتعداد لوگوں کی زندگیوں پر نمایاں اثر ڈالا ہے۔ انہوں نے مذہبی رواداری اور افہام و تفہیم کو فروغ دینے میں نہضۃ العلماء کے کلیدی کردار اور انتہا پسندانہ نظریات کا مقابلہ کرنے کی اس کی کوششوں پر بھی اظہار خیال کیا۔ انہوں نے مزید ہم آہنگی اور انصاف پسند معاشرے کی تعمیر کے لئے مختلف مذاہب اور پس منظر کے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ نہضۃ العلماء اپنے اس مشن میں ثابت قدم ہے اور آنے والے سالوں میں نہضۃ العلماء اپنا اہم کردار ادا کرتا رہے گا۔ روایتی اسلامی اقدار، تعلیم اور سماجی بہبود کے اقدامات کے لئے تنظیم کی وابستگی اس بات کو یقینی بنائے گی کہ یہ آنے والے برسوں تک انڈونیشی معاشرے میں ایک طاقتور اور بااثر قوت بنی رہے۔

گزشتہ برسوں میں نہضۃ العلماء کو درپیش سب سے بڑے چیلنجوں میں سے ایک تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں اپنی آزادی اور مطابقت کو برقرار رکھنا ہے۔ تنظیم کو انڈونیشیا میں بدلتے ہوئے سیاسی منظر پر اپنے وجود کو بچانا اور روایتی اسلامی اقدار کے ساتھ اپنی وابستگی کو جدیدیت اور ترقی کے ساتھ متوازن کرنا ہے۔ ان چیلنجوں کے باوجود، نہضۃ العلماء امن، رواداری، اور سماجی انصاف کے فروغ کے لیے اپنے عزم پر ثابت قدم ہے اور اسلام کے اعتدال پسند اور جامع ویژن کے لیے ایک مضبوط حامی ہے۔

نہضۃ العلماء کو ایک اور چیلنج کا سامنا ہے جو انڈونیشیا اور دنیا بھر میں انتہا پسندی اور دہشت گردی کو لے کر ہے۔ نہضۃ العلماء

نے انتہاپسندی اور دہشت گردی کی کھل کر مخالفت کی ہے اور اس نے اسلام کے پرامن اور بھائی چارے کو فروغ دینے کے لیے کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ، یہ تنظیم بین المذاہب مکالمے کو فروغ دینے میں رہنمائی کا کام کیا ہے اور انڈونیشیا میں مختلف مذہبی برادریوں کے درمیان پل بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان چیلنجوں کے باوجود، نہضۃ العلماء انڈونیشیا کے معاشرے میں ایک اہم اور بااثر قوت بنی ہوئی ہے اور اس نے ملک کے سیاسی، ثقافتی اور سماجی منظر نامے کی تشکیل میں اہم رول ادا کیا ہے۔

اپنی قیام امن کی کوششوں کو آگے بڑھانے کے لیے، نہضۃ العلماء نے اپنے راہ عمل میں یہ طے کیا کہ پہلے مذہبی سفارت کاری کے ذریعے امن کو فروغ دینا اور مذہبی آزادی کی وکالت، خاص طور پر انڈونیشیا اور عالمی سطح پر اقلیتی مذہبی برادریوں کے لیے کرے گا۔ دوسرا، اپنے اثرات کو بڑھانے کے لیے انڈونیشیا اور دنیا بھر میں دیگر مذہبی اور سول سوسائٹی کی تنظیموں کے ساتھ اپنی شراکت داری کو مضبوط کرے گا۔

ان مراحل کو لے کر، نہضۃ العلماء مزید پرامن اور ہم آہنگ انڈونیشیا کی تعمیر میں اپنا حصہ ڈال سکتی ہے اور دیگر مذہبی تنظیموں کے لیے ایک مثال قائم کر سکتی ہے۔ نہضۃ العلماء جیسی تنظیموں کی طرف سے مذہبی سفارت کاری مؤثر طریقے سے امن کو فروغ دے سکتی ہے اور کئی طریقوں سے تنازعات کو حل کر سکتی ہے، مثال کے طور پر؛ تقسیم کو ختم کر کے، اعتماد پیدا کر کے، تنازعات کے پرامن حل کو فروغ دے کر، اور ثقافتی اور مذہبی تناظر فراہم کر کے۔

آخر میں، مذکورہ بالا تمام چیلنجوں کے باوجود، نہضۃ العلماء ایک اچھی پوزیشن میں ہے کہ وہ جنوب مشرقی ایشیا اور دنیا بھر میں امن کو فروغ دینے اور تنازعات کو حل کرنے میں اہم کردار ادا کرتا رہے گا۔

9.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- نہضۃ العلماء کی بنیاد 31 جنوری 1926 (16 رجب 1344 ہجری) کو رکھی گئی۔ اس کو ہاشم اشعری نے قائم کیا۔ یہ دنیا کے بڑے تنظیموں میں سے ایک ہے۔ انڈونیشیا میں 60 ملین اراکین ہیں اور پوری دنیا بھر میں تقریباً 30 ملین اراکین پھیلے ہوئے ہیں۔
- نہضۃ العلماء کی شروعات عربی اسلامی علماء سے ہوئی جو وقت کے ساتھ ساتھ انڈونیشیا میں بورڈنگ اسکول اور علاقائی مدارس میں پروان چڑھے۔
- نہضۃ العلماء کی بنیاد اسلامی تعلیمات اور انڈونیشیائی روایتی تہذیب پر مبنی ہے اور اسلامی تعلیمات کو روایتی تہذیب کی بنیادوں پر واضح کرتا ہے۔ اس حقیقت کی بنیاد پر، کچھ لوگ نہضۃ العلماء کو فکری پسماندگی، سیاست میں موقع پرستی، اور مذہب میں روایتی ہم آہنگی کو منافقانہ سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس، مذہبی روایت پسندی نے نہضۃ العلماء کو ایک ترقی پسند مذہبی تنظیم بننے کے قابل بنایا ہے۔ خود شعوری روایت پسندی نہضۃ العلماء کو جدیدیت اور تبدیلیوں کا سامنا کرنے کے قابل بناتا ہے۔

- سماج کی فلاح وبہبود کے لئے سیاسی سطح پر نہضۃ العلماء نے تحریک محمدیہ سے بھی الحاق کیا۔ ان دونوں اسلامی تنظیموں نے 1937 میں 'مجلس اسلام اعلیٰ انڈونیشیا' (سپریم اسلامک کونسل آف انڈونیشیا) قائم کی تاکہ جزیرہ نما میں تمام اسلامی گروہوں کے لیے ایک وفاقی تنظیم کا افتتاح کیا جاسکے۔
- نہضۃ العلماء کا صد سالہ جلسہ 16 رجب 1444 یعنی 7 اپرل 1923 کو منایا گیا جس میں اس کے کارناموں اور چیلنجز کا تجزیہ کر اس کے مشن کی حصولیابی کا عہد کیا گیا۔

9.9 نمونہ امتحانی سوالات

9.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. تحریک نہضۃ العلماء کی بنیاد کس نے ڈالی؟

(a). ہاشم اشعری (b). شبلی نعمانی (c). سید قطب (d). رشید رضاء

2. 'اسوجا' سے کیا مراد ہے؟

(a). اہل تشیع (b). اہل سنت والجماعت (c). طالب علم (d). عیسائی

3. نہضۃ العلماء کس فقہی مسلک کا پیروکار ہے؟

(a). شافعی (b). حنبلی (c). حنفی (d). مالکی

4. نہضۃ العلماء کی بنیاد کب رکھی گئی؟

(a). 1926 (b). 1930 (c). 1947 (d). 1876

5. نہضۃ العلماء کے نشان میں سب سے بڑا ستارہ کس سے منسوب ہے؟

(a). اللہ سبحان تعالیٰ (b). حضرت محمد ﷺ (c). انڈونیشیا کا صدر (d). انڈونیشیا کا آئین

6. نہضۃ العلماء کے نشان میں جو رسی ہے اس میں کتنی مروڑیں ہیں؟

(a). 100 (b). 99 (c). 91 (d). 10

7. تحریک محمدیہ کے بانی کون ہیں؟

(a). عبدالوحید حسب اللہ (b). ہاشم اشعری (c). احمد دہلان (d). جمال الدین افغانی

8. نہضۃ العلماء کی فقہی مسائل کے لئے قائم کئے گئے مجلس کا کیا نام ہے؟

(a). بحث لیلۃ الاجتماع (b). دار الافتاء (c). نھضۃ الوطن (d). تمام صحیح

9. نہضۃ العلماء بنیادی طور پر تنظیم ہے؟

(a). اقتصادی (b). سیاسی (c). سماجی اور مذہبی (d). سب

10. پسنتران اور سنتری سے کیا مراد ہے؟

(a). مجلس صدر (b). دفتر دفاع (c). بورڈنگ اسکول اور طلبہ (d). صوفی

9.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. نہضۃ العلماء کے آغاز کے پس منظر پر روشنی ڈالیے۔
2. نہضۃ العلماء تحریک محمدیہ سے کس طرح مختلف ہے؟ بیان کیجیے۔
3. نہضۃ العلماء کے تنظیمی ڈھانچے پر روشنی ڈالیے۔
4. نہضۃ العلماء سماجی و مذہبی مسائل کو کس طرح حل کرتا ہے؟ بیان کیجیے۔
5. نہضۃ العلماء کی نظر میں علاقائی روایتوں کی کیا اہمیت ہے؟ نوٹ لکھیے۔

9.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. نہضۃ العلماء کے نشان (logo) پر تفصیلی گفتگو کریں۔
2. نہضۃ العلماء کے قیام و استحکام اور کارناموں پر ایک مفصل مضمون قلم بند کیجیے۔
3. عبدالواحد حسب اللہ اور ہاشم اشعری کی کاوشوں کا جائزہ لیجیے۔

9.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. Encyclopaedia of Islam and the Muslim World, Ed., Richard C Martin, Macmillan Reference, USA, 2004
2. Robin Bush, Nahdatul Ulama, Yusof Ishaq Institute, ISEAS, 2009
3. Faried F. Saenong, Nahdatul Ulama (NU): A Grassroote Movement Advocating Moderate Islam. (Download from Brill.com), https://creativecommons.org/licenses/by-nc-nd/4./
4. F. Ismail, "The Nahdatul Ulama: Its early History and Contribution to the Establishment of Indonesian State",Journal of Indonesian Islam, Vol.5, Issue.2, 2011

اکائی 10:   نورسی تحریک (حصہ اول)

اکائی کے اجزا:

10.0 تمہید

10.1 مقاصد

10.2 پس منظر

10.3 بانی تحریک کے ذاتی احوال

10.4 سعید النورسی کے افکار و نظریات و سیاسی جدوجہد

10.4.1 مدرسۃ الزہرا

10.4.2 استنبول کے اسفار

10.4.3 سیاسی پارٹی میں شمولیت

10.4.4 خطبہ شامیہ

10.5 سعید النورسی کی تصنیفی خدمات

10.6 اکتسابی نتائج

10.7 نمونہ امتحانی سوالات

10.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

10.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

10.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

10.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

10.0 تمہید

اسلام کی تاریخ میں تجدید اور احیائے دین کا عمل مستقل طور پر متفرق اوقات میں درج ہوتا رہا ہے۔ تاریخ میں مختلف ممالک میں اسلامی اعتقادات نظریات واقدار کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی یا اس میں مختلف شکوک وشبہات ڈالے گئے یا اس کے خالص افکار میں دیگر مذاہب اور فلسفہ کی شمولیت کی کوشش کی گئی تو ہر دور اور ہر مقام پر کسی نہ کسی مجدد، مجتہد ومفکر نے اسلامی عقائد کا اس طرح دفاع کیا کہ نہ صرف اسلام کے تئیں شک وشبہات کو رفع کیا بلکہ اسلام کی حقانیت کو اجاگر کر کے اس کی اصلی شکل وصورت کو واضح کر دیا۔ ان تحریکات کے پس منظر میں ایک پہلو اہم ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ غور کریں گے کہ جو تحریکات سقوط خلافت اسلامیہ سے پہلے کی ہیں اور جو اسلام کے سیاسی زوال کے بعد کی ہیں دونوں میں نمایاں فرق موجود ہے، کیوں کہ جدید دور سے پہلے اسلام پر قرآن وسنت پر اعتراض شکوک اور حملے ایسے دور میں ہوئے جب کہ اسلام کے ماننے والے تمدنی حیثیت سے فوقیت رکھتے تھے اور نظریاتی اعتبار سے مقدم تھے؛ اس لیے احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوئے تھے اس کے بر خلاف مغربی استعمار کے بعد اسلامی دنیا میں مسلمان مغربی نظریات سے مرعوب ہو کر اسلامی فکر اور مسلمانوں کی تہذیب سے کنارہ کش ہو چکے تھے اور اپنی نظریاتی شکست قبول کر چکے تھے۔ اس دور کے مسلمان نہ صرف سیاسی اعتبار سے شکست خوردہ ہو چکے تھے بلکہ فکری اعتبار سے بھی احساس کمتری کا شکار ہو چکے تھے۔ ایسے وقت میں مسلم دنیا کے تقریباً ہر خطے میں اسلام کے احیاء اور مسلمانوں کا رشتہ اسلام سے استوار کرنے اور اسلام کی حقانیت کو بیان کرنے کے لیے شروع ہوئیں۔ اس اکائی میں ہم ملت اسلامیہ کے دل کی حیثیت رکھنے والے خلافت عثمانیہ کے سقوط اور اس کے بعد ترکی میں سیکولر نظریات وافکار کے اثرات اور مجتہد اور مفکر بدیع الزماں سعید النورسی ان کے افکار اور ان کی تحریک کے آغاز کے پس منظر کے بارے میں تفصیل سے پڑھیں گے۔

10.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ نورسی تحریک کے بانی بدیع الزماں سعید النورسی کی حیات اور خدمات سے واقفیت حاصل کر سکیں اور ان کی علمی اور فکری ارتقاء کا جائزہ لے سکیں اور ان عوامل کا تجزیہ کر سکیں جس کی بنا پر ان کی انقلابی تحریک رونما ہوئی جس کے اثرات آج بھی نمایاں ہیں۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ ان کی تصانیف اور دیگر علمی کارناموں اور افکار پر بھی گفتگو کر سکیں گے۔

10.2 پس منظر

عثمانی خلافت کے زوال اور مغربی استعمار کے بعد دنیا کا نقشہ سیاسی طور پر تبدیل ہوا۔ جدید ترکی کی تاریخ کا آغاز کمال ازم (مصطفی کمال اتاترک کے استبدادی نظریات وفلسفہ) کے قیام (1923ء-1938ء) سے ہوتا ہے۔ کمال ازم میں اسلام کو ذاتی اور انفرادی عبادات کے دائرے میں محدود کر دیا گیا اور اجتماعی سطح پر مساجد کی امامت مدارس اور اسکول کے صدور کو سرکاری نگرانی میں ایسے امام تیار کرنے کا منصوبہ عمل میں لایا گیا جو حکومت کے فراہم کردہ فرمودات کو بطور خطبہ مسجد میں بیان کریں اور انہیں اصولوں کے تحت مدارس اور اسکول میں تعلیم دیں۔

کمال ازم سے قبل اگرچہ کہ دورِ عثمانی خود ایک روبہ زوال معاشرہ تھا اور خلیفہ باوجود احترام کے حکومتی معاملات میں فیصلہ کن مقام نہیں رکھتا تھا۔ اس کے باوجود خلافت علاماتی طور پر اُمت مسلمہ کے اتحاد اور قوت کا مظہر تھی۔ کمال ازم نے ریاست کو مکمل طور پر مغربی لادینیت کے تصور پر قائم کیا اور مذہبی اثرات کو کم سے کم کرنے کے لیے مغربی تہذیب و ثقافت کی یلغار کر دی اس ضمن میں اس نے رسم الخط کی تبدیلی، اذان کا عربی میں ممنوع کیا جانا، مغربی لباس کا اختیار کیا جانا، لباس میں حجاب پر پابندی اور روایتی ترکی ٹوپی کی جگہ انگریزی ہیٹ کو علاماتی طور پر رواج دے کر ملک کی ثقافت کو تبدیل کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس بات پر بھی زور دیا کہ قرآن کو عربی میں نہیں پڑھا جائے گا بلکہ اس کے ترجمہ پر ہی اکتفا کرنا چاہیے۔

اسی مغرب زدہ الحادی دور میں بدیع الزماں سعید نورسی نے اپنی تحریک کا آغاز کیا جسے نورسی تحریک کہا جاتا ہے۔ انہوں نے قرآن کریم کے دروس مختصر رسائل کی شکل میں اور بعض اوقات طویل خطوط کی شکل میں زیر حراست اور نظر بند ہونے کے باوجود اپنے طلبہ تک پہنچائے۔ ان کے طلبہ نے اس سخت نگرانی والے ماحول میں ان قرآنی رموز کی دستی نقول تیار کر کے جہاں جہاں ممکن ہوا اسے عام کرنے کی کوشش کی۔ استاذ سعید نورسی کی تحریک کمال ازم کے تمام سرکاری زور و قوت کے باوجود عوامی سطح پر پھیلتی رہی اور اس دعوت کے اثرات ان کے انتقال کے 10 سال بعد واضح ہو کر نظر آنے لگے اور ترکی میں دوبارہ اسلام کا احیا ہوا۔

10.3 بانی تحریک کے ذاتی احوال

آپ کا نام سعید تھا۔ بدیع الزماں آپ کا لقب تھا جو آپ کی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنیاد پر آپ کو اس وقت کے علماء نے دیا تھا۔ ترکی کے صوبے تبلیس کے ضلع ہیزان کے گاؤں نورس میں 1873ء / 1290ھ میں پیدا ہوئے۔ اسی نسبت سے انہیں نورسی کہا جاتا ہے۔ آپ نسلاً کرد تھے۔ آپ کے والد کا نام مرزا اور والدہ کا نام نوریہ تھا۔

بچپن ہی سے آپ کی ذہانت، حق گوئی اور قوت حافظہ کے چرچے زبان زد عام تھے۔ نو سال تک آپ کی تعلیم و تربیت آپ کے والدین اور بڑے بھائی کے زیر نگرانی ہوئی۔ عمر کے اس دور میں آپ اپنے بھائی ملا عبداللہ سے بہت متاثر تھے جو ہمہ وقت تحصیل علم میں منہمک رہتے تھے وہ اپنے بھائی کا مقابلہ دوسرے گاؤں کے لڑکوں سے کرتے تو ان میں واضح فرق محسوس کرتے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ فرق علم کی بنا پر ہے وہ اس کی اہمیت کے قائل ہو گئے اور آگے کی زندگی میں یہی ان کا مقصد اولین بن گیا۔

نو برس کی عمر میں حصول علم کے لیے اطراف واکناف کے مدارس کی طرف رجوع کیا لیکن حق گوئی اور بے باکی کی صفات کی بنا پر روایتی تعلیم اور وہاں کے اساتذہ کے تحکمانہ رویوں میں ان کا نباہ مشکل ہو گیا کیوں کہ وہ اپنی عزت نفس کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے لہذا اپنے گاؤں واپس آ گئے۔ اور اپنے طور پر علم کے حصول میں منہمک ہو گئے۔

کہا جاتا ہے کہ ان کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ قرآن کے دو پارے ایک ہی دن میں حفظ کر لیتے تھے اور کسی بھی کتاب کو ایک سرسری نظر سے دیکھ لینے اور اس کے چند اسباق کا مطالعہ کر لینے کے بعد اس کے مفہوم کو پوری طرح سمجھ جاتے تھے۔ اس طرح چند ماہ میں ہی آپ

نے تمام درسی و غیر درسی کتابیں پڑھ لیں۔ان کے قریبی علاقے تبلیس میں قائم مدرسہ میں علم کی جستجو میں پہنچے لیکن استاد نے انہیں بچہ سمجھ کر ایک سینیر طالب علم کے سپرد کر دیا اس بات نے آپ کو بد دل کر دیا ایک دن مسجد میں جب عالم محمد آفندی خطبہ دے رہے تھے انہوں نے جب ایک مسئلہ بیان کیا تو سعید نورسی نے ان کی اصلاح کی اور بتایا کہ میں وہی طالب علم ہوں جسے آپ نے کمسن خیال کر کے اپنی شاگردی میں نہ لیا اس کے بعد آپ نے مدرسہ چھوڑ دیا اور نورشین کی طرف روانہ ہو گئے اور رات کے اندھیرے میں ایک ایسا جنگل عبور کر لیا جسے دن کے وقت بھی لوگ گذرنے میں خوف محسوس کرتے تھے۔ پھر نورشین کا مدرسہ چھوڑ کر کچھ عرصے تک ہیزان میں علم حاصل کیا اور اپنے والد کے پاس لوٹ گئے۔

اپنے گاؤں میں قیام کے دوران آپ نے خواب دیکھا کہ قیامت قائم ہو گئی اور آپ خواب ہی میں نبی ﷺ کی زیارت کی فکر میں تھے اور خود ہی یہ خیال کیا کہ پل صراط کی طرف چلنا چاہیے وہیں سے سب گذریں گے اور نبی ﷺ سے ملاقات ہو گی پل صراط کے پاس چلے گئے اور یکے بعد دیگرے تمام انبیا کرام کی زیارت کے بعد آپ نے نبی کی زیارت کا شرف حاصل کیا تو اپنے لیے علم کی درخواست کی، خواب میں اللہ کے نبی ﷺ نے ایک شرط کے ساتھ انہیں یہ خوشخبری دی کہ انہیں قرآن کا علم عطا ہو گا شرط یہ تھی کہ اُپ کی امت میں سے سعید نورسی کسی سے بھی سوال نہ کریں گے۔اور انہوں نے اس کا وعدہ کر لیا اس کے بعد آنکھ کھل گئی۔اس خواب کا آپ پر بہت گہرا اثر ہوا۔ اور آپ اس عہد پر تا عمر قائم رہے۔زندگی کے مختلف ادوار میں علما اور حکماء نے ان سے سوالات، مناظرے اور مباحثے کیے آپ سب کے جواب دیتے تھے لیکن خود امام بدیع الزماں نے کسی سے سوال نہیں کیے۔ ان سے اس بارے میں استفسار کیا گیا تو آپ نے فرمایا "مجھے علما کے علم پر کوئی شک نہیں، اس لیے میں ان سے سوال نہیں کرتا البتہ اگر کوئی میرے علم پر شک رکھتا ہے تو میں اس کو جواب دینے کا پابند ہوں"۔

کچھ عرصے بعد ارواس کا سفر اختیار کیا اور ایک استاد ملا محمد امین جو ممتاز عالم دین تھے ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا لیکن وہاں بھی زیادہ عرصہ نہ رک سکے۔پندرہ برس کی عمر میں ہی تصوف کی طرف مائل ہو گئے اور ریاضت وزہد میں کمال حاصل کیا۔کچھ مدت عبادت و ریاضت میں گزارنے کے بعد سعید نورسی مزید تعلیم و تربیت کے لیے تبلیس (ترکی کا ایک شہر) پہنچے اور وہاں ملا فتح اللہ آفندی سے درس لینا شروع کیا، لیکن ملا صاحب جس کتاب کا بھی نام لیتے سعید نورسی کہتے کہ انہوں نے یہ کتاب پڑھ لی ہے استاد اور ساتھی طلبہ ان کے اس دعوی کے متعلق شک میں پڑ جاتے۔ چنانچہ استاد سے انہوں نے امتحان لینے کا کہا اور استاد کے ہر سوال کا جواب دے کر اپنی محیر العقول ذہانت اور علمی استعداد سے سب کو حیران کر دیا۔ تلبیس کے شہر میں کچھ عرصہ قیام کے بعد استاد نورسی شیروان کے شہر پہنچے جہاں ان کے بڑے بھائی حصول علم کے لیے مقیم تھے۔وہاں بھائی نے ان کی لیاقت کی جانچ کی تو ان کی ذہانت اور علمی صلاحیت سے متاثر ہو کر ان کی شاگردی اختیار کر لی۔اٹھارہ برس کی عمر میں ہی آپ کا شمار مشہور علماء میں ہونے لگا تھا۔

استاد نورسی نے صرف تین ماہ کے عرصے میں اتنی کتابیں پڑھ لیں اور ان کا علم ان کے اندر سمو گیا جس کو پڑھنے کے لیے عموماً پندرہ سے بیس سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ سعید نورسی نے قرآن کریم، حدیث، فقہ، تاریخ، فلسفہ، جغرافیہ اور دیگر علوم و فنون میں مہارت حاصل کی۔ آپ کے علم کی شہرت نے آس پاس کے علاقوں کے علماء کو بھی متوجہ کر لیا اور ان کی ذہانت اور علمیت کو پرکھنے کے لیے مجالس

منعقد کی جاتیں جہاں ان سے متفرق سوالات کیے جاتے اور آپ ہر سوال کا کماحقہ جواب دے کر سب کو لاجواب کر دیتے۔ اسی طرح کی مجلس میں ان کی علمی قابلیت کے اعتراف میں سعید نورسی کو بدیع الزماں کا لقب دیا گیا جو ان کے نام کا ایک جز بن گیا۔

بدیع الزماں نورسی کی ذہانت نے جہاں ان کو شہرت اور مقبولیت عطا کی وہیں ایک طبقہ ان سے حسد کرنے لگا اور ان پر جبر و تشدد بھی کیا گیا۔ چنانچہ سعرد کے شہر کے مولویوں نے انہیں ایک مجلس مناظرہ میں بلایا جس میں سازش کے تحت ان سے سوالات کرنے اور ان کو زدو کوب کرنے کا پلان بنایا گیا۔ انہیں اس سازش کا پتہ چل گیا مناظرے کے دوران جب مولوی لاجواب ہو گئے تو انہوں نے سعید نورسی کو زدو کوب کرنا شروع کیا عوام نے انہیں بچانے کی کوشش کی تو آپ نے انہیں منع کر دیا اور کہا کہ علمی معاملات کو عوام کی سطح پر نہیں لانا چاہیے اور علما کے اختلاف میں عام لوگوں کو شریک نہ کرنا چاہیے۔ اس وقت کے حاکم کو جب پتہ چلا اور ان مولویوں کو اس نے سزا دینی چاہی تو سعید نورسی نے کہا کہ ''ہم طالب علم ہیں' ایک دوسرے سے لڑتے بھی ہیں اور صلح بھی کر لیتے ہیں اس میں باہر کے لوگوں (غیر عالم) کو دخل دینا مناسب نہیں''، اور ان مولویوں کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا۔

سعید نورسی کو شہرت سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ وہ شہرت سے دور بھاگتے تھے اور گوشہ گمنامی میں علمی استعداد کو بڑھانے پر زیادہ توجہ دیتے تھے چنانچہ وہ ایک عرصہ تک قصبہ تیلو کے ویران قبرستان میں رہے اور اس دوران لغت کی مشہور کتاب 'محیط' حفظ کرنے لگے۔ اور اسے لفظ سین' تک یاد بھی کر لیا لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو بتایا کہ ''قاموس میں ہر کلمہ کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ کتنے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، میں اس کے برعکس اس خبط میں مبتلا ہو گیا تھا کہ کہ ایک ایسی قاموس تیار کروں جس میں یہ بتایا جائے کہ ہر معنی و مفہوم کے لیے کتنے کلمے استعمال کیے جاسکتے ہیں''۔

وہ چیونٹیوں کو بہت پسند کرتے تھے، خلوت گزینی کے دور میں جب ان کے بھائی ان کے لیے کھانا لاتے تو روٹیوں کے ٹکڑے چیونٹیوں کو ڈال دیتے تھے، ان کی سرگرمیوں کا بغور مشاہدہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ چیونٹیاں اجتماعی زندگی گذارتی ہیں اور غیر معمولی طور پر فرض شناس ہوتی ہیں۔ انتھک کام کرتی ہیں اور بہت منظم ہوتی ہیں ان کی انہیں خصوصیات کی بنا پر میں ان کی مدد کرنا چاہتا ہوں''۔

اسی خلوت گزینی کے دوران شیخ عبد القادر جیلانی کی زیارت کی اور ان کے مشورہ پر اس وقت قبیلہ میراں کے رئیس (گورنر) مصطفی پاشا سے ملنے گئے اور اسے دین کی دعوت دی۔ مصطفی پاشا کو علما سے خاص چڑ تھی۔ ملاقات کی وجہ پوچھنے پر سعید نورسی نے اس سے کہا

''میں تم کو نیک راہ پر چلنے کی دعوت دینے آیا ہوں۔ غلط باتوں اور ظلم کو ترک کر دو اور نماز پڑھنا شروع کر دو ورنہ تم کو قتل کر دوں گا'' اس جواب کو سن کر مصطفی پاشا طیش کے عالم میں خیمے سے نکل گیا اور کچھ دیر بعد واپس آکر دوبارہ سوال کیا کہ تم کیا چاہتے ہو انہوں نے جواب دہرایا مصطفی کمال نے کہا کہ یہاں کہ علما سے مناظرہ کرو اگر ان کو تم نے ہرا دیا تو میں تمہاری بات مان لوں گا ورنہ تمہیں دریائے فرات میں پھینکوا دوں گا۔ سعید النورسی نے جواب دیا کہ ''تمام علما کو مطمئن کرنا میری ذمہ داری نہیں اور نہ مجھ کو دریا میں پھینکوانا تمہارے اختیار میں ہے، لیکن اگر میں ان علما کو مطمئن کر دوں تو تمہاری ہی بندوق سے تم کو قتل کروں گا''

اس کے بعد مجلس میں تمام شہر کے معروف علما کو بلایا گیا اور انہوں نے سعید نورسی سے سوالات کیے اور آپ نے انہیں تسلی بخش

جوابات دیے۔ یہ حال دیکھ کر مصطفی پاشانے اپنی بندوق نورسی کو دے دی اور خود نماز کی نیت کی باندھ لی، جس پر نورسی نے انہیں قتل نہ کیا اور ایک عرصے تک بدیع الزماں کے زیر اثر اس نے اپنی سرگرمیوں پر قابو رکھا۔ کچھ عرصے بعد اپنی ظالمانہ روش پر واپس آگیا تو دوبارہ آپ نے اسے سمجھانے کا ارادہ کیا اس دفعہ مصطفی پاشا کے بیٹے نے درمیان میں آکر استاد نورسی کا غصہ ٹھنڈا کیا اور انہیں شہر چھوڑ دینے پر آمادہ کر لیا چنانچہ آپ سرحدی ترکی کے علاقے ماردین کی طرف کوچ کر گئے اور ایک عرصے تک وہیں مقیم رہے اور یہیں سے آپ کی سیاسی سرگرمیوں کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

مردین شام کا ایک سرحدی علاقہ ہے اس علاقہ میں سکونت کے دوران کا سب سے اہم واقعہ یہ رہا کہ استاد نورسی نے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیا جس کی بنا پر انہیں شہر بدر کر دیا گیا اس کے بعد آپ تلبیس چلے گئے وہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد مشہور عالم حسن پاشا کی دعوت پر 'وان' چلے گئے اور وہاں پندرہ سال مقیم رہے اس دوران علوم جدید کے حصول اور رشد وہدایت کے کاموں میں مصروف رہے۔

10.4 سعید النورسی کے افکار و نظریات وسیاسی جدوجہد

بدیع الزماں سعید نورسی اس بات کی تعلیم دیتے تھے کہ مسلمانوں کو جدیدیت کو مسترد کرنے کی بجائے مقدس کتابوں سے رہنمائی لے کر اس کو قبول کرنا چاہیے۔ نورسی نے دور جدید میں اسلام کے بارے میں ایسے نظریات کی تشکیل کی تھی جو کہ عوامی زندگی میں سائنسی اور تکنیکی ترقی کو سموتے ہوئے اسلام کے اہم کردار کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔

استاد بدیع الزماں سعید نورسی نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز بیس برس کی عمر میں کیا۔ اس وقت آپ ماردین کے صوبے میں مقیم تھے۔ انہوں نے سیاسی خرابیوں پر نہایت جرأت کے ساتھ آواز اٹھائی جس بنا پر ماردین کے گورنر نے انہیں بطلس کے حاکم کے پاس بھیج دیا۔ بطلس کے قیام کے زمانے میں ایک مرتبہ حاکم بطلس طاہر پاشا نے ان کی توجہ ایک خبر کی طرف مبذول کروائی جس سے ان کے دل میں زبردست انقلابی تحریک پیدا ہوئی ۔ وہ خبر یورپ کی قرآن کے تیئں شرانگیزیوں سے متعلق تھی۔ جس میں لکھا تھا کہ برطانوی وزیر نو آبادیات نے کہا ہے کہ:

"جب تک مسلمانوں کے پاس قرآن ہے ہم ان پر غلبہ نہیں پاسکتے۔ ہمیں قرآن ان سے لازماً چھیننا ہو گا یا پھر قرآن سے محبت ختم کرنا ہو گی"۔

استاد نورسی گلیڈسٹون کا یہ بیان پڑھ کر بہت زیادہ غمگین ہونے کے ساتھ ساتھ شدید غصہ کا شکار ہو گئے تب انہوں نے اس بات کا عہد کیا کہ میں دنیا پر ثابت کروں گا کہ قرآن ایک معنوی سورج ہے جو نہ بجھ سکتا ہے نہ ہی بجھایا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں اس قرآن کے معجزہ ہونے کو ثابت کرنے اور کافروں کے منہ پوری طرح بند کر دینے پر صرف کرنے لگے۔ ان کی اس فکری جدوجہد کے متعلق ڈاکٹر رمضان بالجہ نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے کہ:

"جب انہوں نے سنا کہ یورپ قرآن کے خلاف سازش کر رہا ہے تو اس کے بعد یکایک قرآن کی اس آیت فاعرض

عنهم (یعنی ان سے منہ پھیر لو) اس کے صحیح فرمان کو سمجھتے ہوئے ان کی فکری دلچسپیوں کو یکسر تبدیل کر دیا۔ انہوں نے اپنے سیکھے ہوئے تمام علوم کو قرآن کے سمجھنے اور اس کی حقیقتوں کو ثابت کرنے کے لیے ایک سیڑھی بنالیا۔ اب ان کا واحد ہدف علمی مقصد اور زندگی کا نچوڑ صرف اور صرف قرآن تھا اور قرآن کا یک معجزہ ہونا ہی ان کا ایک رہبر تھا۔ ان کا مرشد اور استاد تھا''

استاد نورسی نے قرآن کی صداقتوں کو ثابت کرنے کے لیے اپنے علم و عمل کے ذریعے یہ واضح کیا کہ قرآن کو علم اور ارتقاء کا سرچشمہ بنانا چاہیے۔ اس طرح یورپ کی تمام تر سازشیں ناکام ہو سکتیں ہیں۔

10.4.1 مدرسۃ الزہرا

سعید نورسی نے اس بات کو محسوس کیا کہ جدیدیت کے اس دور میں جب سائنس اور فلسفہ کو حرف آخر کا درجہ دیا جا رہا ہے ایسے وقت میں قرآن اور اسلام کی ترویج و اشاعت اور اسلام مخالف شکوک و شبہات کے لیے روایتی طریقہ تعلیم ناکافی ہے۔ اس کے لیے آپ نے کوشش کی اور وان میں قیام کے دوران نظام تعلیم کی اصلاح پر بھی کام کیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ ہماری موجودہ تعلیمی دینی نظام ناقص ہے اور دینی شرعی علوم کے مدارس میں جدید سائنس اور حکمت کی تعلیم اور اسی طرح جدید تعلیمی درسگاہوں میں سائنس کے ساتھ دینی علوم کی تعلیم بھی دی جانی چاہیے۔ اس خیال سے انہوں نے مصر کے جامعہ الازہر کی طرز پر 'مدرسۃ الزہرا' کا منصوبہ مکمل کیا، جسے انہوں نے علوم دینیہ اور جدید علوم کی اشاعت کے نقطہ نظر سے بنایا تھا اور اس میں یہ بات شامل کی تھی کہ دینی درسگاہوں میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ سائنس اور جدید علوم کی تعلیم کو بھی فروغ دیا جانا چاہیے اس منصوبہ کی تکمیل کے لیے امداد حاصل کرنے کے لیے انہوں نے 1896 اور دوبارہ 1907 میں دار الخلافہ استنبول کا رخ کیا اور وہاں کے اہل دانش اور حکمراں کو ایسی یونیورسٹی کے قیام کے لیے قائل کرنے کی کوشش کی وہاں ان کی تجاویز بارآور نہ ہو سکیں۔ استاد سعید النورسی جب دارالخلافہ پہنچے تو سلطان عبد الحمید کی حکومت ختم ہو چکی تھی، مشروطیت کے قیام کے بعد نظریاتی کشمکش پورے عروج پر تھی۔

استاد مشرقی اناطولیہ کے مقام پر جو مدرسہ الزہرا کے نام سے قائم کرنا چاہتے تھے استنبول میں 31 مارچ کو فوج اور علما کی بغاوت اور گرفتاری کے واقعہ کی بنا پر اپنے پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا اور انہیں کورٹ مارشل کا سامنا کرنا پڑا۔ سعید نورسی کے بلند اور خالص عزائم کو غلط معنی پہنائے گئے اور کئی بار انہیں بے بنیاد الزامات کا سامنا کرنا پڑا جس کی بنا پر انہوں نے استنبول چھوڑ دیا لیکن اس مدرسہ کے قیام کی لگن نے انہیں شام کے مختصر قیام کے بعد دوبارہ استنبول کا رخ کرنے پر مجبور کر دیا اور اس وقت کے عارضی خلیفہ رشاد سے رابطہ کر کے اس جدید طرز کے مدرسہ کے قیام لیے انہیں قائل کر لیا اور ان سے اس مدرسہ کے قیام کے لیے انیس ہزار پونڈ کی رقم منظور کروالی اور 'وان' کے علاقے ایدرمیت کے مقام پر آپ نے اس دارالعلوم کی بنیاد ڈالنی شروع کی لیکن اسی دوران میں جنگ عظیم اول کا آغاز ہو گیا اور یہ منصوبہ ادھورا رہ گیا۔

ترکی کی آزادی کے بعد دوبارہ سعید نورسی نے اس طرف اپنی توجہ مبذول کی اور حکومت سے اس کے لیے مزید گرانٹ منظور کروائی لیکن ان کی زندگی میں اس مدرسہ کی داغ بیل نہ پڑ سکی کیوں کہ آپ کو اسلام اور شریعت پسندی کی بنا پر حکومت کی جانب سے

پابندیوں نظر بندیوں اور قید کا سامنا کرنا پڑا۔

استاد نورسی نے ان تمام مصائب سے ہار نہیں مانی بلکہ رسائل نور کو ہی ایک مدرسہ کی حیثیت دی اور اس کے ذریعہ سے قرآن کی تعلیمات اور اسلام کی حقانیت کو فروغ دینے پر توجہ مرکوز کردی اور مایوسی کے اس دور میں امید رحمت کی ایک کرن بن گئے۔ ان رسائل نے سائنس اور مادیاتی ترقی کے نتیجے میں امڈنے والے الحاد کے سیلاب پر بند باندھنے کا کام کیا۔ آپ کے انتقال اور ترکی میں اسلام موافق سیاسی حکومت کے قیام کے بعد مدرستہ الزہرا کا قیام عمل میں لایا گیا اور استاد نورسی کے افکار کی روشنی میں یہاں قدیم اور جدید تعلیم کا امتزاج کے ساتھ تعلیم دی جاتی ہے۔

10.4.2 استنبول کے اسفار

1986 جب پہلی مرتبہ آپ نے استنبول کا سفر کیا تو آپ کی شہرت آپ سے پہلے استنبول پہنچ چکی تھی۔ اور جب آپ استنبول پہنچے تو ایک اخبار نے ان کی آمد پر یہ ہیڈ لائین طبع کی "مشرق کی سنگلاخ چٹانوں سے عقل و دانش کا ایک آتش پارہ استنبول کے افق پر طلوع ہوا ہے"۔

استاد نورسی نے دارالخلافہ پہنچ کر سب سے پہلے وہاں کے علماء کو اپنے یہاں مدعو کیا جہاں مختلف مشہور علما نے آپ سے متفرق سوالات کیے جن کے جواب نے وہاں کے علماء کو بھی حیرت زدہ کر دیا۔ اس قیام کے دوران آپ نے اپنے دروازے کے باہر ایک تختی لکھ کر لٹکادی تھی جو اس طرح تھی "یہاں ہر مشکل گرہ کھولی جاتی ہے اور ہر سوال کا جواب ملتا ہے لیکن کوئی سوال نہیں کیا جاتا"۔ اس بات نے استنبول کے علما کو ان کی طرف راغب کیا اور جوق در جوق لوگ آپ کے پاس اپنے سوالات اور مسائل لے کر آنے لگے۔

استاد نورسی کے استنبول میں قیام کے وقت معروف جامعہ ازہر کے شیخ الجامعہ بھی استنبول آئے ہوئے تھے ان سے بھی آپ کی علمی نشستیں ہوئیں۔ ایک موقع پر شیخ نے استاد سے سوال کیا کہ خلافت عثمانیہ اور یورپی اقوام کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ استاد نورسی نے اس کا عربی زبان میں نہایت جامع جواب دیا "یورپ کو آج اسلام کا حمل ٹھہر چکا ہے اور کسی روز وہ اسے جنے گا اور خلافت عثمانیہ کو تہذیب یورپ کا حمل ٹھہر چکا ہے اور کسی روز وہ اسے جنے گی"۔ استاد کا یہ جواب سن کر شیخ نے حیرت سے کہا کہ ایسے نوجوان سے بحث و مناظرہ نہیں کیا جاسکتا۔

استاد کا یہ تبصرہ آج حرف بحرف سچ ثابت ہو رہا ہے۔ یہ حقیقت عیاں ہو گئی ہے کہ یورپ نے نشاۃ ثانیہ سے قبل جو مسلم ممالک سے اکتساب فیض کیا تھا اس کے نتیجہ میں وہ اسلام کی اکثر خوبیوں کو اپنا چکے ہیں اور اسی طرح ترکی میں تنظیمات کے دور کے بعد جس طرح مغربی فکر کو اپنایا گیا تھا وہ آج اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ترکی یورپی ملک ہے۔

اسی زمانے میں استنبول میں ایمینویل قرہ صوجو ایک یہودی اور فری میسن لاج کا ماسٹر تھا اور سلطان عبد الحمید کو معزول کرنے والے ممبران میں شامل تھا اس نے استاد سے ملاقات کی تا کہ وہ ان کو اپنا ہم خیال بنا سکے استاد نے گفتگو کے دوران اسے ایسے جوابات دیے کہ وہ بحث چھوڑ کر چلا گیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اگر میں استاد کے پاس اور تھوڑی دیر رکتا تو وہ مجھ کو مسلمان بنا لیتے۔

استنبول کے قیام کے دوران میں ہفت روزہ سبیل الرشاد جو اسلامی سرگرمیوں کا مرکز تھا، آپ روزآنہ وہاں جاتے اور وہاں کے ساتھیوں سے گہرے علمی مباحث پر گفتگو اس انداز سے کرتے کہ ان کا بھی جوش ایمانی گرما جاتا۔

10.4.3 سیاسی پارٹی میں شمولیت

استنبول چونکہ سیاسی سرگرمیوں کا گڑھ تھا اور جن وقتوں میں آپ استنبول پہنچے تھے اس وقت نئی نئی سیاسی پارٹیاں وجود میں آرہی تھیں۔ ایسے موقع پر جبکہ مملکت کے مستقبل کا لائحہ عمل تیار کیا جارہا تھا استاد سعید نورسی سیاست سے قطع تعلق نہیں کرسکتے تھے کیوں کہ سیاست سے ان کی دلچسپی اسلام کی خاطر ہی تھی اور وہ سیاست کے راستے اسلام کی خدمت کرنا چاہتے تھے اور مملکت کی سیاسی زندگی میں سیاسی جماعت کے بغیر حصہ نہیں لیا جاسکتا تھا اس لیے استاد نورسی نے اپنے کچھ مجاہد دوستوں کے ساتھ مل کر اتحاد محمدی کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم کی جس کا اہم مقصد شریعت کی حکمرانی اور اتحاد اسلامی کی علم برداری تھا۔ اس جماعت کے اثرات مختصر مدت میں دور دور تک پہنچ گئے۔ ان کے صرف ایک مضمون جو کہ اخبار 'وولکن' میں شائع ہوا تھا پچاس ہزار افراد ان کی پارٹی میں شامل ہوگئے۔ استاد بدیع الزماں کا سیاسی مسلک نہایت سادہ اور واضح تھا آپ جبر و استبداد کے خلاف حریت اور آزادی کے علم بردار تھے اسی وجہ سے وہ مشروطیت یعنی آئینی حکومت کی تائید کرتے تھے۔ اس لئے اس دور میں آپ نے جتنے بھی مضامین لکھے یا جو بھی تقاریر کیں ان میں دو باتوں پر سب سے زیادہ زور دیا اول تو یہ کہ آمرانہ طریقہ ترک کردیا جائے اور لوگوں کو مکمل آزادی دی جائے دوم یہ کہ حکومت کے احکام و قوانین کو اسلامی احکام کے مطابق بنایا جائے انہوں نے عوام کو خبردار کیا کہ اگر آئینی حکومت یا مشروطیت کو 'حریت شریعہ' کے ساتھ قبول نہیں کیا جائے گا تو استبدادی حکومت قائم ہو جائے گی۔ چنانچہ ان کی تقریر کا ایک اقتباس جو انہوں نے اعلان مشروطیت کے تیسرے دن کی تھی اس طرح ہے "اے برادران وطن! حریت کی غلط تفسیر نہ کرو، ورنہ وہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اگر تم نے حسب سابق قید و بند کو نیا لباس پہنایا تو ہمارا گلا گھونٹ دوگے۔ حریت ایسی چیز ہے جسے احکام شریعت پر عمل کرکے اور اخلاق حسنہ کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے اور اس کی نشو نما ہوتی ہے"۔

اسی طرح ایک اور مضمون جو 'حقیقت' کے عنوان سے 'دینی جریدہ' کی ایک اور اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:
"ہمارے اتحاد کی بنیاد توحید پر ہے۔ جب تک ہم توحید پر رہیں گے متحد رہیں گے۔ ہر مومن اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے مکلف ہے، اس زمانے میں مادی ترقی بہت بڑا ہتھیار ہے۔ اجنبی قومیں سائنس، صنعت اور اسلحہ سازی کے ذریعہ ہمیں کچل رہی ہیں۔ ہم بھی سائنس صنعت اور اسلحہ سازی کے ذریعہ اعلائے کلمۃ الحق کے سب سے بڑے دشمن جہل، غربت، اور اختلاف افکار کے خلاف جہاد کریں گے۔ مشروطیت، عدالت مشاورت اور قانون پر منحصر ہے۔ تیرہ سو سال پہلے شریعت غرہ کی تاسیس کے بعد احکام و قوانین کے لیے یورپ کے آگے ہاتھ پھیلانا دین اسلام کے ساتھ ایک بڑا جرم ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے جنوب (ترکی کی سمت کے اعتبار سے قبلہ جنوب میں آتا ہے) کے بجائے شمال کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنا، قوت قانون میں ہونا چاہیے ورنہ استبداد عام ہو جائے گا"۔

استاد بدیع الزماں سعید نورسی کو سیاسی طور پر زیادہ کام کرنے کا موقع نہ مل سکا کیوں کہ اس پارٹی کے قیام کے آٹھ دن بعد ہی ترکی

میں فوجی دستوں کی بغاوت نے صورت حال یکسر تبدیل کر دی اور مشروطیت ختم کر کے مارشل لانافذ کر دیا گیا، سلطان عبد الحمید کو بغاوت کے الزام میں معزول کر دیا گیااوران کے بھائی کو خلیفہ نامزد کر دیا گیا۔ دینی وسیاسی رہنماوں کو گرفتار کر کے مارشل عدالت میں ان پر مقدمہ چلایا گیا جس میں استاد بدیع الزماں بھی شامل تھے۔ عدالت میں چونکہ استاد نورسی پر کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا اس لیے انہیں باعزت بری کر دیا گیا۔

استاد رہا ہونے کے بعد دوبارہ وان چلے گئے اور وہاں رہ کر مسلمانوں کی سماجی اور علمی اصلاحات کے لیے خطبات اور درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اسی زمانے میں مناظرات کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو سوال وجواب کی شکل میں لکھی۔ اس میں ترکی کے سرحدی علاقے کے سرداران اور شام کے علاقے کے امرا سے کیے جانے والے سوالات کے جوابات کے علاوہ اصلاح امت اسلامیہ کے لیے بھی سوال وجواب تحریر کیے گئے۔

10.4.4 خطبہ شامیہ

استاد نورسی جب وان سے شام گئے تو وہاں کے علما کے پرزور اصرار پر عربی میں نہایت فصیح وبلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جو خطبہ شامیہ کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ یہ خطاب آپ نے مسجد اموی میں کیا تھا جس میں لگ بھگ ایک سو علما اور دس ہزار سامعین موجود تھے۔ اس خطبہ کو غیر معمولی قبولیت حاصل ہوئی۔ اس خطبہ میں آپ نے اخلاقی اور مادی بیماریوں کی نشاندہی کی تھی، جن میں اس وقت عالم اسلام مبتلا تھا۔ اس خطبے میں آپ نے نہ صرف ان امراض کی نشاندہی کی بلکہ ان سے خلاصی کے راستے بھی بتائے پھر عقلی دلائل سے ثابت کیا کہ اسلام عنقریب روئے زمیں پر بلند ترین مادی اور معنوی ترقی کے افق پر دوبارہ طلوع ہو گا اور اس کی آئندہ آنے والی تہذیب کمال شان وشوکت کے ساتھ زمین کے چہرے سے تمام میل کچیل صاف کرے گی۔

یہ خطبہ صرف عالم اسلام کے لیے ہی نہیں بلکہ عمومی انسانیت کے لیے بھی ہمہ گیر اور عظیم الشان درس کی حیثیت رکھتا ہے۔ خطبہ شامیہ استاد نورسی کی زندگی ہی میں کئی مرتبہ شائع ہو چکا تھا اور اس کے تمام نسخے ختم ہو گئے تھے بعد میں استاد نورسی کے ایک نسخے کا پتہ چلا تو ان کے شاگردوں کی فرمائش پر استاد نورسی نے اس کا ترکی میں ترجمہ کیا اس وقت کے حالات کے اعتبار سے اضافے بھی کیے اور اس پر ایک مقدمہ بھی تصنیف کیا۔

آپ خطبے کے آغاز میں فرماتے ہیں: ”میں نے اس زمین پر اور اس زمانے میں نوع بشر کی معاشرتی زندگی کے مدرسے میں یہ سیکھا ہے اور اس بات کا علم حاصل کیا ہے کہ قرون وسطی میں جس نے ہمیں مادی طور پر آگے بڑھنے سے روک دیا اور یورپ اور دیگر اقوام کو ترقی کی راہ پر ڈال دیا جس کی بنا پر وہ مستقبل کی سمت میں پرواز کر رہی ہیں، اور ہم پیچھے رہ گئے ہیں، وہ صرف چھ بیماریاں ہیں“۔ استاد کے مطابق مسلمانوں کی بدحالی کی چھ بیماریاں یا اسباب یہ ہیں:

- مایوسی کا چھا جانا
- حیات اجتماعی اور سیاسی صداقت کا خاتمہ

- عداوت سے محبت
- اہل ایمان کے درمیان رابطہ نہ ہونا
- استبداد
- ذاتی مفاد پرستی

استاد نورسی نے آگے ان مہلک بیماریوں کے علاج کے بارے میں فرمایا کہ اس کا علاج انہوں نے قرآن کی ڈسپنسری سے حاصل کیا جو کہ ہمارے معاشرتی زندگی کے لیے ایک میڈیکل کالج کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس علاج کی وضاحت میں آگے آپ نے چھ باتیں کہیں جن میں پہلی بات یا حل 'امید، یعنی رحمت الٰہی سے قوی امید رکھنا' ہے، دوسری بات سستی اور کاہلی سے گریز کرنا۔ تیسری بات 'سچائی' کو مضبوطی سے تھامنا کیوں کہ سچائی اسلام کی اساس ہے اس لیے اپنے درمیان سچائی کو زندہ کرنا ہے۔ چوتھی بات جو فرمائی ہے وہ محبت کی صفت کو پیدا کرنا اور اس صفت سے محبت کرنا اور اور دشمنی کرنے سے نفرت کرنا کیوں کہ دشمنی معاشرتی زندگی کو اوندھا کر کے رکھ دیتی ہے اور یہ ایک نہایت نقصان دہ اور بدصورت صفت ہے۔ اس لیے اس صفت سے دشمنی رکھنی ضروری ہے۔ پانچویں بات جو آپ نے ارشاد فرمائی وہ یہ کہ اس دور میں آدمی کا گناہ صرف اس کا گناہ نہیں رہ جاتا بلکہ بڑھتا جاتا ہے بسا اوقات ایک سو گناہ بن جاتے ہیں اور یہ بسا اوقات خاندان، قبائل اور اقوام کو بھی مشکوک اور مشتبہ کر دیتی ہے بالکل یہی صورت نیکی کی فرمائی کہ کوئی نیکی ایک ہی نہیں رہتی بلکہ بسا اوقات ہزاروں تک پہنچ جاتی ہے اور ایک انسان کی نیکی اس کے قبیلہ قوم اور ملک ایک وقار عطا کرتی ہے۔ چھٹی بات جو آپ نے کہی وہ یہ تھی کہ مسلمانوں کی سعادت اور فیروزمندی کی کنجی اسلامی معاشرتی زندگی میں ہے جس کو انہوں نے شرعی شوریٰ سے تعبیر کرتے ہوئے بتایا کہ جس طرح خاندان اور قبائل باہم ایک دوسرے سے مشورہ کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اسی طرح ملک اور براعظموں کو بھی ایک دوسرے سے مشورہ کرنا چاہیے اور مادی اور روحانی مدد کرنی چاہیے۔

استاد نورسی میدان جنگ میں

استاد سعید نورسی صرف ذہنی طور پر ہی نہیں بلکہ جسمانی لحاظ سے بھی قوی اور جفاکش تھے۔ سپاہیانہ پیشہ کو پسند کرتے تھے۔ نشانہ بازی اور گھڑ سواری آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ استاد کے وان میں قیام کے دوران پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا جو کہ قفقاز کے روسی محاذ سے قریب تھا۔ استاد نورسی جنگ عظیم کے آغاز سے ہی قفقاز کے محاذ میں اپنے طلبہ کے ساتھ بحیثیت ایک رضاکار کمانڈر موجود تھے۔ اس جنگ کے دوران استاد نورسی نے حیرت انگیز بہادری اور اخلاقی کردار کا مظاہرہ کیا۔ اس دوران انہوں نے صوبہ تلبیس اور وان کی بے شمار خواتین اور بچوں کی جانیں بچائیں اور انہیں محفوظ مقامات پر پہنچایا۔ اس حملے کے دوران ان کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی اور وہ روسی فوجیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے اور روسی کیمپ میں علاج کے بعد انہیں 'کوستتروما' نامی علاقے میں قیدیوں کے کیمپ میں بھیج دیا گیا جہاں دیگر ترک فوجی بھی قید تھے۔

اس حالت جنگ اور قید میں بھی استاد نورسی نے علمی و اصلاحی مصروفیات سے روگردانی نہیں کی بلکہ جنگ کے دوران انہوں نے 'اشارات اعجاز' کے نام تفسیر قرآن لکھنے کا آغاز کیا جس کا کچھ متن خندق میں کچھ گھوڑے کی پیٹھ پر اور کچھ مورچوں میں املا کروایا جس کو ان کے ساتھی ملا حبیب قلم بند کرتے رہے۔ روسی کیمپ میں قید کے دوران اپنے ساتھی قیدیوں کو باقاعدگی کے ساتھ درس دیتے تھے۔ استاد نورسی قید خانے کو ہمیشہ مدرسہ یوسفیہ کا درجہ دیتے تھے اور اپنے علمی فیض سے قیدیوں اور پہرے داروں کو بھی سرفراز کرتے تھے۔

روس کی قید میں ڈھائی سال گذارنے کے بعد 1917ء میں استاد کو اس قید سے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ فرار ہونے کے بعد آپ جرمنی کے علاقے میں پہنچے اور وہاں سے استنبول پہنچے اور جنگ عظیم کے اختتام کے بعد ترکی کی آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہوگئے۔ اس زمانے میں برطانوی حکومت نے بعض علما کو بھی اپنا آلہ کار بنانا چاہا تو استاد نے اس نازک موقع پر 'الخطوات الستہ' نامی کتابچہ تصنیف کیا اور علما و عوام کو برطانوی عزائم سے آگاہ کیا۔ یہ کتابچہ خفیہ طور پر شائع کیا گیا اور ان کے ترک طلبہ نے اس کو عوام میں پہنچایا۔

ترکی کی آزادی اور سقوط خلافت اسلامیہ اور حکومت عثمانیہ کے بعد سعید نورسی نے 1922 میں ایک بار دارالحکومت انقرہ میں نئی پارلیمنٹ کا دورہ کیا لیکن وہاں کے یورپی مرعوبیت والے ماحول سے بددل ہو کر پھر وان کا رخ کیا اور اسلام اور سیکولر پسندوں کے درمیان تناؤ سے بیزار ہو کر انہوں نے سیاست سے بالکل کنارہ کشی اور گوشہ نشینی اختیار کرلی، اور یہاں سے ان کی اصلاحی جدوجہد کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ کہتے ہیں کہ اس دور جدید کا آغاز انہوں نے 'اعوذ باللہ من الشیطن و السسیاسیہ' سے کیا۔ اس دور کو وہ خود اپنی شخصیت کو جدید سعید کے نام سے موسوم کیا۔

استاد نورسی کی غیر معمولی ذہانت ایک خدائی تحفہ تھی ان کی ذہانت کا اظہار مشکل ترین مسائل میں ہوتا تھا ان کا ذہن ہمیشہ غور و فکر میں مشغول رہتا ان کا رہبر اور ان کے تمام فیض کا سرچشمہ صرف قرآن تھا وہ اس کی روشنی سے کسب نور کرتے تھے ان کا قلب صحابی کی طرح ایمان سے معمور تھا۔ انہیں شرک و بت پرستی سے اس قدر نفرت تھی کہ ترکی اسکالر اشرف ادیب لکھتے ہیں کہ اگر وہ نبی ﷺ کے عہد میں ہوتے تو بتوں کے توڑنے کا کام انہیں کے سپرد کیا جاتا۔ (بدیع الزماں نورسی اور نورسی تحریک)

10.5 سعید النورسی کی تصنیفی خدمات

استاد بدیع الزماں مشہور مبلغ دین مصلح اور عالم ہونے کے ساتھ ساتھ کثیر التصانیف مصنف بھی تھے۔ تصنیف کا کام وان کے قیام کے دوران ہی شروع کر دیا تھا۔ ان کی تصانیف میں کتابیں، تقریروں کے مجموعے، خطوط اور ایک بڑی تعداد میں رسائل شامل ہیں۔

مناظرات ان کی پہلی تصنیف شمار کی جاتی ہے یہ کتاب عربی زبان میں لکھی گئی، آپ نے ابتداء تفسیر قرآن کریم 'اشارات اعجاز القرآن' کے نام سے لکھنا شروع کی تھی جو کہ جنگ عظیم کی وجہ سے مکمل نہ ہوسکی۔ یہ تفسیر بھی عربی زبان میں ہے۔ اس کی تالیف کا طریق کار نہایت منفرد تھا کیوں کہ آپ نے یہ تصنیف میدان جنگ میں املا کروائی جو کہ کبھی گولیوں کی بوچھاڑ، کبھی گھوڑے کی زین، اور کبھی خندق میں ان کے شاگرد نے لکھیں۔ یہ تفسیر نہایت ایجاز اور اختصار کے ساتھ لکھی گئی اور کسی مرجع اور مصدر کے بغیر لکھی گئی۔ اس تصنیف

کے بارے میں ملا سعید خود فرماتے ہیں کہ چونکہ یہ تفسیر ایسے وقت میں لکھی گئی جبکہ ہر لمحہ شہادت کے لیے تیار رہتا تھا اس لیے یہ کتاب خالص نیت کے ساتھ بلاغت کے قوانین اور علوم عربیہ کے اصولوں کے مطابق لکھی گئی۔ یہ تفسیر ہزار تفاسیر کے برابر ہے اور اس میں ہزار تفاسیر کے برابر قوت ہے، اس تفسیر کی تمام علما اسلام نے تعریف کی ہے اور اس کے بارے میں کہا ہے کہ یہ ایک بے مثال تفسیر ہے۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سعید نورسی نے دو تفاسیر تصنیف کیں ایک اشارات الاعجاز جو نہایت جامع ہے اور دوسری رسائل نور کی شکل میں جو نہایت عام فہم اور اپنے آپ میں نہایت منفرد ہے۔

وان کے قیام کے دوران استاد نورسی نے ریاضی کے موضوع الجبر والمقابلہ پر بھی ایک کتاب لکھی تھی جو کہ آگ لگنے کے حادثہ میں ضائع ہوگئی۔ ان کے علاوہ استاد کی حسب ذیل کتابوں کے نام ملتے ہیں عصائے موسی، فہرست، ذوالفقاالحرب االسیاسیہ، طلسملر یہ کتابیں قدیم ترکی زبان میں تصنیف کی گئیں تھیں۔ ابتدائی مرحلے میں تصنیف کی گئی مزید پانچ کتابوں کے بارے میں پتہ چلتا ہے جن میں سے اکثر آج مفقود ہیں۔

آپ کی مشہور تصانیف میں اقوال، مکتوبات، لمعات، شعاعیں شامل ہیں۔ جو کہ قدیم ترکی رسم الخط جو کہ عربی تھا میں تصنیف کی گئیں یہ اور دیگر تصانیف رسالہ نور کے نام سے شائع ہوئی ہیں جو آپ کے رسائل و مکتوبات کا مجموعہ ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ مختلف رسائل اور جریدوں میں مضامین بھی تحریر کیے اور سیاسی مسائل پر تقاریر بھی کیں۔ نورسی تحریک کے ارتقااور مقبولیت میں رسائل نور کا کردار بہت اہم رہا۔ تحریک کے ارتقامیں رسائل نور کے کردار کے بارے میں تفصیل سے ہم اگلی اکائی میں مطالعہ کریں گے۔

بدیع الزماں سعید نورسی ایک ایسی نمایاں شخصیت ہیں جنہوں نے مختلف مذہبی اصلاحات کے ذریعے مسلم امت کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کی زندگی کو دو اہم ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اول دور کو 'قدیم سعید' کے نام سے جانا جاتا ہے جو سلطنت عثمانیہ کی آخری دہائیوں سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب مسلم دنیا قوم پرستی کے جذبے کی بنیاد پر جغرافیائی طور پر منقسم تھی۔ یہ منظر نامہ مسلمانوں کو درپیش چیلنجوں میں سے ایک تھا جس نے انہیں نہ صرف جسمانی بلکہ روحانی طور پر بھی کمزور کر دیا۔

بدیع الزماں کی زندگی کے دوسرے دور میں ان کے کارناموں کی بنا پر ان کی شخصیت کو 'سعید جدید' کہا جاتا ہے جو پہلی جنگ عظیم میں خلافت عثمانیہ کی شکست کے بعد ابھرا اور ترک جمہوریہ کی پہلی چار دہائیوں تک جاری رہا۔ ترکی کی جمہوری حکومت نے ان کو 1925 میں وان سے جلاوطن کر دیا اور اس کے بعد ان پر ابتلا اور آزمائش کے دور کا آغاز ہوا جس میں رسائل نور اور نورسی تحریک نے اپنے بال و پر نکالے اور ترکی میں اسلام کی شمع کی حفاظت کے لیے فانوس کا کام کیا۔

اپنی زندگی کے اس مرحلے میں، نورسی نے تحریری سرگرمیوں پر زیادہ توجہ دے کر اپنے نقطہ نظر کو فعال سیاسی مشغولیت سے دانشورانہ جدوجہد کی طرف موڑ دیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں دنیا پر ثابت کر دوں گا کہ قرآن وہ روحانی آفتاب ہے جو نہ کبھی غروب ہوگا اور نہ جس کی روشنی کبھی ختم ہو سکے گی۔ اور ان کی اس نئی شخصیات نے اس بات کو رسالہ النور کے ذریعے ثابت کر دیا جس نے پوری مسلم برادری پر نمایاں اثر ڈالا، آپ نے مغربی اناطولیہ کے مختلف علاقوں میں جلاوطنی اور قید کے دوران لکھا تھا۔ رسالہ النور میں، انہوں نے زندگی

کے بنیادی سوالات پر غور کرنے پر زیادہ توجہ دی اور 1923 میں ترک جمہوریہ کے قیام کے بعد نئی قائم کردہ حکومت کی طرف سے درپیش چیلنجوں کا سامنا کرتے ہوئے ترک مسلمانوں کے عقیدے کو مضبوط کرنے کی کوشش کی۔

بدیع الزماں کی زیادہ تر زندگی قید اور جلاوطنی میں گذری۔ آپ نے 27 رمضان 1959ء میں 86 برس کی عمر میں وفات پائی۔

10.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- بدیع الزماں سعید النورسی کردستان سے تعلق رکھنے والے ایک ممتاز عالم دین، مجاہد، مصلح اور صوفی تھے۔ آپ نہایت ذہین و فطین تھے۔ آپ نے قرآن کریم، حدیث، فقہ، تاریخ، فلسفہ، جغرافیہ اور دیگر علوم و فنون میں مہارت حاصل کی۔
- استاد نورسی نے اپنی سیاسی جدوجہد کا آغاز اس وقت کیا تھا جب کہ ان کی عمر بیس برس کی تھی ۔ آپ نے اسلام کی خدمت کی نیت سے سیاست میں حصہ لیا اور اسلامی خلافت کو بچانے کی کوشش کی لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا اور پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا جو کہ قفقفاز کے روسی محاذ سے قریب تھا۔ استاد نورسی جنگ عظیم کے آغاز سے ہی قفقفاز کے محاذ میں اپنے طلبہ کے ساتھ بحیثیت ایک رضاکار کمانڈر موجود تھے۔ اس جنگ کے دوران استاد نورسی نے حیرت انگیز بہادری اور اخلاقی کردار کا مظاہرہ کیا۔
- استاد بدیع الزماں مشہور مبلغ دین مصلح اور عالم ہونے کے ساتھ ساتھ کثیر التصانیف مصنف بھی تھے۔ تصنیف کا کام وان کے قیام کے دوران ہی شروع کر دیا تھا۔ ان کی تصانیف میں کتابیں، تقریروں کے مجموعے، خطوط اور ایک بڑی تعداد میں رسائل شامل ہیں۔
- استاد نورسی کے مطابق مسلمانوں کی بدحالی کے چھ اسباب ہیں: مایوسی کا چھا جانا، حیات اجتماعی اور سیاسی صداقت کا خاتمہ، عداوت سے محبت، اہل ایمان کے درمیان رابطہ نہ ہونا، استبداد اور ذاتی مفاد پرستی۔ جس کے علاج کو وہ قرآن کریم کی تعلیمات کے ساتھ مشروط کرتے ہیں۔
- بدیع الزمان سعید نورسی کی شخصیت نے مختلف مذہبی اصلاحات کے ذریعے مسلم امت کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کی زندگی کو دو اہم ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول دور کو 'قدیم سعید' کے نام سے جانا جاتا ہے جو سلطنت عثمانیہ کی آخری دہائیوں سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب مسلم دنیا قوم پرستی کے جذبے کی بنیاد پر جغرافیائی طور پر منقسم تھی۔
- بدیع الزماں کی زندگی کے دوسرے دور میں ان کے کارناموں کی بنا پر ان کی شخصیت کو 'سعید جدید' کہا جاتا ہے جو پہلی جنگ عظیم میں عثمانی شکست کے بعد ابھرا اور ترک جمہوریہ کی پہلی چار دہائیوں تک جاری رہا۔ ترکی کی جمہوری حکومت نے ان کو 1925 میں وان سے جلاوطن کر دیا اور اس کے بعد ان پر ابتلاء اور آزمائش کے دور کا آغاز ہوا جس میں رسائل نور اور نورسی تحریک نے اپنے بال و پر نکالے اور ترکی میں اسلام کی شمع کی حفاظت کے لیے فانوس کا کام کیا۔

10.7 نمونہ امتحانی سوالات

10.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. نورسی تحریک کے بانی کا نام کیا ہے؟

(a). فتح اللہ گولن (b). بدیع الزمان سعید (c). عمر مختار (d). عمر دحلان

2. نورسی تحریک کا تعلق کس ملک سے ہے؟

(a). لیبیا (b). ترکی (c). انڈونیشیا (d). مصر

3. ان میں کون سی تصنیف استاد نورسی نے میدان جنگ میں تصنیف کی؟

(a). اشارات اعجاز القرآن (b). لمعات (c). مناظرات (d). الخطواط السیاسیہ

4. رسائل النور کا موضوع کیا ہے؟

(a). تفسیر (b). حدیث (c). تصوف (d). تاریخ

5. بدیع الزماں کس کا لقب ہے؟

(a). سعید نورسی (b). عمر مختار (c). حاجی دحلان (d). حسن البنا

6. بدیع الزمان سعید النورسی نے کس کو ظلم سے روکنے کی کوشش کی؟

(a). سلطان عبد المجید (b). سلطان عبد الحمید (c). مصطفی پاشا (d). سب صحیح

7. سعید النورسی کی پہلی تصنیف کا نام کیا ہے؟

(a). مناظرات (b). رسائل نور (c). اشارات الاعجاز (d). خطواط الستہ

8. سعید نورسی کس تحریک کے ممبر تھے؟

(a). جمعیت محمدیہ (b). نیشنل سالویشن پارٹی (c). کمال ازم (d). سب صحیح

9. 'جب تک مسلمانوں کے پاس قرآن ہے ہم ان پر غلبہ نہیں پاسکتے' یہ جملہ کس مستشرق نے کہا تھا؟

(a). گلیڈسٹون (b). لوئس ماسینون (c). کارل مارک (d). سب غلط

10. کس تحریک نے ترکی میں اسلام کے احیا کی پر زور کوشش کی؟

(a). سنوسی (b). نہضۃ العلماء (c). نورسی تحریک (d). مہدوی

10.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. رسائل نور کا تعارف پیش کیجیے۔
2. بدیع الزماں نورسی کے ذاتی احوال پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔
3. مدرسۃ الزہرا کیا ہے اور بدیع الزماں اسے کیوں بنانا چاہتے تھے۔
4. بدیع الزماں نورسی کے سیاسی افکار کا خلاصہ تحریر کیجیے۔
5. بدیع الزماں سعید نورسی کی علمی خدمات پر ایک تجزیاتی نوٹ تحریر کیجیے۔

10.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. نورسی کی حیات و خدمات کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔
2. نورسی کے افکار و نظریات اور ان کے اثرات کا جائزہ پیش کیجیے۔
3. بدیع الزماں سعید نورسی کی سیاسی جدوجہد پر ایک تبصراتی مضمون قلم بند کیجیے۔

10.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

.1	بدیع الزماں سعید النورسی (شخصیت اور تحریک)	:	ثروت صولت
.2	عصر حاضر کی اسلامی تحریکات	:	سیدہ مسعودہ نعیم شاہ
.3	خودی کا سر نہاں	:	سعید نورسی (مترجم ثناء اللہ شاہد)
.4	ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ	:	ثروت صولت
.5	بدیع الزماں سعید نورسی حیات و واقعات	:	شاگرد نورسی (مترجمین: ثناء اللہ شاہد، افضل حسین، صالح سونمر وغیرہ)

اکائی 11: نورسی تحریک (حصہ دوم)

اکائی کے اجزا:

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 نورسی تحریک کا تعارف

2.3 پس منظر آغاز و ارتقا

2.3.1 استاد نورسی اور مسئلہ قومیت

2.3.2 نورسی تحریک کے کارنامے

2.3.3 نورسی تحریک کے اثرات

2.4 نورسی تحریک کے فروغ میں رسائل نور کا کردار

2.4.1 رسائل نور لکھنے کا طریقہ کار

2.4.2 رسائل کا موضوع

2.5 اکتسابی نتائج

2.6 نمونہ امتحانی سوالات

2.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

2.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

2.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

2.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

11.0 تمہید

انیسویں صدی کے نصف اول کا سب سے بڑا سانحہ 3 مارچ 1924ء کو کمال اتاترک کے ہاتھوں خلافت عثمانیہ کا خاتمہ تھا۔ عالم اسلام کے اتحاد کا شیرازہ بکھرنے کی وجہ سے مغربی استعمار اور ان کی بالادستی کے لیے راہیں ہموار ہو گئیں۔ عرب اور ترکی دونوں علاقوں میں قومیت پرست لوگ برسر اقتدار آئے اور زور قوت سے اسلام مخالف اصول کو اپنا وطیرہ بنایا۔

مصطفی کمال پاشا کے سیکولر نظریات اور مغربی طرز حکومت کے مقابلے میں ترکی میں احیائے اسلام کی ایمان کی حرارت سے معمور آواز بلند ہوئی جس نے ترکی میں آئے الحاد کے سیلاب پر بند باندھا اور ترکی عوام کے دلوں میں اسلام کے نور کو دوبارہ داخل کر دیا۔ وہ پر اثر شخصیت بدیع الزماں سعید النورسی تھے جنھوں نے تزکیہ اور تربیت کے نظام کے ذریعہ ترکی عوام کے دلوں میں اپنے خطبات، بیانات، اور رسائل کے ذریعے اسلام کا رشتہ استوار رکھا۔ ان کی بپا کی ہوئی تحریک کو دعوتی، اصلاحی اور اسلامی بنیادوں پر ترک جمہوریہ میں آگے رونما ہونے والی اسلامی تحریکوں کی بنیاد قرار دیا گیا۔

11.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ نورسی تحریک کے پس منظر سے واقف ہو سکیں اور اس تحریک کو فروغ دینے میں رسائل نور اور طلبہ نور کی حیثیت سے بحث کر سکیں۔ اس اکائی کے مطالعے سے آپ رسائل نور کی تحریری خصوصیات اور اس کی انفرادیت کے کا جائزہ لے سکیں اور اسی طرح اس تحریک کے اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے ترکی میں احیائے اسلام پر گفتگو کر سکیں۔

11.2 نورسی تحریک کا تعارف

نورسی تحریک ایک سنی تحریک ہے جس کی بنیاد 20ویں صدی کے اوائل میں مشہور مفکر استاد بدیع الزماں سعید نورسی نے رکھی تھی اور اس کی تشکیل استاد نورسی کی تحریروں جو 'رسائل نور' کے نام سے معروف ہیں، پر ہوئی تھی۔ استاد نورسی کی اس تحریک میں فقہ کے قوانین اور تصوف کے عناصر دونوں شامل ہیں۔ بدیع الزماں نورسی نے تعلیم اور آزادی کے ذریعے دنیا کی زندگی اور آخرت کی زندگی دونوں میں نجات کی اہمیت، قانون کی حکمرانی کی بہترین شکل کے طور پر اسلام، سائنس اور جمہوریت کی ترکیب پر زور دیا۔ اور یہی ان کی تحریک کی اساس بھی تھی۔

استاد نورسی موروثی یا نقلی حیثیت سے عقیدے کو ماننے کے بجائے تحقیقات کے ذریعے اتباع اسلام پر زور دیتے ہیں اور مانتے ہیں کہ اس ایمانی شعور کی بنا پر ہی مسلمان اس وقت مغربی دنیا سے ابھرتے ہوئے مثبتیت (Positivism)، مادیت پسندی (Materialism) اور الحاد (Atheism) جیسے فلسفوں کو مسترد کر سکتے ہیں۔

شریعت کے بارے میں ان کا تصور دو نکتوں پر مشتمل تھا۔ وہ کہتے تھے کہ شریعت کا اطلاق انسانوں کے رضاکارانہ اعمال پر ہوتا ہے

اور یہ فطرت کے قوانین کے مجموعے کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور دونوں کا ماخذ ایک ہی ہے یعنی 'خدائے واحد کی ذات'۔ استاد سعید نورسی کی تحریریں قرآن مجید کی، سائنس اور منطق کی روشنی میں تعبیرِ نو کرتی ہیں۔ ان کی تعلیمات کے نتیجے میں ابھرنے والی نورسی تحریک کے اہداف حسب ذیل تھے:

"سائنس اور اسلام کا ملاپ، جمہوریت کو قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے بہترین نظام حکومت سمجھنا، اسلامی ذہنی سطح کو بلند کرنے کے لیے عقل اور وحی میں تعلق کی نشاندہی کرنا، اور معیاری تعلیم کے دائرے میں رہتے ہوئے دونوں جہانوں میں نجات کا حصول"۔

ہر تحریک کی طرح اس تحریک کو بھی مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور کمال اتاترک کی حکومت نے 1960 اور 1970 کی دہائیوں کے دوران ایک اسلامی تحریک کے طور پر مخالفت کی ان پر الزامات بھی لگے اور ان پر مقدمات بھی دائر کیے گئے۔ طویل تحقیقات کے بعد بھی حکومت کو کوئی ایسا ثبوت نہ ملا جو آپ پر عائد شدہ الزامات کو درست قرار دے سکے یا حکومت سے بغاوت یا کسی اور طرح کی کوئی سازش کا ثبوت ہو اس کے باوجود بھی عدالت نے انہیں سزا دی اور بدیع الزماں اور ان کے ماننے والوں کو مختلف علاقوں میں جلاوطنی اور قید و بند کی زندگی گذارنی پڑی لیکن اس تحریک کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ 1999 کی ترکی کی ایک تعلیمی رپورٹ کی اشاعت کے مطابق نورسی تحریک کے 2 سے 6 ملین پیروکار تھے اور آج بھی اس کے متاثرین کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

11.3 پس منظر آغاز و ارتقا

نورسی تحریک (نور چلوک) ایک ترک اسلامی تحریک ہے جو رسالے نور (Epistle of light) قرآن کی جدید تشریح سے متاثر ہے۔ یہ رسائل پہلی بار 1926 میں برلا کی جیل سے شائع ہوئے تھے۔ سقوط خلافت کے بعد جب تمام فرقوں اور تحریکوں پر پابندی عائد تھی اس دور میں نورسی تحریک تیزی سے پھیلتی رہی۔

جنگ عظیم کے بعد خلافت عثمانی کا سقوط ہو گیا اور ترکی کے حصے بخرے کر دیے گئے جس کے نتیجہ میں جنگ بلقان ہوئی اس کے بعد جب ترکی کو آزادی ملی اور کمال اتاترک کی حکومت قائم ہوئی اس وقت بدیع الزماں سعید نورسی نئی حکومت کی دعوت پر انقرہ گئے اور نئے پارلیمنٹ کا دورہ کیا اور نئے اراکین سے ملاقات و مشاورت کی جس کے بعد سعید نورسی نے محسوس کیا کہ ترکی تو آزاد ہو گیا لیکن اسلام کی ہار ہو گئی اور اب اصل چیلنج سیاسی، معاشی، یا فوجی نہیں بلکہ نظریاتی تھا۔ وہ وہاں کے حالات سے یکسر بددل ہو گئے اور انقرہ سے واپس وان چلے گئے اور سیاست سے بالکلیہ کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اپنی زندگی کے اس دور کو جس کو وہ "جدید سعید" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں یہ بات اخذ کی جا سکتی ہے کہ اس دور کی خصوصیت سیاست اور عوامی زندگی سے ان کا انخلا تھا۔ یہ "اندرونی ہجرت" یا خاموشی میں واپسی ان کی سوچ اور تحریروں میں ہمیں نظر آتی ہے۔ اس دور میں لکھی تصنیفات کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ استاد نورسی کی بنیادی جدوجہد جدیدیت کے ساتھ نہیں بلکہ شکوک و شبہات میں مبتلا عوام کے ساتھ تھی۔

جیسا کہ آپ نے اوپر پڑھا کہ اس تحریک کی ابتدا انیسویں صدی کے آخر میں ہوئی جبکہ اس وقت مغربی استعماریت اور ان کے

افکار سے خلافت اسلامیہ مرعوبیت کا شکار تھی اور جنگ عظیم اول کے اختتام کے بعد سقوط خلافت نے اس تابوت میں آخری کیل کا کام کیا اور مسلمانوں کو مادی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ فکری اعتبار سے احساس کمتری کا شکار کر دیا۔

نورسی تحریک کا آغاز ایک سماجی اصلاحی کاوش کے طور پر ہوا تھا۔ اس کا کوئی باقاعدہ پلیٹ فارم نہیں تھا اس تحریک کو دین اسلام اور اس کے ماننے والوں کے اقدار و ایمان کی حفاظت کے لیے شروع کیا گیا تھا۔ اسی اعتبار سے تحریک کا کوئی باقاعدہ دستور بھی نہیں تھا۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس کی رکنیت کے لیے کوئی رسمی ڈھانچہ اور طریقہ کار نہیں ہے۔ استاد نورسی کی سرپرستی میں یہ تحریک ایک منظم اسکول کی طرح تھی جس سے کئی طلبہ وابستہ تھے جو 'طلبہ نور' کے نام سے جانے جاتے تھے۔ اس تحریک کے فروغ میں سعید نورسی کے طلبہ اور آگے ان کے طلبہ نے نمایاں کردار ادا کیا جن میں مرد اور خواتین دونوں شامل تھے۔ آج بھی اس تحریک سے متاثر ہونے والے افراد مختلف ناموں اور اداروں کے ذریعہ اس تحریک کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ طلبہ نور ایک اسلامی کمیونٹی تشکیل دیتے ہیں جو رسائل نور کی روشنی میں رہنمایانہ خدمات انجام دیتے ہیں۔

طلبہ نور کے افراد میں ایسا اتحاد تھا اور محبت پائی جاتی تھی جو کسی اور تحریک میں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے انہوں نے رازدارانہ انداز میں ایسے عظیم فکر کو پروان چڑھایا اور اس کی اشاعت کی جسے علما شجر طوبیٰ سے تعبیر کرتے ہیں جو دنیا کی مختلف جہتوں میں اپنی شاخیں پھیلاتا جا رہا ہے۔

1923 میں سیکولر ترک جمہوریہ کے استحکام کے بعد، سیکولر اور اسلام پسند قوتوں کے درمیان تناؤ کبھی ختم نہیں ہوا۔ مصطفیٰ کمال اتاترک جس نے سقوط خلافت کے بعد ترکی کو مغربی استعمار سے آزاد کرانے میں اہم کردار ادا کیا نے 'سیکولرائزنگ نیشن' کے نام سے اصلاحات کا ایک سلسلہ شروع کیا جس نے اسلام کو نجی دائرے میں دھکیل دیا اور عوامی دائرے کو غیر اسلامی بنا دیا۔ اس نے اسلامی عقیدے، فکر وزبان و کلچر کی نفی میں اپنا پورا زور صرف کر دیا۔ اس نے نہ صرف یہ کہ ترکی رسم الخط جو عربی تھا اسے لاطینی رسم الخط سے تبدیل کر دیا، مساجد، مدارس و خانقاہیں بند کر دیں بلکہ عربی میں اذان دینا بھی ممنوع قرار دے دیا، اسلامی لباس پہننا جرم قرار دے دیا تھا۔ اخباروں پر پابندی تھی کہ وہ کوئی ایسا مضمون یا مواد شائع نہ کریں جو مذہب کا تصور اجاگر کرتا ہو۔ اور ہر وہ سلسلہ جو ترکوں کو ان کے شاندار اسلامی ماضی اور تہذیب سے جوڑتا تھا اس کو طاقت کے زور پر ختم کیا جا رہا تھا۔

استاد بدیع الزماں سعید جان گئے تھے ایسے تاریک وقت میں صرف قرآن ہی کا نور جگمگا سکتا ہے اس کے علاوہ کوئی اور چراغ اس سیکولر مغربی الحادی آندھی کے سامنے نہیں جل سکتا۔ جیسا کہ ہم نے پچھلی اکائی میں پڑھا تھا کہ انہوں نے اس کا عہد کیا تھا کہ وہ اس بات کو ثابت کریں گے کہ قرآن ایک ایسا سورج ہے جس کی نہ کبھی روشنی ختم ہو گی اور نہ وہ کبھی غروب ہو گا۔ استاد نورسی کے رسائل نور نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر کے ان کے اس دعوے کو سچ ثابت کر دیا۔

بدیع الزماں سعید نورسی کو اناطولیہ کے قریبی علاقے 'بودر' میں جب آپ کو ظلم و تشدد اور انتہائی کڑی نگرانی میں رکھا گیا، آپ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھے بلکہ وہاں کے لوگوں کو ایمان کا درس دینے لگے اور پھر ان درسوں کے نتیجے میں تیرہ درسوں پر مشتمل ایک کتاب

لکھی گئی جس کا نام انہوں نے 'نور کی طرف کھلنے والا پہلا دروازہ' رکھا۔ باوجود اس کے کہ یہ کتاب انتہائی خفیہ طور پر تصنیف کی گئی تھی اور صرف خاص لوگوں کے پاس ہی تھی اس کی شہرت پھیلنے لگی اور ان کے نسخے اور نقلیں تیار کی جانے لگیں اور اس میں تقسیم کی جانے لگیں یہاں تک کہ حکومت کو اس کا علم ہو گیا اور مصطفیٰ کمال تک آپ کی دعوت اور علمی اصلاحات کی رپورٹ پہنچ گئی۔ مصطفےٰ کمال کے لیے ایک لادینی معاشرہ وجود میں لانے کے راستے میں پہلا روڑا ثابت ہوئی۔ گو کہ استاد نورسی نے نہایت حکمت عملی اور خاموشی سے دین اسلام کی شمع روشن کرنے کا کام کر رہے تھے اور کسی بھی طرح حکومت یا سیاست سے ٹکراؤ نہیں رکھتے تھے لیکن ان کے رسائل اور ان کی جماعت جو آن کی آن میں قوت پکڑ گئی اور مختلف علاقوں میں پھیل گئی۔ کمال اتاترک نے اسے سیکولر ریاست کے لیے خطرے کے طور پر دیکھا اور استاد نورسی اور ان کے طلبہ پر بے جا سختیاں کی گئیں ان کی تحریریں ضبط کر لی گئیں اور انہیں مختلف مقامات پر جلاوطن کر کے انہیں نظر بندی کی سزائیں سنائی گئیں۔ استاد نورسی کو ان کی سرگرمیوں سے باز رکھنے کے لیے اجنبیت، تنہائی اور محرومی کی سزا کے طور پر اسپارٹا کے پہاڑوں میں واقع ایک دور دراز کونے بارلا نامی بستی میں بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ وہاں موصوف کو شدید پہروں کے ساتھ یک و تنہا رکھا گیا۔

استاد نورسی ان مصائب سے مایوس ہونے والے نہ تھے بلکہ انہوں نے اسے اپنے لیے کارآمد سمجھا اور پر امید رہے کی اللہ نے انہیں تمام دوسرے مشاغل سے نکال کر رسائل نور کی تصنیف اور اس کی اشاعت کے کام کے لیے فارغ کر دیا ہے۔ آپ جیل کو ہمیشہ 'مدرسہ یوسفیہ' کا درجہ دیتے تھے، فرماتے ہیں کہ جس طرح اگر یوسفؑ اگر جیل نہ جاتے اور اپنے قیدی ساتھیوں کی تعلیم و تربیت نہ کرتے تو آگے کے وقت میں بادشاہ تک ان کی رسائی نہ ہوتی اور نہ ہی وہ ایک عظیم منصب پر فائز ہوتے۔ چنانچہ نظر بندی اور قید تنہائی کے اس موقعے سے استاد نے فائدہ اُٹھایا اور اپنے اُن رسائل کی تصحیح میں وقت گزارنے لگے، جو تلامذہ کی طرف سے اُن کے پاس پہنچتے رہتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ نے الحاد و لادینیت کے خلاف بھی بھرپور مواد تیار کیا۔ کچھ ہی عرصے میں بدیع الزماں کی پُرکشش شخصیت نے خود پہرہ داروں کے دلوں میں اُترنا شروع کر دیا اور تھوڑا ہی عرصہ گزرا کہ پہرے داروں کا ایک گروہ آپ کی دعوت کا حامی اور آپ کے اسلامی نظریات کا علم بردار ہو گیا۔

11.3.1 استاد نورسی اور مسئلہ قومیت

استاد نورسی کی زندگی کے دوران قوم پرستی کا نظریہ مسلم دنیا میں بڑے پیمانے پر پھیلا اور اسے امت کی شناخت کے متبادل کے طور پر فروغ دیا گیا۔ قوم پرستی کی اس فکر نے مسلمانوں کو مختلف نسلی، لسانی، سیاسی اور علاقائی حدود میں تقسیم کر دیا اور ان حدود کو قوم پرستی کا مظہر سمجھا جاتا تھا اور اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ دین، مذہب اور عقیدے کے اعتبار سے امت مسلمہ کا اتحاد محض غیر متعلقہ ہو گیا۔ مسلم امت کے درمیان اس طرح کا اختلاف مسلم دنیا کی مختلف قومی ریاستوں میں تقسیم اور قوم پرستی کے مغربی نظریے سے متاثر ہونے کی بنا پر وجود میں آیا۔

استاد نورسی نے اپنے رسائل میں مسئلہ قومیت پر بھی گفتگو کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ قوم پرستی کا یہ نظریہ کوئی نیا رجحان نہیں ہے بلکہ یہ اسلام سے پہلے کے عرب کے زمانے سے پوری تاریخ میں موجود رہا ہے اور دیگر اقوام عالم میں بھی اس کی مثالیں نظر آتی ہیں۔ عالمی دین

اسلام نے آکر اس قوم پرستی، قبائلیت پرستی اور خاندان پرستی کے جذبے کو نہ صرف مسترد کر دیا بلکہ انسانی اخوت و فلاح کے نظریہ کو فروغ دیا تھا، قوم پرستی کے انکار کے سلسلے میں وہ حدیث کا حوالہ دیتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی ایک روایت میں ظاہر ہوتا ہے "اسلام نے نادانی کے دور کی قومی یا قبائلی فخر سے منع کیا ہے اور کہا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد حبشی غلام اور قریشی کے رہنما میں کوئی فرق نہیں ہے"۔

استاد نورسی نے قوم پرستی کے مسئلے پر نہ صرف بحث کی بلکہ قوم پرستی کی تشریح بھی کی۔ نورسی کی قوم پرستی پر بحث ان کی تصنیف مکتوبات جو کہ خطوط کا مجموعہ ہے کے چھبیسویں خط میں بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں قوم پرستی پر بحث سے ان کا مقصد صرف قرآن کی خدمت ہے کیوں کہ قرآن سماجی زندگی کے حوالے سے ہمیشہ منصفانہ رہا ہے لہٰذا اس غیر منصفانہ حملوں کا دفاع ان کے لیے ضروری ہے۔

استاد نورسی قوم پرستی کو دو الگ حیثیتوں سے واضح کرتے ہیں جسے انہوں نے منفی اور مثبت قوم پرستی کے عنوان سے قائم کیا ہے۔ استاد نورسی کا دعوی ہے کہ منفی قوم پرستی دوسری قوموں پر اپنی قوم کی برتری کا دعوی کرتی ہے۔ اس کی وجہ سے عوام میں اپنی قوم پر فخر کرنے اور دوسری قوموں سے منفرد اور الگ ہونے کا احساس کو فروغ ملتا ہے۔ یہ قوم پرستی کے جذبات عام طور پر دوسری قوموں کے خلاف تعصب کا باعث بنتے ہیں۔ سماجی لحاظ سے، یہ لوگوں کو اپنی قوم سے محبت کرنے اور اس کی تعریف کرنے اور دوسروں کو دشمن سمجھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ یہ اپنی تعریف خود کرنے کو بڑھاوا دیتا ہے اور دوسروں کے تئیں ہمدردی اور رواداری کو فروغ نہیں دیتا۔ نورسی کے مطابق، "منفی قوم پرستی نسلی عزائم کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے؛ اور یہ باہمی دشمنی کی وجہ ہے"۔

سعید نورسی قوم پرستی کے منفی مضمرات پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ اسلام صرف نیکی اور تقوی کے کاموں میں تعاون کی وکالت کرتا ہے؛ گناہ، برائی اور ناانصافی کے کاموں میں نہیں۔ نورسی نے اپنے رسالہ النور میں منفی قوم پرستی پر سخت تنقید کی اور دلیل دی کہ یہ نسل پرستی کے برابر ہے۔ ایک ایسا جذبہ ہے جو معاشرے میں ہم آہنگ زندگی کے نظام کو تباہ کرتا ہے۔

استاد نورسی نے مغرب کے بالمقابل قوم پرستی کو ایک منفرد اور مثبت انداز سے پیش کیا ہے انہوں نے قوم پرستی کے مثبت پہلوؤں کی طرف اشارہ کر کے قوم پرستی کو مذہب کی عالمگیر اقدار کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی بھی کوشش کی اور حق، انصاف، مساوات اور باہمی تعاون کی عالمگیر اقدار کے ذریعے قوم پرستی کے نظریے کی وضاحت کرنے کی کوشش کی جو امن، سماجی استحکام اور یکجہتی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔

استاد نورسی خیالات کی طاقت اور علمی انقلاب پر یقین رکھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ترکی قومیت کے جنون میں مبتلا قوم میں شعور کی شمع جلانے اور دیگر اسلامی روح کے متلاشی لوگوں کی حرارت کو برقرار رکھنے کے لیے روزمرہ کی زندگی کی رہنمائی کے لیے ایک نیا نقشہ تیار کیا اور اپنی پوری قلمی وخیالی قوت اس میں صرف کر دی۔

11.3.2 نورسی تحریک کے کارنامے

نورسی تحریک گو کہ ایک باقاعدہ اور منظم تحریک نہ ہی اس کا کوئی پلیٹ فارم تھا اس کے باوجود اس تحریک کے دور رس مثبت اثرات مرتب ہوئے اس تحریک کے سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ آج ترکی میں جتنا بھی اسلام نظر آتا ہے وہ اسی تحریک مرہون منت ہے۔

مصطفی کمال اتاترک جسے اپنے اصلاحات کی بناپر فادر آف دی نیشن کہا جاتا تھا اس کی بیش تر اصلاحات اسلام مخالف، مغربی نظریہ سے مرعوب اور ترک سماج اور مزاج کے متضاد تھیں۔ نورسی اور ان کی تحریک نے اس کی خاموش مخالفت کی۔ اسلام کو سادہ اور آسان انداز میں پیش کر کے مخلوق کو خالق سے جوڑنے کی فکر کی اور روزمرہ کی زندگی کے عوامل اور افعال سے اسلام کے نظریات و تعلیمات کو ہم آہنگ کیا۔ اور یہ لیے انہوں نے حکومت مخالفت یا تصادم کا راستہ اختیار کیے بغیر ممکن کیا۔

رسائل نور کے ذریعہ استاد نورسی نے نہ صرف یہ کہ اسلام سے عوام کا رابطہ بحال کیا بلکہ اپنے دلنشین، سادہ انداز میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کے پورے لوازمات اس میں شامل کر دیے، جن کو پڑھ کر اللہ کی وحدانیت اس کی ربوبیت کی حقانیت اور اللہ کے رسول ﷺ کی وفاداری کے شیدائی بن جاتے۔

نورسی تحریک کی اہم کارناموں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جس وقت عربوں کی مخالفت میں عربی زبان پر پابندی عائد کی گئی ایسے وقت میں ان رسائل نے نہ صرف قرآن کی اہمیت کو اجاگر کیا بلکہ اس کے ذریعہ یہ پیغام عام کیا کہ قرآن کو صحیح معنوں میں سمجھنے کے لیے عربی زبان میں پڑھنا لازمی ہے اور ترجمے کی مدد سے قرآن کما حقہ سمجھ میں نہیں آسکتا اس لیے اس زبان کو سیکھنا اور سمجھنا ضروری ہے۔ اسی طرح عبادات (اذان و نماز و دعا) بھی عربی زبان میں ادا کیا جانا ہی اس کے حق ادا کرنے کے لیے ضروری ہے۔

رسائل نور میں مذہب اسلام اور مذہبی عقائد کو نقصان پہنچانے والے افکار و نظریات کی طرف بھی تنبیہ کی گئی جس نے ترکی میں نیشنلزم، کمیونزم اور فری میسن جیسی تحریکات پر روک لگانے میں اور ان کی فعالیت کو کم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

11.3.3 نورسی تحریک کے اثرات

مصطفی کمال اتاترک کے بعد ترکی میں 'احیائے اسلام کا کارنامہ' اکثر اسلام پسندوں کی زبان پر رہتا ہے، اس پورے کارنامہ کا سب سے بڑا کریڈٹ بدیع الزماں سعید نورسی کو جاتا ہے۔ ان کے اس کارنامے کے اثرات کو سمجھنے کے لیے یہاں مریم جمیلہ جو کہ ایک جرمن نژاد نومسلم خاتون ہیں اور انہوں نے اسلام اور مغرب کی کشمکش کے بارے میں بہت کثرت سے کتابیں تحریر کی ہیں کا اقتباس نقل کیا جاتا ہے جو ان کے ایک خط سے ماخوذ ہے، جو امریکہ سے شائع ہونے والے انگریزی ماہنامے NUR کو لکھا گیا تھا، اور اس کی اشاعت بابت اکتوبر 1975 میں شائع ہوا تھا، یہ اقتباس سعید نورسی کی تحریک کی کامیابی کا راز بتاتا ہے۔ وہ نورسی تحریک اور سعید نورسی کے مشن کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''میری ناچیز رائے یہ ہے کہ اس صدی میں جن رہنماؤں نے اسلام کے احیا کا کام کیا ہے ان میں صرف سعید نورسی ہی ماضی کے عظیم اولیا اللہ کی فہرست میں جگہ پاسکتے ہیں۔ ان کے حالات زندگی اور تحریروں کے مطالعے سے میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ ان کا روحانی رتبہ عرب بر صغیر پاک و ہند کے دوسرے ہم عصر رہنماؤں سے بلند تر ہے ان کی محترم ذات میں ایک سچے ولی اور مرد مجاہد کی تمام خوبیاں جمع ہوگئی تھیں۔ انہوں نے بے لوث خدمات اور تصانیف کی شکل میں جو ورثہ چھوڑا ہے، اس کو صرف ترکی یا ترکوں تک محدود نہیں رکھا جاسکتا، وہ ایک مشترکہ میراث ہے، جس میں ساری دنیا کے مسلمانوں کا حصہ ہے۔''۔

نورسی تحریک کی کاوشوں کے دوررس اثرات مرتب ہوئے اور ترکی میں اسلام مخالف ماحول اسلامی رواداری والے ماحول میں بدلنے لگا اور 1950 کی دہائی میں جمہوریت کے جھنڈے تلے ایک کثیر الجماعتی نظام کا آغاز ہوا۔ جس میں دیگر سیاسی پارٹیوں کے ساتھ اسلام پسند لوگوں نے بھی پارٹیوں کو تشکیل دے کر سیاسی طور پر اپنی شمولیت درج کروائی۔ ان میں نیشنل سالویشن پارٹی کے سیاسی رہنما نجم الدین اربکان بھی رسائل نور کے متاثرین میں تھے جنھوں نے آگے چل کر حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور ترکی میں اسلامی اصلاحات پر کام کیا۔ مساجد میں عربی میں اذان دینے اور اسلامی لباس اور اسی طرح کی پابندیوں کو ختم کرکے دوبارہ اسلام کو ترکی معاشرے میں عام کیا۔

نورسی تحریک سے متاثر ہو کر ترکی میں کئی دیگر سیاسی اور غیر سیاسی تحریکیں اور تنظیمیں وجود میں آئیں تاہم ایک بات واضح رہے کہ نورسی تحریک نے کبھی باقاعدہ سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ البتہ طلبہ نور کی تائید اسلام پسند سیاسی رہنماؤں کو حاصل رہی۔

1970 کی دہائی کے آخر اور 1980 کی دہائی کے اوائل میں نور کے پیروکاروں میں سب سے بڑی اور موثر تحریک گولن کمیونٹی موومنٹ ہے، جس کے قائد فتح اللہ گولن ہیں۔ 1990 کی دہائی کے اوائل میں، یہ تحریک نہ صرف ترکی میں بلکہ بین الاقوامی سطح پر، خاص طور پر وسطی ایشیا کی نئی ریاستوں میں بھی کافی مقبول ہوئی۔

نورسی تحریک کا طریق کار ایک استبدادی نظام کے تحت رہنے والے ممالک میں زندگی گزارنے والے مختلف طبقوں کے مسلمانوں میں کام کرنے کے لیے انتہائی موزوں ہے، دوسرے مسلم یا غیر مسلم ملکوں کی اسلامی تحریکوں کے برخلاف نورسی تحریک مخالفانہ ماحول میں پروان چڑھنے کی حامل ہے بلکہ یہ دعوی بے جانہ ہوگا کہ آج ترکی میں جس درجہ کا بھی اسلام نظر آتا ہے بدیع الزماں سعید نورسی کی انتھک اور بے لوث جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ دوسری اسلامی تحریکوں کے مقابلے میں جن کو یا تو صاحب اقتدار لوگوں نے دبادیا یا وہ بے حرکت اور غیر موثر بن گئیں یا اپنے ہدف عین سے بھٹک گئیں یہ بات دیکھی جاسکتی ہے کہ نورسی تحریک نے نہ صرف اپنے ملک بلکہ پورے عالم اسلام کو متاثر کیا اور محیر العقول کامیابی حاصل کی ہے۔

جدید ترکی میں نورسین تھاٹ کو پڑھنے سمجھنے اور تحقیق کے لیے مختلف ادارے قائم کیے گیے ہیں اور ان کی فکری نقطہ نظر کو تعلیمی نظام میں شامل کرنے کے لیے باقاعدہ انسٹیٹوٹس بنائے گئے ہیں۔ جہاں سے عالمی پیمانے پر رسائل نور کی روشنی میں سعید نورسی کے افکار و نظریات کی اشاعت کی جارہی ہے۔

11.4 نورسی تحریک کے فروغ میں رسائل نور کا کردار

جیسا کہ آپ نے اوپر پڑھا کہ نورسی تحریک کے فروغ میں رسائل نور نے اہم کردار ادا کیا۔

رسالہ النور، بدیع الزماں نورسی کی ایک گراں قدر کوشش تھی جس کا مقصد اسلامی شخصیت، اسلامی فکر اور خاص طور پر ترک عوام اور عام طور پر مسلم امت میں اسلامی بیداری پیدا کرنا تھا۔ دشمن کی طرف سے پیدا کردہ مذہب کے بارے میں غلط فہمی کا مقابلہ کرنے، قرآن کی سچائی کو سائنسی اور عقلی طور پر ثابت کرنے اور مسلمانوں کے عقیدے کو زندہ کرنے میں اس کا کردار نہایت اہم رہا۔ ان رسائل نور

کی خصوصیات اور اس کی انفرادیت کے بارے میں ہم تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

رسالہ النور کو نورسی تحریک کے لیے ایک پلیٹ فارم کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔ تحریک کے رہنما بدیع الزماں سعید نورسی نے ان رسائل کے ذریعہ قوم پرستی سمیت سیکولر نظریات کے خلاف اسلامی عقیدے کا دفاع کیا جس نے نہ صرف ترکی بلکہ پورے عالم اسلام اور مسلم امت پر بہت بڑا اثر ڈالا۔ رسائل نور قرآن کو ایک "زندہ دستاویز" کے طور پر فروغ دیتا ہے جس کی ہر دور میں بار بار تشریح کرنے کی ضرورت ہے۔

رسائل نور کی تالیف کے وقت استاد نورسی نے یہ بیان کیا تھا کہ یہ مولفات قرآن کریم کے اعجاز کی جھلکیاں ہیں اور ان کا فائدہ انسانوں کے تمام گروہوں کو ہوگا۔ اور یہ رسائل وطن اور قوم کی حفاظت کے لیے ایک ایسی آہنی دیوار بن جائیں گے جو وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے الحادی سیلاب کے آگے بند باندھیں گے۔ اسی طرح انہوں نے رسائل نور کی تصنیف کے وقت یہ بھی کہا تھا کہ 'رسائل نور کے ذریعے جو خدمت کی جارہی ہے عنقریب یہ وسیع پیمانے پر پھیل جائے گی، اور ترک قوم نئے سرے سے اسلام کے لشکروں میں ایک ہراول لشکر اور اس کے جاں نثاروں میں سے ایک جاں نثار امت بن کر ابھرے گی'۔ اسی طرح انہوں نے اس عظیم الشان تصنیف کے وقت یہ بھی کہا جو آج بالکل سچ ثابت ہو رہا ہے کہ ہماری قوم (ترک) عنقریب مادی اور معنوی طور پر ترقی کر جائے گی اور مستقبل میں رسائل نور کے اشاعت کے نتیجے میں اسلام قومی سطح پر اپنایا جائے گا اور سرکاری طور پر نشر کرنے، پھیلانے اور وزارت تربیت کے قرآنی حقیقت کو مضبوطی سے پکڑنے کے نتیجے میں ایک عظیم قوت بن کر ابھرے گا۔ اس طرح ان رسائل نے انتشار اور کشمکش کے دور میں لوگوں کے عقیدے پر مثبت اثر ڈالا اور کثیر لوگوں کے شبہات اسلام سے متعلق دور کیے اور روحانی اور اخلاقی اصلاح بھی کی۔

ان رسائل کی تعداد ایک سو تیس ہے اور یہ مختلف عناوین کے تحت چار حصوں میں منقسم ہیں۔ چونکہ ان کو رسائل کی صورت میں ترتیب دیا ہے اس لیے ان کو رسائل نور کہا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض رسائل مختصر مضامین کی طرح ہیں اور بعض ایک کتاب کی صورت میں طویل بھی ہیں۔

1. مجموعہ سوزلر (Sozler) یعنی کلمات (Words)، یہ کتاب 720 صفحات پر مشتمل ہے۔
2. مجموعہ لمعلر (Lemalar) یعنی لمعات (Falshes)۔ یہ 430 صفحات پر مشتمل ہے۔
3. مجمعہ مکتوبات (Letters) یہ مجموعہ 500 صفحات پر مشتمل ہے۔
4. مجموعہ شعاع لر (Sualar) یعنی شعاعیں (Rays)، یہ مجموعہ 495 صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ تمام رسائل قدیم ترکی (عربی) رسم الخط میں تحریر کیے گئے تھے۔ رسائل نور کو عربی میں تالیف کرنے کی وجہ کے بارے میں خود استاد نورسی کہتے ہیں کہ ان کا عربی میں طبع کیا جانا اس لیے ضروری تھا کیوں کہ عربی حروف میں ہی وہ قوت ہے کہ وہ قرآن کریم کی خدمت اور اس کے رسم الخط کی حفاظت کی ذمہ داری لیے ہوئے ہیں۔ 1950 کے بعد ان رسالے نور کا جدید لاطینی ترکی میں ترجمہ کیا گیا اور

آج وسطی ایشیا کی تقریباً تمام زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

یہ رسائل نہایت ناساز گار حالات میں لکھے گئے ہیں کیوں کہ اس دور میں عربی رسم الخط میں لکھنے پر پابندی لگ چکی تھی اور عربی رسم الخط کے چھاپے خانے بند کر دیے گئے تھے۔ اس دور میں یہ رسائل ہاتھ سے لکھے جاتے تھے جن کی طلبہ اور عقیدت مند اور نقلیں تیار کرتے اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ان کی اشاعت کا لازوال کارنامہ سر انجام دیتے تھے۔ جسے تاریخ میں نور پوسٹا سلار (Postmen of the Light) کے نام سے جانا جاتا ہے. ان رسائل میں خطبات اور ضمیمے وغیرہ کے علاوہ کورٹ مارشل کے دوران نورسی پر کیے گئے مقدمات کی کاروائیاں بھی شامل ہیں۔ ان رسائل میں قدیم اور جدید علوم کا امتزاج بھی پایا جاتا ہے۔

11.4.1 رسائل نور لکھنے کا طریقہ کار

ان رسائل کو لکھنے کا طریقہ کار بھی مختلف و منفرد تھا چونکہ استاد نورسی زود نویس نہیں تھے اس لیے وہ تیزی کے ساتھ کتاب کاتبوں کو املا کرواتے تھے جس کو ان کے شاگرد نہایت برق رفتاری سے تحریر کرتے اور اس کے بعد مبیضہ کی تصحیح استاد خود کرتے اور کاتب کی ہلکی سی غلطی کی بھی اصلاح کرتے اس کے بعد ان رسائل کی نقلیں تیار کر کے مفت تقسیم کی جاتی تھیں۔

11.4.2 رسائل کا موضوع

رسائل نور کا موضوع قرآن کی تفسیر ہے مگر ان میں آیات کی ترتیب نہیں پائی جاتی جیسا کہ ہم کلاسیکی اسلامی تفسیر میں دیکھتے ہیں جس میں آیات کے معانی پر تبصرے کیے جاتے ہیں۔ اس کے بالمقابل رسائل نور ایک موضوعاتی تفسیر ہے جو اسلام کے بنیادی عقائد اور اصولوں سے متعلق شکوک وشبہات کا جواب دیتی ہے۔ اس مجموعے میں چودہ کتابیں شامل ہیں۔ جس میں حسب ضرورت ایک ایک آیت کی تفسیر میں قرآنی حقائق کا اثبات ہے۔ اس تفسیر کی یہ انفرادیت ہے کہ پوری اسلامی دنیا کے علماء اس تفسیر سے متفق ہیں۔

استاد نورسی نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ دینی حقائق کو حکمت اور دلائل سے سمجھایا جائے تا کہ شک کرنے والے کے ضمیر کو اطمینان ہو جائے۔ قرآن اور ایمان کا مقابلہ کرنے والوں کا تعاقب کرنے کے لیے رسائل نور نے حجت اور مطمئن کرنے والا انداز اختیار کیا، نزاع اور فساد یا زور و جبر کا نہیں۔ اسی طرح ان رسائل کے ذریعہ یہ بھی ثابت کیا کہ اسلام دیگر کسی بھی دین کے مقابلے میں زیادہ حق پر مبنی ہے اسی طرح انہوں نے مغرب کی طرف سے آنے والے علوم وفنون کے بارے میں واضح کیا کہ ان کی طرف توحید میں بھیگے ہوئے قرآنی تفکر کی آنکھ سے دیکھنا چاہیے کیوں کہ وہ تو اصل میں اسلام کی پونجی ہیں اور ان کی طرف ان کے خالق و باری کے تعلیمات کے آئینہ میں دیکھنا چاہیے۔

ان رسائل میں زیر بحث مسائل کی فہرست طویل ہے۔ چند مسائل کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے:

اعجاز قرآن۔ پیغمبر اسلام کی صداقت، حشر اور قیامت، کائنات اور انسان کی تخلیق کی حکمت، معراج نبوی ﷺ کی حقیقت، اجتہاد، نفس ناطقہ، کائنات کے راز۔ توحید اور متکلمین کے اختلاف کی تحلیل۔

رسائل نور میں سعید نورسی کی اپنی زندگی اور دیگر تشریحات کے بارے میں عکاسی اور تفصیلات بھی شامل ہیں۔ یہ تاثرات اور تفصیلات پڑھنے والے کو یہ سیکھنے میں مدد کرتے ہیں کہ قرآن کے اصولوں پر روزمرہ کی سرگرمیوں کو کس طرح عمل میں لایا جائے، اور کسی شخص کے بدلتے ہوئے زندگی کے حالات اور جذبات پر قرآن کو کس طرح "نصب" کیا جائے۔

قرآن کی تفسیر لکھنے کے سلسلے میں استاد نورسی مختلف تشبیہات اور استعارہ اور قصوں کے ذریعہ اپنی بات رکھتے ہیں جو ان کی اختراع ہے۔ ان کے طرز تحریر کو سمجھنے کے لیے یہاں آپ کے لیے رسائل نور سے ایک اقتباس نقل کیا گیا ہے۔

رسالہ نور سے اقتباس

'بسم اللہ (یعنی اللہ کے نام سے) ہر اچھائی اور بھلائی کی بنیاد اور ہر اہم کام کا سر آغاز ہے، اس لیے ہم بھی اسی سے آغاز کرتے ہیں۔ اے میرے نفس، تمہیں اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ یہ پاکیزہ اور مبارک لفظ جس طرح اسلام کا ایک شعار ہے، اسی طرح یہ وہ برگزیدہ کلمہ ہے جس کا ورد تمام موجودات زبان حال سے کر رہی ہیں۔ پس اے عزیز من، اگر تیری یہ خواہش ہے کہ تجھے بسم اللہ میں پائی جانے والی اس دائمی اور عظیم الشان قوت اور نہ ختم ہونے والی وسیع و عریض برکات کا ادراک ہو جائے تو اس چھوٹی سی کہانی کو غور سے سنو۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دو آدمی ایک ایسے علاقے میں چلے گئے جہاں لاقانونیت اور بدامنی کا راج تھا۔ ایسی جگہوں میں سفر کرنے والے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ کسی طاقتور کی حمایت اور حفاظت میں رہے، تاکہ غنڈوں، بدمعاشوں اور لٹیروں کی دستبرد سے محفوظ رہ کر اپنا کام سر انجام دے سکے۔ ایسا نہ کرنے والا بہت سی پریشانیوں میں گھر جائے گا اور کسی حادثے کا شکار ہو جانے کا اندیشہ بھی ہے۔ اب سن، ان آدمیوں میں سے ایک آدمی متواضع اور دوسرا خود سر اور مغرور تھا۔ عاجز اور متواضع آدمی اس علاقے کے ایک بہت طاقتور آدمی کی حفاظت میں آ گیا۔ جب کہ مغرور آدمی نے کسی کے ساتھ اس قسم کا تعلق جوڑنے سے انکار کر دیا۔ طاقتور کے ساتھ تعلق رکھنے والے آدمی سے ہر کوئی عزت و احترام سے پیش آتا، اور اس تعلق کے باعث لٹیروں سے بھی اس کو حفاظت حاصل ہو گئی۔ جب کہ خود سر اور مغرور آدمی کو اس قدر مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا کہ جو بیان سے باہر ہے۔ وہ اپنے تمام سفر میں مستقل خوف و ہراس اور خطرات سے دوچار رہا، اور یوں اس نے اپنے آپ کو خود ہی ذلیل و رسوا کر لیا۔

پس اے میرے مغرور نفس، یاد رکھ کہ اس وسیع و عریض دنیا میں تو بھی مسافر کی طرح ہے۔ اور یہ دنیا جس میں تو گھوم پھر رہا ہے لاقانونیت کی جگہ ہے۔ یہ بھی ذہن میں رکھ کہ تیرے ساتھ ہر طرح کی ضرورتیں لگی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تیری کمزوری اور عاجزی کی بھی کوئی حد نہیں ہے (اپنی ضرورتوں اور بیماریوں کے معاملے میں وسائل کے باوجود اپنی بے بسی پر غور کر!)۔ اسی طرح تیرے دشمنوں کی حاجات و ضروریات کی بھی کوئی حد نہیں ہے (اور عین ممکن ہے کہ ان کی حاجت تجھ سے پوری ہوتی ہو جس کے نتیجے میں تو ان کے ظلم و زیادتی کا شکار ہو سکتا ہے)۔ تو حالت جب یہ ہے، تو پھر (بسم اللہ کے اقرار کے ذریعے جو تیرے عجز کا اظہار ہے) اس دنیا کے ابدی مالک اور ازلی حاکم کی پناہ میں آ جا، اس طرح تو دنیا کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور مصائب و حادثات کے سامنے خوف و خطر کی ذلت سے بچا رہے گا۔ یقیناً بسم اللہ ایسا بابرکت خزانہ ہے جو تیرے لامتناہی عجز و فقر کو (اللہ کی) وسیع اور بے پایاں رحمت و قدرت کے ساتھ منسلک کر دیتا ہے اور

تیرے عجز و فقر کو اللہ قدیر رحیم کے حضور مقبول ترین سفارشی بنا دیتا ہے۔ یقیناً جو شخص بسم اللہ کے ساتھ حرکت کرتا ہے اس کی مثال اس شخص کی ہے جو فوج میں بھرتی ہو جائے، اب وہ کسی سے خوف نہیں کھاتا ہے، بلکہ قانون اور حکومت کا ترجمان بن جاتا ہے"۔

اپنے طرز تحریر میں وہ صرف کہانیوں اور مثالوں ہی کے ذریعہ اپنی بات نہیں رکھتے بلکہ سوال و جواب اور مکالمہ کے طریقہ کار کو اختیار کر کے بات کو دلنشین اور آسان انداز میں بھی سمجھاتے ہیں اور قرآنی آیات اور اس کے نکات کو واضح کرتے ہیں۔ جس کی ایک مثال اس طرح ہے

'سوال: جس طرح ہم پھل فروش کو (پھل کی) قیمت ادا کرتے ہیں، تو آپ کیا کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار جو یہ سب نعمتیں ہمیں عطا کر رہا ہے اور ان کا حقیقی مالک ہے، وہ ہم سے کون سی قیمت کا مطالبہ کرتا ہے؟

جواب: وہ منعم حقیقی (نعمتیں دینے والا یعنی اللہ تعالی) ہم سے ان بیش بہا نعمتوں کی قیمت کے طور پر تین چیزیں طلب کرتا ہے:

(1) ذکر (2) شکر (3) فکر

پس جان لو، بسم اللہ ابتدا کے لحاظ سے ذکر ہے اور الحمد للہ انتہا کے لحاظ سے شکر ہے اور جو چیز ان دونوں کے درمیان میں ہے وہ فکر ہے، یعنی ان انوکھی نعمتوں کے بارے میں غور و فکر کرنا اور اس بات کا سمجھنا کہ یہ نعمتیں اس ذات کا معجزہ اور اس کی بے پایاں رحمت کے تحفے ہیں جو احد اور صمد یعنی یگانہ، یکتا اور بے نیاز ہے۔ بس اس سوچ کا نام ہی فکر ہے''۔

مفکرین اور علما کی رائے کے مطابق استاد نورسی کے مکتوبات نے وہ کام کیا جو لشکر نہیں کر سکتے تھے۔ اس ظلم و استبداد کے دور میں رسائل نور کی قلمی کاپیوں کی اشاعت سے دین کے داعی اور ملت میں استقامت کے حاملین تیار کیے جاتے رہے ہیں۔

استاد نورسی نے اس بات کو شدت سے محسوس کر لیا تھا کہ جدید دور کے انسان کی سب سے بڑی ضرورت اخلاقی و روحانی بیداری ہے، ان کا ماننا تھا کہ نوجوانوں کے انداز فکر کو مادہ پرستی سے روحانیت کی طرف موڑ دیا جائے تو ان کا ایمان محفوظ رہ سکتا ہے۔ استاد نورسی کے رسائل نور اسی مقصد کے لیے وقف ہیں۔ ان رسائل میں استاد نے صرف ان کے عہد کے ہی نہیں بلکہ مستقبل میں پیدا ہونے والی نسلوں کو بھی مخاطب کیا ہے۔

11.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے

- نورسی تحریک کا آغاز ایک ایسے وقت میں ہوا جب کہ عالم اسلام کی متحدہ خلافت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور اسلام اور مسلمانوں کی تمدنی فوقیت پر مغربی استعمار کا قبضہ ہو چکا تھا۔
- سعید نورسی اس وقت کے رونما ہونے والے قومیت کے مسئلہ پر بھی اپنی تصانیف میں گفتگو کی اور اسلامی نقطہ نظر سے قومیت کے مثبت اور منفی اثرات پر روشنی ڈالی ہے۔

- رسالہ نور قرآن پاک کی تفسیر ہے جو 1910 اور 1950 کی دہائی کے درمیان ترکی کے بٹلیس علاقے سے تعلق رکھنے والے ایک کرد اسلامی اسکالر سعید نورسی نے لکھی تھی۔ اس کا بنیادی مقصد ترکی میں مذہبی احیا لانا تھا۔
- چونکہ ریاست نے نورسی تحریک کے بانی کے کاموں کو تمام پڑھنے یا بحث پر پابندی لگادی تھی، اس لیے رسائل نور ہاتھ سے لکھے جاتے تھے اور ایک خفیہ نیٹ ورک کے ذریعے تقسیم کیے جاتے تھے، جسے نور پوسٹاسلار (Postmen of the Light) کے نام سے جانا جاتا ہے.
- رسائل نور میں اسلامی ذرائع کا تجزیہ اور سعید نورسی کے دور کی "ذہنیت" کے اعتبار سے قرآن کے متن کی دوبارہ تشریح شامل ہے۔ تاہم، یہ صرف ایک تفسیر نہیں ہے، کیونکہ اس میں سعید نورسی کی اپنی زندگی اور تشریحات کے بارے میں عکاسی اور تفصیلات شامل ہیں۔ یہ تاثرات اور تفصیلات سیکھنے میں مدد کرتی ہیں کہ قرآن کے اصولوں پر روزمرہ کی سرگرمیوں کو کس طرح عمل میں لایا جائے، اور کسی شخص کے بدلتے ہوئے زندگی کے حالات اور کیفیات میں قرآن پر کس طرح عمل کیا جائے۔
- رسائل نور کی تصنیف کا آغاز 1925 میں برلا میں جلاوطنی کے دوران ہوا ان رسائل کی تعداد ایک سو تیس ہے اور یہ چار حصوں میں منقسم ہیں۔ چونکہ ان کو رسائل کی صورت میں ترتیب دیا ہے اس لیے ان کو رسائل نور کہا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض رسائل مختصر مضامین کی طرح ہیں اور بعض کتاب کی صورت میں طویل بھی ہیں۔
- ترکی میں احیائے اسلام میں نورسی تحریک کا بڑا دخل ہے اور اس تحریک نے دوسری مسلم ممالک تحریکوں کے بالمقابل نہ صرف اپنے مقاصد کو حاصل کیا ہے بلکہ محیر العقول کامیابی حاصل کی ہے۔
- استاد نورسی نے اس بات کو شدت سے محسوس کر لیا تھا کہ جدید دور کے انسان کی سب سے بڑی ضرورت اخلاقی وروحانی بیداری ہے، ان کا ماننا تھا کہ نوجوانوں کے انداز فکر کو مادہ پرستی سے روحانیت کی طرف موڑ دیا جائے تو ان کا ایمان محفوظ رہ سکتا ہے۔ استاد نورسی کے رسائل نور اسی مقصد کے لیے وقف ہیں۔

11.6 نمونہ امتحانی سوالات

11.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. Father of Turkik Nation کسے کہا جاتا ہے؟

(a) استاد نورسی (b) خلیفہ عبد الحمید (c) کمال اتاترک (d) سب صحیح

2. کس تحریک نے اس بات پر زور دیا کہ قرآن کو صحیح معنوں میں سمجھنے کے لیے عربی سیکھنا ضروری ہے؟

(a) سنوسی تحریک (b) وہابی تحریک (c) نورسی تحریک (d) اخوان المسلمون

3. رسائل نور کتنے مجموعوں پر ترتیب دیا گیا ہے؟

(a)چار (b) پانچ (c)سات (d)نو

4. رسائل نور کا تعلق کس تحریک سے تھا؟

(a)نورسی تحریک (b)سنوسی تحریک (c)وہابی تحریک (d)سب غلط

5. نورسی تحریک کے بانی کون تھے؟

(a)بدیع الزماں سعید (b)عمر مختار (c) حاجی دحلان (d)حسن البنا

6. انقرہ شہر کس ملک میں ہے؟

(a)یمن (b)ترکی (c)بحرین (d)قطر

7. ترکی میں سقوط خلافت کے بعد قرآن کی اہمیت کو کس نے اجاگر کیا؟

(a)سنوسی تحریک (b)وہابی تحریک (c)نورسی تحریک (d)نہضۃ العلما

8. مجموعہ مکتوبات میں کتنے خطوط شامل ہیں؟

(a)20 (b)33 (c)50 (d)70

9. مجموعہ لمعلر کتنے صفحات پر مشتمل ہے؟

(a).430 (b)720 (c)1050 (d)14

10. رسائل نور بنیادی طور پر قرآن کی تفسیر ہیں؟

(a). صحیح (b).غلط

11.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. نورسی تحریک کے پس منظر پر ایک مختصر نوٹ تحریر کیجیے۔
2. طلبہ نور پر ایک نوٹ قلم بند کیجیے۔
3. رسائل نور کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔
4. رسائل نور کے نقل واشاعت کے طریقہ کار پر تبصرہ کیجیے۔
5. نورسی تحریک کے اثرات ونتائج موجودہ دور میں بھی باقی ہیں۔بحث کیجیے۔

11.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. رسائل نور کی اہمیت اور اس کی خصوصیت پر ایک جامع مضمون تحریر کیجیے۔

2. نورسی تحریک کے اثرات ونتائج کا تجزیہ کیجیے۔

3. ترکی میں اسلام کی تجدید میں نورسی تحریک کے کردار سے بحث کیجیے۔

11.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. بدیع الزماں سعید النورسی (شخصیت اور تحریک)	:	ثروت صولت
2. عصر حاضر کی اسلامی تحریکات	:	سیدہ مسعودہ نعیم شاہ
3. خودی کا سرنہاں	:	سعید نورسی (مترجم ثناءاللہ شاہد)
4. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ	:	ثروت صولت
5. بدیع الزماں سعید نورسی حیات وواقعات	:	شاگرد نورسی (مترجمین: ثناءاللہ شاہد، افضل حسین، صالح سونمر)

اکائی 12: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (حصہ اول)

اکائی کے اجزا:

12.0 تمہید
12.1 مقاصد
12.2 بانی سر سید کون
12.2.1 حسب ونسب
12.2.2 تعلیم
12.2.3 ملازمت
12.2.4 تحقیقی مزاج
12.2.5 آثار الصنادید
12.2.6 1857ء
12.2.7 کارنامے
12.2.8 مدرسہ کا قیام
12.2.9 اسباب بغاوت ہند
12.2.10 قحط
12.2.11 غازی پور
12.3 علی گڑھ
12.3.1 انسٹی ٹیوٹ گزٹ
12.3.2 مدرسۃ العلوم
12.3.3 انگلینڈ کا سفر

12.3.4 مسلمانوں کی تعلیم

12.3.5 مدرسۃ العلوم کی تکمیل

12.3.6 محمڈن اینگلو اورینٹل کالج

12.3.7 یونیورسٹی کی تجویز

12.3.8 یونیورسٹی کے لیے چندے کی کوشش

12.4 اکتسابی نتائج

12.5 نمونہ امتحانی سوالات

12.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

12.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

12.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

12.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

12.0 تمہید

ہمارے ملک ہندوستان میں سینکڑوں یونیورسٹیاں ہیں، ان میں اکثر وہ ہیں جن کے بارے میں عام طور سے زیادہ معلومات نہیں ہیں، لیکن کچھ یونیورسٹیاں ایسی بھی ہیں جو اپنی تاریخی، تعلیمی، انتظامی لحاظ سے کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ ان یونیورسٹیوں میں اتر پردیش کے شہر علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی بھی ہے جو ہندوستان میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھی جاتی ہے اور ایک حوصلہ مند طالب علم اس میں تعلیم حاصل کرنے کی تمنا کرتا ہے۔ اس یونیورسٹی کا نام اور کام بین الاقوامی پیمانہ پر بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔

12.1 مقاصد

مسلم یونیورسٹی کی انفرادیت، اس کی غیر معمولی شہرت، اس کی امتیازی حیثیت کے اسباب کو جاننے کے لیے، اس کے بانی، اس کے قیام کے زمانہ کے حالات اور یونیورسٹی ہونے سے پہلے اس کے تعلیمی مرحلوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس کی ابتداء کیوں ہوئی؟ اس کی تعلیمی صورت شروع میں کیا تھی؟ اور سب سے بڑھ کر اس کے قیام کا مقصد کیا تھا؟ ان سوالوں کے جواب سے ہی مسلم یونیورسٹی کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے ذکر میں سب سے پہلے اس کے بانی سر سید احمد خاں کی شخصیت کا ذکر آتا ہے اور اس سے بھی پہلے ان حالات پر نظر جاتی ہے جن کے درمیان سر سید کی شخصیت نمودار ہوئی اور جس نے ان حالات کے تقاضوں کو صرف سمجھا ہی نہیں بلکہ ان کو پورا کرنے کی کوشش بھی کی۔

12.2 بانی سر سید کون

سر سید کی سب سے بڑی اور مکمل سوانح عمری خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے لکھی، جس کا نام "حیاتِ جاوید" رکھا۔ اس کے ٹائٹل پر عالی جناب جواد الدولہ، عارف جنگ ڈاکٹر سر سید احمد خاں جیسے الفاظ سے سر سید کا تعارف ہے اور یہ بتاتا ہے کہ مغلیہ دورِ حکومت کے بالکل آخری زمانہ میں سر سید کا تعلق اس طبقہ سے تھا جو شاہی دربار سے تعلق رکھنے والا تھا اور سماجی لحاظ سے بلند درجہ رکھتا تھا۔ القاب و آداب وہ چاہے جتنے رسمی رہے ہوں اور مغل دور کے عہد زوال میں بے معنی ہو چکے ہوں لیکن وہ اشرافیہ طبقہ کی پہچان متعین کرنے میں بہر حال ایک موثر علامت تھے۔

12.2.1 حسب و نسب

سر سید کو باپ اور ماں دونوں جانب سے پُر فخر نسب کی نسبت حاصل تھی۔ ان کے والد میر متقی تھے جو مغل بادشاہ اکبر کے بچپن اور جوانی کے دوست تھے، اس لیے اکبر شاہ کے تختِ شاہی پر بیٹھنے کے بعد میر متقی کا اثر و رسوخ بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ تیراکی اور تیر اندازی میں ماہر تھے، کیوں کہ ان دونوں فنوں کو اس زمانہ میں جوہر شرافت سمجھا جاتا تھا۔ سر سید نے بھی تیراکی اور تیر اندازی ان ہی سے سیکھی۔ ننھیال کا حال خود سر سید نے اپنے نانا خواجہ فرید الدین احمد کے حالات میں لکھا۔ خواجہ فرید الدین کو خاندان میں سب سے زیادہ لائق و دانش مند سمجھا جاتا تھا۔ ریاضی میں تو ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ سر سید کی والدہ خواجہ صاحب کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ اولاد کی تربیت میں ان کو خداداد ملکہ ملا تھا۔ وہ جتنی عقل مند اور سمجھدار تھیں اس سے زیادہ وہ دل کی نیک اور فطرت کی پاک تھیں۔ 17/ اکتوبر 1817ء میں سر سید دلی میں پیدا ہوئے، ان کے ذکر میں ان کی ماں کے کئی واقعات مولانا حالیؔ نے حیات جاوید میں لکھے اور مقصد بھی یہ بتایا کہ ان واقعات سے سر سید کی طبیعت اور مزاج اور فطری خوبیوں کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے کہ یہ خوبیاں ان کو ان کے خاندان سے بطور میراث حاصل ہوئی تھیں۔

12.2.2 تعلیم

سر سید کی تقریب بسم اللہ وقت کے بڑے بزرگ شاہ غلام علیؒ نے کرائی۔ پھر گھر ہی میں ایک قدیم شریف گھر کی نوکرانی سے انہوں نے قرآن مجید پڑھا، اس کے بعد مکتب میں عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ریاضی خاندانی علم تھا، اس لیے اس پر خاص توجہ رہی۔ سر سید کو شروع سے آلاتِ رصد جاننے کا شوق پیدا ہوا، اس لیے اس فن کی اہم کتابیں اپنے ماموں سے پڑھ لیں، طب کی تعلیم بھی حاصل کی، یہ سب اٹھارہ انیس برس کی عمر میں انہوں نے حاصل کر لیا۔ کتابوں کا شوق ایسے ماحول میں کیوں نہ ہوتا، حالیؔ لکھتے ہیں کہ اس وقت دلی میں جو

ناموراہل علم تھے، جیسے صہباؔئی، غالبؔ اور آزردہؔ، سرسید کو ان سے ملنے اور پاس بیٹھنے کا موقع ملا۔

12.2.3 ملازمت

1838ء میں سرسید کے والد کا انتقال ہوا، سرسید قریب بائیس سال کے تھے۔ ان کے والد کو قلعہ سے تنخواہ ملتی تھی، انتقال کے بعد یہ بہت کم رہ گئی۔ مالی دشواریاں شروع ہوئیں تو سرسید کو گورنمنٹ کی ملازمت کا خیال پیدا ہوا۔ یہاں قلعہ اور گورنمنٹ دونوں پر توجہ دینے کی ضرورت ہے یعنی بادشاہ کا عمل دخل صرف قلعہ تک تھا، باقی ملک کے انتظامی امور پر انگریزوں کا غلبہ ہو چکا تھا۔ سرسید کے خالو دلی میں گورنمنٹ یعنی انگریز انتظامیہ کے تحت عدالت میں صدرِ امین تھے۔ ان سے سرسید نے کچہری میں کام کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ چند مہینوں کی محنت کے بعد ان کو فوجداری کے شعبہ میں سررشتہ دار کا منصب دے دیا گیا۔ 1839ء میں ایک انگریز آفیسر رابرٹ ہملٹن آگرہ کے کمشنر ہوئے تو انہوں نے سرسید کو اپنے پاس بلا کر نائب منشی کا عہدہ دے دیا۔ یہاں سرسید نے اپنی لیاقت کا بہترین تعارف اس طرح کرایا کہ کمشنری کا پورا دفتر مرتب کر دیا۔ اسی دوران فارسی زبان میں جام جم کے نام سے امیر تیمور سے بہادر شاہ ظفر تک کا حال مرتب کیا اور دیوانی کے قوانین کا ایک خلاصہ بھی تیار کر دیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ 1841ء میں وہ مین پوری ضلع کے منصف مقرر کیے گئے۔ 42ء میں ان کا فتح پور سیکری میں تبادلہ ہو گیا۔ اسی زمانہ میں انہوں نے تین چھوٹی چھوٹی مذہبی کتابیں لکھیں جن میں جلاء القلوب بذکر المحبوب رسالہ حضورؐ کے حالات میں تھا۔ اسی دوران وہ دلی آئے تو قلعہ میں بہادر شاہ نے ان کو عارف جنگ جواد الدولہ کا شاہی خطاب عطا کیا۔ یہ 1841ء کی بات ہے۔

1846ء میں سرسید کا تبادلہ آگرہ سے دہلی ہو گیا۔ یہاں 1846ء سے 1854ء تک جب تک وہ مستقل صدر امین مقرر نہیں ہوئے تھے، وہ دہلی ہی میں رہے۔ اب سرسید انتیس برس کے ہو گئے۔ یہاں آ کر احساس ہوا کہ علوم مشرقیہ جو شروع میں پڑھے اب وہ سب ذہن سے نکل گئے۔ اس احساس نے ان کو پھر سے تفسیر، حدیث، فقہ، ادب عربی کو بہتر طریقہ سے پڑھنے پر آمادہ کیا۔

12.2.4 تحقیقی مزاج

دلی میں منصفی کے زمانہ میں سرسید کے دل میں آیا کہ شہر دہلی کی عمارتوں اور مضافات کی تاریخی جگہوں کی ایک تحقیقی روداد تیار کی جائے۔ یہ کام اس وقت جس قدر دشوار تھا آج اس کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اکثر عمارتیں کھنڈر بن چکی تھیں۔ کتبات کی عبارتیں پڑھنے کے لائق نہ رہی تھیں۔ بانیوں کے حالات کا بھی علم نہیں تھا۔ عمارتوں کی لمبائی چوڑائی کو ناپنا، یہ ساری تفصیل حیات جاوید میں دیکھی جا سکتی ہے۔ حالیؔ نے اس وقت سرسید کی کیفیت کو ایک عربی شعر سے واضح کیا، جس کا ترجمہ یہ ہے:

"وہ ایسے شوق سے اوپر چڑھ رہا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں اس کو آسمان پر کچھ کام ہے"۔

لیکن یہ محض شعری خیال نہیں تھا، سرسید کے اندر کام کرنے کی جو صلاحیتیں پوشیدہ تھیں یہ سب اسی کا ظہور تھا بلکہ بقول حالیؔ: یہ سرسید کی ترقیوں کی گویا پہلی سیڑھی تھی۔

12.2.5 آثار الصنادید

سر سید نے جو کچھ جمع کیا اس کو آثار الصنادید کا نام دیا۔ 1847ء میں یہ چھپ کر شائع ہو گیا، مسٹر رابرٹس اس وقت دہلی کے کلکٹر تھے، وہ انگلینڈ گئے تو وہاں اس کتاب کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں پیش کیا، وہاں اس کو بے حد پسند کیا گیا، یہاں تک کہ اس کے انگریزی ترجمہ کی بات ہوئی۔ اس کو دیکھتے ہوئے سر سید نے آثار الصنادید کو نئے سرے سے مرتب کیا۔ 1861ء میں اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ مشہور مستشرق گارساں دتاسی نے کیا، اس کی مقبولیت ہی تھی کہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سر سید کو اپنا آنریری فیلو بنالیا، اسی دوران سر سید نے کئی اور رسالے مختلف علمی موضوعات پر لکھے۔

1855ء میں سر سید مستقل صدر امین ہو کر بجنور چلے گئے، دو سال بعد 1857ء میں آزادی وطن کی پہلی تحریک سامنے آئی، ظاہر ہے یہ سارا زمانہ کس بے چینی، بے یقینی اور اضطراب کا تھا لیکن ان دو سالوں میں سر سید نے اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ ضلع بجنور کی تاریخ مرتب کی اور اس سے بڑھ کر آئین اکبری کی تصحیح اور تکمیل کی۔ یہ بتاتا ہے کہ سر سید کس عزم اور کس آہنی عمل کے انسان تھے، وہ رکنا اور تھکنا جانتے ہی نہیں تھے، اسی لیے وہ تاریخ میں سر سید بن کر انفرادی شان پر فائز ہوئے۔

12.2.6 1857ء

1857ء کا سال ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ نا قابل فراموش رہے گا۔ اس نے ملک کی قسمت کا فیصلہ ہی نہیں کیا، قوموں کی بربادی اور پھر بیداری کا گواہ بھی بن گیا۔ انقلاب صرف ملک کی سیاسی تاریخ ہی میں نہیں آیا، افراد کی زندگیاں بھی اس انقلاب کے اثر سے کچھ سے کچھ ہو گئیں۔

10 رمئی 1857ء کو دلی میں انگریزوں کے خلاف بغاوت ہوئی۔ 12 رمئی کو بجنور میں اس کا اثر ظاہر ہوا، اس وقت سر سید نے اپنا فرض سمجھتے ہوئے کئی یوروپین لوگوں کو بچانے میں کامیابی حاصل کی۔ انہوں نے جس دلیری اور جوانمردی سے انگریزوں کی جان بچائی، اس کی داستان بہت طویل ہے لیکن پڑھنے کے لائق ہے۔ انگریزوں کی سیاست اور ہندوستانیوں میں اختلافات پیدا کر کے ان کو غلام بنالینے کی چاہت کا بنیادی مطالعہ کرنا ہو تو بجنور کی سرکشی یا بغاوت بہت کچھ سناجاتی ہے۔

بہر حال سر سید حالات کو دیکھ کر نہایت خلوص سے ہندوستانیوں کے نقصانات کو کم کرنے کے لیے کوشاں رہے، حیات جاوید میں لکھا ہے کہ سر سید ہی کی رائے کا یہ نتیجہ تھا کہ امن ہو جانے کے بعد ضلع کے عام باشندوں سے بہت کم مواخذہ کیا گیا۔

12.2.7 کارنامے

سر سید کو ان کی خدمات کا بدلہ کبھی مقصود نہیں تھا، ان کی طبیعت اور فطرت کو جاننے والے یہی کہتے تھے کہ سر سید اپنی خدمت کا انعام یہی سمجھتے تھے کہ ایسے نازک وقت میں ان کی جانب سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہو جو اخلاق اور شرافت کے خلاف ہو، مگر انگریزی حکومت نے خود سے ان کی خدمات کی قدر کی اور ان کو خلعت وانعام اور دو نسلوں تک کی پنشن سے نوازا۔ اس کے علاوہ ایک بڑے رئیس تھے

جو باغی ہو گئے تھے، ان کی بڑی جائداد سر سید کے حوالے کرنا چاہا مگر سر سید نے یہ سوچ کر اس کو قبول نہیں کیا کہ ”مجھ سے زیادہ کوئی نالائق نہ ہو گا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں“۔ سر سید کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے اس قسم کے واقعات کا گہرائی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

اپریل 1858ء میں سر سید مراد آباد کے صدر الصدور بنائے گئے۔ غدر کے بعد اس ضلع میں بھی ہندوستانیوں کی جائیدادیں بڑے پیمانہ پر ضبط کی جانے لگی تھیں۔ سر سید کی وجہ سے ایسی جائیدادیں جتنی مراد آباد میں واگذاشت اور بحال ہوئیں ایسی کسی ضلع میں نہیں ہوئیں۔

12.2.8 مدرسہ کا قیام

مراد آباد میں سر سید نے تاریخ سرکشی بجنور شائع کی۔ یہ کتاب آج بھی بحث کا موضوع ہے لیکن حالیؔ نے ایمانداری سے لکھا کہ واقعات کے بیان کرنے میں سر سید نے مذہبی یا قومی تعصبات کو مطلق دخل نہیں دیا۔

مراد آباد ہی کے قیام میں 1859ء میں سر سید نے ایک فارسی مدرسہ قائم کیا۔ اس سے پہلے وہاں کوئی مدرسہ نہ تھا۔ مدرسہ کا یہ قیام سر سید کی زندگی کا ایک موڑ سمجھنا چاہیے۔ مغلیہ حکومت کے خاتمہ اور انگریزوں کے مکمل قبضہ اور حکومت قائم ہونے کے بعد سر سید کی فکر اور سوچ نے یہ نیا موڑ لیا کہ اب عزت سے زندہ رہنا ہے تو تعلیم پر ساری توجہ مرکوز کرنا پڑے گی۔ اسی مراد آباد کے قیام میں انہوں نے گورنمنٹ کے ورناکیولر اسکولوں کے نظام پر سخت اعتراض کرتے ہوئے گورنمنٹ کو مشورے بھی دیے۔ انہوں نے جو اعتراض کیے وہ آج بھی بار بار پڑھنے کے لائق ہے۔ انہوں نے لکھا کہ ”گورنمنٹ کا یہ کہنا کہ ہم کو اس قدر تربیت سے کچھ علاقہ نہیں بلکہ ہم اسی قدر تعلیم کے خواہاں ہیں جو امور معاش سے علاقہ رکھتی ہے اور جو منحصر ہے صرف جغرافیہ، حساب اور ہندسہ پر، یہ نہایت بے جا ہے“۔ اس مضمون میں سر سید نے دیسی زبانوں کی جگہ ذریعہ تعلیم انگریزی بنائے جانے کی بات ضرور کی مگر وجہ یہی تھی کہ اس وقت تک دیسی زبانیں علمی ترقی کے لیے تیار نہیں تھیں۔

12.2.9 اسباب بغاوت ہند

مراد آباد ہی کے زمانہ قیام میں انہوں نے اسباب بغاوت ہند پر ایک رسالہ لکھا جس میں ہندوستانیوں کو اور خصوصاً مسلمانوں کو بغاوت کے الزام سے بری ثابت کیا۔ جو اسباب انگریزوں کے ذہن میں سما گئے تھے ان کی تردید کی اور ان کو غلط بتایا۔ یہ رسالہ 1859ء میں چھپ گیا۔ ان کے ایک دوست رائے شنکر داس نے کہا کہ یہ کتاب جتنی بھی چھپی ہے سب جلا دو اور اپنی جان کو خطروں میں نہ ڈالو کہ انگریز تم سے ناراض ہو جائے گا۔ سر سید نے کہا کہ ان باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک اور قوم اور خود حکومت کی خیر خواہی سمجھتا ہوں۔ اگر ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا دونوں کے لیے مفید ہو، مجھ کو نقصان بھی پہنچ جائے تو گوارا ہے۔ رائے شنکر داس یہ سن کر آبدیدہ ہو گئے اور پھر خاموش بھی ہو گئے۔ یہ کتاب جب حکومت کے ایوان تک پہنچی تو گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے اسے خیر خواہی پر محمول کیا مگر برطانیہ کے فارن سکریٹری مسٹر ہیڈن نے اس کے خلاف سخت تقریر کی اور کہا کہ اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے، اس سے حسب ضابطہ باز پرس

ہونی چاہیے اور جواب طلب کرنا چاہیے اور پھر سخت سزا دینا چاہیے۔ مگر چونکہ اس رائے کے ہمنوا کم تھے اس لیے سر سید سزا سے بچ گئے۔ اس کتاب کے کئی ترجمے بھی ہوئے مگر سب سے اچھا ترجمہ 1873ء میں سر سید کے دوست کرنل گریہم نے شائع کر دیا۔

مرادآباد ہی میں انہوں نے لائل محمڈنز آف انڈیا کے نام سے کچھ رسالے شائع کرنا شروع کیے جن کا مقصد گورنمنٹ کے ذہن کی صفائی تھی۔

12.2.10 قحط

1860ء میں مرادآباد قحط کی زد میں آ گیا۔ اس کے انتظام کے لیے مرادآباد کے کلکٹر مسٹر اسٹریچی نے سر سید کا انتخاب کیا۔ سر سید نے جس سلیقہ سے اس موقع پر انسانی ہمدردی کا اظہار کیا وہ نہایت غیر معمولی ثابت ہوا۔ چودہ ہزار ضرورت مندوں کو گھنٹہ بھر میں کھانا تقسیم کر دیا جاتا، بیماروں کے لیے شفاخانے ہر وقت تیار، بیماروں کو پرہیزی کھانا، مسلمانوں کے لیے مسلمان باورچی اور ہندوؤں کے لیے ہندو باورچیوں کا انتظام، غرض عام آدمی کو ایک ذرا بھی تکلیف نہیں ہوئی اور کمال یہ ہے کہ ایسے اچھے انتظام میں سب سے کم روپیہ مرادآباد ہی میں خرچ ہوا۔ بعد میں اعتراف کیا گیا کہ سر سید کو جو عزت اور نیک نامی تمام ہندوستان میں حاصل ہوئی یہ اسی بھلائی اور نیکی کا ثمرہ ہے جو قحط کے انتظام میں ان سے ظاہر ہوئی۔ اس قحط کے نتیجے میں بہت سے بچے یتیم ہوئے۔ ان کی دیکھ بھال میں سر سید نے جو رویہ اختیار کیا اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں مگر اس کو اصل کتابوں میں ضرور دیکھنا چاہیے کہ سر سید کے دل میں یہ ارادہ پکا ہو گیا کہ جب بھی موقع ملے گا تمام ہندو مسلمانوں سے چندہ کر کے کسی بڑے شہر میں ایک بڑا یتیم خانہ قائم کیا جائے گا۔ ان یتیموں کو دیکھ کر یہ یقین ہو گیا کہ جب تک ہندوستان میں تعلیم عام نہ ہو گی ان خرابیوں کا مکمل خاتمہ بھی نہیں ہو سکتا۔

سر سید ایک طرف تو ان انتظامی امور کے لیے خود کو وقف کیے ہوئے تھے دوسری طرف وہ علمی کاموں سے بھی الگ نہیں تھے۔ مرادآباد ہی میں انہوں نے تاریخ فیروز شاہی کی تصحیح کی، 1862ء میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے اس کو شائع کیا۔ اسی زمانہ میں انہوں نے اسلام اور مسیحیت کے موضوع پر تبیین الکلام جیسی بے نظیر کتاب لکھنے کی شروعات کی۔

اہلیہ کا انتقال

مرادآباد ہی میں 1861ء میں سر سید کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت سر سید کی عمر چوالیس برس کی تھی، جسم توانا و تندرست تھا۔ سید حامد اور سید محمود اور ایک بیٹی سب کمسن اولاد تھے۔ دوستوں نے نکاح ثانی کا مشورہ دیا لیکن سر سید نے فیصلہ کر لیا کہ اب عمر کا سارا سرمایہ قومی خدمات ہی کے لیے وقف ہو گا۔

12.2.11 غازی پور

1862ء میں سر سید کا تبادلہ مرادآباد سے غازی پور ہو گیا۔ یہاں آنے کے بعد ان کے دل میں صرف ایک خیال ہی رہ گیا کہ جب تک ہندوستان میں علم کی روشنی نہ پھیلے گی اس وقت تک ہندوستانیوں کی بھلائی کی ساری تدبیریں فضول اور بیکار ہیں۔ اس کے لیے سر سید نے

سب سے پہلے اس کام کو ضروری قرار دیا کہ علوم جدیدہ کی کتابوں کو دیسی زبانوں میں منتقل کیا جائے۔ اس غرض سے انہوں نے غازی پور میں 1864ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔

اسی سال انہوں نے غازی پور میں ایک مدرسہ قائم کر دیا، یہ مدرسہ قومی چندہ کی بنیاد پر قائم کیا گیا، اس کے مقاصد میں اس کو بڑا کالج بنانا تھا، راجہ ہر دیو نارائن سنگھ اس کے سرپرست بنائے گئے۔ انگریزی، اردو، فارسی، عربی اور سنسکرت زبانوں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا مگر غازی پور اور اس مدرسہ کی قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا، اسی سال 1864ء میں سرسید کا تبادلہ علی گڑھ کے لیے ہو گیا اور یہ مدرسہ جو اگر سرسید چند سال اور وہاں رہ جاتے تو ممکن ہے کہ یہ مدرسۃ العلوم یا مسلم یونیورسٹی پر سبقت لے گیا ہوتا۔

12.3 علی گڑھ

1864ء میں سرسید علی گڑھ آ گئے۔ وہ علی گڑھ جس کی عزت اور شہرت خدا نے سرسید کی ذات سے وابستہ کی تھی۔ سرسید کے ساتھ سائنٹفک سوسائٹی کا تمام عملہ بھی غازی پور سے علی گڑھ آ گیا، یہاں سوسائٹی کو بڑی ترقی ملی، عالیشان عمارت بن گئی۔ 1866ء میں اس کا افتتاح میرٹھ کے کمشنر مسٹر ولیمس نے کیا، چند برسوں میں اس سوسائٹی نے بہت سی مفید کتابیں انگریزی سے ترجمہ کر کے شائع کیں۔

1865ء میں سرسید نے سوسائٹی کی جانب سے کاشتکاری کے موضوع پر کتابیں تالیف کرنے کا منصوبہ بنایا اور خود ہی یہ کام اپنے سر لیا، اس کے لیے انہوں نے مضامین کی ایک لمبی فہرست بھی تیار کر لی مگر یہ کام پورا نہ ہو سکا۔

12.3.1 انسٹی ٹیوٹ گزٹ

1866ء میں انہوں نے ہندوستانیوں کو اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے برطانوی پارلیمنٹ سے براہ راست رابطہ قائم کرنے کی سہولت کی بات اٹھائی اور اس کے لیے علی گڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد رکھی۔ 1866ء ہی میں سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی کی جانب سے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نام کا اخبار جاری کیا۔ اس اخبار نے بڑی شہرت پائی۔ اس میں زیادہ آرٹیکل سرسید کے قلم سے ہوتے۔ شروع میں صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید انگریزی خیالات کو ہندوستانی لباس میں اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی لباس میں پیش کر کے دونوں قوموں میں اتحاد چاہتے تھے، سیاسی اور سماجی موضوعات سے زیادہ تعلیمی موضوع پر آرٹیکل ہوتے۔ اس اخبار کے متعلق حیات جاوید سے اور کئی تفصیلات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

1867ء میں سرسید جج کا عہدہ پا کر علی گڑھ سے بنارس آ گئے۔ یہاں وہ 1876ء تک رہے، یہاں انہوں نے ورناکیولر یونیورسٹی کے قیام کے لیے کوششیں کیں۔ یہی نہیں 1867ء میں انہوں نے ہومیوپیتھک علاج کی حمایت کرنے اور اس کے رواج کو عام کرنے کا ارادہ کیا۔ مہاراجہ بنارس کی صدارت میں انہوں نے بنارس میں ہومیوپیتھک ڈسپنسری اینڈ ہاسپٹل کھولا اور مسلسل لوگوں کو اس جانب توجہ دلاتے رہے۔

12.3.2 مدرسۃ العلوم

مسلم یونیورسٹی کے ذکر میں سر سید کی یہ تمام کوششیں بظاہر غیر متعلق سی لگتی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی یا اس کے نقش اول مدرسۃ العلوم کے قیام کو سمجھنے کے لیے اس سر سید کو سمجھنا بہت ضروری ہے جس نے ہندوستانیوں کو انگریزوں کی حکومت اور اقتدار کے سایہ میں عزت کے ساتھ جینا سکھانا چاہا تھا۔ وہ ہر روز محکوم ہندوستانیوں کے احساس کمتری یا غلامی کو دور کرنے کے لیے مسلسل سماجی خدمات کے لیے خود کو وقف کرتے رہے۔ 1857ء کے بعد ان کا یہ خیال عقیدہ میں بدل گیا تھا کہ جب تک مسلمانوں میں مغربی تعلیم نہ پھیلے گی اور انگریزوں کے ساتھ میل جول نہ ہو گا اس وقت تک مسلمانوں کا پنپنا اور ہندوستان میں عزت سے رہنا دشوار ہو گا۔ اس خواہش کے ساتھ ایک اور خیال یہ تھا کہ سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد کا جواب لکھنے کے لیے بہت سی کتابوں کی ضرورت تھی جو ہندوستان میں ناپید تھیں، ان کو حاصل کرنے کے لیے انگلستان جانا ضروری تھا، چنانچہ 1869ء میں وہ بنارس سے انگلینڈ کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں وہ سترہ مہینے رہے، اس پوری مدت میں انہوں نے جو کچھ کیا وہ ان کے سفر نامہ میں دیکھا جا سکتا ہے اور خاص طور پر قوم کی خیر خواہی اور مفید تعلیم پر قوم کی بے حسی کا ذکر جگہ جگہ ہے۔

12.3.3 انگلینڈ کا سفر

انگلینڈ میں ان کی بڑی عزت افزائی ہوئی۔ 1869ء میں ان کو سی، ایس، آئی کا خطاب اور تمغہ ملا، یہ انگلینڈ کا بڑا سرکاری اعزاز تھا، ان کو اور بھی اعزاز ملتے رہے لیکن سر سید کے ذہن اور دل میں جو سودا سمایا تھا وہ تعلیم کا تھا، انگلینڈ میں بھی انہوں نے انگریزوں کی تعلیم و ترقی کے موضوع پر ایک رسالہ لکھا اور ہندوستان میں اپنے اخبار کے لیے اردو میں بھی ایک مضمون اسی عنوان سے بھیجا، عام طور پر ہندوستان میں لوگ اس سے ناراض ہوئے، مولانا حالیؔ کے قول کے مطابق ''یہ سب در حقیقت تمہیدیں تھیں ان کارروائیوں کی جو آخر کار ہندوستان پہنچ کر سر سید کے ہاتھ سے ظہور میں آنے والی تھیں''۔ انگلینڈ کے اس قیام میں انہوں نے اپنی مشہور ترین تالیف خطبات احمدیہ بھی وہیں پوری کی۔

12.3.4 مسلمانوں کی تعلیم

1870ء میں سر سید ہندوستان واپس آ گئے۔ بنارس میں اپنے عہدہ کا چارج لیا، یہاں آتے ہی انہوں نے اس بڑے کام کی بنیاد ڈالنا شروع کی جس کے لیے وہ انگلستان گئے تھے۔ یہ کام کیا تھا؟ یہ کام مسلمانوں کی تعلیم کا منصوبہ تھا، وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کے مذہبی خیالات اور انگریزوں اور انگریزی سے ان کی نفرت اور تعلیم کے مفہوم سے ان کی ناواقفیت ان کے اصل مقصد یعنی ایک محمڈن یونیورسٹی کے قیام میں مخالفتوں کا ایک طوفان کھڑا کر دیں گے۔ وہ جانتے تھے کہ جو ہندوستان میں اور یونیورسٹیاں ہیں ان کے نظام تعلیم سے حقیقی لیاقت نہیں پیدا ہو سکے گی۔ اس بات کو مسلمانوں، عام ہندوستانیوں اور خود انگریزی حکومت کے کانوں تک پہنچانا ضروری تھا، اس لیے انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ مسلمانوں کے مزاج کو بدلنے کے لیے رسالہ تہذیب الاخلاق کا اجراء کیا۔ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ جاننے کے لیے اپنے وقت کا یہ مشہور ترین رسالہ آج بھی سب سے زیادہ کار آمد ہے۔ 1870ء میں اس کا پہلا شمارہ نکلا، یہ پرچہ چونکہ ایک بالکل نئے انداز میں مذہب و اخلاق اور تعلیم اور معاشرتی اصلاح کی تبلیغ کرنے والا تھا، اس لیے اس کی مخالفت شد و مد سے ہوئی۔ کفر کے فتوے سر سید اور ان کے

ساتھیوں پر لگائے گئے، مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اس کی آواز زمانہ کی گونج کے موافق تھی، اس لیے اس کی مقبولیت بھی بڑھتی گئی۔ ایک تو سر سید اور سید مہدی علی خان کی دلکش تحریریں، دوسرے اس کے مضامین کا نرم اور سنجیدہ اسلوب اور اس کا یہ انداز کہ جو بات سچ معلوم ہو وہ لوگوں تک پہنچادی جائے، زبردستی اس کو منوانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس پرچہ نے مدرسۃ العلوم کے سرسید کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں سب سے زیادہ اہم کردار ادا کیا۔ مدرسۃ العلوم کے سلسلہ میں ہر کوشش اسی رسالہ کے ذریعہ لوگوں کو ملتی رہی، حالیؔ کے بقول "سرسید کی کوششوں کے عملی نتائج اس کے ذریعہ سے دریافت ہوتے تھے اور اس لیے روز بروز مدرسۃ العلوم کی عظمت کا خیال لوگوں کے دلوں میں زیادہ ہوتا گیا۔

12.3.5 مدرسۃ العلوم کی تکمیل

1876 میں سرسید پنشن لے کر علی گڑھ آ گئے اور یہیں سے ان کو مدرسۃ العلوم کی تکمیل، اس کی عمارتیں تعمیر کرنے اور ہر طرح سے کالج کی زمین کو آباد و سرسبز کرنے کی طرف پوری طرح توجہ کرنے کی فرصت ملی۔

سرسید کے بنارس کے زمانۂ قیام کی دیگر تفصیلات میں مثلاً کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان کا قائم کیا جانا، اسی طرح مدرسۃ العلوم کے مجوزہ قیام کے لیے ایک کمیٹی خزینۃ البضاعۃ کی تشکیل کیا جانا اور سب سے بڑھ کر ڈاکٹر ہنٹر کی ایک کتاب اور انڈین مسلمز پر ایک طویل ریویو کے ذریعہ اس کتاب کی غلط بیانیوں کو واضح کرنا تھا۔ اس ریویو سے سرسید کی عظمت انگریز حکام کی نگاہوں میں بہت بڑھ گئی۔ سرسید کی سوانح حیات میں اس کتاب کا عمل اور رد عمل کا مطالعہ بہت اہم ہے لیکن یہاں یہ ہمارے موضوع سے الگ ہے۔ موضوع تو مسلم یونیورسٹی کے نقش اول مدرسۃ العلوم کی تاریخ کو جاننا ہے۔

فروری 1873ء میں بنارس کے ایک جلسہ میں سید محمود نے اس مدرسہ کے باقاعدہ قیام کی تحریک کی، چنانچہ 1873ء ہی میں علی گڑھ میں ایک جلسہ ہوا، پھر کئی اور جلسے ہوئے اور آخر کار 24 مئی 1875ء جو کہ ملکہ وکٹوریہ کی سالگرہ کا دن تھا، اس مدرسہ کے افتتاح کی تاریخ مقرر ہوئی۔ سرسید بنارس سے آئے اور باقاعدہ یکم جون 1875ء سے اس میں تعلیم شروع ہو گئی۔

اب جہاں مسلم یونیورسٹی کی دنیا آباد ہے، یہ خطہ چھاؤنی تھا اور فوج کی پریڈ ہوا کرتی تھی، سرسید نے اس زمین کو حاصل کرنے کے لیے درخواست دے دی، یہ قریب 74/ایکڑ کی زمین تھی لیکن انگریز حکام اس درخواست کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، یہاں تک کہ سرسید اور ان کے رفقا مایوس ہونے لگے، مگر یہ خوش قسمتی تھی کہ عین اسی مایوسی کے عالم میں سر جان اسٹریچی، لیفٹننٹ گورنر ہو گئے، ان کو سرسید سے پہلے سے تعلق تھا، انہوں نے خود آ کر زمین کا معائنہ کرنے کے بعد چند شرطوں کے ساتھ زمین دینے پر تیار ہو گئے اور اس طرح حسب ضابطہ اس قطعۂ زمین پر قبضہ دلا دیا گیا، ابتدائی مدرسہ اسی سرزمین پر قائم ہو گیا۔

سرسید بنارس سے 1876ء میں ملازمت سے پنشن لے کر علی گڑھ آ گئے تو مدرسۃ العلوم کی زمین اور وہاں مدرسہ کے ابتدائی درجات شروع ہو چکے تھے۔ سرسید مستقل طور پر آئے تو علی گڑھ ضلع کے تمام رئیسوں اور سربرآوردہ لوگوں نے ان کے اعزاز میں جلسہ کیا۔ ان کو سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ اس سپاس نامہ کے شکریہ کے طور پر سرسید نے کہا کہ دلی میرا وطن ہے، وہاں بزرگوں اور عزیزوں کی ہڈیاں

دفن ہیں اور بہت سے عزیز اب بھی وہیں رہتے ہیں۔ خیال یہی ہوا کہ جہاں کی مٹی سے بنا ہوں میری خاک پھر اسی میں مل جائے، لیکن اس وطن کو صرف مدرسۃ العلوم کی محبت اور اپنی قوم کی بھلائی کی وجہ سے چھوڑا ہے اور یہاں ایک غریب مسافر کی طرح سکونت اختیار کی ہے۔ اسی تقریر میں سرسید نے بڑے جذباتی انداز میں کہا اور یہ آج بھی اس لیے نقل کرنے کے لائق ہے کہ معلوم ہو کہ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے پیچھے جذبات کیا تھے؟ سرسید نے کہا کہ میں نے جب بھی کوئی عمدہ چیز دیکھی، عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا، علمی مجلسیں دیکھیں، عمدہ مکانات دیکھے، عمدہ پھول دیکھے، کھیل کود اور عیش و آرام کے جلسے دیکھے، یہاں تک کہ کبھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہماری قوم ایسی کیوں نہیں؟ جہاں تک ہو سکا ہر موقع پر میں نے قومی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا، سب سے اول یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کے لیے قوم ہی کے ہاتھ سے ایک مدرسۃ العلوم قائم کیا جائے۔ مسلم یونیورسٹی کے آغاز اور اس کی ابتدا کو جاننے اور سمجھنے کے لیے سرسید کے یہ الفاظ ہمیشہ زندہ رکھے جانے کے لائق ہیں کہ مسلم یونیورسٹی قومی ترقی کے لیے قائم کی جانے والی تعلیم کی دنیا ہے۔

12.3.6 محمڈن اینگلو اورینٹل کالج

سرسید علی گڑھ میں ہمیشہ کی طرح ہمہ تن اپنے مشن میں مصروف ہوگئے۔ مدرسۃ العلوم کی عمارتوں میں تیزی سے ترقی شروع ہوئی۔ پورے ہندوستان میں چندہ کے لیے کوششیں تیز تر ہونے لگیں اور پھر یہ ہوا کہ علی گڑھ صرف مدرسۃ العلوم یا دارالعلوم ہی نہیں رفتہ رفتہ قومی ہمدردی، قومی اتحاد، قومی مصالح اور قومی مقاصد کا صدر مقام اور مرکز بننے لگا اور پھر وہ وقت بھی آیا جب مدرسۃ العلوم، محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے قالب میں بدلنے کے لیے تیار ہوا۔ 8 جنوری 1877ء کو لارڈ لٹن نے کالج کا سنگ بنیاد غیر معمولی اور غیر متوقع شان و شوکت کے ساتھ رکھا۔

12.3.7 یونیورسٹی کی تجویز

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ سرسید کے فرزند سید محمود نے ایک اسکیم 10/فروری 1873ء میں پیش کی تھی اور اس میں اس بات کی تصریح کی تھی کہ ہماری غرض صرف ایک مدرسہ یا کالج ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ ایک یونیورسٹی قائم کرنا ہے، کمیٹی نے جو انگریزی نام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی رکھا ہے اس میں بجائے کالج کے یونیورسٹی ہونا چاہیے اور اردو میں بجائے مدرسۃ العلوم کے دارالعلوم نام رکھنا چاہیے اور گورنمنٹ صرف نگرانِ حال رہے، اس کی اور کسی قسم کی مداخلت اس دارالعلوم میں نہ ہونی چاہیے۔ اس اسکیم کی جو کاپی گورنمنٹ کو بھیجی گئی اس میں بھی یونیورسٹی کا لفظ موجود تھا لیکن گورنمنٹ کا یہ جواب آیا کہ اگر کمیٹی محمڈن یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے تو حکومت اس کو گرانٹ نہیں دے گی۔ سرسید کا تب یہ کہنا تھا کہ اگر مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ان کی ضرورتوں کے موافق اپنے طور پر تعلیم کا نظم نہیں کیا جائے گا تو بچوں میں اصل لیاقت پیدا نہیں ہو سکے گی۔ اسی لیے ایک مرحلہ یہ بھی آیا کہ سرسید حکومت سے بے نیاز ہو کر یونیورسٹی کے لیے تیار ہو گئے لیکن اس صورت میں یونیورسٹی چلانا اور اس کی ڈگریوں کا پھر بھی حکومت میں نہ تسلیم کیا جانا ایسی باتیں تھیں جن سے بقول مولانا حالی "سرسید کو اپنا منصوبہ پورا کرنے سے بالکل مایوسی ہوگئی"، اس وقت یونیورسٹی قائم کرنے کا خیال انہوں نے چھوڑ دیا

اور مدرسۃ العلوم میں وہی کورس اختیار کرنا پڑا جو موجودہ یونیورسٹیوں کا تجویز کردہ ہے، یعنی وقتی طور پر عالم یہ تھا کہ اگر آسمان تک پرواز کی طاقت نہیں تو اتنا ہی اڑیں جہاں تک رسائی ہو سکے، وقتی طور پر یونیورسٹی سے مایوس ضرور ہوئے لیکن مدرسۃ العلوم کے لیے انہوں نے عزم کر لیا کہ اس کو قائم رہنا ہے اور قائم رہنے کے لیے قوم سے چندہ کرنا ہے۔ لکھا گیا کہ یہ سب سے زیادہ مشکل کام تھا، عام مسلمان تو سر سید کے مذہبی اور قومی خیالات سے یوں ہی بدگمان تھے، علماء اور دانشور بھی ان کے خلاف فتووں اور مضامین کا انبار لگا رہے تھے۔ سر سید جب تک سرکاری عہدوں پر تھے چندہ لینا آسان تھا، اب عہدے نہیں رہے تو چندہ دینے والے بھی محدود ہو گئے، مگر سر سید جس آہنی عزم کے مالک تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیس برس کے عرصہ میں سات آٹھ لاکھ روپے کی عمارت تیار ہو گئی۔ مدرسہ کی آمدنی سے اسی ہزار سالانہ کا خرچ چلنے لگا۔ اس رقم کو ڈیڑھ سو سال پہلے کی قدر سے دیکھا جائے تو یہ اربوں روپے کے برابر تھی، لوگوں کے لیے یہ کسی معجزہ سے کم نہیں تھا مگر حیات جاوید کے مصنف کی نظر میں جب ایک دانش مند، سچا آدمی استقلال اور ہمت سے کام لیتا ہے تو وہ ہر مشکل پر غالب آ سکتا ہے۔ سر سید نے جس لیاقت اور ایمانداری سے مدرسۃ العلوم کے کام کو آگے بڑھایا اس کو دیکھ کر مخالف بھی کام کی عظمت کو سمجھنے لگے، سب سے بڑھ کر قوم کو یہ اطمینان ہوا کہ جس کام کے لیے روپیہ دیا جا رہا ہے وہ صحیح طور پر صرف بھی ہوتا ہے۔

مدرسۃ العلوم یا محمڈن کالج کی عمارتیں جس شاندار پیمانہ پر بننا شروع ہوئیں اس سے بھی لوگ متاثر ہوئے۔ کالج کی بڑائی دیکھ کر مسلمانوں کو اپنی عظمت کے بھولے خواب یاد آنے لگے اور دوسری طرف حکام کے دلوں میں بھی کالج کی وقعت بڑھنے لگی۔

12.3.8 یونیورسٹی کے لیے چندے کی کوشش

کالج کی ترقی اور تعمیرات کی یہ داستان بہت دلچسپ ہے۔ سر سید نے کیسے کیسے چندہ کی راہیں ہموار کیں، بے شمار طریقے اور تدبیریں اختیار کر کے وہ کالج کے لیے سرمایہ فراہم کرتے رہے۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ سر سید نے اپنے مدرسہ یا کالج کی خاطر ہر بات کو اپنے نفس پر گوارا کر لیا تھا، انہوں نے جگہ جگہ جس طرح جلسوں میں لوگوں سے خطاب کیا وہ اب تاریخ کا حصہ ہے مگر ایسا حصہ ہے جس کو بار بار دیکھنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے، ایک جلسہ میں کہا کہ فرض کرو کہ میں ایک بدعقیدہ ہوں مگر آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر، مرتد آپ کی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے تو کیا آپ اس کو اپنا خادم اور خیر خواہ نہ سمجھیں گے۔

سر سید کی عمر ڈھل رہی تھی مگر مدرسہ یا کالج کے چندے کے لیے وہ پورے ملک میں بڑے بڑے سفر کرتے رہے اور کمال یہ ہے کہ ان تمام اسفار کا خرچ وہ اپنی جیب سے پورا کرتے۔ ایک طریقہ یہ نکالا کہ جو لوگ ان کی دعوت کرنا چاہتے تو ان سے دعوت پر خرچ کیا جانے والا روپیہ لے کر کالج میں جمع کرتے اور اس طرح دعوت کی جگہ چندہ ان کو زیادہ خوش کر دیتا۔ ایسے کئی واقعات سر سید کی سوانح میں درج کیے گئے ہیں، ان کو پڑھنے کی ضرورت ہے۔

بہر حال سر سید نے اپنی عجیب و غریب تدبیروں سے مدرسہ کے لیے سرمایہ جمع کیا، انگلینڈ سے آنے کے بعد وہ اٹھائیس سال زندہ رہے اور یہ تمام مدت صرف اس فکر کی نذر ہو گئی کہ کس طرح روپیہ فراہم ہو اور مسلمانوں کے لیے اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت کا سامان مدرسۃ العلوم میں کس طرح ہو۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ اس قسم کے صدہا واقعات روزانہ ہی گزرتے تھے۔ ان کو بیان اسی لیے کیا گیا کہ جس

قوم میں عام طور پر تعلیم کی قدر نہ ہو، جہاں ہر کام کا مدار شخصیت اور ذاتی اغراض پر ہو، جہاں قومی ترقی اور قومی فلاح کے نتائج سے لوگ بے خبر ہوں، جہاں امیر بے پروا، دولت مند مسرف یا بخیل ہوں، علما زمانے کی ضرورتوں سے ناواقف اور عوام الناس جاہل اور مفلس ہوں وہاں ایک ایسا کام جس سے تمام قوم کی بھلائی مقصود ہو کوئی شخص نہیں کر سکتا، جب تک کہ وہ سر سید کی طرح اپنے آپ کو اس کام میں فنا نہ کر دے اور جو فائدے وہ اپنی عقل مندی، شہرت، لیاقت، وجاہت، دوستی، کوشش اور محنت سے خود اٹھا سکتا ہے ان سے خود دست بر دار ہو کر اس کام پر وقف نہ کر دے۔ یہ سر سید اور ان کی آرزو مسلم یونیورسٹی کو سمجھنے کے لیے بنیادی اہمیت کی حاصل عبارت ہے۔ سر سید مدرسہ کی خاطر اپنے اوپر یہ بھی لازم کیے ہوئے تھے کہ کوئی اور کام یا کوشش ایسے معاملہ میں نہ کی جائے جس کا مدرسہ سے تعلق نہ ہو، یہ فنائیت کی بڑی مثال ہے۔

سر سید نے جس شان سے اور جس شان کی عمارتیں بنوائیں اس کو اس نظر سے بھی دیکھا گیا کہ آئندہ نسلوں کو اپنے قومی انسٹی ٹیوشن کی عظمت و شان دیکھ کر اس کو باقی و قائم رکھنے کا زیادہ خیال ہو۔ اسٹریچی ہال تیار ہوا تو ایک معزز شخص نے کہا کہ جب تک یہ عمارت قائم ہے مسلمان یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم مرے ہوئے بھی ایسے کام کر گزرتے ہیں جو زندوں سے نہیں ہو سکتے۔ مدرسہ یا اب مسلم یونیورسٹی کی ان عمارتوں کو بھی گہرائی سے دیکھنے کی ضرورت ہے کہ سر سید نے آئندہ نسلوں کے فخر کے لیے تمام عمارتوں کے بانیوں، محسنوں، مربیوں اور مددگاروں کے نام بڑے اہتمام سے لکھوا دیے، عمارتوں کے طرز تعمیر میں قوم کی تاریخ کے روشن پہلوؤں کو دکھانے کا جو لحاظ رکھا گیا سر سید اور ان کی یونیورسٹی دونوں کا مقصد سمجھنے میں دشواری نہیں آتی اور یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ سر سید نے اپنے نام کو کیوں چھپائے رکھا؟ مسلم یونیورسٹی کے گہر ہونے تک مدرسۃ العلوم کے قطرے پر جو گزری اس کا ایک ایک لمحہ آنکھوں میں بسا لینے کی دعوت دیتا ہے۔

12.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- 17/اکتوبر 1817ء میں سر سید دلی میں پیدا ہوئے، سر سید کی تقریب بسم اللہ وقت کے بڑے بزرگ شاہ غلام علیؒ نے کرائی۔ پھر گھر ہی میں ایک قدیم شریف گھر کی نوکرانی سے انہوں نے قرآن مجید پڑھا، اس کے بعد مکتب میں عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ریاضی خاندانی علم تھا، اس لیے اس پر خاص توجہ رہی۔ سر سید کو شروع سے آلاتِ رصد جاننے کا شوق پیدا ہوا، اس لیے اس فن کی اہم کتابیں اپنے ماموں سے پڑھ لیں، طب کی تعلیم بھی حاصل کی، یہ سب اٹھارہ انیس برس کی عمر میں انہوں نے حاصل کر لیا۔
- مسلم یونیورسٹی کے ذکر میں سر سید کی یہ تمام کوششیں بظاہر غیر متعلق سی لگتی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی یا اس کے نقش اول مدرسۃ العلوم کے قیام کو سمجھنے کے لیے اس سر سید کو سمجھنا بہت ضروری ہے جس نے ہندوستانیوں کو انگریزوں کی حکومت اور اقتدار کے سایہ میں عزت کے ساتھ جینا سکھانا چاہا تھا۔ وہ ہر روز محکوم ہندوستانیوں کے احساس کمتری یا غلامی کو

دور کرنے کے لیے مسلسل سماجی خدمات کے لیے خود کو وقف کرتے رہے۔

- سرسید بنارس سے 1876ء میں ملازمت سے پنشن لے کر علی گڑھ آ گئے تو مدرسۃ العلوم کی زمین اور وہاں مدرسہ کے ابتدائی درجات شروع ہو چکے تھے۔ سرسید مستقل طور پر آئے تو علی گڑھ ضلع کے تمام رئیسوں اور سربر آوردہ لوگوں نے ان کے اعزاز میں جلسہ کیا۔ ان کو سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ اس سپاس نامہ کے شکریہ کے طور پر سرسید نے کہا کہ دلی میرا وطن ہے، وہاں بزرگوں اور عزیزوں کی ہڈیاں دفن ہیں اور بہت سے عزیز اب بھی وہیں رہتے ہیں۔ خیال یہی ہوا کہ جہاں کی مٹی سے بنا ہوں میری خاک پھر اسی میں مل جائے، لیکن اس وطن کو صرف مدرسۃ العلوم کی محبت اور اپنی قوم کی بھلائی کی وجہ سے چھوڑا ہے اور یہاں ایک غریب مسافر کی طرح سکونت اختیار کی ہے۔

12.5 نمونہ امتحانی سوالات

12.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. سرسید کب پیدا ہوئے؟

(a). 1817ء (b). 1917ء (c). 1857ء (d). 1947ء

2. حیات جاوید کی مصنف کا نام بتائیں؟

(a). الطاف حسین حالی (b). علامہ شبلی نعمانی (c). محسن الملک (d). وقار الملک

3. سرسید کے نانا کا نام بتائیں؟

(a). فرید الدین احمد (b). شیخ احمد سرہندی (c). خلیل اللہ (d). سب غلط

4. سرسید کی تقریب بسم اللہ کس نے کروائی؟

(a). شاہ غلام علیؒ (b). مولوی خلیل اللہ (c). شاہ ولی اللہ (d). سب صحیح

5. حیات جاوید میں کس کی زندگی کے حالات بیان کیے گیے ہیں؟

(a). سرسید احمد خاں (b). مدن موہن مالویہ (c). قاسم نانوتوی (d). سید علی مونگیری

6. آثار الصنادید کے مصنف کا نام بتائیں؟

(a). سرسید احمد خاں (b). مدن موہن مالویہ (c). قاسم نانوتوی (d). سید علی مونگیری

7. 1859 میں سرسید نے کہاں مدرسہ قائم کیا؟

(a). مراد آباد (b). غازی پور (c). دہلی (d). علی گڑھ

8. آثار الصنادید کا ترجمہ گارساں د تاسی نے کس زبان میں کیا؟

(a). فرانسیسی (b). انگریزی (c). عربی (d). سریانی

9. سر سید کا مراد آباد سے غازی پور کب تبادلہ ہوا؟

(a). 1862ء (b). 1817ء (c). 1857ء (d). 1877ء

10. سائنٹفک سوسائٹی کہاں قائم کی گئی؟

(a). غازی پور (b). حیدرآباد (c). بنارس (d). دہلی

12.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. سر سید کی ابتدائی زندگی پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔
2. سر سید احمد خاں کے تحقیقی مزاج پر روشنی ڈالیے۔
3. سر سید احمد خاں کے کارنامے تحریر کیجیے۔
4. یونیورسٹی کے لیے سر سید کی کوششوں کا جائزہ لیجیے۔
5. اسباب بغاوت ہند لکھنے کی وجوہات بیان کیجیے۔

12.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. سر سید احمد خاں کی ملازمت کے بارے میں تفصیل سے لکھیے۔
2. سر سید کے علی گڑھ منتقل ہونے کے بعد ان کی کوششوں پر مضمون لکھیے۔
3. مراد آباد میں مدرسے کے قیام اور اسباب بغاوت ہند پر تحریر کیجیے۔

12.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. بزم وفا، مدیر مشحون احمد، انجمن طلبائے قدیم لکھنؤ 2002ء
2. تاریخ علی گڑھ تحریک، پروفیسر مسز ممتاز معین اور پروفیسر انصار احمد خان، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس 1980ء۔
3. تہذیب الاخلاق مشاہیر علی گڑھ نمبر، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی فروری 2013ء، مارچ 2013ء، جون 2013ء، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
4. حیات جاوید، مولانا الطاف حسین حالیؔ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 1979ء۔
5. دی علی گڑھ موومنٹ، شان محمد، میناکشی پرکاشن میرٹھ، نئی دہلی 1975ء۔

اکائی 13: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (حصہ دوم)

اکائی کے اجزا:

13.0 تمہید
13.1 مقاصد
13.2 کالج کا انتظام تعلیم
13.3 سرسید کا انتقال اور کالج کی حالت
13.3.1 نواب محسن الملک
13.3.2 نواب وقار الملک
13.4 علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لیے جدوجہد
13.5 علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
13.6 اکتسابی نتائج
13.7 نمونہ امتحانی سوالات
13.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
13.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
13.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
13.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

13.0 تمہید

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد جب مسلمان ظلم وستم کے شکار ہوئے تو اس ماحول میں سرسید نے اپنی قوم کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔ اسباب بغاوت ہند لکھ کر جنگ کی وجوہات کو انگریزوں کے سامنے پیش کیا۔ اس کے علاوہ سرسید نے مسلمانوں کی توجہ تعلیم کی طرف مبذول

کروائی۔ اپنی سرگرمیوں کا مرکز علی گڑھ کو بنایا جس کی وجہ سے اس کو علی گڑھ تحریک کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس تحریک نے ادبی، مذہبی، معاشرتی اور مسلمانوں کی تعلیمی زندگی پر انمٹ نقوش چھوڑے۔

13.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ علی گڑھ تحریک میں انتظام تعلیم، سرسید کی وفات کے بعد کالج کی حالت، نواب محسن الملک اور وقار الملک، اس میں شامل افراد کی کوششوں اور یونیورسٹی تک کا سفر طے کرنے کے بارے میں آگاہی حاصل ہو۔

13.2 کالج کا انتظام تعلیم

مدرسۃ العلوم یا محمڈن کالج میں دو ڈپارٹمنٹ تھے، ایک انگریزی شعبہ جس میں یونیورسٹی کا کورس پڑھانا تجویز ہوا تھا، دوسرا اورینٹل شعبہ جس کے لیے ایک کمیٹی تھی، اردو میں علوم جدیدہ اور فارسی، عربی ادب اور علوم قدیمہ پڑھانے کی تجویز تھی۔

1887ء میں کالج میں کلاس قائم ہو گئی، اسی سال محمڈن کالج فرسٹ آرٹس کے امتحان تک اور 1881ء میں بی اے اور ایم اے تک کلاس شامل ہو گئے، 1882ء میں قانون کے لیے کلکتہ یونیورسٹی اور سائنس اور آرٹس کی اعلیٰ تعلیم کے لیے الہ آباد یونیورسٹی سے مدرسۃ العلوم کا الحاق ہو گیا۔

1893ء میں سید محمود نے ایک لکچر میں بتایا کہ مدرسۃ العلوم نے کتنی تیزی سے مسلمان گریجویٹس کی تعداد میں اضافہ کیا۔

1878ء میں سرسید کو لیجسلیٹیو کونسل کا ممبر مقرر کیا گیا۔ ہندوستانیوں میں سرسید وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے کونسل کی ممبری کے زمانہ میں ہندوستان کی بھلائی کے لیے قانون بنایا، چیچک کے ٹیکے اور قاضیوں کے تقرر کا قانون پاس کرایا۔ سرسید کی زندگی کے ان پہلوؤں کا بظاہر ہمارے موضوع سے براہ راست تعلق نہیں لیکن اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تعلیم کے بنیادی مقصد کو اپنی زندگی کا حصہ بنانے کے ساتھ وہ اپنے ملک و قوم کے لیے ہر مفید اور تعمیری کام کو بھی یکساں اہمیت دیتے تھے۔ خاندانی وقف قانون بھی ایسی ہی کوشش سے اس ممبری کے زمانہ میں ان سے ایجوکیشن کمیشن میں طویل گفتگو کی گئی۔ یہ گفتگو ایسے سوالوں پر مشتمل تھی کہ کیا مغربی علوم کی تعلیم دیسی زبانوں میں انگریزی زبان کی بہ نسبت زیادہ مفید ہوگی؟ یا یہ کہ کس تدبیر سے تعلیم کی آزادی اور اس کی اختلافی نوعیتوں کو محفوظ رکھا جا سکے؟ یہ سوال بھی سامنے آیا کہ حکومت کو کس کس حد تک ہر قسم میں تعلیم کی امداد دینی مناسب ہے؟ ایک سوال یہ بھی کیا گیا کہ گرانٹ ان ایڈ کا قاعدہ جو رواج میں ہے وہ کافی ہے یا نہیں؟ اسکالرشپ کی ضرورت ہے یا اس کو رشوت کے طور پر سمجھا جائے؟ یہ سوال بھی کیا گیا، ساتھ ہی یہ بھی پوچھا گیا کہ حکومت کی تعلیم کیا اس اثر کو پیدا کرنے میں قاصر رہتی ہے کہ مضامین تعلیم بے شمار ہیں اور کسی ایک مضمون میں کافی لیاقت نہیں ہوتی؟ یہ سوال بھی اہم تھا کہ حکومت مسلمان لڑکیوں کی تعلیم میں کہاں تک کوشش کر سکتی ہے؟ ان سوالوں کے جواب میں سرسید نے طویل گفتگو کی، یہاں اس کے ذکر سے یہ بتانا کہ مدرسۃ العلوم کو یونیورسٹی بننے کی راہ میں سرسید نے تعلیم کے موضوع پر کس آخری حد تک تیاری کی تھی۔ اسی تیاری میں محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن کا نام لیا جا سکتا ہے۔ سرسید نے 1883ء میں یہ تنظیم قائم کی کہ طالب علم

انگلینڈ جا کر کس طرح سول سروس کی ڈگری حاصل کر سکتے ہیں۔

مدرسۃ العلوم یا محمڈن کالج کی حالت جب اطمینان کے قابل ہوگئی تو سرسید کو خیال آیا کہ صرف ایک کالج سے قومی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا، پورے ملک کے طلبہ کی ضرورتوں کو دیکھنے کے لیے ایک بنیادی ادارہ ہونا چاہیے، چنانچہ 1886ء میں سرسید نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ یہاں اس کی کارکردگی کی گنجائش نہیں لیکن اس تنظیم کا یہ مقصد ضرور پورا ہوا کہ مسلمانوں میں عام طور سے تعلیم کا خیال زیادہ ہو گیا۔

اس دوران سرسید کو کے-سی-ایس-آئی اور ڈاکٹر آف لا جیسے اعزاز ملتے رہے۔ محمڈن کالج کی ترقی کے ساتھ انتظامی مسائل بھی بڑھتے گئے، بعض ناخوشگوار حالات بھی پیدا ہوئے، ان میں سب سے شدید صدمہ 1895ء میں پہنچا جس کی تکلیف ان کو اخیر دم تک رہی۔ ان کے دفتر کے ایک ملازم نے بڑا غبن کیا، یہ شخص ہیڈ کلرک تھا، اس نے ایک لاکھ سے زیادہ کی رقم خرد برد کر دی، اس کی وجہ سے کالج کا تعمیراتی کام تو بند ہی ہو گیا، آئندہ چندہ بھی متاثر ہو گیا، وہ شخص تو پکڑا گیا، جیل بھی گیا لیکن سرسید کا جو حال ہوا وہ مولانا حالی کے الفاظ میں یہ تھا کہ گویا اس رنج میں ان کا کام ہی تمام ہو گیا۔

سرسید تمام خدمات اپنی قدرت کے موافق برابر انجام دیتے رہے، کالج کی بہبودی کا خیال ان کے دل سے فراموش نہیں ہوتا تھا، وہ کمزور ہو گئے، بیٹے کی علالت سے وہ خود ٹوٹ سے گئے مگر اسی حالت میں انہوں نے تعلیم کے موضوع پر کئی مضامین لکھے۔ ان کا بھی وقتِ آخر قریب آ گیا تھا، 27 مارچ 1898ء کو انہوں نے اس دنیا کو الوداع کہہ دیا۔

1898ء کو اگر 1875ء کے پس منظر میں دیکھا جائے تو قابل یقین حقیقتیں سامنے آتی ہیں۔ اس 1875ء میں جب علی گڑھ میں ابتدائی اسکول کھولا گیا اس وقت کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم ہو چکی تھیں، اس وقت پورے ہندوستان میں مسلمانوں میں صرف سترہ بی اے اور تین ایم اے تھے، جب کہ برادران وطن میں گریجویشن کرنے والے قریب ایک ہزار تھے۔ ایسے میں اسکول کے کالج ہونے کے بہت کم وقت میں صرف سرسید کے کالج سے قریب تین سو گریجویٹ کامیاب ہو کر نکلے، یہی نہیں محمڈن کالج کا اثر ملک کے دیگر صوبوں میں صاف نظر آنے لگا۔ ساتھ ہی سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ محمڈن کالج کے اسکالرشپ، ہاسٹل، اسپورٹس، ڈسپلین، قومی لباس، کالج کے احاطہ میں سوسائٹیاں اور مکتب وغیرہ جیسے شعبوں نے محمڈن کالج کو صرف ایک عام کالج کی جگہ ایک بڑے تعلیمی ادارے میں جس طرح بدلا وہ اصل میں کالج کے یونیورسٹی ہونے کا کامیاب سفر تھا۔

سرسید کی اکثر علمی توقعات ان کی وفات کے وقت تک پوری ہو چکی تھیں مدرسۃ العلوم کو کالج کا نام ملا۔ 1877ء میں قائم شدہ اس کالج کے لیے ملک اور بیرون ملک کے بہترین، قابل اور ہونہار اساتذہ ملے۔ سید محمود مسٹر سڈون اور مسٹر بیک تو تھے ہی، سر ٹامس آرنلڈ، سر والٹر رائے تھے اور سب سے بڑھ کر علامہ شبلی تھے جن کو سرسید کے دوست مولوی سمیع اللہ کی مردم شناس نگاہ نے منتخب کیا تھا۔ ان کے علاوہ محمد اکبر کاندھلوی، سر تھیوڈو باریسن اور مسٹر آرسی بالڈ جیسے اساتذہ تھے جو آکسفورڈ اور کیمبرج جیسی یونیورسٹیوں کے معیار کے تھے۔ سرسید نے ملک و قوم کے لیے جو تعلیمی انقلاب پیدا کیا وہ اپنی اہمیت اور مستقبل میں اپنے نتائج کے لحاظ سے ایک ایسا کارنامہ ہے جس کو

ناقابل یقین ہی کہا جا سکتا ہے۔ ایک قلیل عرصہ میں یعنی محمڈن اسکول 1875ء اور محمڈن کالج 1878ء کے قیام کے چند برسوں میں قوم کے تعلیمی مزاج کو نفرت سے قبولیت کی منزل تک لانا یہ سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ سرسید کے دیگر کارنامے کم نہیں، اس کے لیے حیات جاوید جیسی کتاب مثال کے لیے کافی ہے جس میں سرسید کی تعلیمی خدمات کا ذکر قریب تین سو صفحات میں ہے تو ان کی سرکاری خدمات سیاسی اور ملکی اور مذہبی خدمات کا بیان بھی قریب ڈھائی سو صفحات میں ہے اور پوری کتاب ساڑھے آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب بجائے خود سرسید کی عظمت کی گواہ بن گئی ہے۔

مسلم یونیورسٹی یا ہندوستان میں جدید تعلیم کی کوئی تاریخ حیات جاوید کی مدد کے بغیر نہ مستند ہو سکتی ہے اور نہ قابل قبول، اس لیے بعد کے زمانہ میں شیخ اکرام جیسے نکتہ ور اور نکتہ چیں مورخ کو لکھنا پڑا کہ مسلمانوں کے مصائب اگر تمام تر اقتصادی ہوتے تب بھی ان کا حل آسان نہیں تھا لیکن سرسید کے زمانے میں جو نئے نئے مسائل پیش آرہے تھے وہ زندگی کے ہر شعبے کے متعلق تھے۔ اقتصادی اور مذہبی پستی کی اصلاح کے لیے ضروری تھا کہ مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کریں اور وہ اس سے بدکتے تھے، زبان اور نظم و نثر بھی جس سطح کی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ ایسی زبان اور ایسی نثر میں علمی مسائل پیش کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ قوم کی اصلاح کے لیے ضروری تھا کہ ایک نئی زبان تیار ہو، نیا لٹریچر پیدا ہو، نئی شاعری ہو، سرسید کی تحریک نے یہ سب کیا۔ اس لیے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ سرسید کی تعلیمی اصلاح کا زمانہ اردو ادب کا بھی شاندار عہد ہے۔ اردو ادب کے عناصر خمسہ میں سے چار یعنی حالیؔ، شبلی، نذیر احمد اور خود سرسید اسی لیے قرار دیے گئے۔ اس کے علاوہ سرسید کی یہی تعلیمی انقلابی کوشش تھی جس نے محسن الملک، وقار الملک، خواجہ غلام الثقلین، چراغ علی جیسے اہل قلم اور خطیب و مقرر پیدا کر دیے۔

یہاں خلاصہ کے طور پر مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ بھی ذہن میں رہنے کے لائق ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ اگر پہلی بار محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے نئے انداز کلام سے دنیا کو روشناس کرایا، اردو خطابت کی پہلی تربیت گاہ دراصل یہی کانفرنس ہے۔ اس کی آغوش میں وقت کے بلند پایہ ارباب ادب کی خطیبانہ صلاحیتیں بیدار ہوئیں، اس کانفرنس کے پلیٹ فارم نے انہیں عوام الناس سے متعارف کرایا اور یہیں حقیقت میں ان کی شخصیتوں کے دبے ہوئے نقوش ابھرے۔

سرسید کے بارے میں ایک عظیم دانشور اور ڈاکٹر سید عابد حسین کا یہ جملہ بھی سرسید اور علی گڑھ تحریک اور مسلم یونیورسٹی کو سمجھنے میں بہت کچھ مدد کر سکتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ''سرسید کو اس تدبر اور حکمت عملی کا بچا کھچا سرمایہ ملا تھا جس کی بدولت مسلمانوں نے سات آٹھ سو برس ہندوستان پر حکومت کی''۔

مسلم یونیورسٹی کے تخیل کو حقیقت میں بدلنے کا ایک مرحلہ سرسید کی وفات پر پورا ہوا لیکن انہوں نے اپنے رفقا کی شکل میں جو سرمایہ چھوڑا اس نے قریب بائیس سال بعد اس خواب کو جس طرح حقیقت میں ڈھالا، وہ آگے پیش کیا جاتا ہے۔

13.3 سرسید کا انتقال اور کالج کی حالت

سرسید کا انتقال 1898ء میں ہوا۔ اس سے قریب دس سال پہلے 1889ء میں ایم اے او کالج کی مینیجنگ کمیٹی کی جگہ ٹرسٹی بل کو منظوری ملی، جس کی رو سے سرسید سکریٹری اور ان کے بیٹے سید محمد جوائنٹ سکریٹری بنائے گئے۔

اس وقت کالج کی مالی حالت بہتر تھی اور بہتر ہوتی جارہی تھی لیکن جب سرسید کی وفات ہوئی تو بقول شیخ اکرام مصنف ”موج کوثر“کالج کی کشتی ہچکولے کھارہی تھی، پچاس ہزار کا قرض تھا، آمدنی اتنی بھی نہ تھی کہ روزمرہ کے اخراجات پورے ہوسکیں۔ غبن کے واقعہ کے بعد چندہ آنا بند ہو گیا تھا، اس کے بعد طلبہ بھی کم ہونے لگے۔ 1895ء میں کالج میں 565 طالب علم تھے، 1898 میں سرسید کی وفات کے چار روز بعد طلبہ کی تعداد صرف 343 رہ گئی۔ کالج کے لیے یہ بڑا نازک وقت تھا اور ڈر تھا کہ سرسید، مولوی سمیع اللہ اور سرسید کے رفقا کی ساری محنت ضائع نہ ہوجائے۔ ایسے موقع پر ٹرسٹیوں نے سمجھداری سے کام لیا۔ سید محمود جو اب سکریٹری تھے لیکن حالات ان سے سنبھل نہیں رہے تھے اس لیے نواب محسن الملک کو سرسید کا جانشین چنا گیا اور ان کو ٹرسٹی بورڈ کا سکریٹری مقرر کر دیا گیا۔ یہ فیصلہ کالج کے لیے جتنا صحیح ثابت ہوا اس سے زیادہ نواب محسن الملک کی کامیابی کالج کو یونیورسٹی بنانے کی تحریک سے ملی۔

مالی لحاظ سے 1898ء میں سالانہ آمدنی 76 ہزار تھی جو نو سال میں یعنی محسن الملک کے انتقال کے سال (1907ء) تک ڈیڑھ لاکھ ہو گئی، مسلم یونیورسٹی بنانے کی تحریک سے چھ لاکھ کا چندہ جمع ہو گیا۔ اس کے علاوہ کالج کے طلبہ کی شہرت بھی عروج پر پہنچ گئی۔

13.3.1 نواب محسن الملک

نواب محسن الملک نے کالج کو نئی زندگی اور نیا وقار دیا۔ ان کا اصل نام سید مہدی علی تھا۔ 1873ء میں اٹاوہ میں پیدا ہوئے یعنی سرسید سے بیس سال چھوٹے تھے، پہلے کلرک پھر تحصیلدار ہوئے، ڈپٹی کلکٹر ہوئے اور 1871ء میں ریاست حیدرآباد میں انسپکٹر آف ریونیو ہو گئے۔ اپنے قابل قدر کاموں کی وجہ سے منیر نواز جنگ، محسن الدولہ، محسن الملک کے خطابات سے سرفراز ہوئے۔ 1893ء میں وہ پنشن لے کر علی گڑھ میں سرسید کے ساتھ شریک کار ہوئے۔ انہوں نے سرسید کی جس طرح مدد کی اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ حالیؔ نے سرسید کے رفقاء کا حال نہیں لکھا کہ یہ ان کا کام ہے جو مدرسۃ العلوم کی تاریخ لکھے، لیکن محسن الملک کے متعلق لکھا کہ ”لیکن ایک شخص جو سرسید کے کاموں کا مددگار ہی نہ تھا بلکہ اس گاڑی کو ہانکنے میں گویا برابر کا جوڑ تھا، ان کا ذکر اگر نہیں کیا جائے تو ہمارے نزدیک سرسید کی کامیابی کا ایک بڑا سبب بیان کرنے سے رہ جائے گا“۔

علامہ شبلی نعمانی نے بھی محسن الملک کو سرسید کا برابر کا شریک سمجھا، ایک مضمون میں لکھا کہ:

”لوگوں کو ڈر تھا کہ سرسید مرحوم کے بعد ان کے منصوبوں کو کون انجام دے گا لیکن خدا نے انہی کے ہم نشینوں میں سے ایسا شخص (محسن الملک) پیدا کر دیا جو اور امور میں گو سرسید کا ہمسر نہ تھا لیکن کالج کی ترقی، وسعت اور مقبول عام بنانے میں سرسید سے کسی طرح کم نہ تھا، اس نے تھوڑی سی مدت میں سات آٹھ لاکھ روپیہ جمع کر دیا، کالج کی ہر شاخ اتنی ترقی کر گئی کہ اگر کوئی شخص جس نے سرسید کی زندگی میں کالج کو

دیکھا تھا آج جاکر دیکھ لے تو کالج کو پہچاننا مشکل ہوگا، کانفرنس جو روز بروز مردہ ہوتی جاتی تھی مرحوم نے اس کو دوبارہ زندہ کیا اور لاہور سے لے کر ڈھاکہ تک اس کے ڈانڈے ملا دیے"۔

نواب محسن الملک کی اس کامیابی کا ایک سبب شیخ اکرام نے یہ بتایا کہ وہ ہر ایک کا دل ہاتھ میں رکھتے تھے، طبعاً حلیم تھے اور لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے اور انہیں خوش رکھنے کا سلیقہ خوب آتا تھا، اس کے علاوہ ان کی تعریف میں یہ بات بھی کہی گئی کہ وہ اس نکتے کو بھی خوب سمجھتے تھے کہ ایک جزوی یا مشکوک مذہبی یا معاشرتی اصلاح کے لیے قوم کے مستقبل یا اپنے سارے تعلیمی پروگرام کو خطرہ میں ڈالنا قومی ہمدردی کا راستہ نہیں رہا، باہمی مفاہمت اور ایک دوسرے کا نقطہ نگاہ سمجھنا اجتماعی زندگی کی بنیاد ہے، چنانچہ محسن الملک نے عام مسلمانوں کے دلوں میں علی گڑھ کے متعلق اختلافات بہت کم کر دیے۔

1900ء میں بعض حالات اور حکومت کے دباؤ کی وجہ سے محسن الملک نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا مگر ان کے اس فیصلہ سے عام مسلمان خوش نہیں ہوئے، سرسید کے رفقا جن میں وقار الملک اور نواب حبیب الرحمن خاں شیروانی اور سر مزمل اللہ خان وغیرہ نے خط لکھ کر یہاں تک کہہ دیا کہ "سکریٹری شپ کالج سے اس وقت آپ کا علاحدہ ہونا، کالج کی موت اور قومی مصیبت ہے اور اس کا مواخذہ آپ سے خداوند ذوالجلال کے حضور میں ہوگا"، سر مزمل اللہ اس وقت ٹرسٹی بورڈ کے جوائنٹ سکریٹری تھے، انہوں نے محسن الملک کے استعفیٰ کی صورت میں اپنا استعفیٰ بھی دینے کی بات کہہ دی، اس تمام دباؤ کا نتیجہ یہ ہوا کہ نواب محسن الملک کالج کے سکریٹری بنے رہے۔ 1907ء میں ان کا انتقال ہو گیا، مولانا حالیؔ نے ایک شعر میں ان کا مکمل تعارف کرا دیا کہ:

وہ ملک کا محسن وہ مسلمانوں کا غم خوار　　　سر کر کے مہم قوم کے کام آ گیا آخر

13.3.2 نواب وقار الملک

نواب محسن الملک کے بعد ایم اے او کالج کے مسلم یونیورسٹی بننے کے سفر میں جو دوسرا سب سے اہم نام ملتا ہے وہ نواب وقار الملک کا ہے۔ وہ کالج کے سفر میں سرسید کے ساتھ رہے، لیکن بعض معاملات میں جب ٹرسٹی بورڈ کے قیام کے سلسلے میں انہوں نے سرسید سے اختلاف بھی کیا، نواب محسن الملک سے بھی بعض معاملات میں وہ متفق نہیں تھے، شیخ اکرام نے اس کا ایک سبب ان بزرگوں کی طبیعتوں کے اختلاف اور مزاج کیفیتوں کا فرق بتایا ہے لیکن یہ بھی لکھا کہ سرسید اور وقار الملک دونوں جزوی اختلاف کے باوجود ایک ہی ڈھب کے انسان تھے یعنی دونوں دل کے صاف، زبان کے کھرے اور ارادے کے پکے تھے، یہی حال محسن الملک اور وقار الملک کے مابین خیالات میں اختلافات کا تھا لیکن کمال یہ ہے کہ اس سے ان کے قومی کاموں میں کوئی کمزوری نہیں آئی۔

نواب وقار الملک ساڑھے چار سال کالج کے سکریٹری رہے۔ ان کے زمانہ میں خاص بات یہ ہوئی کہ انہوں نے پرنسپل کے بڑھتے ہوئے اختیارات کو محدود کر دیا، اس سے پرنسپل اور یوریپین اسٹاف کے خلاف جو عام شکایتیں تھیں ان کا خاتمہ ہو گیا۔

1912ء میں نواب وقار الملک نے درازی عمر اور ضعف کی وجہ سے اپنا عہدہ چھوڑ دیا تو ان ہی کے کہنے پر نواب اسحاق خاں رئیس جہانگیر آباد سکریٹری منتخب ہوئے۔ انہوں نے 1918ء میں وفات پائی۔

13.4 علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لیے جدوجہد

ظاہر ہے اس تمام عرصہ میں کالج کو ان تمام مسائل سے دوچار ہونا پڑا جو حکومت انتظامیہ اور عوام کی اپنی اپنی مصلحتوں پر منحصر ہوتے ہیں۔

مسلم یونیورسٹی بننے کے لیے شاید 1920ء تک کا انتظار نہ کرنا پڑتا، کیونکہ نواب محسن الملک نے پہلے ہی سات آٹھ لاکھ روپے جمع کر لیے تھے، ان کے بعد ایک اور نام نمایاں ہوا وہ آغاخان کا تھا جو ہز ہائنیس کہلاتے تھے، انہوں نے اس کام کے لیے بڑی محنت کی، بیس لاکھ روپے حکومت کی مانگ تھی کہ جب یہ روپے جمع ہو جائیں تو یونیورسٹی بننے کی اجازت دی جائے گی۔ آغاخان نے بیس لاکھ روپے جمع کر لیے لیکن حکومت نے کچھ ایسی شرطیں رکھ دیں کہ نواب وقارالملک، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ شبلی نے ان کی مخالفت کی، جس کی وجہ سے یونیورسٹی کا معاملہ عرصہ تک کھٹائی میں پڑا رہا۔

دوسری طرف ہندوؤں نے اپنی یونیورسٹی کی تحریک مسلمانوں سے بہت بعد میں شروع کی، انہوں نے حکومت کی شرطیں قبول کر کے بنارس میں ہندو یونیورسٹی بنالی۔ بقول شیخ اکرام بہت سا قیمتی وقت ضائع کرنے کے بعد کارکنان علی گڑھ کالج نے شرائط قبول کر کے یونیورسٹی بننے کی راہ ہموار کر لی اور 1920ء میں محمڈن کالج مسلم یونیورسٹی میں بدل گیا۔

مسلم یونیورسٹی بننے کی یہ روداد چند سطروں میں آ گئی لیکن یہ چند سطریں کتنے عرصے اور کتنی محنت کے بعد تیار ہوئیں اس کا اندازہ اس روداد سے کیا جاسکتا ہے جس کو "مسلم یونیورسٹی" کے نام سے منشی محمد امین زبیری نے تیار کیا۔ مصنف امین زبیری اس وقت ریاست بھوپال میں بڑا مقام رکھتے تھے، ظل السلطان نام کے رسالہ کے ایڈیٹر تھے، اس رسالہ میں کوئی سنہ اشاعت یا طباعت نہیں دیا گیا ہے لیکن پہلے ہی صفحہ پر التماس کے عنوان سے جو عبارت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ یونیورسٹی بننے سے پہلے کی داستان ہے۔ "التماس" کی پوری عبارت یہ ہے: "اس رسالہ میں سید محمود مرحوم، ہز ہائنیس آغاخان، راجہ صاحب محمود آباد، صاحبزادہ آفتاب احمد خان، حاذق الملک، البشیر، پیسہ اخبار، کانفرنس کے پریسیڈنٹوں اور دیگر اکابر کی رایوں، یونیورسٹی کے جلسوں کے ریزولیشنوں اور دیگر ضروری کاغذات وغیرہ کا اقتباس سلسلہ وار تاریخی طور پر درج کیا گیا ہے، جس کا مطالعہ یونیورسٹی کے مسائل پر بحث کرنے کے لیے ضروری ہے اور آخر میں مولف نے خود بھی مسائل عجلت و تاخیر وغیرہ پر بحث کی ہے"۔

یہ رسالہ مسلم یونیورسٹی بننے کے سلسلہ میں ایک اہم ماخذ ہے، اس کی ابتدا ہی ان الفاظ سے کی گئی ہے کہ:

"مسلم یونیورسٹی کی تاسیس کا مسئلہ اس قدر پیچیدہ ہو گیا ہے کہ اس کے سلجھانے کے لیے بڑے تحمل و غور اور صبر و استقلال کی ضرورت ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی لازمی ہے کہ ہم مسلمانان ہند کے تعلیمی رہبروں کی راہوں اور خیالات پر جنہوں نے گذشتہ پندرہ برسوں سے اس کے متعلق رہنمائی کی ہے۔ یکسوئی کے ساتھ غور کریں اور ان تمام ابواب کا گہری نظر سے مطالعہ کریں جو گذشتہ 18/سال میں قائم ہو چکے ہیں"۔

مولف نے مسلم یونیورسٹی کے تخیل کی بنیاد سید محمود کے دل ودماغ میں دیکھی، اس سے پہلے کے باب میں ہم نے بھی حیات جاوید کے حوالے سے یہی لکھاہے کہ محمڈن کالج یا ایم اے او کالج کے ذکر میں پہلی بار سید محمود نے یونیورسٹی کا لفظ استعمال کیا، مدرسۃ العلوم کے سلسلہ انتظام وتعلیم میں انہوں نے اس تخیل کو ظاہر کیا تھااور یہ کہا تھا کہ:

''سب سے پہلے مجھ کو یہ بیان کرنا چاہیے کہ بجز اس کے کہ گورنمنٹ محض نگرانِ حال رہے اور کسی قسم کی مداخلت گورنمنٹ کی اس دارالعلوم میں نہیں ہونی چاہیے''۔ یہ بھی کہا کہ ''اگر ہمارے دارالعلوم سے عمدہ تعلیم پانا مقصود ہے تو انگریزی حکومت خود بخود ہمارے دارالعلوم کی مربی ہوگی اور اگر کچھ روپیہ کی مدد ہم کو ہماری گورنمنٹ دے گی تو ہم کو گورنمنٹ کی نگرانی کرنے پر کچھ عذر نہ ہوگا بشرطیکہ ہمارے انتظام میں کچھ مداخلت نہ ہو''، یہ بھی کہا کہ ''دارالعلوم کا بلاشبہ علی گڑھ میں مقرر ہونا چاہیے، مگر مدرسے دارالعلوم کے مختلف شہروں اور مقاموں میں جہاں کہیں بھی ممکن ہو مقرر ہونے چاہئیں یعنی دوسرے شہروں کے کالجوں کا الحاق اس یونیورسٹی سے ہونا چاہیے''۔

منشی امین زبیری نے 1911ء سے 1916ء تک وہ تمام رپورٹیں جمع کرلیں جو اس وقت کے قومی اخباروں میں یونیورسٹی کے تعلق سے شائع ہوئی تھیں۔ انہوں نے ان رودادوں کو سرمایۂ بصیرت وبصارت سے تعبیر کیا کہ ان تمام رودادوں نے رائے عامہ کو ایک مرکز پر جمع کردیا اور جن کو پڑھنے کے بعد یہی نتیجہ نکلا کہ اس سلسلہ میں اب تک جو کچھ کیا گیا وہ سب سید محمود کے تخیل ہی کی ترجمانی تھی۔

اصل اختلاف دو باتوں میں تھا، ایک تو کالجوں اور مدرسوں کا الحاق، دوسرے گورنمنٹ کے اختیارات، ان دونوں کے بارے میں زبیری لکھتے ہیں کہ ان مسائل کے متعلق ہم صاف طور پر شرعی، اخلاقی اور قانونی وعدہ کیا گیا کہ ہماری تمام تعلیم گاہیں یونیورسٹی سے ملحق ہوں گی اور یہ بھی باور کرایا گیا کہ ہماری یونیورسٹی آزاد یونیورسٹی ہوگی۔

الحاق کا مسئلہ نیا نہیں تھا، 1899ء میں یعنی سرسید کے انتقال کے ایک سال بعد ایم اے او کالج کے مشہور پرنسپل مسٹر بیک نے ایک خط محمڈن مسلم یونیورسٹی کے متعلق لکھا، اس میں صاف طور پر کہا گیا تھا کہ اس میں شک نہیں کہ اس اسلامی یونیورسٹی کا مسلمانوں کے دیگر تعلیمی اداروں سے جو تمام ہند میں ہیں ایک گہرا تعلق ہوگا۔

یہی بات ڈاکٹر ضیاء الدین نے بھی کہی، انہوں نے کہا ہندوستان کے تمام لڑکوں کو علی گڑھ میں ایک جگہ جمع کرنا ناممکن ہے، آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیاں چاہتی ہیں کہ تعلیم کو ہر گھر کے دروازے تک پہنچادیں تو ہم خود کو سمیٹ لیں، یہ کہاں کی دانش مندی ہے۔

مسٹر ماریسن کے ایک خطبہ کا ذکر پہلے حصہ میں آچکا ہے، ان کی رائے بھی یہی تھی مگر وہ اس کو ریزیڈنشیل یونیورسٹی دیکھنا چاہتے تھے۔ مسٹر ماریسن نے 1901ء کے مدراس کے ایک اجلاس میں اس مجوزہ یونیورسٹی کو سنٹرل محمڈن یونیورسٹی کا نام دیا، بات آگے بڑھی تو تخیل عملی صورت میں ظاہر ہونے لگا، 1904ء میں بمبئی میں ایک کانفرنس میں سر آغاخان نے اعلان کردیا کہ:

''ہم سنٹرل یونیورسٹی چاہتے ہیں اور اس کے زیر اختیار بہت سے کالجوں کو دیکھنے کی خواہش ہے، 1911ء آتے آتے انہوں نے دہلی سے کہا کہ یونیورسٹی کے علاوہ ہم کو اول درجہ کے پراونشل کالج تو قائم کرنے چاہئیں جو مسلم یونیورسٹی کے ساتھ ملحق کیے جائیں''۔

آنریبل محمد شفیع، صاحبزادہ آفتاب احمد خان، عزیز مرزا جیسے اس وقت کے نمایاں ترین مسلمان معززین نے بھی ان ہی باتوں کا بلند آہنگی سے اظہار کیا۔

سرسید علی امام نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ اس قومی یونیورسٹی کے قائم ہونے سے جو مفید نتائج پیدا ہو سکتے ہیں اس کا اندازہ لگائیے کہ اس کا ایک ہی مرکز ہو گا، تعلیم کا ایک ہی طرز اور ضابطہ ہو گا، ہمارے جس قدر کالج وغیرہ موجود ہیں ان میں اور ایک بڑی قوت میں جس کے رہبر میرے مخدوم جناب مولانا شبلی ہیں یعنی ندوہ میں اگر کوئی رشتہ قائم ہو سکتا ہے تو وہ یونیورسٹی ہی کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔

یونیورسٹی کا یہی الحاق کا مسئلہ تھا جس پر مسلمان رہنماؤں اور حکومت میں اتفاق نہیں ہو پا رہا تھا مگر اس کے ساتھ ہی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ 1912ء تک مسلم یونیورسٹی کے قیام کی نیت اب پختہ ہو چکی تھی، رہا دوسرا مسئلہ یعنی اختیارات اور آزادی کا، اس میں وہ صراحت تو نہیں دکھائی دے رہی تھی جو مسئلہ الحاق میں دیکھی گئی مگر ذمہ دار حضرات یہ ضرورت ظاہر کر رہے تھے کہ یونیورسٹی اسی طرح آزاد ہو گی جس طرح آکسفورڈ اور کیمبرج آزاد ہیں۔

یہی بات اس وقت کے جتنے بھی عمائد اور قائد تھے ان کی زبان سے ادا ہو رہی تھی۔ اس زمانہ میں یعنی 1905ء میں مشیر الدولہ ممتاز الملک خلیفہ محمد حسین نے امین زبیری سے کہا کہ جن مقاصد کو لے کر سرسید مرحوم نے علی گڑھ کالج بنا کر محمڈن یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی تھی اور جب تک ہم اپنی تعلیم کے سامان کو اپنی مجموعی قوتوں سے مکمل و مستحکم کر کے اس کو کالج سے یونیورسٹی نہ بنالیں اور اپنے طرز پر کامل اختیار نہ حاصل کر لیں، یہ جدوجہد جاری رہے گی۔

معلوم ہوا کہ مسلم یونیورسٹی بننے سے پہلے پورے ہندوستان میں اس کے اختیارات و آزادی کو لے کر ہلچل مچی ہوئی تھی اور یہ ہلچل سرسید کے انتقال کے بعد ہی سے شروع ہو گئی تھی۔ 1899ء میں عماد الملک نے نواب محسن الملک کو لکھ کر کہا تھا کہ ہم کو ہمت نہیں ہارنی ہے بلکہ دوگنا قوت کے ساتھ اپنے لیے ایک معقول دارالعلوم قائم کرنے کی کوشش جاری رکھنا چاہیے اور یہ دارالعلوم یا یونیورسٹی ان تمام قید وحدود سے آزاد ہو جو سرکاری مداخلت کو دعوت دیتی ہیں۔

1911ء میں عماد الملک نے پھر یونیورسٹی کے لیے آکسفورڈ اور کیمبرج کو نمونہ بنا کر پیش کیا اور اپنی بات کی تائید میں ایک برطانوی وزیر کی بات نقل کی جنھوں نے کہا تھا کہ "آکسفورڈ اور کیمبرج کی بنیاد فیاض اور مذہبی لوگوں نے ڈالی تھی، ان کا گورنمنٹ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ان کی روایات میں کسی کا دخل نہیں ہے، ہندوستان میں بھی اس بات کی ضرورت ہے، آپ کو ایسی یونیورسٹی کی ضرورت ہے جو اپنا انتظام خود کرے اور جس کی بنیاد مذہب پر ہو"۔

اختیارات اور آزادی کا معاملہ شاید مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں سب سے زیادہ بحث کا موضوع بنا۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خان نے بھی خلیفہ محمد حسین اور عماد الملک کی طرح 1909ء میں ایک تقریر میں کہا کہ:

"خوب سمجھ لیجیے جو نظام تعلیم ملکی مصالح کا تابع ہو وہ مرض کا علاج نہیں ہو سکتا اور اسی لیے سرسید آخر وقت تک سمجھاتے رہے کہ

جب تک قوم کی تعلیم خود قوم کے ہاتھ میں نہ آئے گی اس وقت تک وہ اصلی بہبودی کا ذریعہ نہیں ہو سکتی"۔

1911ء میں صاحب زادہ آفتاب احمد خان نے رسالہ کانفرنس میں لکھا کہ: "اور یہ عرض کیا جاچکا ہے کہ تجویز کردہ یونیورسٹی اصولاً آکسفورڈ اور کیمبرج کے نمونے پر ہو گی، ان دونوں کی خصوصیت میں ہے کہ وہ گورنمنٹ سے بے تعلق اور آزاد ہیں، یہ صرف نصاب بنا کر امتحان لینے والی اور محض تعلیم دینے والی جماعتیں نہیں ہیں بلکہ تربیت کا خاص اہتمام کرتی ہیں"۔

اسی مضمون میں مسٹر ماریسن کا یہ قول بھی نقل کیا گیا کہ:

"ہماری تمنا اس یونیورسٹی کو قائم کرنے سے صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم پوری طرح مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہو"۔

ان اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے بننے میں قوم کے جذبات کیا تھے، امین زبیری نے لکھا کہ ہمارے قومی اخبارات اور پرجوش مقررین نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں وہ ساری قوتیں استعمال کر دیں جن سے یونیورسٹی قیام اور اس کی آزادی کی وکالت مضبوط سے مضبوط اور موثر سے موثر ثابت ہو سکے، علماء و مشائخ نے وعظ اور حلقہ مریدین میں تلقین میں بھی اس موضوع کو شامل کر لیا۔ ملک کے مختلف علاقوں کے والیوں اور نوابوں اور رئیسوں نے صرف بڑی بڑی رقمیں ہی نہیں دیں بلکہ اپنی اپنی ریاستوں میں چندہ کی فراہمی کی تحریک بھی کی۔ عورتوں نے الگ اس تحریک میں پرزور حصہ لیا، خواتین میں سب سے آگے ہز ہائنیس فرمانروائے بھوپال نے ہر کمی کو پورا کر دیا، ان تمام کوششوں کا حاصل یہ نکلا کہ پوری قوم یونیورسٹی کی امید میں سرشار ہو گئی اور سب سے بڑھ کر اختیار و آزادی کے مسئلہ نے ایک قومی روایت کی صورت اختیار کر لی، یہی نہیں اب انگریز حکام میں سے کئی لوگوں نے اس تحریک کی تائید میں قدم آگے بڑھائے، ایسے حکام کو امین زبیری نے نیک دل اور ذمہ دار عہدہ داروں کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے، ان میں مسٹر پورٹر لفٹیننٹ گورنر، مسٹر بٹلر، ہز آنر سلریف اور ڈواٹر جیسے بڑے نام شامل ہیں، مسٹر ڈواٹر جو اندور کے گورنر جنرل تھے انہوں نے بھوپال میں ایک اسٹیٹ ڈنر میں تو یہ تک کہہ دیا کہ:

"یہ ایک ایسی اسکیم ہے کہ جس وقت یہ اچھے پیمانہ پر قائم ہو جائے گی تو ہم کو یقین ہے کہ ہندوستان میں یہ ایسی تعلیم گاہ ہو گی جو غرناطہ اور قرطبہ کی شان کو دوبارہ زندہ کر دے گی"۔

1911ء میں ممبر تعلیمات جو شاید اس وقت وزیر تعلیم کا عہدہ تھا، انہوں نے راجہ صاحب محمود آباد کو خط لکھا کہ اگر روپیہ جمع کر دیا جائے تو یونیورسٹی والوں کی تمام خواہشیں یا مانگیں پوری کر دی جائیں گی، اس خط سے یہ معلوم ہوا کہ نواب وقار الملک، آفتاب احمد خان اور ڈاکٹر ضیاء الدین نے قوم کی خواہشات ممبر تعلیم کے سامنے پوری طرح رکھ دی تھیں، یعنی حکومت مسلمانوں کی خواہشوں سے پوری طرح آگاہ تھی، امین زبیری نے اس خیال کی تائید میں نواب وقار الملک کی اس تحریر کو بھی پیش کیا جو اگست 1911ء کے علی گڑھ گزٹ میں شائع ہوئی اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے جولائی 1912ء میں تو صاف لکھا گیا کہ آنریبل ممبر تعلیمات نے 1911ء میں شملہ میں جس وفد سے ملاقات کی، اس کے سامنے مسئلہ الحاق سے کسی قسم کا اختلاف ظاہر نہیں کیا۔

امین زبیری کے الفاظ میں یہ دور امیدوں اور تمناؤں کا دور تھا، قوم کے بہترین دل و دماغ اور تعلیمی تجربہ کار، آئین و ضوابط کے بنانے میں مصروف ہو گئے، چنانچہ ایک مسودہ تیار ہوا جس میں قومی و ملکی ضرورتوں اور حکومت کی مصلحتوں کو دیکھتے ہوئے پہلے تو کالج کے

ٹرسٹیوں اور کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے ممبروں کو دیکھنے اور ان کی رائے جاننے کے لیے بھیجا گیا اور پھر آنریبل ممبر تعلیم کے پاس بھیجا گیا، امین زبیری کے الفاظ میں اس مسودہ میں حاکم و محکوم کے تعلقات کا پورا لحاظ رکھا گیا اور اس بات پر غور کر لیا گیا تھا کہ:

"مسلم یونیورسٹی کے طلبہ ایسی ہی قابلیت اور اعتماد کے قابل ہوں گے جیسے کہ دوسری سرکاری یونیورسٹیوں کے طلبہ ہوتے ہیں اور اس کے لیے کام کرنے والوں پر اعتبار، قواعد و ضوابط اور مالی حالت کی جانچ پرکھ لازمی ہے، اسی کے ساتھ ہم کو یہ حق بھی ہے کہ ہم خواہش کریں کہ گورنمنٹ کو ہر قسم کا ضروری اطمینان دلانے کے بعد ہم کو بھی ایک ایسی واجبی آزادی حاصل ہونی چاہیے جو مجوزہ یونیورسٹی کو عام نگاہوں میں با قوت ثابت کرنے اور اس کے چلانے والوں کے بھی اعزاز کے منافی نہ ہو"۔

اس مسودہ میں یہ بات بھی رکھی گئی کہ چونکہ اس یونیورسٹی کا تعلق کسی خاص صوبہ سے نہیں ہے بلکہ پورے ہندوستان سے ہے، اس لیے وائسرائے چانسلر ہوں گے، سینٹ میں ان کی طرف سے پانچ ممبر ہوں گے، وائس چانسلر کورٹ کے ممبر طے کریں گے، منظوری چانسلر کی ہوگی، وائس چانسلر کا مسلمان ہونا لازمی ہے اور وہی کورٹ آف ٹرسٹیز کا سکریٹری اور کونسل و سینیٹ کا صدر رہو گا۔

ظاہر ہے یہ سارے قواعد بڑی دور اندیشی سے طے کیے گئے، وائسرائے کے چانسلر ہونے کا مطلب تھا کہ اس سے یونیورسٹی کا اعتماد بڑھے گا، مسلمانوں کو ایک الگ فخر و عزت کا موقع ملے گا اور یہ بھی کہ وائسرائے کو منظوری اور تجویز کو واپس کرنے کا حق دینے کا مطلب حکومت ہند کے شاہی اختیارات کا حصہ دار بنانا سمجھا گیا۔

یہاں تک تو امیدوں کی باتیں تھیں لیکن 1912ء میں حکومت کے محکمہ تعلیم کی جانب سے ایک اعلان نکلا کہ:

"یہ قطعی طور پر فیصلہ ہو گیا کہ علی گڑھ اور بنارس کی یونیورسٹی کا دائرۂ اثر اسی مقام تک محدود ہو جس میں کہ وہ یونیورسٹی قائم ہو"۔

اس اعلان کے بعد ہی ایک باضابطہ خط راجہ صاحب محمود آباد کے نام ممبر تعلیمات کا آیا، جس میں الحاق کو نامنظور کیے جانے کے اسباب بتائے گئے اور یہ بھی کہ وائسرائے چانسلر نہیں ہوں گے، چانسلر یونیورسٹی خود منتخب کرے، اس قسم کے اور بھی کچھ مشورے دیے گئے اور یہ بھی کہا گیا کہ اگر 30 لاکھ روپے کی مقررہ رقم فراہم ہو جائے، دستور قابل اطمینان ہو تو یونیورسٹی کے سرمایہ میں ایک سالانہ عطیہ ملے گا، یہ بھی مشورہ بلکہ فیصلہ آیا کہ مسلم یا محمڈن یونیورسٹی نام کے بجائے یونیورسٹی علی گڑھ کا نام ہو گا اور یہ قطعی فیصلہ ہے۔

اس اعلان کے شائع ہوتے ہی تمام قوم میں ایک مایوسی کا ماحول چھا گیا، رہنماؤں نے اسی مایوسی میں اپنی رایوں کا اظہار شروع کر دیا، راجہ صاحب محمود آباد نے اس مراسلہ کے جواب میں لکھا کہ ہماری کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کی رائے ہے کہ: "وزیر ہند کے فیصلوں کو قبول کرنے کا اختیار نہیں رکھتی جو ان اصولوں کے برخلاف ہیں جن کی بنیاد پر یونیورسٹی کے لیے قانون بنانے کی خواہش کی گئی تھی"۔

کمیٹی نے الحاق کی نامنظوری پر سخت مایوسی کا اظہار کیا اور لکھا کہ: "وہ یہ ترمیم نہیں کر سکتی کہ مسلم یونیورسٹی کا دائرۂ اثر اسی مقام تک محدود ہو جہاں وہ قائم ہوتی ہے اور اس تعلیم گاہ سے باہر کے انسٹی ٹیوشنوں کے ملحق کرنے کا اس کو اختیار نہ ہو"۔

اسی طرح چانسلر شپ کے مسئلہ اور گورنر جنرل یا اجلاس کونسل کو اختیارات سونپنے سے بھی اختلاف کیا، یونیورسٹی کے نام کے

متعلق جو فیصلہ ہوا کانسٹی ٹیوشن کمیٹی نے اس کو سخت صدمہ کا باعث اور عزیز ترین آرزؤں کے بالکل خلاف بتایا۔

یہ تو اس خط کی باتیں ہیں، راجہ صاحب محمود آباد نے کمیٹی کے جلسہ میں یہ بھی کہہ دیا کہ اگر ہماری درخواست کی سماعت نہیں ہوئی تو فی الحال یونیورسٹی کا مطالبہ ملتوی کر دیں گے مگر کوشش ضرور جاری رکھیں گے۔

آغا خان نے تار کے ذریعہ پیغام بھیجا اور کہا کہ قوم کو چاہیے کہ وہ گورنمنٹ سے عرض معروض کرے اور اس بات کی درخواست کرے کہ وہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرے اور اگر گورنمنٹ یہ بات نہ مانے تو قوم کو اپنے حقوق کا ثابت قدمی کے ساتھ مطالبہ کرنا چاہیے۔

اسی طرح عبد القیوم پشاور اور نواب سر فراز حسین پٹنہ نے کہا کہ مقامی یونیورسٹی ہر گز منظور نہ کی جائے اور یہ کہ اگر الحاق نہ ملے تو یونیورسٹی فضول ہے۔ مسٹر سر فراز حسین نے کہا کہ الحاق نہایت ضروری ہے، اس کے لیے جد وجہد کرنا پڑے گی اور خان بہادر سید جعفر حسین نے کہا کہ ثابت قدمی سے کام کیے جانا ہے، یونیورسٹی خود گھر آئے گی، چارٹر کی پرواہ نہ کرنا چاہیے، چارٹر کے لفظ ہی کو بھلا دینا چاہیے، اس لفظ کو صرف اس وقت زبان پر لانا ہے جب یونیورسٹی ہمارے مطالبات کے مطابق ملے۔

ان رؤسا کے ساتھ نواب وقار الملک، جسٹس کرامت حسین، جسٹس شاہ دین اور علامہ شبلی کی رائیں بھی الحاق کے حق میں پڑھی گئیں، نواب رامپور بھی کثرت رائے سے متفق تھے۔

ایک دلچسپ بات یہ بھی سامنے آئی کہ بعض ممبران نے یہ کہہ دیا کہ اگر مقامی یونیورسٹی کو مان لیا گیا تو چندہ دینے والے مسلمانوں کی طرف سے کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے ممبروں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی اور ان سے چندہ واپس کرنے کا مطالبہ کیا جائے گا۔

آخر کار حکومت سے مزید گفتگو کرنے کے لیے ایک ریزولیشن، گورنر کے چانسلر نہ بننے اور اختیارات کونسل کے سپرد کرنے کے فیصلہ پر دوسرا ریزولیشن پاس کیا گیا اور تیسرا ریزولیشن نام کی تبدیلی کے فیصلہ کے خلاف پیش ہوا، جس کی تحریک مولانا محمد علی نے اور تائید مولوی بشیر الدین، نواب نصیر حسین خیال، ڈاکٹر ناظر الدین حسن بیرسٹر نے کی، اس کمیٹی میں جتنے لوگ شامل تھے بقول امین زبیری وہ ہر طریقہ سے قوم میں واجب الاحترام تھے۔

بہر حال اس کے بعد ایک اور جلسہ دسمبر 1912ء میں لکھنؤ میں نواب صاحب رامپور اور راجہ صاحب محمود آباد کی صدارت میں ہوا اور اس میں عوامی طور پر وہی تجویزیں منظور کی گئیں جو کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے اجلاس میں منظور کی جا چکی تھیں، البتہ ایک وفد کی تشکیل ضرور ہوئی جو وائسرائے سے مل کر مسائل کو حل کر سکے۔

اسی دوران ہندو یونیورسٹی اسکیم کے متعلق ممبر تعلیم کی ایک چٹھی بھی سامنے آئی جو جولائی 1914ء کو مہاراجہ دربھنگہ کے نام لکھی گئی تھی، اس خط سے ہندو اور مسلم یونیورسٹی کے مسائل کو مشترک طور پر دیکھنے کا نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خان نے گورنمنٹ سے الحاق کرتے رہنے کی بات کرتے ہوئے کہا کہ سر دست الحاق نہیں ملتا تو کوئی حرج نہیں مگر اس سے ہمیشہ کے لیے دست بردار نہیں ہونا چاہیے، انہوں نے نام کی تبدیلی کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دی، اس لیے کہ قوم ایسی نا سمجھ

نہیں ہے کہ حقیقی مقاصد کو محض نام کے لیے ختم ہو جانے دے، البتہ گورنمنٹ کے اختیارات انہوں نے یہ کہہ کر نامنظور کر دیے کہ اگر یونیورسٹی کی اصل باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ رہی تو ایسے چارٹر سے کیا فائدہ؟

شیخ عبداللہ نے کہا کہ ثابت قدم رہیں گے تو یونیورسٹی ضرور ملے گی، سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ جس نقطہ خیال پر قوم متفق ہو چکی ہے اسی پر قائم رہا جائے۔ قومی استقلال میں ہر گز ڈگمگایا نہ جائے۔

نواب وقار الملک نے بھی لکھا کہ وہ گورنمنٹ کے فیصلہ سے سخت مایوس ہیں مگر مسلمانوں کو بدستور اپنی خواہش پر قائم رہنا چاہیے، ہماری آئندہ نسلیں جو عدم الحاق کے نقصانات سے متاثر ہوں گی وہ ہمارے اوپر لعنت بھیجیں گی، گورنمنٹ مالک ہے، مختار ہے وہ کوئی حق ہم کو دے یا نہ دے لیکن ایسی حکومتی تجویزوں پر ہمارا رضامند ہونا ہر گز مناسب نہیں ہے۔

اس کے علاوہ غلام الثقلین اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے بھی اسی قسم کے خیالات ظاہر کیے، مولانا فرنگی محلی نے یہ بھی کہا کہ ہمیں ملک گیری کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم صرف اپنی تعلیم اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔

اب ایک صدی کے بعد یہ سب پڑھتے ہوئے کچھ عجیب سا لگتا ہے، مگر اس سے یہ تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی اور اس کا مقام سرسید کی محنت کا پورے ملک پر کیا اثر تھا۔

ایک صاحب میجر سید حسن بلگرامی کی ایک تقریر کو منشی امین زبیری نے نہایت معرکۃ الآراء لکھا، یہ تقریر لکھنؤ کانفرنس 1912ء میں انہوں نے بحیثیت صدر کی تھی، ہمارے سامنے پوری تقریر نہیں صرف اس کے کچھ حصے ہیں، جیسے انہوں نے یہ کہا کہ:

"بالفرض ہم یہ مان لیں کہ حکومت پرانی لکیر کو چھوڑ کر نئی لکیر پر چلنا شروع کر دے اور آئندہ اس کو زیادہ کامیابی ہو تو سوال یہ ہے کہ اس قسم کی درس گاہ میں خواہ وہ کیسی ہی عمدہ کیوں نہ ہو مسلمانوں سے یہ توقع کیوں کی جاتی ہے کہ وہ اس میں خاص طور سے دلچسپی لیں اور پھر ایسی گہری دلچسپی کہ جو کچھ تعلیمی سرمایہ ان کو اس وقت حاصل ہے اس پر قربان کرنے کو آمادہ ہو جائیں اور تعلیمی حیثیت سے ہمیشہ کے لیے اپنے آپ کو دیوالیہ بنالیں"۔

انہوں نے علی گڑھ کے کامیابی کے اصول اپنی ضروریات کی واقفیت کے ساتھ مسلسل عمل اور خود مختاری کے ساتھ مستقل ہونے کا عمل، سرکاری عہدہ داروں کی برابر مداخلت سے حفاظت، مشفقانہ نظم و نسق، طلبہ کے ساتھ سلوک وغیرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"جو ہم چاہتے تھے وہ یہ تھا کہ اسی قسم کا نظم و نسق ہم ایک ایسی یونیورسٹی میں جاری کر سکیں جس کو ہم اپنا کہہ سکتے ہوں، سکریٹری آف اسٹیٹ کے فیصلے نے اس کو ایک امر محال کر دیا ہے"۔

اسی درمیان ہندو یونیورسٹی بنانے والوں نے گورنمنٹ کی تجویزوں کو اصولاً مان لیا تو کچھ لوگوں نے اسی طرح مسلم یونیورسٹی سے بھی توقع کی، اس کے متعلق انہوں نے کہا کہ ان کی قوم میں نہایت ذہین اور معاملہ فہم لوگ ہیں جو اپنی ضروریات کو خوب سمجھتے ہیں، ہم کو دیکھنا ہے کہ ان کو کیا ملتا ہے اور وہ کیا قبول کرتے ہیں، اس کے علاوہ سب سے بڑی بات تو یہ یاد رکھنے کی ہے کہ ہندوؤں کے پاس کوئی علی گڑھ

کالج نہیں ہے جو ان کو گنوانا پڑے۔

الحاق اور اختیارات اور آزادی کی یہ بحث مسلم یونیورسٹی بننے کی تاریخ میں اس لحاظ سے سب سے اہم ہے کہ اس میں اس وقت کے ہندوستانی مسلمانوں کی اجتماعی فکر مندی بتاتی ہے کہ نئے ہندوستان میں عصری تعلیم کے حاصل کرنے کا مقصد دراصل کیا تھا، یہ صرف مسلم یونیورسٹی بننے کی ہلچل نہیں تھی، اس کے پیچھے ایک شکست خوردہ قوم کے ٹوٹے ہوئے حوصلوں کو نئے سرے سے جوڑنا بھی تھا اور اصلاً اس کو سرسید کے خواب کی توسیع بھی کہہ سکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس وقت کے باثر اخباروں جیسے پیسہ اخبار اور البشیر وغیرہ نے ان مسائل کو اپنا پہلا موضوع بنالیا جو ایم اے او کالج کے مسلم یونیورسٹی بننے کی راہ میں روڑے بن رہے تھے۔

البشیر اخبار نے 1912ء کے ایک شمارہ میں الحاق کی شرط کو نامنظور کیے جانے پر مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ اس بحث میں مسلم یونیورسٹی اور ہندو یونیورسٹی کو ایک ساتھ اس لیے نہیں دیکھنا چاہیے کہ ہندو کی ضروریات اور ان کی تعلیمی حالت بالکل جداگانہ قسم کی ہے، وہ چارٹر حاصل کریں یا نہ کریں، ہم کو اس معاملہ میں ان کی تقلید کرنا مناسب نہیں، البشیر نے گورنمنٹ کی شرطوں کے بارے میں لکھا کہ سرسید کو کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہ آیا ہو گا کہ وہ ایسی یونیورسٹی بنائیں گے جو ان کی اس آزادی کو بھی چھین لے گی جو ان کو اور ان کے قائم مقاموں کو حاصل ہے، اسی اخبار نے برادران وطن کی تعریف کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ ان کے بہ کثرت کالج اور اپنے ہائی اسکول ہیں، گورنمنٹ کی یونیورسٹیوں میں ان کا کافی اثر ہے، سررشتہ تعلیم میں ان کو پورا قابو حاصل ہے، ان میں تعلیم کی کافی ترقی ہو چکی ہے، ان میں قومی کام کرنے والے اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ، ایثار نفس کر کے نہایت قلیل تنخواہ پر اپنی زندگیاں قومی تعلیم کے لیے وقف کر رہے ہیں، ان کو منظوری یا نامنظوری دونوں صورتوں میں خطرہ نہیں، اس لیے سخت شرطوں کے باوجود ان کو فائدہ اٹھانے سے کوئی روک نہیں سکتا لیکن مسلمانوں کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔

یہ صرف ایک دو نمونے ہیں ورنہ اندازہ بتائیے کہ سارے ملک کے مسلمانوں پر یونیورسٹی کے سلسلے میں ہر قسم کے خیالات جاننے کی ہوڑ لگی ہوئی تھی۔

1914ء تک آتے آتے ہندو یونیورسٹی کے لیے حکومت نے اپنی شرائط کی مہر لگادی، جن کو اگرچہ برادران وطن اور ان کے اخبارات نے جیسے لیڈر، امرت بازار پتریکا، ہندو انڈین گزٹ، ٹریبون نے سخت تنقید کا نشانہ بنایا لیکن حکومت کی شرائط پر مبنی مسودہ کونسل میں پیش ہو گیا اور اس نے قانون کی صورت اختیار کرلی۔

حالات کی اس کروٹ نے اب مسلمانوں کے ایک طبقہ کے دل میں یہ جوش پیدا کر دیا کہ ان ہی شرائط پر اگر مسلم یونیورسٹی ملے تو لے لینا چاہیے، اس طبقہ کی نمائندگی صاحبزادہ آفتاب احمد خان کر رہے تھے۔

1914ء میں علامہ شبلی کا انتقال ہوا، وہ اگرچہ اس وقت علی گڑھ اور ندوہ دونوں سے رخصت ہو کر سیرت النبیؐ کی تالیف میں یکسو ہو گئے تھے مگر ان کا یہ شعر مسلم یونیورسٹی کے لیے قوم کی خواہش کا آئینہ بن گیا، امین زبیری نے اپنے رسالہ میں جو ہمارا سب سے بڑا ماخذ ہے

اس کے ٹائٹل پر اوپر وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا اور نیچے یہی شعر لکھا کہ:

ہمیں یک حرف از یونیورسٹی مدعا باشد ☆ کہ ایں سر رشتہ تعلیم مادر دست ما باشد

لیکن 1915ء کے اواخر میں یہ دباؤ بڑھتا ہی گیا کہ ہندو یونیورسٹی کی طرح مسلم یونیورسٹی کے لیے حکومت کی شرطیں تسلیم کر لی جائیں، 1916ء میں راجہ صاحب محمود آباد نے محمد علی جناح، مظہر الحق اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری جیسے لیڈروں کو بھی اس کے لیے تیار کر لیا۔

1919ء میں جب مسٹر بٹلر نے علی گڑھ کا دورہ کیا تو اس طبقہ کے میاں محمد شفیع کو حکومت میں تعلیمی ممبر بنایا گیا، اس حیثیت سے انہوں نے مسلم یونیورسٹی بل کو منظور کرانے میں بڑی سرگرمی دکھائی۔

13.5 علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

14/ ستمبر 1920ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ پاس کر دیا گیا اور یکم دسمبر 1920ء میں یہ لاگو بھی کر دیا گیا، مسلم یونیورسٹی کا یہ سفر ایک طرف سے پورا ہوا یعنی سرسید کا ایم اے او اب مسلم یونیورسٹی کی صورت میں بدل گیا، راجہ صاحب محمود آباد پہلے وائس چانسلر اور فرمانروائے بھوپال سلطان جہاں بیگم اس کی پہلی چانسلر بنیں اور آغا خان پہلے پرو چانسلر ہوئے۔

17/ دسمبر کو اسٹریچی ہال میں باقاعدہ افتتاح کی تقریب ہوئی، مگر مولانا محمد علی اور ان کے ہم نوا اس سے الگ ہی رہے، مسلمانوں میں بھی زیادہ جوش دکھائی نہ دیا، مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے رسالہ معارف میں لکھا کہ:

"علی گڑھ میں اس "مسلم یونیورسٹی" کا افتتاح ہو گیا جو سرسید مرحوم کے رویائے یوسفی کی تعبیر خیال کی جاتی...... اگر یہ شام کو نہ ہوئی ہوتی تو وائس چانسلر کا نغمہ مسرت صرف اسٹریچی ہال میں گونج کر نہ رہ جاتا بلکہ اس کی آوازِ بازگشت سارے ہندوستان میں سنائی دیتی اور ہم بھی بغداد و قرطبہ کی کھوئی ہوئی دولت کو اس کو نشانِ بازیافت سمجھ کر خوش ہوتے"۔

بہر حال مسلم یونیورسٹی کا نیا سفر شروع ہوا۔ 1923ء میں راجہ محمود آباد کے استعفیٰ کے بعد نواب مزمل اللہ خان وائس چانسلر ہوئے، یہ اعزازی قسم کے لوگ تھے، 1924ء میں کورٹ نے طے کیا کہ ایسے کو وائس چانسلر بنایا جائے جو سارا وقت یونیورسٹی کو دے سکے، چنانچہ صاحبزادہ آفتاب احمد خان کا تقرر بحیثیت وائس چانسلر ہوا۔

اس کے بعد مسلم یونیورسٹی کی ایک تاریخ ہے جس میں سر راس مسعود، سر ضیاء الدین احمد، سر شاہ محمد سلیمان، زاہد حسین، نواب اسماعیل خان اور پھر ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے نام ترتیب سے آتے ہیں۔

وائس چانسلروں کے ساتھ طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، یونیورسٹی ایکٹ کے تحت شروع میں پندرہ شعبے قائم ہوئے تھے، انگریزی ادب، تاریخ، پولیٹکل سائنس، معاشیات، نفسیات، طبیعیات، کیمیاء، ریاضی، جغرافیہ، سنی دینیات، شیعہ دینیات، اسلامک اسٹڈیز، عربی زبان، فارسی، اردو اور قانون، بعد میں ضرورت کے لحاظ سے ایجوکیشن، نباتات، حیوانیات، زراعت، میڈیسن، ٹیکنالوجی اور کامرس، ہندی اور سنسکرت شعبے کھولے گئے، اقامتی سہولتیں بڑھتی گئیں، تعلیم نسواں کا بھی خاص اہتمام ہوتا رہا، یونیورسٹی کھیلوں کی دنیا میں اپنے

بلند معیار کے لیے مشہور ہوئی، ہاسٹلوں اور یونیورسٹی کے مخصوص یونیفارم نے تمام طلبہ میں ایک مساوات اور ایک برادری کا ماحول بنادیا۔

سرسید اوران کے ادارہ کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ جاگیردارانہ اور سامراجی ماحول ہونے کے باوجود انہوں نے ایک ایسا ادارہ دیا جہاں طبقاتی ونسلی اور دوسری عصبیتوں کی زہر کم ہی نہیں ہوئی بلکہ ختم ہو کر رہ گئی۔ جہاں علاقائیت کے اثرات بھی کم دکھائی دیے اور یہ بھی کہ بظاہر مسلم یونیورسٹی اپنے نام سے کسی ایک غریب یا طبقہ کی نمائندہ تھی مگر اس کے دروازے ہر مذہب کے لیے کھلے رہے، کبھی مذہب کی بنیاد پر طالب علموں کو تقسیم کرنے کی ایک بھی مثال نہیں ملتی، آزادی ملک کے بعد بھی علی گڑھ کی اس خوبی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

ایک نہایت پرکشش، خوبصورت اور دلآویز اور باوقار ماحول بنانے میں سب سے زیادہ حصہ یونیورسٹی کے اساتذہ کا رہا، نامی گرامی اور اپنے فن میں کامل اساتذہ کا اجتماع بھی یونیورسٹی کا امتیازی وصف ہے، یہاں اس کے نامور وائس چانسلروں اور اساتذہ اور پروفیسروں اور دانشوروں کی فہرست کی گنجائش ہی نہیں، بس ایک صاحب قلم کا یہ قول نقل کیا جاسکتا ہے کہ سرسید اور ان کے رفقائے کار سے لے کر آج تک علم کی کوئی ایسی شاخ نہیں ہے جس میں علی گڑھ کے علماء اور ادیبوں نے اضافہ نہ کیا ہو۔

سر آغاخان جنھوں نے مسلم یونیورسٹی بنانے میں بڑا کردار ادا کیا۔ اپنے آخری وقت میں لکھا کہ:

"جب میں گزشتہ دور پر نگاہ ڈالتا ہوں کہ پچھلے چالیس سال میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جن باتوں کی نمائندگی کرتی رہی ہے اور جو کچھ اس نے حاصل کیا ہے وہ میری زندگی کا ایسا رخ ہے جس پر میں ابدی سکون سے سوچ سکتا ہوں......بڑھاپے میں میرے لیے اس سے زیادہ خوش کن، اطمینان و قوت بخش خیال اور کیا ہو سکتا ہے"۔

آغاخان کے یہ تاثرات ظاہر ہے اس نسل کے ترجمان میں جس نے مسلم یونیورسٹی کا پودا لگایا، یہاں ایک اور تاثر نقل کیا جاسکتا ہے، یہ پروفیسر محمد شمیم جیراج پوری کے تاثرات ہیں، وہ70ء کی دہائی کے طالب علم ہیں، انہوں نے علی گڑھ کی خوبصورت روایات میں سینئروں کے ذریعہ جونیئروں کے انٹروڈکشن کو علی گڑھ کی ایک اہم اور عظیم روایت قرار دیا، اس تعارفی ذریعہ سے جو مضبوط ترین برادرانہ پیار زندگی بھر کا ساتھ ہو جاتا ہے وہ بقول پروفیسر جیراج پوری کہیں اور نہیں ملا۔

پروفیسر شمیم جیراج پوری مولانا آزاد یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر بنے، ایسے میں ان کے یہ الفاظ مسلم یونیورسٹی کے لیے بڑے جامع بن جاتے ہیں کہ مسلم یونیورسٹی ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک مضبوط تحریک ہے، یونیورسٹی کی توسیع میں یہ تو ہو سکتا ہے کہ اس کی قدرتی دلکشی جذبہ اور روایات تھوڑی بہت متاثر ہوئی ہوں لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلم یونیورسٹی آج بھی کسی موازنہ اور مقابلہ سے بالاتر ہے۔

13.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- مدرسۃ العلوم یا محمڈن کالج کی حالت جب اطمینان کے قابل ہوگئی تو سرسید کو خیال آیا کہ صرف ایک کالج سے قومی تعلیم کا مسئلہ

حل نہیں ہو سکتا، پورے ملک کے طلبہ کی ضرورتوں کو دیکھنے کے لیے ایک بنیادی ادارہ ہونا چاہیے، چنانچہ 1886ء میں سرسید نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ یہاں اس کی کارکردگی کی گنجائش نہیں لیکن اس تنظیم کا یہ مقصد ضرور پورا ہوا کہ مسلمانوں میں عام طور سے تعلیم کا خیال زیادہ ہو گیا۔

- سرسید کا انتقال 1898ء میں ہوا۔ اس سے قریب دس سال پہلے 1889ء میں ایم اے او کالج کی مینیجنگ کمیٹی کی جگہ ٹرسٹی بل کو منظوری ملی، جس کی رو سے سرسید سکریٹری اور ان کے بیٹے سید محمد جوائنٹ سکریٹری بنائے گئے۔

14/ ستمبر 1920ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ پاس کر دیا گیا اور یکم دسمبر 1920ء میں یہ لاگو بھی کر دیا گیا، مسلم یونیورسٹی کا یہ سفر ایک طرف سے پورا ہوا یعنی سرسید کا ایم اے او اب مسلم یونیورسٹی کی صورت میں بدل گیا، راجہ صاحب محمود آباد پہلے وائس چانسلر اور فرمانروائے بھوپال سلطان جہاں بیگم اس کی پہلی چانسلر بنیں اور آغا خان پہلے پرو چانسلر ہوئے۔

13.7 نمونہ امتحانی سوالات

13.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. سرسید کا انتقال کب ہوا؟

(a). 1898ء (b). 1817ء (c). 1857ء (d). 1947ء

2. نواب محسن الملک کہاں پیدا ہوئے؟

(a). اٹاوہ (b). علی گڑھ (c). مرادآباد (d). دہلی

3. علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ایکٹ کب پاس ہوا؟

(a). 1920ء (b). 1947ء (c). 1818ء (d). سب غلط

4. علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی پہلی چانسلر کا نام بتائیں؟

(a). سلطان جہاں بیگم (b). رضیہ سلطانہ (c). شجرۃ الدر (d). سب صحیح

5. ان میں کون سی سرسید کی تصنیف نہیں ہے؟

(a). آثار الصنادید (b). خطبات احمدیہ (c). اسباب بغاوت ہند (d). سب صحیح

6. خطبات احمدیہ کے مصنف کون ہیں؟

(a). شبلی نعمانی (b). محسن الملک (c). سرسید احمد خاں (d). وقار الملک

7. ”دی لائف آف محمد“ کا جواب کس نے لکھا؟

(a). شبلی نعمانی (b). محسن الملک (c). سرسید احمد خاں (d). وقار الملک

8. ان میں سے کون علی گڑھ سے منسلک نہیں تھا؟

(a). محسن الملک (b). وقار الملک (c). صاحبزادہ آفتاب احمد (d). قاسم نانوتوی

9. نواب محسن الملک کا اصلی نام کیا تھا؟

(a). سید مہدی علی (b). الطاف حسین (c). محمد احمد (d). سب غلط

10. نواب وقار الملک کی وفات کب ہوئی؟

(a). 1918ء (b). 1818ء (c). 1920 (d). 1988

13.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. نواب محسن الملک کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔
2. نواب وقار الملک کی کوششوں کا اجمالی خاکہ بیان کیجیے۔
3. شروعاتی دور کے کالج انتظام تعلیم پر نوٹ لکھیے۔
4. الحاق کے مسئلہ پر بحث کیجیے۔
5. علی گڑھ تحریک سے جڑے اہم شخصیات کا ذکر کیجیے۔

13.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جدوجہد پر تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بننے کے بعد کے حالات کا جائزہ لیجیے۔
3. سرسید کے انتقال کے بعد کالج کے حالات پر روشنی ڈالیے۔

13.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

---

1. علی گڑھ تحریک، نسیم قریشی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ 1960ء۔
2. علی گڑھ فرسٹ جنریشن، ڈیوڈ لیلی ویلڈ، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی۔
3. علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ڈاکٹر محمد وجیہ الدین، ہارپر کولنس پبلشرز، انڈیا۔
4. علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار، محمد عبد القدیر 2005ء۔
5. کچھ یادیں کچھ باتیں، پروفیسر محمد شمیم جیراج پوری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 2002ء۔
6. علی گڑھ ماضی وحال، پروفیسر رشید احمد صدیقی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی 1971ء۔

اکائی 14. دارالعلوم دیوبند

اکائی کے اجزا:

14.0 تمہید

14.1 مقاصد

14.2 قیام دارالعلوم کا پس منظر

14.3 دیوبند

14.4 قیام دارالعلوم

14.5 انتظامی امور

14.5.1 دفاتر دارالعلوم

14.6 تعلیمی نظام

14.6.1 دارالعلوم کے تعلیمی شعبہ جات

14.7 دارالعلوم کا مقصد اور اس کی خصوصیات

14.8 اکتسابی نتائج

14.9 نمونہ امتحانی سوالات

14.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

14.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

14.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

14.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

14.0 تمہید

ہندستان میں مدارس عربیہ کی تاریخ بہت قدیم ہے، مسلمانوں کے ہندستان میں باضابطہ داخلہ کے بعد ہی سے مسلم حکام اور امراء نے علم کی نشر واشاعت کی کوششیں شروع کر دیں، ملتان میں ناصر الدین قباچہ نے 1226ء ہی میں ایک مدرسہ تعمیر کیا اور اس کا انتظام وانصرام مشہور عالم قاضی منہاج سراج کو سپرد کیا، محمد بختیار خلجی نے اسی زمانے میں جب بنگال فتح کیا تو وہاں ایک شہر رنگ پور آباد کیا اور وہاں متعدد مسجدیں، خانقاہیں اور مدرسے آباد کیے، سلطان محمد تغلق کے زمانے میں ہی صرف دہلی میں ایک ہزار سے زائد مدارس موجود تھے، ان کے مدرسین کے لئے شاہی خزانہ سے تنخواہیں مقرر تھیں، ان مدارس میں علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ معقولات اور ریاضی کی بھی تعلیم دی جاتی تھی، گجرات کے فرمانروا سلطان محمد عادل شاہ متوفی 1510ء نے اپنی حدود مملکت میں متعدد مدارس کھولے، ان میں حکومت کی جانب سے طلبہ کو بہترین شاہی کھانے کھلائے جاتے تھے، ہر طالب علم کو ماہانہ وظیفہ بھی ملتا تھا، سلاطین شرقیہ نے جونپور میں متعدد مدارس تعمیر کئے، ان میں درس وتدریس کے لئے دور دراز سے علماء کو بلایا، ان میں سے متعدد مدارس کے باقیات آج بھی موجود ہیں، مغلیہ عہد میں بھی مدارس کو خوب نشو ونما حاصل ہوا، شاہ جہاں کے عہد میں دہلی، لاہور، سیالکوٹ، احمد آباد اور جون پور علم وفن کے ایسے مراکز تھے جہاں ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک سے بھی طلبہ حصولِ علم کے لئے آیا کرتے تھے، اس دور میں مسجدوں سے متصل مدارس بھی ہوا کرتے تھے، شاہ جہاں کے عہد میں مسجد فتح پوری اور مسجد اکبر آبادی قائم ہوئی ان میں باقاعدہ مدرسے قائم تھے، مسجد فتح پوری آج بھی دلی میں موجود ہے، لکھنو کا فرنگی محل کا مدرسہ اورنگ زیب کے عہد کی یادگار ہے۔

مدارس صرف بڑے بڑے شہروں ہی میں نہیں بلکہ گاؤں اور دیہاتوں میں بھی موجود تھے، شاہی خزانے سے ان مدارس کی سرپرستی ہوا کرتی تھی اس کے علاوہ مختلف حکمرانوں نے متعدد جاگیریں اور گاؤں اس کے لئے وقف کر رکھے تھے، بادشاہوں کے علاوہ مسلم امراء اور مخیر حضرات بھی مدارس قائم کرتے اور ان کی سرپرستی کرتے تھے اور اس خدمت کو سعادتِ دارین سمجھتے تھے، مگر اسلامی حکومت کے زوال کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں علمی سرگرمی بھی کم ہو گئیں اور عوام تن آسانی میں مشغول ہو گئے، بالآخر 1857ء میں مغلیہ عہد کے خاتمہ کے بعد انگریزی حکومت نے مدارس کے نظام کو بھی ختم کر دیا اور اس کی جگہ نیا نظامِ تعلیم جاری کر دیا، جس سے علماء کو یہ خوف ہونے لگا یہ تعلیم کم اور لوگوں کو مسیحی بنانے کی مشینری زیادہ ہے، ایسے ہی مشکل حالات میں چند صالح نفوس نے یہ ارادہ کیا کہ علم دین کی ایک ایسی تحریک شروع کی جائے جو پورے ہندستان میں دینی علوم وفنون کے پھیلانے کا کام کرے۔

14.1 مقاصد

اس مضمون کا مقصد دار العلوم دیوبند کا تعارف ہے، یہ ادارہ محض ایک مدرسہ ہی نہیں بلکہ ایک تاریخ اور تحریک ہے، اس کے قیام کے پس منظر میں ایک پوری تاریخ پوشیدہ ہے، اس مضمون کو پڑھ کر آپ اس تاریخ سے بھی واقف ہوں گے اور خود دارالعلوم کے قیام کی تاریخ اور دار العلوم کے قیام کے مقاصد اور اس کی خصوصیات سے بھی واقف ہوں سکیں گے۔

14.2 قیام دار العلوم کا پس منظر

دار العلوم دیوبند کا قیام کسی وقتی جوش اور جذبہ کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے کچھ ایسے محرکات تھے جو ایک طویل عرصہ سے امتِ مسلمہ کے فکر مند طبقہ کو اس کے قیام کے لئے قدم اٹھانے کے لئے مجبور کر رہے تھے، درالعلوم دراصل ایک ایسی تحریک کا نام ہے جس کا مقصد علم دین کا فروغ اور امت کو ان لادینی تہذیب و ثقافت سے بچانا ہے جو ایمان و عقیدہ لئے خطرہ ہیں، لہذا دار العلوم کا قیام ایک ایسے دور میں ہوا جب ہندستان میں مسلم حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور انگریز اقتدار میں آ چکے تھے، مسلم حکومت کے خاتمہ کے بعد اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی علوم فنون کی سرپرستی کرنے والا کوئی نہیں تھا، مسلم دور حکومت میں جو مدارس اسلامی علوم وفنون کی تعلیم دے رہے تھے وہ سب یک بعد دیگرے بند کئے جا رہے تھے، ان کی عمارتیں گرائی جا رہی تھیں، امراء اور بادشاہوں نے مدارس کے لئے جو مختلف اوقاف قائم کر رکھے تھے ان سب کو ختم کیا جا رہا تھا، نئی نسل کو دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کے ذرائع مفقود ہوتے جا رہے تھے، علماء کرام چوں کہ انگریزی اقتدار کے خلاف تھے لہذا یا تو انہیں قتل کیا جا رہا تھا یا وہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے پر مجبور تھے، یا حالات سے تنگ آکر دیگر اسلامی ممالک کی طرف ہجرت کر رہے تھے، وہ علماء جو کسی طرح بچے ہوے تھے انہیں بھی انگریزی حکومت کی طرف سے ہمیشہ خطرہ لگا رہتا تھا، دوسری طرف انگریز ایک نئی تعلیمی پالیسی لے کر ہندستان آئے تھے، جس کا خالص مقصد ہندستان میں اپنی حکومت چلانے کے لئے مناسب کارندوں کو تیار کرنا اور انہیں عیسائی بنانا تھا، چنانچہ عیسائی مبلغین کھلے عام پورے ہندستان میں گھوم گھوم کر اسلام کو چیلنج کر رہے تھے اور اسلامی تعلیمات کے سلسلے میں عوام الناس کے درمیان شکوک وشبہات پیدا کر رہے تھے، عیسائیت کی تبلیغ کے لئے مختلف سوسائٹیز، چھاپے خانے اور تعلیم گاہیں قائم کی جا رہی تھیں، جو تعلیم کم اور عیسائیت کی تبلیغ کی مشینریاں زیادہ تھیں۔

سیاسی شکست کے ساتھ مسلمانان ہند ذہنی شکست سے بھی دوچار ہو رہے تھے، دینی شعور رخصت ہو رہا تھا، مختلف جاہلانہ رسوم ورواج جڑ پکڑ رہے تھے، مسلمانوں میں کفر والحاد کے پھیلنے کا خطرہ بڑھتا جا رہا تھا، اور یہ ڈر پیدا ہو رہا تھا کہ اگر عیسائیت کے اس سیلاب کے سامنے بندھ نہیں باندھا گیا تو یہ عوام کے ایمان واعتقاد کو بہالے جائے گا، لہذا ایسے ادارہ کے قیام کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو پورے ہندستان میں مسلمانوں کی علمی اور دینی رہنمائی کر سکے اور پورے ملک کے لئے ایک نمونہ بن سکے تاکہ مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت کی جائے اور ان کی دینی، سماجی اور سیاسی زندگی کو اسلامی رنگ میں ڈھالا جائے اور علوم دینیہ کو فروغ دیا جائے اور انگریزی فتنہ جو عوام الناس کے دلوں میں اسلام تعلیمات کے لئے شکوک وشبہات پیدا کر رہا ہے اس کا مقابلہ کیا جا سکے۔

یہی وہ پس منظر تھا جسے دیکھ کر حاجی عابد حسین دیوبندی، مولانا قاسم نانوتوی جیسے کچھ اور مخلصین نے یہ عزم کیا کہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے جس طرح اپنے عہد میں علم دین کے روشنی پھیلائی تھی اور ملک وقوم کی علمی وفکری تشکیل کی تھی اسی طرز پر ایک مدرسہ قائم کیا جائے، لہذا اللہ کے ان نیک بندوں نے اسی مقصد کے تحت دیوبند کی سرزمین پر دار العلوم قائم کیا۔

14.3 دیوبند

دار العلوم جس سرزمین پر قائم ہوا اس کا نام دیوبند ہے، گرچہ یہ وسعت یا صنعت وتجارت کے اعتبار سے کوئی قابل ذکر علاقہ نہیں ہے، مگر اپنی علمی اور دینی اہمیت کی وجہ سے آج پوری دنیا میں مشہور ہے، یہ ضلع سہارنپور کی ایک تحصیل ہے، یہاں قدیم زمانے سے ہندوؤں کا ایک معروف مندر "دیوی کنڈ" ہے جو بن یعنی جنگل میں واقع ہے، اسی مناسبت سے اس علاقہ کو "دیوی بن" کہا جاتا تھا جو کہ کثرت استعمال سے دیوبند ہو گیا، یہ ملک کی راجدھانی دلی سے 144 کلومیٹر کی دوری پر دوآبہ (گنگا جمنا) کے سرسبز علاقہ میں واقع ہے، اس کی تاریخ بہت ہی قدیم ہے، قدیم کتبوں اور تاریخ کی کتابوں میں اس کا ذکر ملتا ہے، مسلم دور حکومت کے متعدد آثار یہاں پائے جاتے ہیں، یہاں شہنشاہ اکبر کے عہد کا اینٹ سے بنا ہوا ایک قلعہ موجود تھا، دیگر مسلم عہد حکومت میں بھی یہاں متعدد مساجد کی تعمیر ہوئی، مثلاً مسجد قلعہ سلطان سکندر لودھی، مسجد خانقاہ شہنشاہ اکبر، مسجد ابو المعالی شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر، یہ سبھی مساجد اپنے عہد کے بادشاہوں کے دور میں تعمیر ہوئیں۔

جب ذمہ داران دار العلوم نے مدرسہ کے قیام کا ارادہ کیا تو اہل دیوبند نے پوری گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا، اور بہت ہی فیاضی کے ساتھ اپنا مال خرچ کیا، ابتدا میں تمام ہی طلبہ کے قیام وطعام کی جتنی بھی ضرورت تھی وہ محض اہل دیوبند کے چندے سے پوری ہو گئی۔

14.4 قیام دار العلوم

برطانوی حکومت کے قیام کے بعد اب دینی مدارس کے قیام وانتظام کی ذمہ داری عام مسلمانوں کے کندھوں پر آگئی تھی، لہذا چند صالح نفوس نے یہ ارادہ کیا کہ سرزمین دیوبند میں ایک ایسے ادارے کا قیام ہو جس میں بغیر کسی فیس اور معاوضہ کے نئی نسل کی دینی تربیت ہو سکے اور وہ ہندستان میں دینی علوم کی ایک ایسی تحریک ہو جو پورے ہندوستان میں پھیل جائے، ان میں سرفہرست حاجی محمد عابد، مولانا ذوالفقار علی، مولانا فضل الرحمان، مولانا مہتاب علی اور مولانا قاسم نانوتوی علیہم الرحمۃ تھے، ان حضرات کے پیش نظر ایسے مدرسہ کا قیام تھا جہاں طلبہ اسی طرح سے بنا کسی خرچ کے تعلیم حاصل کر سکیں جس طرح اسلامی دور حکومت میں کرتے تھے، جب ان حضرات نے اس جانب قدم بڑھایا تو انہیں سب سے پہلے پیسے کی ضرورت پڑی جس سے ان کا دامن خالی تھا، لہذا انہوں نے عوامی چندے کا راستہ اختیار کیا، اس زمانے میں یہ بالکل انوکھا طریقہ تھا، کیوں کہ اس پہلے مدارس ومساجد کی ذمہ داری بادشاہ اور امراء کے ذمہ تھی، اور ان کے لئے جاگیریں وقف تھیں، سوانح قاسمی میں لکھا ہے بروز جمعہ ماہ ذی قعدہ 1282ھ حاجی سید محمد عابد جو دیوبند کے رہنے والے تھے فجر بعد دیوبند کی مسجد چھتہ سے نکلے، اپنا رومال کو ہی جھولا بنایا اور اس میں تین روپے اپنی جیب سے ڈالے پھر مولوی مہتاب علی مرحوم کے پاس تشریف لائے انہوں نے چھ روپے عنایت کئے اور دعا کی، مولوی فضل الرحمان نے بارہ روپے دئے، مولوی ذوالفقار علی نے بارہ روپے پھر محلہ ابو البرکات پہونچے، اس طرح ایک ہی دن میں دو سو روپے جمع ہو گئے۔

خاطر خواہ چندہ اکٹھا ہونے کے بعد ایک بہت ہی محدود پیمانے پر 15 محرم الحرام 1283ھ بروز پنجشنبہ مطابق 31 مئی 1866ء کو چھتے کی قدیم مسجد کے کھلے صحن میں انار ایک چھوٹے سے درخت کے سائے میں بڑی ہی سادگی کے ساتھ مدرسہ کا افتتاح عمل میں آیا، مختصر

سے سرمائے اور محض ایک استاذ اور اور ایک طالب علم کے ساتھ درس و تدریس کا آغاز ہوا، ذمہ داروں کے پاس سوائے توکل علی اللہ، اخلاص اور خدمتِ دین کے جذبہ کے، کوئی دنیوی سرمایہ نہ تھا جس سے یہ امید کرتے کہ یہ مدرسہ ایک دن ہند کا جامعہ از ہر بن جائے گا، گرچہ سرمایہ مختصر تھا، لیکن ان کا خلوص اور عزم بہت بلند تھا، لہذا اسی اخلاص کے نتیجہ تھا کہ چند ہی سالوں میں یہ پورے ہندستان کا ایک مرکزی ادارہ بن گیا، اور اپنے رقبے اور طلبہ کی تعداد کے اعتبار سے بھی پورے ہندستان میں ام المدارس کا درجہ حاصل کر لیا۔

مدرسہ تو قائم ہو گیا، لیکن مدرسہ کے قیام کے بعد اس کو چلانے کے لئے بھی سرمایہ کی ضرورت پڑتی ہے، اور مدرسہ جتنا وسیع ہوتا جاتا ہے اتنی ہی زیادہ پیسوں کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے، لہذا قیام کے بعد مزید پیسوں کی ضرورت پڑی، چنانچہ اس بار چندے کے لئے باضابطہ اشتہار دیا گیا، اس میں درج ذیل عبارت لکھی ہوئی تھی۔

الحمد للہ مقام قصبہ دیوبند ضلع سہارنپور میں اکثر اہل علم نے جمع ہو کر کسی قدر چندہ جمع کیا اور ایک مدرسہ عربی پندرہ تاریخ محرم الحرام 1283ھ جاری ہوا اور مولوی محمد محمود صاحب بالفعل بمشاہرہ 15 روپۓ ماہوار مقرر ہوئے، چوں کہ لیاقت مولوی صاحب کی بہت کچھ ہے اور تنخواہ بسبب قلت چندہ کے کم، ارادہ مہتمان مدرسہ کا ہے کہ بشرط وصول زر چندہ قابل اطمینان جس کی امید رکھی ہے تنخواہ مولوی صاحب موصوف کی زیادہ کی جاوے اور ایک مدرس فارسی وریاضی کا مقرر ہو، جملہ اہل ہمت و خیر خواہان ہند خصوصا مسلمانان سکنائے دیوبند و قرب وجوار پر واضح ہو کہ جو لوگ اب تک شریک چندہ نہیں ہوئے بدل شریک ہو کر امداد کافی دیویں اور واضح ہو کہ چندہ مفصلہ فہرست ہذا کے کہ جس کی میزان کل 401 روپۓ 8 آنے ہے دوسرا چندہ واسطے خوراک و مدد خرچ طلبہ بیرونجات کے جمع ہوا ہے اور سولہ طالب علموں کا صرفہ جمع ہو گیا ہے اور ان شاء اللہ روز بروز جمع ہوتا جاتا ہے اس میں طلبہ بیرونجات کو کھانا پکا پکایا اور رہنے کو ملے گا، کتابوں کا بندوبست بھی متعاقب ہو گا۔ نام مہتمان کے درج ذیل ہیں، جس صاحبوں کو روپیہ بھیجنا منظور ہو تو بنام ان کے بذریعہ خط بیرنگ ارسال فرمادیں، رسید اس کی بصیغہ پیڈ بھیجی جائے گی، فقط۔ حاجی عابد حسین، مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی، مولوی مہتاب علی صاحب، مولوی ذوالفقار علی صاحب، مولوی فضل الرحمان صاحب، منشی فضل حق صاحب، شیخ نہال صاحب۔

العبد فضل حق، سرابراہ کار مدرسہ عربی فارسی وریاضی قصبہ دیوبند ضلع سہارنپور، تحریر بتاریخ 19 محرم الحرام 1283ھ روز دو شنبہ۔

اس طرح عوامی چندے کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور مدرسہ مسلسل دن بدن آگے بڑھتا رہا، جس شخصیت کو اس درسگاہ کے اولین استاذ ہونے کا شرف حاصل ہوا اس کا نام مولانا ملا محمود دیوبندی تھا، آپ کی بطور عربی استاذ پندرہ روپۓ ماہانہ تنخواہ پر تقرری ہوئی، آپ کافی ذی استعداد استاذ تھے اور لیاقت کے اعتبار سے یہ تنخواہ کم تھی، اس کا احساس ذمہ داران مدرسہ کو بھی تھا اور یہ ارادہ تھا کہ چندہ اگر زیادہ مقدار میں آئے تو آپ کی تنخواہ میں بھی اضافہ کیا جائے اور مزید کچھ اور استاذ کی بھی تقرری کی جائے جو بچوں کو فارسی اور ریاضی کی تعلیم دے سکے، جس شخصیت کو اس درسگاہ کا اولین طالب علم ہونے کا شرف حاصل ہوا اس کا نام محمود حسن تھا جو بعد میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی نام سے مشہور ہوئے، اس طرح دار العلوم کے پہلے استاد اور طالب علم دونوں ہی نام اور صفات دونوں ہی اعتبار سے محمود تھے،

حاجی عابد حسین صاحب چوں کہ محرک اول تھے لہذا وہی مدرسہ کے سب سے پہلے مہتمم قرار پائے، مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب اپنی علمی وقار اور عظمت کی بنا پر مدرسہ کے سرپرست مقرر ہوئے، مولانا یعقوب نانوتوی جو اجمیر، بنارس اور سہارنپور وغیرہ میں محکمہ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر رہ چکے تھے پہلے صدر مدرس قرار پائے۔

14.5 انتظامی امور

اس وقت دار العلوم دیوبند ایشیا کا سب سے بڑا اور اہم ادارہ ہے، اس کے نظم وانصرام کے لئے ضروری تھا کہ اس کا پورا ایک سسٹم بنایا جائے، لہذا اس کے لئے مختلف سطح پر متعدد کمیٹیاں، شعبہ جات اور عہدے بنائے گئے ہیں، جس کے تحت پورے دار العلوم کا نظم ونسق چلتا ہے، ان کا ذکر مندرجہ ذیل ہے۔

مجلس شوری: دار العلوم دیوبند کی سب اہم کمیٹی مجلس شوری ہے، اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ مدرسہ کے تمام کاموں کی نگرانی ورہنمائی کرے، اس کی پیش کردہ تمام ہی تجاویز پر عمل پیرا ہونا سب کے لئے لازم ہوتا ہے، چاہے وہ مالیات سے متعلق ہوں، یا کسی نئے قانون کو وضع کرنا ہو یا دار العلوم کے تمام ہی جائداد کی نگرانی کرنی ہو یا دار العلوم کے کسی ملازم کو برخواست کرنا ہو، غرض تمام ہی امور میں اس کا فیصلہ واجب التعمیل ہوتا ہے، چنانچہ آغاز قیام ہی سے دار العلوم نے اپنا نظم انصرام حکم خداوندی "وأمرهم شورى بينهم" کے تحت رکھا، اس میں پورے ملک سے وہ منتخب افراد ہوتے ہیں جو علم دین، اخلاص وللّٰہیت اور عقل ودانش کے اعتبار سے ممتاز ہوں، چنانچہ دار العلوم کی ابتدائی مجلس شوری سات اراکین پر مشتمل تھی، ان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

حاجی عابد حسین، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا مہتاب علی، مولانا ذوالفقار علی، مولانا فضل الرحمان، منشی فضل حق، شیخ نہال احمد رحمہم اللہ۔

موجودہ دور میں مجلس شوری کے ارکان کی تعداد اکیس 21 ہوتی ہے، اس میں کم از کم گیارہ (11) علماء کا ہونا ضروری ہے، باقی ارکان دوسرے شعبہ سے ہوسکتے ہیں، اس بات کی بھی کوشش ہوتی ہے کہ کم از کم دو افراد مقامی یعنی دیوبند کے ہوں، دار العلوم کا مہتمم اور صدر مدرس بحیثیت اپنے عہدہ کے اس کے ممبر ہوتے ہیں، اس مجلس کی سال میں دو میٹنگ ہوتی ہے، میٹنگ کے انعقاد کے لئے کم از کم ایک تہائی تعداد کا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے۔

مجلس عاملہ: یہ کمیٹی مجلس شوری کے کاموں کی تعمیل میں مدد کرتی ہے، شوری میں منظور کی گئی تجاویز کو عملی جامہ پہناتی ہے، نظم تعلیم اور دفاتر کے حسابات کی نگرانی اسی کے ذمہ ہوتی ہے، یہ نو (9) ممبران پر مشتمل ہوتی ہے، سات ممبران مجلس شوری کے ہوتے ہیں، دار العلوم کا مہتمم اور صدر مدرس بحیثیت اپنے عہدہ کے اس کے ممبر ہوتے ہیں۔

مہتمم: یہ دار العلوم کا سب سے بڑا عہدہ ہوتا، اس ذمہ داری پر وہی لوگ فائز کئے جاتے ہیں جو علم وفضل، تقوی وللّٰہیت، انتظامی صلاحیت کے ساتھ ساتھ ملک میں اپنا ایک ممتاز مقام رکھتے ہوں، مہتمم دار العلوم شعبہ تعلیمات اور دیگر روز مرہ کی تمام تدریسی اور غیر

تدریسی امور کے صحیح طریقہ سے انجام دہی کا ذمہ دار ہوتا ہے، مجلس شوری اور مجلس عاملہ کا ممبر ہوتا ہے، دار العلوم کی پوری تاریخ میں جتنے بھی مہتمم رہے ہیں وہ اپنی علمی، انتظامی اور دیگر اعلی صلاحیتوں کی وجہ سے پورے ملک شہرت رکھتے تھے، دار العلوم کے پہلے مہتمم حاجی عابد حسین صاحب تھے اور موجودہ مہتمم مولانا ابو القاسم نعمانی صاحب ہیں۔

نائب مہتمم: مہتمم کے کاموں میں تعاون کے لئے نائب مہتمم کا تقرر کیا جاتا ہے، یہ مہتمم کے تفویض کردہ اختیار کے مطابق کام کرتا ہے اور مہتمم کی عدم موجوگی وہی مدرسہ کا اور وہی مہتمم کے قائم مقام ہوتا ہے۔

صدر مدرس: یہ تمام ہی تعلیم امور کا نگراں ہوتا ہے، تمام ہی طلبہ کی دینی واخلاقی تربیت اس کے ذمہ ہوتی ہے، تمام ہی تعلیمی امور کے نظم وانصرام کے لئے مجلس تعلیمی کے نام سے ایک کمیٹی ہے جو صدر مدرس کو ان تمام امور سے متعلق مشورہ دیتی ہے، ان مجلس کے ارکان مہتمم، صدر مدرس، نائب مہتممین اور طبقہ علیا کے دو اساتذہ ہوتے ہیں، اب تک جتنے بھی صدر المدرسین رہے ہیں وہ اپنے علم وفضل اور انتظامی امور کی وجہ سے پورے ملک میں شہرت رکھتے تھے، دار العلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس مولانا یعقوب نانوتوی صاحب تھے اور موجودہ صدر مدرس مولانا ارشد مدنی صاحب ہیں۔

ناظم تعلیمات: ناظم تعلیمات صدر مدرس کے ساتھ تعلیمی امور کی نگرانی کرتا اور دفتر تعلیمات کا سربراہ ہوتا۔

14.5.1 دفاتر دار العلوم

دار العلوم بہت ہی وسیع ادارہ ہے، اس کے انتظام کو چلانے کے لئے مختلف دفاتر کی ضرورت تاکہ یہ وسیع ادارہ بہتر طریقہ سے اپنا کام کرسکے، لہذا مندرجہ ذیل دفاتر سے ہی دار العلوم کا پورا نظام چلتا ہے۔

دفتر اہتمام: یہ دار العلوم کا سب سے بڑا اور اہم انتظامی شعبہ ہے، اسی دفتر سے دار العلوم کی تمام سرگرمیوں کے لئے احکام صادر کئے جاتے ہیں، مجلس شوری اور مجلس عاملہ میں لئے گئے تمام ہی فیصلوں کی تعمیل یہیں سے ہوتی ہے، اس دفتر کا ذمہ دار مہتمم دار العلوم دیوبند ہوتا ہے۔

دفتر تعلیمات: یہ دفتر بھی کلیدی اہمیت کا حامل ہے، یہ شعبہ دار العلوم کی تمام ہی علمی سرگرمیوں کی نگرانی کرتا ہے، یہ تمام ہی کلاسز کا صحیح سے اجراء، امتحانات، طلبہ کے داخلے، ان کی حاضری، تمام ہی طلبہ کا ریکارڈ، سند کا اجراء وغیرہ کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

شعبہ محاسبی: قیام دار العلوم کے دوسرے سال ہی اس شعبہ کا قیام کردیا گیا تھا، تمام ہی مالیاتی امور یہیں سے دیکھے جاتے ہیں، ہر قسم کے آمد وصرف کی تفصیل رکھنا اس کی ذمہ داریوں میں شامل ہے، اساتذہ کی تنخواہیں اور طلبہ کے وظائف یہیں سے جاری کئے جاتے ہیں۔

محافظ خانہ: یہ شعبہ 1937ء میں قائم ہوا، اس میں دار العلوم کے تمام ہی تاریخی ریکارڈ محفوظ رکھے جاتے ہیں، دار العلوم کے انتظام وتعلیم سے متعلق افراد کے ریکارڈ، مجلس شوری وعاملہ کی تمام کاروائیوں کے ریکارڈ، دار العلوم کی تمام رسیدات اور سندات کی طباعت کا کام بھی یہیں سے ہوتا ہے نیز تمام شعبہ جات کو اسٹیشنریز وغیرہ یہیں سے فراہم کی جاتی ہیں اور دفتر اہتمام سے صادر ہونے والے جملہ احکامات

اور کاغذات کی نقول یہاں جمع ہوتی ہے۔

کتب خانہ: دار العلوم کا کتب خانہ ہندستان کے چند بڑے کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے، اس میں اہم کتابوں کے ساتھ ساتھ نادر مخطوطات بھی موجود ہیں، اس میں بہت سی کتابیں دار العلوم نے خرید کر جمع کی ہیں، جب کہ بہت ساری کتابیں مختلف افراد اور ممالک کے سربراہان نے بطور ہدیہ پیش کی ہیں، اب تک اس کتب خانہ میں تقریبا دولاکھ کتابیں موجود ہیں، جس میں بڑی تعداد اسلامی علوم وفنون سے متعلق ہیں، جب کہ دیگر فنون سے متعلق بھی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے، تمام ہی کتابوں کو جدید طریقہ سے مرتب کے کرکے رکھا گیا ہے، لہذا مدرسہ کے اساتذہ وطلبہ کے علاوہ دیگر شائقین علم وفن بھی تحقیق کے لئے مسلسل آتے رہتے ہیں، کتب خانہ کی قدیم عمارت 1906ء میں تعمیر ہوئی تھی، جس میں مسلسل توسیع بھی ہوتی رہی، اس وقت شیخ الہند کے نام سے ایک مستقل شاندار سات منزلہ گول عمارت تعمیر ہوچکی ہے، اس میں پانچ لاکھ سے زائد کتابوں کے رکھنے کی گنجائش ہے، مزید مطالعہ اور دیگر امور کے لئے علیحدہ ہال بھی موجود ہیں۔

شعبہ تنظیم وترقی: دار العلوم کا یہ شعبہ 1355 ہجری میں قائم ہوا، اس کا کام مالیات اور غلہ کی فراہمی ہے، طلبہ کو غلہ فراہم کرنے کی ذمہ داری اسی شعبہ کی ہے، عطیات وصول کرنے کے لئے متعدد سفراء مامور ہوتے ہیں جو ملک بھر میں چندہ جمع کرتے ہیں۔

دار الاقامہ: یہ دار العلوم کا نہایت ہی اہم شعبہ ہے، اس کے تحت طلبہ کے کمروں اور سیٹ کا الاٹمنٹ، ان کی نگرانی، طلبہ کے مسائل، طلبہ کا شناختی کارڈ کا اجراء وغیرہ اہم امور شامل ہیں، دار الاقامہ میں اس وقت دار جدید، رواق خالد، شیخ الہند منزل، شیخ الاسلام منزل، حکیم الامت منزل وغیرہ شامل ہیں، ان سب میں تقریبا چار ہزار طلبہ اور اساتذہ کا قیام رہتا ہے، ہاسٹل میں طلبہ کی نگرانی کے لئے اساتذہ کرام ہر وقت موجود رہتے ہیں۔

شعبہ مطبخ: اس شعبہ کا قیام 1910ء میں عمل میں آیا، اس شعبہ میں تقریبا پچاس افراد کام کرتے ہیں جو ہر وقت چار ہزار طلبہ کے لئے صبح وشام کا کھانا تیار کرکے تقسیم کرتے ہیں، مطبخ کی عمارت کا احاطہ دار العلوم کے جنوبی گوشہ میں چھتہ مسجد کے پاس واقع ہے، اس کے فرائض میں کھانے کے ضروری سامان کی فراہمی، کھانا پانے والے تمام ہی طلبہ کا ریکارڈ اور اس کا مکمل حساب رکھنا شامل ہے، دار العلوم کی طرف سے طلبہ کو مفت کھانا فراہم کیا جاتا ہے، مستطیع طلبہ کو اختیار ہوتا ہے وہ قیمتا کھانا حاصل کرسکیں، طلبہ کے لئے پرہیزی کھانے کی بھی سہولت موجود ہے۔

شعبہ تعمیرات: یہ شعبہ 1914ء میں قائم ہوا، یہ دار العلوم کے تمام ہی تعمیراتی کاموں کی نگرانی کرتا ہے، نئی عمارتوں کی تعمیر، پرانی عمارتوں کی اصلاح ومرمت، رنگ وروغن اس کے فرائض میں شامل ہیں، اس کے تحت کئی شاندار عمارتیں تعمیر ہوئیں، اس میں سنگ مرمر کی پرشکوہ مسجد جامع رشید، مدرسہ ثانویہ، دار المدرسین، شیخ الہند منزل، شیخ الاسلام منزل، شیخ الہند لائبریری وغیرہ جیسی اہم عمارات شامل ہیں۔

شعبہ اوقاف: اہل خیر حضرات ہر دور میں دار العلوم کے لئے جائداد وقف کرتے رہے ہیں، یہ اوقاف ہندستان کے مختلف علاقوں میں موجود ہیں، لہذا ان کی دیکھ بھال، عمارتوں کے کرایہ کی وصولی، نادینے والوں نیز قبضہ کرنے والوں کے خلاف قانونی کاروائی کرنے جیسے

اہم امور کے لئے یہ شعبہ 1917ء میں قائم ہوا۔

مکتبہ دار العلوم: دار العلوم کا یہ ایک اشاعتی ادارہ ہے، اس کے تحت دار العلوم کے اساتذہ و علماء کی کتابیں شائع کی جاتی ہیں، یہ اب تک ساٹھ سے زیادہ کتابیں شائع کر چکا ہے، جس میں فتاوی دار العلوم بھی شامل ہے، کچھ دیگر اکیڈمیوں سے شائع ہونے والی کتابیں بھی یہاں ملتی ہیں، طلبہ کو دی جانے والی انعامی کتابیں بھی اسی مکتبہ سے شائع ہوتی ہیں۔

شعبہ برقیات: یہ شعبہ 1952ء میں قائم ہوا، دار العلوم کی وسیع عمارتوں میں بجلی کے صحیح انتظام کے لئے یہ شعبہ قائم کیا گیا، درسگاہوں، دار الاقامہ، دفاتر، مساجد، راستوں میں بجلی اور پنکھوں کی دیکھ بھال، پانی کی سپلائی، واٹر ٹینکو کی دیکھ بھال، نیز دار العلوم کی گاڑیوں کی دیکھ بھال، ان کی مرمت اور مختلف جلسوں میں بجلی اور لاؤڈ اسپیکر کے انتظامات اس کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔

عظمت ہسپتال: دار العلوم نے طب یونانی کی تعلیم کے لئے دار الشفاء قائم کیا تھا، یہ بعد میں عظمت ہسپتال کے نام سے موسوم ہوا، اس میں طلبہ کو مفت اور غیر طلبہ کو نہایت کم قیمت پر علاج دستیاب ہوتا ہے، یہاں یونانی اور ایلوپیتھک دونوں قسم کے علاج کا نظم ہے، اس سے مستفید ہونے والوں کی تعداد نہایت وسیع ہے۔

مہمان خانہ: مہمان خانہ 1899ء میں قائم ہوا، 1951ء میں اس کی مستقل عمارت تعمیر ہوئی، اس میں میٹنگ ہال، طعام ہال، کمرے، وغیرہ شامل ہیں، مجلس شوری اور عاملہ کے اجلاس یہیں ہوتے ہیں، اس کے علاوہ سال بھر ملک اور بیرون ملک سے آنے والے مہمانوں کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔

شعبہ خریداری: دار العلوم میں جتنی بھی خریداری ہوتی ہے وہ اسی شعبہ کے تحت ہوتی ہے، یہ شعبہ 1998ء میں قائم ہوا۔

اسٹاک روم: خریداری کے بعد تمام سامان یہاں رکھے جاتے ہیں اور حسب ضرورت متعلقہ شعبوں کو فراہم کئے جاتے ہیں۔

دفتر صفائی وچمن بندی: دار العلوم کے اندر جملہ صفائی ستھرائی اور پارکوں و کیاریوں کی دیکھ بھال اسی شعبہ کے ذمہ ہے۔

14.6 تعلیمی نظام

اس وقت دار العلوم میں جو نصاب رائج ہے اسے درس نظامی کہا جاتا ہے، ان نظام کے بانی ملا نظام الدین سہالوی لکھنوی تھے، آج ملک کے زیادہ تر مدارس میں جو نظام رائج ہے وہ انہیں کی یادگار ہے، اس نظام میں فقہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، دار العلوم نے اپنے قیام کے بعد اسی نصاب کو اپنایا، لیکن چوں کہ یہ نصاب کافی پرانا ہو چکا تھا، وقت کے ساتھ اس میں تبدیلیوں کی ضرورت تھی، لہذا دار العلوم نے اسے بعینہ اپنانے کے بجائے ضروری ترمیم کے بعد اپنایا، چنانچہ موجودہ درس نظامی اپنے اصل درس نظامی سے کافی مختلف ہے، لیکن چوں کہ اسی نصاب کو اخذ کیا گیا تھا لہذا آج بھی اسے درس نظامی ہی کہا جاتا ہے، موجودہ درس نظامی میں تقریبا تیس موضوعات پر پچاس سے زائد کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، ان میں تفسیر و ترجمہ قرآن، حدیث واصول حدیث، فقہ واصول فقہ، نحو و صرف، علم بلاغت، منطق و فلسفہ، تاریخ و تصوف، عقائد وادب اور تجوید جیسے علوم پڑھائے جاتے ہیں، ابتدائی چند کتابوں کو چھوڑ کر زیادہ تر کتابیں عربی ہی میں ہیں، وقت اور حالات

کے ساتھ اس میں حذف واضافہ بھی ہوتا رہا، چوں کہ دار العلوم کے نصاب کا اصل مقصد قرآن وحدیث اور فقہ کی تعلیم ہے، لہذا تمام ہی تبدیلیاں اس کو پیش نظر رکھ کر کی جاتی ہیں، دوسرے علوم وفنون کی گنجائش اسی حد تک ہے جب تک قران وحدیث اور فقہ اور ان کو پڑھنے اور سمجھنے میں جن جن علوم کی ضرورت ہے وہ تبدیلیاں ان علوم کی تدریس میں مخل نہ ہوں اور بنیادی مقصد کو متاثر نہ کریں۔

14.6.1 دار العلوم کے تعلیمی شعبہ جات

دار العلوم نے اسی نصاب کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مختلف درجات اور شعبے قائم کئے ہیں، جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

شعبہ عربی وتکمیلات: شعبہ عربی میں آٹھ سالہ کورس ہوتے ہیں، پہلا سال عربی اول اور آخری سال دورہ حدیث کا کہلاتا ہے، اس میں قرآن وحدیث، عربی زبان وادب، فقہ، اصول فقہ منطق، بلاغت، جیسے علوم کی تدریس ہوتی ہے، دورہ حدیث کی تکمیل اور امتحان میں کامیابی کے بعد طلبہ کو فاضل کی سند دی جاتی ہے، یہ سند ملک ہندوستان کی متفرق جامعات اور اسلامی ممالک کی متعدد جامعات میں انٹر اور بی۔اے کے برابر تسلیم کی جاتی ہیں۔

تکمیل تفسیر: یہ ایک طرح سے تخصص فی التفسیر کا درجہ ہے، اس میں دورہ حدیث سے فارغ ہونے والے منتخب طلبہ داخلہ پاتے ہیں، اس میں تفسیر ابن کثیر، تفسیر بیضاوی، مناہل العرفان اور اس طرح کی دیگر کتابوں کی تدریس ہوتی ہے۔

تخصص فی الحدیث: اس میں دورہ حدیث یا تکمیلات سے فارغ ہونے والے منتخب طلبہ کو داخلہ دیا جاتا ہے، اس میں علوم حدیث، اصول حدیث، فن تخریج جیسے علوم سے متعلق کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔

تکمیل افتاء: یہ شعبہ دار الافتاء کی نگرانی میں کام کرتا ہے، یہ ایک سالہ کورس ہے، اس میں بھی دورہ حدیث سے فارغ شدہ طلبہ ہی داخلہ کے اہل ہوتے ہیں، اس میں طلبہ کو فتوی نویسی، فقہ وافتاء کی اعلی کتابوں کی تعلیم ہوتی ہیں، اس سے فارغ ہونے والے طلبہ کو افتاء کی سند دی جاتی ہے اور وہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں نئے آنے والے مسائل کا حل پیش کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔

تدریب فی الافتاء: یہ کورس تکمیل افتاء سے فارغ ہونے والے طلبہ کے لئے ہے، یہ دوسالہ کورس ہے، اس میں طلبہ کو فتوی نویسی کی مشق کرائی جاتی ہے اور اہم فقہی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، اس سے فارغ ہونے کے بعد طلبہ کو فقہ وفتوی کے میدان میں دسترس حاصل ہو جاتی ہے۔

تکمیل علوم: یہ ایک سالہ کورس ہے، دورہ حدیث سے فارغ ہونے والے منتخب طلبہ اس میں داخلہ کے لئے اہل ہوتے ہیں، یہ کورس طلبہ کو اسلامی علوم میں مزید ماہر بنانے کے لئے ہے، اس میں اہم اسلامی کتابیں مثلا "حجۃ اللہ البالغہ"، "مقدمہ ابن الصلاح"، تفسیر بیضاوی" وغیر جیسی اہم کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔

تکمیل ادب عربی: یہ ایک سالہ کورس ہے، دورہ حدیث سے فارغ ہونے والے وہ طلبہ جو مزید عربی زبان وادب میں مہارت حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ اس میں داخلہ لے سکتے ہیں، اس میں عربی انشاء پردازی، صحافت، عربی بول چال کی مشق کرائی جاتی ہے۔

تخصص فی الادب: اس میں تکمیل ادب سے فارغ ہونے والے طلبہ داخلہ کے اہل ہوتے ہیں، اس میں طلبہ عربی زبان وادب میں مہارت حاصل کرتے ہیں، یہ کورس دو سال پر مشتمل ہے۔

شعبہ انگریزی زبان وادب: یہ شعبہ 2002ء میں قائم ہوا، یہ دو سالہ کورس ہے، جو طلبہ دورہ حدیث سے فارغ ہو چکے ہیں وہ اس میں داخلہ لے سکتے ہیں، اس میں طلبہ کو انگلش گرامر، انگریزی، اردو اور عربی ترجمہ اور انگریزی بول چال کی مشق کرائی جاتی ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کو موجودہ دور میں انگریزی نہ جاننے کہ وجہ سے جن مشکلات کا سامنا ہوتا ہے ان کا مقابلہ کر سکیں اور اسلام کو پیش آنے والے نئے چیلنجز کا سامنا کرنے کے اہل ہوں۔

شعبہ کمپیوٹر: اس شعبہ کا قیام 1996ء میں عمل میں آیا، اس میں منتخب فاضل طلبہ کو داخلہ دیا جاتا ہے، اس میں ڈی ٹی پی (DTP) سے متعلق تمام ہی چیزیں سکھائی جاتی ہیں ساتھ ہی ساتھ انگریزی کی بھی تعلیم دی جاتی ہے، یہ ایک سالہ کورس ہے، سال کے آخر میں کامیاب ہونے والے طلبہ کو ڈپلومہ کی سند دی جاتی ہے، اس سے فارغ ہونے والے طلبہ اپنے روزگار کو بہتر طریقہ سے چلانے اور اچھی ملازمت کے لئے اہل ہو جاتے ہیں۔

شعبہ خوش خطی: اس میں دو درجہ ہیں، پہلے درجہ میں محض اچھی تحریر لکھنے کی مشق کرائی جاتی ہے، جب کہ دوسرے درجہ میں باقاعدہ فن کتابت کی تعلیم دی جاتی ہے، اس میں طلبہ کو وظائف بھی دئے جاتے ہیں، یہ ایک اختیاری مضمون کے طور پر پڑھایا جاتا ہے، کورس پورا کرنے کے بعد طلبہ کو سند بھی دی جاتی ہے۔

شعبہ دار الصنائع: طلبہ علم کے ساتھ ساتھ کچھ ہنر بھی سیکھ سکیں تا کہ بوقت ضرورت یہ کام آسکے، اس مقصد کے تحت یہ شعبہ 1945ء میں قائم کیا گیا، اس میں خیاطی اور جلد سازی کی تعلیم دی جاتی ہے، طلبہ کرتا پاجامہ، صدری وشیروانی کی کٹنگ ایک سال میں سیکھ لیتے ہیں، کچھ طلبہ مستقل طور پر اس شعبہ میں داخلہ لیتے ہیں، جب کہ کچھ طلبہ دوسرے کورسز کے دوران اختیاری مضمون کے طور پر اس میں داخلہ لیتے ہیں۔

شعبہ تجوید وقرأت: اس میں قرآت وتجوید کی تعلیم دی جاتی ہے، اس کے مختلف کورسز ہیں، مثلا حفص اردو ایک سالہ، حفص عربی ایک سالہ، سبعہ ایک سالہ اور عشرہ ایک سالہ کورس ہوتا ہے، اس میں تجوید کی کتابیں اور قرأت کی مشق کرائی جاتی ہے، فضیلت کے بعد اس میں مستقل طور پر داخلہ بھی ہوتا ہے، اس کے علاوہ عربی کے طلبہ کو پارہ عم کی مشق بھی کرائی جاتی، یہ ایک لازمی پیپر ہوتا ہے جس کو پاس کرنا سبھی طلبہ کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

شعبہ تحفیظ القرآن وناظرہ: اس میں چھوٹے بچوں کو باقاعدہ حفظ وناظرہ کی تعلیم دی جاتی ہے، اس میں صرف مقامی بچے یا جن کا کوئی مقامی سرپرست ہو وہی داخلہ لے سکتے ہیں۔

شعبہ دینیات وفارسی: یہ پرائمری درجات کی جگہ ہے، پہلے یہ دو الگ شعبہ تھے، اب دونوں کو ملا کر پانچ سالہ کورس بنایا گیا ہے، اس میں دینیات کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، حساب، ہندی اور انگریزی وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے، یہاں سے پڑھنے کے بعد طالب علم کسی بھی نظام

تعلیم میں بآسانی اپنی تعلیم جاری رکھ سکتا ہے۔

14.7 دارالعلوم کا مقصد اور اس کی خصوصیات

انگریزوں نے حکومت حاصل کرنے کے بعد تعلیم وتربیت کے نظام کو بھی تباہ کر دیا تھا، اور ایک ایسا نظام تعلیم جاری کر دیا تھا جس سے مسلمانوں کا شیرازہ عملاً بکھر رہا تھا، انگریزی تعلیم حاصل کرکے لوگ دین سے بےزار اور اسلامی عقائد سے منحرف ہو رہے تھے اور انگریزوں کے آلہ کار بن رہے تھے، لہذا ضرورت تھی ایک ایسی تحریک کی جو پورے ہندستان میں اسلامی تعلیم وتربیت کی نشرواشاعت، پوری ملت اسلامیہ ہند کی دینی قیادت اور ان کے ذہن وفکر کے اندر آزادی کی روح پھونک سکے، انہی مقاصد کے تحت دارالعلوم دیوبند کا قیام ہوتا ہے، دارالعلوم کو قائم کرنے کے بعد اکابر دیوبند نے باقاعدہ طور مدرسہ کے دستور اساسی میں ان مقاصد کو بھی درج کیا اور اسے مندرجہ ذیل طریقہ سے بیان کیا:

قرآن مجید، تفسیر، عقائد، حدیث، عقائد وکلام اور ان کے علوم کے متعلق ضروری اور مفید فنون آلیہ کی تعلیم دینا، اور مسلمانوں کو مکمل طور پر اسلامی معلومات بہم پہونچانا، رشد وہدایت اور تبلیغ کے ذریعہ اسلام کی خدمت انجام دینا، ثانوی مرتبہ میں دیگر علوم فنون کی جو عربی زبان کی تحصیل یا مذہبی اغراض کی تکمیل کے لئے ضروری یا مفید ہوں، اسی طرح فارسی اور دیگر زبانوں کی بقدر ضرورت تعلیم دینا، دوسرے فنون وحروف کو بقدر ضرورت اسی حد تک اختیار کرنا کہ اصل مقصد تعلیم میں نقصان واقع نہ ہو، اور جنہیں اصل مقصد کے لئے معین ومفید سمجھا گیا ہو۔

اعمال واخلاق اسلامیہ کی تربیت اور طلبہ کی زندگی میں اسلامی روح پیدا کرنا۔

اسلام کی تبلیغ واشاعت اور دین کا تحفظ ودفاع اور اشاعت اسلام کی خدمت بذریعہ تحریر وتقریر بجالانا اور مسلمانوں میں تعلیم وتبلیغ کے ذریعہ سے خیر القرون اور سلف صالحین جیسے اخلاق واعمال اور جذبات پیدا کرنا۔

حکومت کے اثرات سے اجتناب واحتراز اور علم وفکر کی آزادی کو برقرار رکھنا۔

علوم دینیہ کی اشاعت کے لئے مختلف مقامات پر مدارس عربیہ قائم کرنا اور ان کا دارالعلوم سے الحاق۔

دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم مولانا قاری محمد طیب نے دارالعلوم کی خصوصیات کی تشریح مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے:

اول مذہبیت: دارالعلوم مذہبی قوت کا سرچشمہ ہے اور اول سے آخر تک اسلام کے دستور وآئین کا پابند ہے، یہی وجہ ہے کہ یہاں کا ہر فرد اسلام کا نمونہ کامل ہے۔

دوم آزادی: جس کے معنی یہ ہے کہ یہ دارالعلوم مکمل طور پر بیرونی غلامی کے خلاف ہے، اس کا نظام تعلیم وتربیت، اس کا نظام مالیات اور اس کا نظام اجتماعی سراسر آزاد ہے، دنیا میں یہ پہلی جامعہ ہے جس کے سامنے حکومت نے بارہا پیش کش کی مگر اس نے لاکھوں روپئے کی پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

سوم سادگی اور محنت پسندی: جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہاں کے علماء اور فضلاء زندگی میں بڑی سے بڑی مصیبت برداشت کرنے کے عادی ہیں۔

چہارم کردار وبلند اخلاقی: جس کا مفہوم یہ ہے یہاں کے طلبہ اس کردار بلند کا نمونہ کامل ہیں جس کو انہوں نے اپنے اکابر سے پایا ہے، یہ کردار سراسر روحانی ہے۔

پنجم علمی اور تعلیمی وابستگی: یہ وہ خصوصیت ہے جسے دار العلوم دیکھنے والا اولین لمحات میں محسوس کرسکتا ہے، دار العلوم کی ہر خصوصیت کو زندگی کے آئینہ میں دیکھا جاسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ دار العلوم دیوبند میں دنیا کے ہر حصے کے طلبہ موجود ہیں، دار العلوم کے اساتذہ بہترین اساتذہ ہیں، دار العلوم کے خدام ایثار وقربانی کا زندہ نمونہ ہیں۔

دار العلوم کی داغ بیل ان علماء ربانیین نے ڈالی جو سراپا خلوص وللّٰہیت تھے، ان کا دل ودماغ ملت اسلامیہ کے شاندار مستقبل کے لئے بے چین تھا، انہوں نے خود کو اشاعت دین اور ترویج علوم دینیہ کے لئے وقف کردیا تھا، رب العالمین نے دار العلوم اور اس کی خدمت کو مقبولیت عطا فرمائی اور اس نے ملک اور بیرون ملک کی دینی، علمی، اخلاقی اور اصلاحی جو خدماتِ عظیم انجام دی ہیں وہ کبھی بھلائی نہیں جاسکتیں، یہاں سے ہزاروں علماء وصوفیاء، محدثین، فقہاء، مصنفین اور مبلغین پیدا ہوئے اور وہ لوگ بھی پیدا ہوئے جنہوں نے ملک کی آزادی اور ترقی میں بے مثال قربانیاں پیش کیں۔

14.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- ہندستان میں مدارس کی تاریخ دور جدید سے نہیں شروع ہوتی، بلکہ مسلم حکمرانوں نے ہمیشہ تعلیم پر توجہ دی، علوم وفنون کی اشاعت کے لئے ہر دور میں مدارس قائم کئے، یہ مدارس طلبہ واساتذہ کے لئے ہر طرح کی سہولت بھی فراہم کرتے تھے، حکومت کی طرف سے طلبہ کے قیام وطعام کا باضابطہ انتظام ہوتا تھا، ان مدارس کی ایک بڑی تعداد ہے جو ہر شہر میں مسلم حکمرانوں اور امراء کے ذریعہ قائم کئے گئے، انگریزی حکومت کے قیام تک یہ تمام مدارس موجود تھے، انگریزی حکومت کے قائم ہونے کے بعد نظام تعلیم تبدیل ہوگیا، لہذا وہ مدارس جو حکومت کی سرپرستی میں دینی تعلیم کے درس وتدریس کا انتظام کرتے تھے وہ سب بند ہوگئے، حکومت نے اپنی سرپرستی بند کردی، بلکہ بہت سے مدارس کی عمارتیں بھی ختم کردی گئیں۔
- حکومت کے ذریعہ دینی تعلیم وتدریس کی سرپرستی بند کردینے کے بعد اب یہ ذمہ داری علماء اور اصحاب خیر کے کندھوں پر آگئی تھی، یہی وہ ذمہ داری کا احساس تھا جس کے تحت دیوبند میں چند علماء اور اصحاب خیر نے ایک چھوٹے سے مدرسہ کا قیام کیا، جو دھیرے دھیرے ایشیا کی عظیم درسگاہ دار العلوم دیوبند کی شکل اختیار کرگیا، یہاں پر تعلیم وتدریس کا ویسے ہی انتظام کیا گیا جیسا مسلم دور حکومت میں ہوتا تھا، لہذا یہاں بھی طلبہ کے لئے کسی فیس اور اجرت کے بغیر تعلیم وتربیت اور قیام اور طعام کا انتظام کیا جاتا ہے، دار العلوم کے درسِ نظامی میں وہ تمام اہم کتابیں شامل ہیں جن کو پڑھ کر طالبِ علم علمِ دین میں دسترس حاصل کرلیتا ہے، لہذا بعد میں قائم ہونے والے مدارس نے بھی اپنے

نصاب میں اسی درس نظامی کو شامل کیا۔

- دار العلوم کا اپنا تدریسی نظام اپنے آپ میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے، اس میں وہ تمام علوم وفنون کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جن کو پڑھنے کے بعد طالب علم اپنی تمام ہی دینی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے اور سماج میں پیدا ہونے والے مسائل کے سلسلے میں دین کا نقطہ نظر پیش کر سکتا ہے، ان تمام علوم کو مختلف درجات اور شعبوں میں تقسیم کیا ہے، آٹھ سالہ عربی کورس اور مزید مختلف علوم میں تخصص سے فراغت کے بعد طالب علم شرعی علوم میں درک اور ید طولی حاصل کر لیتا ہے۔
- دار العلوم ایک وسیع وعریض ادارہ ہے، اس کا رقبہ کافی وسیع ہے، مختلف علوم وفنون سے متعلق متعدد شعبہ جات قائم ہیں، یہاں ایک بڑی تعداد میں طلبہ ملک کے مختلف گوشوں سے حصول علم کے لئے آتے ہیں، مدرسہ نے طلبہ اور اساتذہ کی سبھی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے ہر طرح کی سہولیات فراہم کی ہیں، ان تمام امور کو بہتر طریقہ سے چلانے کے لئے دار العلوم نے بہت ہی عمدہ اور بہترین انتظام کئے ہیں، ہر کام سے متعلق علیحدہ شعبے قائم کئے ہیں، ہر شعبہ میں متعدد ملازمین ہیں جو بخوبی اپنی ذمہ داریوں کو انجام دے رہے ہیں۔

14.9 نمونہ امتحانی سوالات

14.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. مسجد فتح پوری کا مدرسہ کس کے دور میں قائم ہوا؟

(a). اکبر (b). جہاں گیر (c). شاہ جہاں (d). اورنگ زیب

2. فرنگی محل کا مدرسہ کس شہر میں قائم کیا گیا؟

(a). آگرہ (b). لکھنو (c). دہلی (d). کلکتہ

3. دیوبند کا پرانا نام کیا تھا؟

(a). دارابند (b). دیوبھومی (c). دیونگری (d). دیوی بن

4. دار العلوم کے سب سے پہلے مہتمم کون تھے؟

(a). حاجی عابد حسین (b). مولانا محمد قاسم نانوتوی (c). مولانا ذوالفقار علی (d). مولانا فضل الرحمان

5. دار العلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس کون تھے؟

(a). مولانا قاسم نانوتوی (b). مولانا حسین احمد مدنی (c). مولانا مہتاب علی (d). مولانا یعقوب نانوتوی

6. دار العلوم کا شعبہ عربی وتکمیلات کا کورس کتنے سالوں میں پر مشتمل ہوتا ہے؟

8.(a) 7.(b) 6.(c) 5.(d)

7. دار العلوم دیوبند میں رائج نصاب کو کیا نام دیا جاتا ہے؟

(a). درس نظامی (b). درس حدیث (c). علوم عربیہ (d). جدید نصاب

8. دار العلوم میں انگریزی زبان وادب کا شعبہ کب قائم ہوا؟

(a) .2003 (b).2002 (c).2001 (d).2000

9. دار العلوم کی نئی لائبریری کا کیا نام ہے؟

(a). محمود الحسن لائبریری (b). قاسم لائبریری (c). مدنی لائبریری (d). شیخ الہند لائبریری

10. دار العلوم کا سب سے بڑا عہدہ کیا ہے

(a). ناظم (b). صدر (c). شیخ الحدیث (d). مہتمم

14.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. سرزمین دیوبند کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ تحریر کیجیے۔
2. دار العلوم کی مجلس شوری کے بارے میں مختصراً تحریر کیجیے۔
3. قیام دار العلوم کا پس منظر بیان کیجیے۔
4. دار العلوم کا مقصد اور خصوصیات بیان کیجیے۔
5. دار العلوم کے تین تعلیمی شعبہ جات کا جائزہ لیجیے۔

14.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. قیام دار العلوم کے قیام کے اسباب اور ابتدائی حالات ذکر کیجیے۔
2. دار العلوم کے انتظامی امور کس طرح انجام دئے جاتے ہیں، بیان کیجیے۔؟
3. دار العلوم کے تعلیمی نظام پر گفتگو کیجیے۔

14.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تاریخ دار العلوم دیوبند : سید محبوب رضوی
2. دار العلوم دیوبند جامع ومختصر تاریخ : ڈاکٹر مولانا محمد اللہ قاسمی
3. دار العلوم دیوبند اور حکیم الاسلام : محمد اسلام قاسمی
4. سوانح قاسمی جلد دوم : مولانا سید مناظر احسن گیلانی
5. تاریخ دار العلوم دیوبند : مولانا قاری محمد طیب صاحب

اکائی 15: ندوۃ العلماء

اکائی کے اجزا:

15.0 تمہید
15.1 مقاصد
15.2 قیام ندوہ سے پہلے کا سیاسی منظر نامہ
15.3 ندوۃ العلماء
15.3.1 ندوۃ العلماء کے قیام کا پس منظر
15.3.2 اغراض ومقاصد
15.3.3 رائج نصاب تعلیم
15.3.4 تعارف ندوہ اور ملت کا رد عمل
15.3.5 لکھنو میں ندوۃ
15.3.6 نظام تعلیم
15.4 بانیان تحریک
15.5 اکتسابی نتائج
15.6 کلیدی الفاظ
15.7 نمونہ امتحانی سوالات
15.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
15.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
15.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
15.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

15.0 تمہید

انیسویں صدی عالم اسلام کے لیے سیاسی اور فکری زوال کی صدی ہے۔ ہندوستان میں بھی سلطنت مغلیہ اور مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کا چراغ گل ہو چکا تھا اور انگریز اس پر قابض ہو چکے تھے۔ ایسے دور میں محمد علی مونگیری کی شخصیت نے جدید تقاضوں کو محسوس کیا اور اس کے لیے بے چین ہوئے۔ آپ نے دینی تعلیمی تحریک کی بنیاد ڈالی اور ندوۃ العلماء کا تخیل پیش کیا۔ ندوہ کی تحریک ملکی معاملات اور سیاست سے جدا ہو کر خالص علمی اور اصلاحی تحریک تھی۔ جس کا مقصد تھا کہ قدیم دینی نصاب اور نظام تعلیم کی کمیوں کو دور کرنا، اس کے علاوہ دینی علوم کی ترقی اور علماء کے مابین لڑائی جھگڑے کا خاتمہ، مختلف فیہ مسئلوں پر طبع آزمائی کے بجائے اصولی مسائل کی طرف توجہ مبذول کرنا۔ یہ تحریک 1892 میں شروع ہوئی اور 1898 میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی بنیاد لکھنو میں رکھی گئی۔

15.1 مقاصد

اس اکائی کا بنیادی مقصد آپ کو اس بات سے واقف کرانا ہے کہ اس وقت ہندوستان اور مسلمانوں کے سیاسی و معاشی حالات کیا تھے۔ اس تحریک کے مقاصد اور اس کے روح رواں کون لوگ تھے، اس تحریک کا مقصد کیا تھا اس کے ساتھ ساتھ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام اور اس کے نظام تعلیم سے آگاہی حاصل کر سکیں۔

15.2 قیام ندوہ سے پہلے کا سیاسی منظر نامہ

1857ء کی بغاوت کے بعد اس کا سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو اٹھانا پڑا۔ انگریز حکومت کے ذمہ دار و سیاست دانوں نے اس کا بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ اس بغاوت کے پیچھے مسلمانوں کا ہاتھ ہے اور وہ ہی اس کے ذمہ دار ہیں۔ اس جنگ میں مسلمان و ہندو دونوں شریک تھے لیکن قیادت اور رہنمائی زیادہ تر مسلمانوں نے کی اسی وجہ سے مسلمانوں کو زیادہ خمیازہ بھگتنا پڑا۔ مرکزی حیثیت میں جو مسلمان تھے ان کو الگ کیا گیا، معاش کی مشقتوں میں الجھایا گیا، ان کی جائداد اور اوقاف کو غصب کر لیا گیا۔ انہی جائدادوں اور اوقاف سے مسلمانوں کے مدارس اور تعلیمی ادارے رواں دواں تھے۔ ایسے تعلیمی اداروں کا قیام کیا گیا جس سے مسلمان خاطر خواہ استفادہ نہ کر سکیں۔ مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ معمولی الزام یا شبہ میں ان کو قتل کر دیا جاتا یا سخت سزاؤں سے دوچار ہونا پڑتا۔ سرکاری نوکریوں کے دروازے بند کر دیے گیے۔ مسلمانوں کی حالت دن بہ دن خستہ ہوتی چلی جا رہی تھی۔ مسلمانوں کا زیادہ تر وقت اپنا دفاع اور اپنے اوپر لگے الزامات کی صفائی دینے میں گزر رہا تھا۔ اس کی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ قومی سیاست یا قوم میں بیداری پیدا کرنے کے لیے کوئی لائحہ عمل تیار کر سکیں۔ انگریز سرکار سے پہلے تک تعلیم مفت دی جاتی تھی جس کے اخراجات بادشاہ، امرا اور دولت مند لوگ برداشت کرتے تھے اور اس کے لیے ان لوگوں نے بڑی بڑی جائدادیں وقف کر رکھیں تھیں۔ مغل حکومت کے خاتمے کے بعد انگریزوں نے حکومت کی سرکاری زبان انگریزی قرار دی اور

عربی وفارسی کے مدرسوں کو بند کر دیا، اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں تبدیلی کی گئی۔ تعلیمی نظام کے تباہی کی وجہ سے ملک میں جہالت کا روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔

اسی کے ساتھ ایک مصیبت یہ بھی تھی کہ یورپین قوم نے جب دوسرے ممالک میں اپنے پیر جمانا شروع کیے تو عیسائی پادریوں کو بھی اپنے مذہب کو فروغ دینے کی خواہش پیدا ہوئی۔ جس ملک میں بھی انگریزوں کے قدم مضبوط ہوتے وہاں عیسائی مبلغین پہنچ کر اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے لگتے۔ ہندوستان پر قبضہ حاصل کرنے کے بعد یورپ و امریکہ سے عیسائی اداروں سے پادریوں کی ایک اچھی تعداد ہندوستان آئی اور ان لوگوں نے آپسی اتفاق سے ہندوستان کے علاقوں کو اپنی اشاعت کے لیے بانٹ لیا۔ غرض ان لوگوں نے ہندوستان کے تقریباً ہر گاؤں یا قصبہ میں اپنے مشن کو فروغ دینے کے لیے پادریوں کو روانہ کیا۔ عیسائیت کی ترویج واشاعت میں حکومت نے بڑی سرگرمی اور جوش دکھایا۔ حکومتی پشت پناہی کی وجہ سے مغربی تہذیب کو عوام میں قبولیت حاصل ہوتی رہی۔ ان کے بڑھتے ہوئے اثرات سے مسلمانوں نے اقدامی کوشش کے بجائے دفاع کرنا مناسب سمجھا۔ وہ اس بات کے لیے سرگرداں ہوئے کہ کس طرح سے مسلمانوں کے اندر دینی جذبہ، اسلامی روح اور تہذیب کے جو نشان باقی رہ گیے ہیں ان کو محفوظ کیا جائے۔

15.3 ندوۃ العلماء

15.3.1 ندوۃ العلماء کے قیام کا پس منظر

اوپر آپ نے ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی و معاشی صورت حال کے بارے میں مختصراً پڑھا۔ 1857ء کی تحریک کے ناکام ہونے کے بعد انگریزوں کا غصہ پورے طور پر مسلمانوں پر تھا جس کی وجہ سے انہوں نے مسلمانوں سے بدلہ لینا شروع کر دیا۔ ان حالات میں دو تحریکیں وجود میں آئیں۔ ایک تحریک کی قیادت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے کی اور دارالعلوم دیوبند کا قیام 1866ء عمل میں آیا۔ دوسری تحریک کی بنیاد سرسید اور ان کے رفقا نے 1877ء میں ایم۔ اے۔ او کالج کی بنیاد ڈالی۔ پہلی تحریک خالص دینی تھی جس کے حامی علمائے دین تھے جب کہ دوسری تحریک میں سرسید احمد خان اور نئے مکتب فکر کی سوچ کے حامل افراد تھے۔ دینی قیادت کے افراد نے دین کے سرمایے کی حفاظت اور مسلمانوں کے دینی تشخص کو بچانے کے لیے دینی مدارس کے قیام کو ضروری سمجھا تا کہ مسلمان سیاسی خستہ حالی کے بعد کم سے کم اخلاقی و دینی زوال کے شکار نہ ہوں۔ ان مدارس سے ایسے لوگ تیار کیے جائیں جو اسلامی شریعت کے واقف کار ہوں اور اپنی شناخت کے ضامن ہو سکیں۔ مولانا قاسم نانوتوی اور سرسید احمد خاں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ دونوں لوگ ایک ہی استاد کی شاگرد تھے اور دونوں کا مقصد بھی ایک تھا۔ دونوں لوگوں نے امت مسلمہ کی اصلاح کی ذمہ داری اٹھائی۔ دونوں لوگ مسلم سماج کی صورت حال دیکھ کر بے چین ہوتے لیکن دونوں کے نظریات اور طریق کار میں بڑا اختلاف تھا۔ مولانا قاسم مسلم معاشرے کی اصلاح کے لیے مذہبی تعلیم پر زور دے رہے تھے چنانچہ دارالعلوم دیوبند نے خالص مذہبی تعلیم کے ذریعے اس تحریک کو فروغ دیا اور حکومت کے ساتھ عدم تعاون کی حکمت عملی پر کاربند رہے۔ اس کے برعکس علی گڑھ نے مغربی تعلیم اور دینیات کے اشتراک سے اس مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ

حکومت وقت سے اتحاد اور تعاون کی پالیسی پر عمل پیرا رہے۔ نظریات میں فرق اور طریق کار الگ ہونے کے باوجود دونوں نے ملک اور مسلم سماج کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔

یہ دونوں تحریکیں ہندوستان میں بڑی شان و شوکت کے ساتھ اپنی خدمات انجام دے رہی تھیں لیکن ان دونوں تحریکوں میں فکری اختلاف تھا اور دونوں کے کارکن ایک دوسرے کے سامنے صف آرا تھے کیوں کہ ایک تحریک (علی گڑھ) جو نئے علوم کا حصول، مذہب کی عقل سے تفہیم، سماجی اصلاح کے لیے کوشاں تھی تو دوسری طرف وہ تحریک (دارالعلوم دیوبند) جو اسلامی پہچان اور اسلام کی بقا کے لیے وجود میں آئی تھی۔ غرض مسلم معاشرہ دو طبقوں میں تقسیم ہو چکا تھا ایک طرف عالم دین جو مدارس سے فراغت حاصل کر رہے تھے تو دوسری طرف یونیورسٹی اور کالجوں کے لوگ تھے۔ ان دونوں طبقوں کے درمیان اجنبیت اور ناشناسائی تھی اسی وجہ سے ان دونوں کے درمیان مسافت بڑھتی گئی۔ وقت نے معاشرے کو ایسے موڑ پر لا کھڑا کر دیا تھا کہ مختلف مسلک اور فرقے ایک دوسرے کو کم تر دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ یہ وہ دور تھا کہ مسلمان آپس میں ہی لڑ رہے تھے، اپنے ہی لوگوں کو اور اسلام کے ماننے والوں کو نیچا دکھا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو لعن طعن کر رہے تھے۔ اس صدی میں تقریباً پوری اسلامی دنیا کی یہی کیفیت تھی۔ مناظروں کا بازار گرم تھا اور تضحیک سے بات بڑھ کر مقدمہ اور فوج داری تک پہنچ چکی تھی۔

دوسری طرف مغربی تہذیب بزرگوں کی روایت کو کچل رہی تھی۔ برطانوی حکومت ملک پر دن بہ دن اپنا شکنجہ مضبوط کرتی جا رہی تھی۔ عیسائی مناظر بھی اپنے دست کو وسعت دے رہے تھے۔ اسلام و اسلامی تعلیمات کے خلاف اپنی فکر کی ترویج منصوبہ بند طریقے سے کر رہے تھے لیکن مسلمان فکری طور پر ایک دوسرے کو ناتواں اور برباد کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ مقلدین اور غیر مقلدین کی کشمکش میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ اس دور میں ہندوستان کے مقتدر شخصیات پر کفر کے فتوے بھی لگائے گئے غرض ملت اسلامیہ کا شیرازہ پوری طرح بکھر چکا تھا۔ اس کے علاوہ قدیم وجدید کی کھینچا تانی بھی عروج پر تھی۔ انیسویں صدی کے اواخر میں جب مغربی تہذیب چاق وچوبند نظر آ رہی تھی اور مشرقی تہذیب تنزلی کی طرف تھی۔ ان دونوں تہذیبوں کے درمیان کی کشمکش بھی اپنے عروج پر تھی۔ جس کے سیاسی، معاشی و تہذیبی پہلو بھی تھے۔ اس صدی میں متعدد تحریکیں منظر عام پر آئیں اور اپنے دائرے میں اسلام اور مسلمانوں کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔

دیوبند کے قائم ہوئے 26 سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ کے اٹھارہ سال ہونے کو تھے۔ ایسے پر فتن دور میں مولانا سید علی مونگیری نے ان دونوں طبقوں (دارالعلوم دیوبند، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کے درمیان ایک پل بنانے کا ارادہ کیا جہاں بغیر مترجم کے ان دونوں طبقوں میں افہام و تفہیم ممکن ہو۔ اس تحریک کو لے کر 1892ء میں مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسہ دستار بندی کے وقت ندوۃ العلماء کا خیال علماء کے سامنے پیش کیا۔ دردمند حضرات نے اس پیش کش کو قبول کیا اور یہ طے پایا کہ علما کی ایک مستقل انجمن قائم کی جائے اور اگلے سال اس کے جلسے کا اہتمام کیا جائے جس میں ہندوستان کے جید علمائے کرام کو دعوت دی جائے کہ وہ اس میں شریک ہوں۔ دو سال بعد 1894ء کو پھر سے فیض عام کی دستار بندی کے ساتھ ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس بڑے جاہ و حشم کے ساتھ منعقد ہوا۔ اس موقع پر ملک کے دردمند حضرات ایک ساتھ بیٹھے، اس میٹنگ میں ماہرین تعلیم کے سبھی افراد کو دعوت دی گئی۔ یہ لوگ کسی ایک طبقے سے

تعلق نہ رکھتے تھے بلکہ مختلف مکاتب فکر سے جڑے ہوئے تھے۔ یہ سبھی لوگ معاشرے کی دن بہ دن تنزلی کو لے کر بے چین تھے اور خواہش مند تھے کہ صورت حال بدلنی چاہیے۔ اس میں متفقہ رائے سے قرار داد منظور کی گئیں اور اس قرارداد میں "ندوۃ العلماء" نام کا انتخاب کیا گیا۔ اس کی بنیاد یہ طے کی گئی کہ مسلمانوں کا باہمی اتحاد، اسلامی اصول اور شریعت اسلامی کو مدنظر رکھ دینی نصاب علوم میں ممکن تبدیلیاں جو حالات حاضرہ کی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ اس انجمن سے ایسے علماء تیار کیے جائیں جو قدیم وجدید دونوں طبقوں کی رہنمائی کر سکیں اور امت مسلمہ کی دینی، فکری وعلمی قیادت کی اس خلا کو پُر کر سکیں جو زمانہ دراز سے خالی چلی آرہی ہیں۔ اس کے پہلے ناظم مولانا سید علی مونگیری منتخب ہوئے۔

1894ء میں جس تحریک کا عملاً آغاز ہوا تھا وہ اپنے اصلاحی وتعمیری منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ اس تحریک کے سالانہ اجلاس پابندی کے ساتھ ہندوستان کے مرکزی شہروں میں ہوتے رہے اور اس کی شہرت پورے ملک میں ہوتی رہی۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا کام 1898ء میں لکھنو میں "دارالعلوم ندوۃ العلماء" سے شروع کیا گیا۔ اس تحریک سے ایک سے بڑھ کر ایک حضرات منصہ شہود پر آئے اور ان لوگوں نے ندوہ کے نام کو بلندیوں پر پہنچایا اور دنیا کو متعارف کرایا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں کے فضلاء کو دینی ودنیاوی دونوں جماعتوں کی تائید حاصل تھی۔

15.3.2 اغراض ومقاصد

شروعات میں اس تحریک کے روبرو دو مقاصد تھے:

1. علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں دوررس اور بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔
2. رفع نزاع باہمی یعنی اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا۔

اس تحریک کے قدم جیسے جیسے آگے بڑھتے گیے، تحریک نے دائرہ کار اور مقاصد کو وسیع کیا تو چار درج ذیل مقاصد مزید طے پائے۔

1. علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں دوررس اور بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔
2. ایسے علما پیدا کرنا جو کتاب وسنت کے وسیع وعمیق علم کے ساتھ جدید خیالات سے بخوبی واقف اور زمانہ کے نبض شناس ہوں۔
3. اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا۔
4. اسلامی تعلیمات کی اشاعت بالخصوص برادران وطن کو اس کی خوبیوں سے روشناس کرانا۔ (تاریخ ندوۃ: ص 55-56)

تحریک ندوۃ العلماء میں شامل ہوئے لوگ اس بات کا اندازہ کر چکے تھے کہ نہ مشرق کی ہر چیز کو پسند کرنا اور نہ مغرب کی ہر چیز سے نفرت کرنا اسلام کا تقاضہ ہے۔ بلکہ پرانی اور نئی فکر کی آمیزش وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ندوۃ العلمانے جسمانی وروحانی علاج کو سمجھا اور اس بات پر غور وخوض کیا کہ مسلمانوں کی تنزلی اور گمراہی کے کیا اسباب ہیں۔ خلاصہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی بربادی کا اصل سبب تعلیم سے قطع تعلقی ہے۔ رائج طریقۂ تعلیم سے اس لیے منھ موڑ لیا کہ یہ وقت کی ضرورتوں کو پورا نہیں کر رہا ہے اور انگریزی علوم سے اس لیے بے اعتنائی برتی گئی کہ اس سے مذہب خطرے میں پڑ سکتا ہے۔

15.3.3 رائج نصاب تعلیم

ندوہ کے قائم ہونے سے پہلے جتنے بھی مدارس تھے، ان کے یہاں نصاب تعلیم میں معقولات (حکمت، فلسفہ اور منطق کا علوم) پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ استاد اور طالب علم کا بیش قیمتی وقت اس پر بہت زیادہ خرچ ہوتا تھا اس کے بالمقابل قرآن، حدیث وفقہ پر اتنی توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ تہذیب وتمدن کے بدلاؤ سے ان مدارس کی حیثیت کمزور ہو چکی تھی جو موجود تھے، جدید افکار و نظریات کی تبدیلی سے ان کی واقفیت نہ تھی۔ اسحاق جلیس ندوی نے اپنی کتاب تاریخ ندوہ میں اس وقت کے نصاب تعلیم کا مجملاً خاکہ کھینچا ہے۔

1. اس نصاب میں قوت مطالعہ کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے اور تحصیل فن کی طرف توجہ کم کی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ طلبا میں ضرورت سے زیادہ احتمال آفرینی پیدا ہو جاتی ہے لیکن کسی فن میں کمال حاصل نہیں ہوتا۔
2. منطق کی کتابیں ضرورت سے بہت زیادہ ہو گئی ہیں، شروع سے لیجیے تو پندرہ کتابیں صرف منطق کی اس نصاب میں ہیں۔ صغریٰ کبریٰ، ایساغوجی، قال اقول، میزان منطق وغیرہ۔
3. منطق کی پندرہ کتابیں نصاب درس میں ہیں اور تفسیر کی صرف دو کتابیں بیضاوی اور جلالین۔ بیضاوی کے صرف ڈھائی پارے پڑھائے جاتے ہیں اور جلالین پوری پڑھائی جاتی ہے لیکن اس کے اختصار کا حال یہ ہے کہ اس کے الفاظ وحروف قرآن مجید کے الفاظ وحروف کے برابر ہیں۔
4. حدیث وتفسیر کو ادب وعربیت سے مدد حاصل ہوتی ہے اس کا حصہ بہت کم ہے، بلاغت میں صرف دو کتابیں درس میں ہیں، مختصر و مطول۔ مختصر پوری پڑھائی جاتی ہے اور مطول چوتھائی سے بھی کم۔
5. منطق کی کتابیں جو درس میں داخل ہیں ان میں خلط مبحث بہت ہے ملا حسن، حمد اللہ اور قاضی ہیں تو منطق، لیکن ان میں منطق کے جس قدر مسائل ہیں اس سے کہیں زیادہ امور عامہ اور فلسفہ کے مسائل ہیں، جعل بسیط اور جعل مرکب، علم باری، کلی طبعی کا وجود فی الخارج وغیرہ ایسے اہم مسائل ہیں جن میں مصروف ہو کر طالب علم کو منطق کے خاص مسائل کی طرف بہت کم توجہ ہو سکتی ہے۔
6. اس نصاب میں تاریخ، جغرافیہ، علم اعجاز القرآن اور ضروری علوم بالکل نہیں۔ (ص66-67)

اس وقت تک مدارس میں درس نظامی یا درس نظامی کی بگڑی ہوئی صورت کا نصاب تعلیم رائج تھا لیکن اس میں ایک مدت سے کوئی تبدیلی نہیں کی گئی تھی اور جو تبدیلیاں ہوئیں بھی تو بغیر غور وفکر کے اس کتاب کو شامل نصاب کر لیا گیا جو شروح وحواشی پر مبنی تھی۔

1894ء کے جلسے میں ملک کے بڑے علمائے کرام کی موجودگی میں ایک دستور العمل منظور کیا گیا اور اس میں چار تجاویز پاس ہوئیں۔

1- موجودہ طریقہ تعلیم قابل اصلاح ہے۔

2- مدارس اسلامیہ کے مہتمم ہر سال ندوہ کے اجلاس میں شریک ہوں۔

3- مدارس اسلامیہ جو کثرت سے ملک کے مختلف حصوں میں قائم ہیں ان میں موافقت قائم کی جائے اور ہندوستان کے دو تین بڑے مدارس کو مرکز بنا کر چھوٹے مدرسوں کا اس سے الحاق کر دیا جائے۔

4- مدرسہ فیض عام کی ترقی اور مالی تعاون کے سلسلے میں تھی۔

نصاب کی اصلاح سے متعلق سبھی لوگوں کی رائے لی گئی جس میں ملک کے تقریباً سبھی مسالک کے علمائے کرام کو شامل کیا گیا اور کثرت رائے سے نصاب میں تبدیلی کو منظور کیا گیا جس کے لیے بارہ علما کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جو رائج نصاب اور طریقہ تعلیم و تدریس پر غور وخوض کرکے سفارشات پیش کریں۔

ندوہ کے بانیوں نے نصاب تعلیم کی ان کمزوریوں کو مد نظر رکھا اور حالات کے تناظر میں ایسا نصاب بنانے کی کوشش کی جو تربیت و معاشرت کے اعلیٰ معیار کو قائم رکھ سکیں۔ اس کے لیے تجاویز پیش کی گئیں اور اس کا مقصد واضح کیا گیا کہ ہمارے تعلیم یافتہ طالب علم مہذب اور پابند شریعت ہوں اور دوسروں پر اپنا اثر پیدا کر سکیں۔ طالب علموں میں بہادری وبے خوفی پیدا ہو اور دینی علوم بالخصوص علم کلام میں مہارت حاصل ہو۔ جو کہ وقت کی ضرورت ہے تاکہ لامذہبیت اور خدا کا انکار کرنے والی جماعت سے پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کیا جاسکے۔ اس کے ساتھ طلبہ گھوڑ سواری، بندوق چلانا، تیر اکی اور دوسری جسمانی ورزش میں حصہ لیں۔ حلال رزق کے لیے طلبہ کو کوئی ہنر سکھایا جائے جس کا انتخاب طلبہ کے میلان اور ان کے تعلق پر ہوگا۔ ایک ماہ میں دو یا تین بار طلبہ علمی واخلاقی مضمون پر گروپ ڈسکشن کریں اور اس کے لیے ایک مخصوص کمرہ ہوگا۔ اس کے ساتھ جدید اسالیب تعلیم و تربیت پر بھی زور دیا گیا ہے۔ غرض ندوہ نے شروعاتی دنوں سے ہی اپنے مقاصد میں درس وطریقہ تربیت میں تبدیلی کرکے نصاب تعلیم کی اصلاح کرکے اس کمی کو پورا کردیا۔ ندوہ کے قائم ہونے کا مقصد جہاں نصاب کی اصلاح اور آپسی کشمکش کو ختم کرنا تھا وہیں علماء کی ایسی ٹیم بھی تیار کرنا تھا جن کے خیالات میں وسعت پائی جاتی ہو اور زمانے کی رفتار سے بھی واقف ہوں اور جدید و قدیم دونوں علوم پر اچھی نظر رکھتے ہوں۔ دونوں طبقوں کے لوگوں نے ان کوششوں کو سراہا اور خیر مقدم کیا۔

15.3.4 تعارف ندوہ اور ملت کا ردعمل

مولانا سید علی مونگیری نے ناظم بننے کے بعد مولانا مشتاق علی کو ذمہ داری سونپی کہ وہ ہندوستان میں ندوہ کا تعارف کرائیں۔ آپ نے بڑی خوش اسلوبی سے اس ذمہ داری کو پورا کیا۔ اس کے لیے انہوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا اس کے علاوہ جدہ، مکہ و مدینہ منورہ کا بھی دورہ کیا۔ عوام وخواص دونوں حلقوں میں اس تحریک کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ ندوہ کے وفد کو لیا۔ غرض ملک کے سبھی مختلف المسالک و مکاتب فکر کے اشخاص نے جس جوش وجذبے سے اس تحریک کا استقبال کیا اس کی مثال ہندوستان میں شاذ ہی ملتی ہے۔ یہ آواز اس شخص کے دل کی دھڑکن بن گئی جو ملت کی خستہ حالی پر فکر و تذبذب میں مبتلا تھا۔ اس تحریک کی صدا نے ہندوستانی مسلمان کے اندر ایک نئی جان ڈال دی اور سماجی، تعلیمی اور فکری حالت میں ایک نئی شمع نظر آئی۔ بعد میں پھر کئی بڑے علمائے کرام نے اس میں شرکت کی اور اس تحریک کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ مثلاً شاہ سلیمان پھلواریؒ، مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی، مولانا

عبد الحکیم صاحب حسنیؒ اور مولانا شبلی وغیرہ۔

15.3.5 لکھنو میں ندوۃ

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام پر مختلف لوگوں نے مختلف رائیں دی کہ وہ کس جگہ اور کہاں ہو۔ جو شخص جس شہر کو بہتر سمجھتا اس کے حق میں رائے دیتا اور اس شہر کے متعلق علمی مناسبت بھی شمار کرواتا، اس کے فوائد سے بھی آگاہ کرتا۔ اس بابت مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواری نے فرمایا:

"لکھنو میں فائدہ ہے۔ اس وقت مولانا عبد الحق نے دہلی کے جو فضائل بیان کیے ہیں، ان کا میں منکر نہیں ہوں، در حقیقت دہلی فیض کا سرچشمہ ہے اور بزرگان اولیائے کرام کے فیوض ظاہری و باطنی کا سب سے زیادہ میں معترف ہوں، مگر بات یہ ہے کہ دارالعلوم کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ وہاں نہیں ہے، دارالعلوم ایسے مقام پر ہونا چاہیے، جہاں کے لوگوں کو علم و فضل سے دلچسپی ہو اور وہاں کی آب و ہوا اچھی ہو، حفظ و صحت کا لحاظ بہت ضروری ہے اور دہلی کی آب و ہوا اچھی نہیں ہے، اس لیے لکھنو میں دارالعلوم قائم ہونا چاہیے، لکھنو میں قائم ہونے سے ایک فائدہ عظیم یہ ہوگا کہ اس کے نواح میں رؤسا کثرت سے ہیں، وہ اس میں بہت مدد دیں گے"۔ ص194

غرض لکھنو اور دہلی کے بارے میں ایک عرصے تک بحث و مباحثہ ہوتا رہا، ظاہر ہے دہلی شہر کی فضیلت ہر لحاظ سے اپنی جگہ مسلم تھی۔ بالآخر یہ طے پایا کہ کثرت رائے سے اس پر فیصلہ کیا جائے۔ چنانچہ سبھی لوگوں سے اس پر رائے لی گئی اور زیادہ تر لوگوں نے لکھنو کے حق میں فیصلہ کیا۔

فیصلہ ہونے کے بعد یہ قرار پایا کہ دارالعلوم کے ابتدائی درجات کا فوراً آغاز کر دیا جائے۔ غرض اس کام کے لیے مولانا علیؒ چند اشخاص کے ساتھ لکھنو پہنچے، ان لوگوں کا استقبال کرنے کے لیے منشی احتشام علی رئیس کاکوروی پہلے سے حاضر تھے۔ مولانا علیؒ اور ان کے ساتھیوں نے لکھنو آنے کی وجہ بتائی۔ منشی احتشام نے بڑی فراخ دلی سے اپنی دو جگہ کی زمین کی پیش کش کی۔ عصر کے بعد یہ لوگ زمین دیکھنے گیے اور بر ورہ حسن باڑی والے حصے کو منتخب کیا۔ منشی صاحب نے بخوشی اس کو دارالعلوم کی نذر کر دیا۔ جب تک دارالعلوم کی اپنی کوئی بلڈنگ نہیں بن جاتی اس وقت تک کے لیے منشی احتشام صاحب نے محلہ گولہ گنج میں خاتون منزل نامی بلڈنگ کو خرید کر ندوہ کے سپرد کر دیا۔ اس عمارت میں دارالعلوم کا عملی طور پر آغاز ہوا۔ 1897ء تک ندوہ کا مرکزی دفتر کانپور ہی میں تھا لیکن اس فیصلے کے بعد 2 ستمبر 1898ء کو لکھنو منتقل ہو گیا۔ 4/اکتوبر 1898ء کو اس کی افتتاحی تقریب رکھی گئی۔ جس میں اہل علم اور معزز افراد نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ مولانا حفیظ اللہ دارالعلوم کے پہلے مہتمم قرار دیے گئے۔ جس منصوبے کے تحت اس ادارے کا قیام وجود میں آیا تھا اس کے لیے ایک کثیر سرمائے کی ضرورت تھی۔ جس کے لیے ملک بھر میں چندے کی مہم شروع کی گئی اور لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء، دارالافتاء اور اسلام کی اشاعت کا خرچ تقریباً دس سے بارہ لاکھ کا تخمینہ لگایا گیا اس کو کس طرح حاصل کیا جائے اس پر عمل درآمد کے لیے تجاویز پیش کی گئیں۔

1. ہندوستان کے چھ کروڑ مسلمانوں سے چار کروڑ مسلمانوں سے فی کس چار آنے وصول کیے جائیں تو ایک کروڑ روپیہ وصول ہو سکتا

ہے۔

2. ہر شخص اپنے اوپر لازم کرلے کہ جس وقت وہ اپنی ضرورت سے روپیہ خوردہ کرائے تو ایک پیسہ اس کام کے لیے علاحدہ کرے۔

3. برادری میں اس بات پر عہد ہو جائے کہ تقریبات شادی، ختنہ، عقیقہ اور نکاح وغیرہ کے موقع پر اس اہم دینی کام کے لیے معتد بہ رقم دی جائے۔

4. اپنی پہلی تنخواہ یا اس کا ایک حصہ ندوے کے لیے نکالیں، جیسا کہ میرٹھ کے عالی ہمتوں نے کیا ہے۔

5. سوداگر اور ٹھیکیدار اپنے نفع میں سے ایک قلیل مقدار اس مذہبی خدمت کے لیے جدا کرتے جائیں۔

6. مسجدوں اور عام نشست گاہوں میں مقفل امدادی صندوق رکھے جائیں۔

7. لاولد مالدار مسلمان اپنی جائداد اور دیگر اموال ایسے کاموں کے لیے وقف کردیں۔(ص196-197)

15.3.6 نظام تعلیم

جس مقصد کے تحت اس ادارے کا قیام وجود میں آیا اس کو حاصل کرنے کے لیے تین حصے کیے گئے۔ اول: درجہ ادنی، دوم: درجہ متوسط، سوم: درجہ اعلیٰ۔

درجہ ادنی

اس کی مدت خواندگی تین سال رکھی گئی ہے اور اس کے نصاب میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ علوم عربیہ اور دینیات میں بقدر ضرورت طلبا کو دسترس حاصل ہو جائے۔ مقصود یہ ہے کہ طالب علم عربی سے اس طرح واقف ہو جائے کہ جب چاہے اس میں مہارت حاصل کرسکے۔ اس کے علاوہ قرآن، حدیث، فقہ اور عقائد سے بھی شناسائی ہو جائے۔

درجہ متوسط

اس کی مدت خواندگی 5 سال ہے۔ اس میں وہ لوگ جو علوم متداولہ میں مہارت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں سے فارغ ہونے پر طالب علم کو ہر علم میں صلاحیت پیدا ہو جائے گی اور وہ جس میدان میں چاہے کمال حاصل کرسکے گا۔ یہ نہ ہو کہ طلبہ متنبی اور حریری کو پڑھ لیں لیکن دولائن عربی کی نہ لکھ سکیں، اگر لکھنا آجائے تو پانچ منٹ عربی میں بات چیت نہ کرسکیں۔ ان سب کے باوجود قرآن کو تجوید سے نہ پڑھ سکیں بلکہ قرآن مجید اور حدیث پر بہت زیادہ توجہ دی جائے۔

درجہ اعلیٰ

اس کی مدت دو سال ہے۔ اس کا مقصد صرف قوت قریبہ اور مہارت پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ مطالعے کی عادت کے ساتھ استیعاب مسائل اور تبحر علمی پیدا کرنا ہے۔ طالب علم کی دلچسپی کو مد نظر رکھتے ہوئے کسی خاص فن کی تکمیل کرائی جائے گی کیوں کہ ایک شخص تمام علموں کی باریکیوں کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ اس درجہ سے فارغ ہونے کے بعد طلبہ کو خاص لقب سے نوازا جائے گا۔ مثلاً مفسر، محدث، فقیہ

وغیرہ۔

15.4 بانیان تحریک

اس تحریک کے محرک اور اس تحریک میں جان پھونکنے والوں میں جن شخصیات کو زیادہ شہرت ملی ان میں سے چار نام کا ذکر درج ذیل ہے۔

مولانا سید علی مونگیری، علامہ شبلی نعمانی، مولانا حکیم سید عبدالحی، مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی

مولانا سید علی مونگیری(1846-1927ء)

مولانا سید علی مونگیری(1846-1927ء) کو اس تحریک کا ابتدائی معمار شمار کیا جاتا ہے۔ تعلیمی سلسلہ مکمل کرنے کے بعد آپ نے مدرسہ فیض عام کانپور ڈھائی تین سال تک درس حدیث دیا۔ مدرسہ فیض عام میں ہی آپ نے ایک انجمن "انجمن تہذیب" کے نام سے قائم کی جس نے آگے بڑھ کر تحریک ندوہ کی شکل اختیار کرلی۔ فیض عام کے جلسے میں ہی آپ نے ندوۃ العلماء کے قیام کی تحریک شروع کی جس پر لوگوں نے لبیک کہا۔ 1894ء میں ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا اور آپ کو اس کا ناظم منتخب کیا گیا۔ آپ نے اس ذمہ داری کو بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا۔ ندوۃ تحریک، قیام، مقاصد اور تعارف کے لیے آپ نے بڑے پیمانے پر مہم شروع کی۔ آپ کی ہی نظامت میں ندوہ کا مجوزہ خاکہ ترتیب دیا گیا۔

شبلی نعمانی(1857-1914ء)

ندوہ کے معماروں میں دوسرا سب سے اہم نام علامہ شبلی نعمانی کا ہے۔ جن کا تعلق اعظم گڈھ سے ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وکالت اور تجارت کی لیکن ان کی طبیعت ان سب کاموں نہ لگی۔ بالآخر 1883ء میں ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں استاد کی حیثیت سے جوائن ہوئے۔ سرسید کے ساتھ آپ نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے لیکن ان کے سیاسی نظریات مختلف ہونے کی وجہ سے وہ علی گڑھ سے سبکدوش ہوگئے۔ انہی ایام میں ندوۃ العلماء تحریک کا سلسلہ شروع ہوا تھا اور اس تحریک سے متاثر ہو کر علی گڑھ سے الگ ہونے کے بعد اس تحریک سے جڑ گیے۔ ندوہ آنے کے بعد آپ کو معتمد کی ذمہ داری دی گئی۔ اس کے علاوہ آپ ایک اچھے سیرت نگار اور سوانح نگار، عربی، فارسی اور اردو کے بہترین نقاد اور ادیب وشاعر بھی شمار کیے جاتے ہیں۔

مولانا حکیم سید عبدالحی(1869-1923ء)

آپ کا تعلق بریلی سے تھا، پڑھے لکھے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ تحصیل علم کی فراغت کے بعد آپ نے ہندوستان کے مشہور دینی وعلمی مراکز کا سفر کیا جو دہلی اور مغربی یوپی کے اطراف میں واقع تھا۔ وہاں پر درس میں شرکت حاصل کرکے حدیث کی اجازت حاصل کی اور علمی وباطنی استفادہ کیا۔ تحریک ندوۃ العلماء کی تحریک نے آپ کو بھی متاثر کیا اور اس کے جلسوں میں حاضری دیتے رہے۔ آپ کو ندوہ کے پہلے ناظم مولانا محمد علی مونگیری کے تحت کام کرنے کا شرف حاصل ہوا اور مددگار ناظم کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں۔ 1915ء

میں آپ کو نظامت کی ذمہ داری دی گئی جس کو آپ نے آخری عمر تک بڑی خوش اسلوبی سے ادا کیا۔ آپ کے دور نظامت میں ندوہ کے سامنے کئی چیلنجز آئے لیکن آپ کے پیروں میں لغزش نہ آئی اور آپ نے ثابت قدمی سے ان مشکلات کا سامنا کیا۔

مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی (1867-1950ء)

آپ علی گڑھ کے قریب بھیکم پور گاؤں میں پیدا ہوئے۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد آپ دکن میں صدر الصدور کی حیثیت سے منتخب ہوئے، دینی خدمت ادا کرنے کے لیے آپ نے یہ عہدہ قبول کیا۔ نظام نے مذہبی امور کی ذمہ داری آپ کے سپرد کی اور 13 سال تک وہ اس عہدے پر فائز رہے۔ جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد) کے قیام میں بھی آپ کا تعاون رہا۔ شروعاتی دور سے آپ کو ندوہ اور علی گڑھ تحریک سے خاصا لگاؤ تھا۔ ندوہ کے باقاعدہ طور پر ممبر رہے اور تین مرتبہ سالانہ جلسوں کی صدارت کی۔ 'الندوہ' جب نکلا تو مولانا شبلی کے شریک ادارت بھی سنبھالی اور علمی و تحقیقی مضامین سے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ علی گڑھ میں ایک عرصے تک شعبہ دینیات کے اعزازی صدر رہے۔

15.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- ندوہ کے قائم ہونے سے پہلے جتنے بھی مدارس تھے، ان کے یہاں نصاب تعلیم میں معقولات (حکمت، فلسفہ اور منطق کا علوم) پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ استاد اور طالب علم کا بیش قیمتی وقت اس پر بہت زیادہ خرچ ہوتا تھا اس کے بالمقابل قرآن، حدیث و فقہ پر اتنی خصوصی توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ جتنے بھی مدارس موجود تھے تہذیب و تمدن کے بدلاؤ سے ان کی حیثیت کمزور ہو چکی تھی، جدید افکار و نظریات کی تبدیلی سے ان کی واقفیت نہ تھی۔
- مولانا سید علی مونگیری نے ناظم بننے کے بعد مولانا مشتاق علی کو ذمہ داری سونپی کہ وہ ہندوستان میں ندوہ کا تعارف کرائیں۔ آپ نے بڑی خوش اسلوبی سے اس ذمہ داری کو پورا کیا اس کے لیے انہوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا اسکے علاوہ جدہ، مکہ و مدینہ منورہ کا بھی دورہ کیا۔ عوام و خواص دونوں حلقوں میں اس تحریک کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ ندوہ کے وفد کو لیا۔ غرض ملک کے سبھی مختلف المسالک و مکاتب فکر کے اشخاص نے جس جوش و جذبے سے اس تحریک کا استقبال کیا اس کی مثال ہندوستان میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔
- اس تحریک کے محرک اور اس تحریک میں جان پھونکنے والوں میں جن شخصیات کو زیادہ شہرت ملی ان میں سے چار نام قابل ذکر ہے۔ مولانا سید علی مونگیری، علامہ شبلی نعمانی، مولانا حکیم سید عبدالحی، مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی وغیرہ۔
- مولانا سید علی مونگیری (1846-1927) کو اس تحریک کا ابتدائی معمار شمار کیا جاتا ہے۔ تعلیمی سلسلہ مکمل کرنے کے بعد آپ نے مدرسہ فیض عام کانپور ڈھائی تین سال تک درس حدیث دیا۔ مدرسہ فیض عام میں ہی آپ نے ایک انجمن "انجمن تہذیب" کے

نام سے قائم کی۔ جس نے آگے بڑھ کر تحریک ندوہ کی شکل اختیار کرلی۔ فیض عام کے جلسہ میں ہی آپ نے ندوۃ العلماء کے قیام کی تحریک شروع کی تھی اور لوگوں نے جس پر لبیک کہا۔ 1894ء میں ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا اور آپ کو اس کا ناظم منتخب کیا گیا۔

15.6 کلیدی الفاظ

علوم متداولہ	:	وہ علوم جو عام طور سے رائج ہوں
رواں دواں	:	منہمک، مشغول و مصروف
خمیازہ	:	مکافات، نتیجہ، سزا یا بدلہ
پشت پناہی	:	حمایت، تعاون، مدد
جاہ وحشم	:	شان وشوکت، جاہ وجلال

15.7 نمونہ امتحانی سوالات

15.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. ندوہ تحریک کی بنیاد کس نے ڈالی؟

(a). محمد علی مونگیری (b). مولانا قاسم نانوتوی (c). سر سید احمد خاں (d). محسن الملک

2. تحریک دارالعلوم دیوبند کے قائد کون تھے؟

(a). مولانا قاسم نانوتوی (b). مولانا محمود مدنی (c). سید جلال الدین عمری (d). حسین احمد مدنی

3. تحریک علی گڑھ کے قائد کون تھے؟

(a). سر سید احمد خاں (b). پی۔ کے عبدالعزیز (c). اسلم جیراج پوری (d). شبلی نعمانی

4. دارالعلوم ندوۃ العلماء کب قائم ہوا؟

(a). 1898ء (b). 1920ء (c). 1866ء (d). 1877ء

5. دارالعلوم ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس کہاں ہوا؟

(a). مدرسہ فیض عام (b). علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (c). دارالعلوم دیوبند (d). جامعہ نظامیہ

6. انجمن تہذیب کس نے قائم کیا؟

(a). محمد علی مونگیری (b). مولانا قاسم نانوتوی (c). سر سید احمد خاں (d). شبلی نعمانی

7. ندوہ کے پہلے ناظم کون تھے؟

(a). محمد علی مونگیری (b). شبلی نعمانی (c). ابوالحسن علی ندوی (d). سب غلط

8. ندوہ کے تعارف کے لیے محمد علی مونگیری نے کس کو ذمہ داری سونپی؟

(a). مولانا مشتاق علی (b). اشرف علی تھانوی (c). مولانا قاسم نانوتوی (d). تمام صحیح

9. دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لیے پہلے کس نے اپنی زمین وقف کی؟

(a). منشی احتشام علی رئیس (b). مستنصر باللہ (c). ابوالعباس سفاح (d). عمر بن عبد العزیز

10. دارالعلوم ندوۃ العلماء کے پہلے مہتمم کا نام بتائیں؟

(a). مولانا حفیظ اللہ (b). شبلی نعمانی (c). مولانا مشتاق علی (d). مولانا عبد الحق

15.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. قیام ندوہ سے پہلے کا سیاسی منظر نامہ پیش کیجیے۔
2. دارالعلوم ندوۃ کے لکھنو قیام پر مضمون لکھیے۔
3. ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد پر بحث کیجیے۔
4. دارالعلوم ندوۃ کے لیے چندے کی جو تجاویز پیش کی گئیں ان کا جائزہ لیجیے۔
5. ندوہ کے نظام تعلیم پر نوٹ لکھیے۔

15.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. ندوۃ العلماء کے قیام کے پس منظر بیان کیجیے۔
2. بانیان تحریک پر مفصل مضمون تحریر کیجیے۔
3. رائج نصاب تعلیم پر مضمون قلم بند کیجیے۔

15.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تاریخ ندوہ	:	مولوی محمد اسحاق جلیس ندوی
2. 1947 کے بعد ہندوستان میں اسلامی تحریکیں	:	ڈاکٹر اقتدار احمد خاں
3. سیرت مولانا سید علی مونگیری	:	مولانا سید محمد الحسنی
4. حیات عبد الحی	:	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

اکائی 16: جامعہ ملیہ اسلامیہ

اکائی کے اجزا:

16.0 تمہید
16.1 مقاصد
16.2 جامعہ ملیہ اسلامیہ
16.2.1 جامعہ کے قیام کا پس منظر
16.2.2 جامعہ کی تاسیس
16.2.3 جامعہ کے تاریخی مراحل
16.2.4 جامعہ کے قیام کے اغراض مقاصد
16.2.5 جامعہ کے شعبہ جات
16.3 جامعہ ملیہ اسلامیہ کے چند اہم شعبہ جات کا تعارف
16.3.1 جامعہ کی کارکردگی
16.4 اکتسابی نتائج
16.5 نمونہ امتحانی سوالات
16.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
16.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
16.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
16.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

16.0 تمہید

ہر ملک میں اس کے تعلیمی اداروں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ ملک کے استحکام اور اس کے ارتقاء میں قوت متحرکہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تعلیمی اداروں کی اسی اہمیت کے پیش نظر تحریک آزادی کے عظیم رہنماؤں نے ہندوستانی عوام بالخصوص مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کو دور کرنے کے لئے تحریکیں شروع کیں اور ادارے قائم کئے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ تحریک آزادی کی کوکھ سے جنم لینے والا ایک ایسا ہی قومی تعلیمی ادارہ ہے جو ہندوستان میں قومی یکجہتی و متحدہ قومیت کی نشانی اور جمہوری و سیکولر روایت کا امین ہے بانیان جامعہ نے جن مقاصد کے تحت اس ادارہ کو قائم کیا تھا اپنے قیام سے لے کر تا حال یہ ادارہ ان کو عملی جامہ پہنانے میں لگا ہوا ہے۔ اس اکائی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مکمل تفصیلات بیان کی گئی ہے۔

16.1 مقاصد

اس اکائی کے مقاصد یہ ہیں کہ آپ ہندوستان کے مشہور ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام، اس کا پس منظر، تاریخ، تعلیمی نظام اور اغراض و مقاصد سے پوری طرح متعارف ہوں۔ اس اکائی کا مقصد یہ بھی ہے کہ طلبہ اس ادارہ کی خدمات اور کارکردگی سے واقف ہو کر اپنے اندر یہ جذبہ پیدا کریں کہ وہ ملک و ملت کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔

16.2 جامعہ ملیہ اسلامیہ

16.2.1 جامعہ کے قیام کا پس منظر

جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ہندوستان کی تحریک آزادی کے نتیجہ میں ابھرنے والے قومی جذبات، احساسات اور خیالات کا ایک مثالی تعلیمی اور تہذیبی ادارہ ہے۔ جب ہندوستان میں تحریک آزادی زوروں پر تھی اور ملک کی عوام اپنے رہنماؤں کے ساتھ برطانوی حکومت کے ظلم و ستم کے خلاف ملک کی آزادی کے لئے متحدہ جدوجہد کر رہے تھے۔ اس وقت تحریک آزادی کے عظیم رہنما موہن داس کرم چند گاندھی جی نے خلافت اور عدم تعاون کی تحریکات کے دوران سرکاری امداد سے چلنے والے تعلیمی اداروں کے بائیکاٹ کی صدا لگائی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عوام ہر سطح پر عدم تعاون کا رویہ اپنا کر حکومت پر یہ دباؤ بنائیں کہ حکومت برطانیہ ہندوستان کو آزاد کرے۔ دوسری طرف خلافت تحریک بھی برطانوی حکومت سے مطالبہ کر رہی تھی کہ وہ مسلمانوں کے سیاسی ادارہ خلافت کو ختم نہ کرے۔ ان حالات میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے محرک وہ طلبہ تھے جو خلافت کانفرنس اور تحریک عدم تعاون سے اتفاق رکھتے تھے جیسا کہ گاندھی جی نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، علی گڑھ میں زیر تعلیم طلبہ کے والدین کے نام ایک اپیل جاری کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں سمجھتا ہوں کہ علی گڑھ کے طلبہ کے والدین بھی دوسرے والدین کی طرح اس ضرورت کا احساس کرتے ہوں گے کہ اپنے بچوں کو سرکار سے امداد پانے والے اسکولوں اور کالجوں سے نکال لیں جس نے مسلمانوں کے ساتھ غداری کی اور پنجاب میں اپنے ظالمانہ رویہ سے پوری قوم کی توہین کی ہے۔ کاش آپ کو یہ احساس ہوتا

کہ وطن عزیز کا مقدر ہم والدین کے ساتھ نہیں بلکہ ہمارے بچوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ کیا ہم انہیں اس غلامی کی لعنت سے جس نے انہیں پیٹ کے بل رینگنے پر مجبور کر دیا ہے چھٹکارہ نہ دلائیں گے ؟

"اس اپیل کے نتیجے میں علی گڑھ کے طلبہ یونین ہال میں جلسہ کر کے کالج کے ذمہ داروں سے یہ کہنے لگے کہ اس ادارہ کو بھی سرکاری سرپرستی سے آزاد کیا جائے۔ طلبہ کی اس تحریک کا اثر کالج کے ذمہ داروں پر تو نہیں ہوا لیکن طلبہ و اساتذہ کی ایک بڑی تعداد نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی قیادت میں جو اس وقت کالج کے طالب علم تھے رہبران وطن کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے کالج کو خیر آباد کہہ کر علی گڑھ ہی میں دیار شوق اور شہر آرزو کی بستی بسانے کے لئے خیمہ زن ہو گئے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ گویا یہ ادارہ تحریک آزادی کے زیر اثر قومی زندگی کے ہر شعبے بالخصوص تعلیم کو برطانوی اثرات سے محفوظ رکھنے کی جدوجہد کی ایک روشن علامت ہے ساتھ ہی ساتھ یہ ادارہ قومی تعلیمی نظام کی ضرورت کی تکمیل کا ذمہ دار بھی ہے جس میں ملک کی تہذیبی و ثقافتی اور قومی و اسلامی اقدار کا ایک امتزاج موجود ہے۔"

16.2.2 جامعہ کی تاسیس

جامعہ ملیہ کا سنگ بنیاد 29 اکتوبر 1920 کو ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ کی مسجد میں بعد نماز جمعہ شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ہاتھوں رکھا گیا۔ جو شدید علالت کے باوجود علی گڑھ تشریف لائے جب کہ ان کا لکھا ہوا افتتاحی خطبہ مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھا۔ اس کے پہلے امیر الجامعہ (چانسلر) حکیم اجمل خاں اور پہلے شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) مولانا محمد علی جوہر بنائے گئے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ جو 1920 میں بے سروسامانی کے عالم میں علی گڑھ میں چند خیموں میں وجود میں آئی تھی آج ہندوستان کی ایک مایہ ناز مرکزی یونیورسٹی کی صورت میں دہلی میں فروغ پزیر ہے اور علم کی شعاعوں سے ملک و قوم کو منور کر رہی ہے۔ یہ ان بے لوث محسنوں کی قربانیوں کا نتیجہ ہے جنہوں نے اپنے جذبوں کی قوت اور افکار کی وسعت سے ایک علم کی بستی آباد کر دی تھی۔

ملک میں تحریک آزادی کے زیر اثر جتنے بھی ادارے وجود میں آئے ان میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کو اس لحاظ سے ایک امتیاز حاصل ہے کہ اس کے بانیان اور معماروں میں بیشتر وہی شخصیات تھیں جو ملک کی آزادی کے اہم رہنما تھے مثلاً مہاتما گاندھی، مولانا محمود حسن، مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا ابو الکلام آزاد ان ہی لوگوں نے اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی اور اسے حالات کے نشیب و فراز سے بچاتے ہوئے اور تمام تر مشکلات و مصائب کو برداشت کرتے ہوئے ترقی کی راہ پر گامزن رکھا اور اس کے بعد دہلی میں اس ادارے کو زندگی نو دینے والوں میں سر فہرست ڈاکٹر ذاکر حسین، عبد المجید خواجہ، پروفیسر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب اور ان کے رفقاء کا اہم کردار ہے۔ اس لیے ان لوگوں کے نام بھی بانیان جامعہ میں شمار ہوتے ہیں۔

16.2.3 جامعہ کے تاریخی مراحل

جامعہ ملیہ اسلامیہ اپنے قیام کے بعد پانچ سال تک علی گڑھ ہی میں چلتا رہا۔ شروع میں شہر کے عوام، بہی خواہوں اور قائدین نے اس کے اخراجات کی ذمہ داری اٹھائی اور قومی رہنما اس کی سرپرستی کرتے رہے۔ لیکن قومی رہنماؤں کے بار بار قید و بند ہونے اور دہلی سے دور ہونے کی وجہ سے امیر الجامعہ حکیم اجمل خاں کو بھی اس کے انتظام و انصرام اور دیکھ بھال کرنے میں دشواریاں ہونے لگیں اس لئے ان

کے مشورے پر جولائی 1925 میں جامعہ کو قرول باغ دہلی میں طیبہ کالج سے ملحق کرائے کی عمارتوں میں منتقل کر دیا گیا۔اس طرح یہ ادارہ علی گڑھ کے بعد دہلی میں چھ سال تک کرائے کی عمارتوں میں چلتا رہا۔ پھر امیر الجامعہ حکیم اجمل خاں کی وفات کے بعد ان کے جانشین ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی رہنمائی میں جب اوکھلا گاؤں میں زمین خرید کر 1931 میں اس ادارہ کی پہلی عمارت تعمیر ہونا شروع ہوئی تو 1935 میں جامعہ نگر کے نام سے موسوم علاقہ کو جامعہ کی مستقل قیام گاہ بنادیا گیا جہاں آج جامعہ اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ میں "عدم تعاون کے زمانے کے اس شوخ اور دل آویز بچہ کو، آج تندرست و توانا نوجوان کی شکل میں مرکزی ادارہ کی حیثیت حاصل ہے۔اس مقام تک پہنچنے کے لئے اس ادارہ کو کئی مرتبہ مشکل حالات سے بھی گزرنا پڑا۔

شروع میں جامعہ کی مالی اعانت بڑی حد تک خلافت کمیٹی کے فنڈ سے کی جاتی تھی لیکن بعد میں جب اہل جامعہ نے یہ فیصلہ کیا کہ ذہنی آزادی برقرار رکھنے کے لئے اسے خلافت کمیٹی کا دست نگر نہیں رہنا چاہئے تاکہ جامعہ ایک خود مختار ادارہ بن سکے۔ مگر یہ تصور اپنے ساتھ سخت مالی دشواریاں بھی لے کر آیا۔1924 میں شدید مالی بحران کی وجہ سے جامعہ کا وجود خطرے میں پڑ گیا اور جامعہ کو بند کئے جانے کی تجویز آنے لگیں لیکن اکابرین جامعہ حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار انصاری اور عبدالمجید خواجہ وغیرہ نے فیصلہ کیا کہ اسے بند نہیں کیا جاسکتا۔ان لوگوں نے اس دشواری سے نجات کی بروقت صورت یہ نکالی کہ اسے دہلی منتقل کر دیا جائے لہٰذا وسائل کی سخت قلت کے باوجود جامعہ ملیہ اسلامیہ کو باقی و برقرار رکھا گیا اور دہلی منتقل کر دیا گیا۔

دہلی میں جامعہ کو دوبارہ زندگی دینے میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے دو ساتھی ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب کی قربانیوں کو اہل جامعہ کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔اس دوران ڈاکٹر ذاکر حسین اعلیٰ تعلیم کے لئے جرمنی جا چکے تھے جہاں ان کے ساتھ مذکورہ بالا دونوں رفقاء بھی تھے ان لوگوں نے جرمنی سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد 1926 میں جامعہ واپس آکر یہ عہد کیا کہ اس تعلیمی و تہذیبی جدوجہد کے چراغ کو ہر حال میں روشن رکھیں گے۔اس کے بعد ایک نئے جوش و حوصلہ کے ساتھ جامعہ کو ایک مثالی تعلیمی ادارہ بنانے کی صبر آزما تگ و دو شروع ہوئی جس میں ایک طرف تعلیم و تربیت کے ذریعہ طلبہ کی کردار سازی، اسلام کی اصل روح کا شعور قومی اقدار سے واقف کرانے اور انہیں قومی یکجہتی کے جذبات سے سرشار کرنے کی خاطر جتن کئے گئے، وہیں دوسری جانب ادارے کو مالی دشواریوں سے نکالنے کے لئے ملک بھر میں اہل خیر افراد سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا گیا یہاں تک کہ 1939 میں گاندھی جی کو بھی لکھنا پڑا کہ جامعہ وہ واحد ادارہ ہے جس کے پاس وہ ایثار شیوہ کارکن تھے جو سچے مسلمان بھی تھے اور راسخ قوم پرست بھی تھے۔ڈاکٹر ذاکر حسین نے جامعہ کے کارکنوں کی اس بے مثال ایثار و قربانی کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا:

"یہ قوم کے بچوں کے لئے اپنی جانیں کھپاتے رہے ہیں اور خود ان کے بچے اچھی غذا اور اچھے لباس کے لئے ترسے ہیں۔یہ قوم کی ذہنی زندگی کے لئے اپنا سب کچھ تج کر چکے ہیں اور خود ان کی ذہنی غذا کی فراہمی کا ٹھیک انتظام نہیں ہو سکا۔یہ کتابوں کو ترستے ہیں، تحقیقی وسائل کو ترستے ہیں، انہیں مہینوں ان کے حقیر معاوضے نہیں ملتے اور پھر کہیں سے روپیہ آجاتا ہے تو یہ پہلے جامعہ کے لئے زمین خریدواتے ہیں اور اپنے مطالبات کو مؤخر کر دیتے ہیں۔"

15 اگست 1947 کو جب ہندوستان پر آزادی کا آفتاب طلوع ہوا تو جامعہ نے بھی آزادی کی فضا میں اپنی پرواز تیز کر دی اور اس میں کبھی کوتاہی نہ آنے دی، جواہر لال نہرو نے بھی 1948 میں ڈاکٹر ذاکر حسین کو لکھا کہ اس واقعہ میں شک کی گنجائش نہیں کہ بہت کم ادارے اپنے امتیازی مطمح نظر اور مقصد کی توانائی اور حرارت کو بچائے رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں وقت کے ساتھ ان کے معاملات بے کیف ہو جاتے ہیں۔ اس ولولہ سے محروم جس نے انہیں حیات بخشی تھی۔ میں اس حقیقت پر جتنا غور کرتا ہوں اسی قدر یہ تاثر پختہ ہوتا جاتا ہے کہ جامعہ ہی وہ واحد ادارہ ہے جس نے اپنے قدیم محرکات اور اپنے ابتدائی جوش و خروش کو باقی رکھا ہے۔ آزادی کے بعد حکومت ہند نے بھی جامعہ کے مثالی کردار کو سراہتے ہوئے قومی تعلیم کا اہم مرکز قرار دیا ہے۔ 1962 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کو یونیورسٹی گرانٹ کمیشن ایکٹ کی دفعہ 3 کے تحت ڈیمڈ یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا۔ اور 1988 میں ہندوستانی پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے تحت اس کو مرکزی یونیورسٹی کی حیثیت دی گئی۔ اس کے بعد سے اب تک اس ادارے نے ترقی کے کتنے ہی مدارج و مراحل طے کئے ہیں۔ اور جس جوش و خروش اور توانائی و حرارت کا ذکر جواہر لال نہرو نے کیا تھا جامعہ کے دیوانوں کے اندر نہ صرف باقی ہے بلکہ اپنے داغ کو روشن رکھنے کی بھرپور کوشش بھی کی ہے۔

16.2.4 جامعہ کے قیام کے اغراض مقاصد

جس طرح تحریک آزادی کے اہم مقاصد میں ملک کو برطانوی تسلط سے آزاد کرا کر عوام کو تعلیمی، معاشی اور سماجی پس ماندگی سے نجات دلانا تھا اسی طرح جامعہ کے تعلیمی منشور میں ایک مشترک ہندوستانی قومیت کی تشکیل اور ذہنی جمود کے مقابلے اجتہادی فکر کو فروغ دینا تھا۔ جیسا کہ شیخ الہند مولانا محمود حسن نے اپنے افتتاحی خطبہ میں جامعہ کے قیام کا مقصد بتاتے ہوئے کہا تھا کہ مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر سے مطلقاً آزاد کیا باعتبار عقائد و خیالات اور کیا باعتبار اخلاق و اعمال ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں اور ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیئے کہ ہم اپنے کالجوں سے سستے غلام پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں۔ یہی وہ بنیادی مقاصد تھے جو بعد میں بھی اکابرین جامعہ کے پیش نظر رہے۔ پہلے امیر جامعہ حکیم اجمل خاں کے الفاظ میں ہم نے اصولی حیثیت سے تعلیم کو صحیح شاہراہ پر ڈال دیا ہے اور جہاں ہم نے سچے مسلمان پیدا کرنے کی تدبیر اختیار کیں وہیں اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا کہ تعلیم و تربیت میں ماحول کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے اور اسلامیات کے ساتھ ساتھ وطن کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا بھی ہمارے پیش نظر ہے۔ اس طرح پہلے شیخ الجامعہ مولانا محمد علی جوہر نے 1925 میں کہا تھا کہ جامعہ کے قیام کا پہلا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو حق دوست اور حق پرست بنانا اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ ان کو وطن دوست و حریت پرور ہندوستانی بنایا جائے۔

اس طرح معماران نے جامعہ میں اسلامی روایات کے ساتھ متحدہ قومیت کو شامل کر کے دینی و عصری تعلیم کا سنگم، تعلیم و ضمیر کی آزادی، وطن دوستی و حریت پروری اور سادگی و بلند ہمتی کو اہل شوق کا نصب العین اور سرپھروں کا مطمح نظر قرار دیا۔ جامعہ اپنے قیام کے پہلے دن سے انہی مقاصد کے حصول کے لئے کوشاں ہے۔ جیسا کہ جامعہ نے اپنی پہلی مجلس تاسیسی کے وقت جو اپنی تعلیمی پالیسی بنائی تھی اس کی خاص باتیں یہ تھیں کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں سبھی مذاہب و مسالک کے طلبہ کو داخلہ دیا جائے گا اور ہر طالب علم کے لئے اس کے مذہب کی

تعلیم کا انتظام ہو گا لہذا یہاں ہر طالب علم کے لئے عصری تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کو بھی لازمی مضمون کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ دوسرا انقلابی فیصلہ یہاں کا ذریعہ تعلیم اردو ہو گا اور انگریزی کی تعلیم ثانوی زبان کی حیثیت سے دی جائے گی جامعہ میں طلبہ کو یہ اختیار ہے کہ وہ اپنا امتحان اردو، ہندی اور انگریزی میں سے کسی بھی زبان میں دے سکتے ہیں تیسرے پیشہ وارانہ تعلیم کے لئے باقاعدہ صنعت و حرفت کی تعلیم کے شعبے قائم ہیں جہاں طلبہ اپنے ذوق کے مطابق تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔

حکومت نے بھی اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ جامعہ اپنے اغراض و مقاصد کے تحت جن کا ذکر اس کے دستور میں کیا گیا ہے کہ ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کی سیکولر اور مذہبی تعلیم کا انتظام کرے گی اور قومی زندگی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھے گی۔ جامعہ نے زمانے کے نئے تقاضوں کے تحت اپنے اندر تبدیلیاں پیدا کیں ہیں۔ اس نے نئی اور پرانی قدروں کے امتزاج سے اپنا ایک مخصوص طور و طریقہ متعین کیا ہے اور اپنا قومی اور اسلامی موقف اور مطمح نظر ہمیشہ قائم رکھا ہے۔

16.2.5 جامعہ کے شعبہ جات

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا شمار ملک کے اہم تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے۔ دوسری یونیورسٹیوں کی طرح جامعہ میں بھی مختلف علوم مثلاً سماجی علوم، زبان و ادب، تعلیم اور سائنس و ٹکنالوجی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہاں کے ماس کمیونی کیشن، بایولوجیکل سائنسز، انجینئرنگ اور تعلیم کے شعبے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ جامعہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور وزارات تعلیم کے تحت ہے اور اس کی ڈگریاں دوسری یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کی مساوی اور تسلیم شدہ ہیں۔

جامعہ میں 11 فیکلٹیز، 37 ڈپارٹمنٹس، 25 سینٹر اور 6 اسکول ہیں جن میں تقریباً 175 کورسیز ہیں۔ جامعہ کا خاص امتیاز یہ ہے کہ یہاں نرسری و ابتدائی درجات سے لے کر اعلیٰ تحقیق تک کی تعلیم و تدریس کا انتظام ہے۔ جامعہ کے مختلف تعلیمی مراکز اور شعبہ جات اس طرح ہیں:

جامعہ میں نرسری، مڈل اور سینئر سکنڈری اسکول ہیں جامعہ نرسری اسکول میں تین سے چھ سال کے بچوں کو عام طریقے سے ہٹ کر کھیل کود اور بامقصد تفریح کے ذریعہ تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ مڈل اسکول میں پہلی سے آٹھویں اور سینئر سیکنڈری اسکول میں نویں سے بارہویں جماعت تک کی تعلیم کا انتظام ہے۔ مڈل اور سینئر سیکنڈری اسکول علاحدہ دو شفٹ میں مخلوط تعلیم کے لئے ہیں جبکہ مزید ایک اسکول صرف لڑکیوں کی تعلیم کے لئے بھی ہے جامعہ نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں تدریس کے بالکل نئے طریقوں کا استعمال کر کے دیگر اداروں سے الگ اپنا ایک معیار قائم کیا ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے لئے فیکلٹی آف ہیومنٹیز اینڈ لینگویجیز، فیکلٹی آف سوشل سائنسز، فیکلٹی آف ایجوکیشن، فیکلٹی آف سائنسز، فیکلٹی آف لائف سائنسز، فیکلٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹکنالوجی، فیکلٹی آف لاء، فیکلٹی آف آرکیٹیکچر، فیکلٹی آف فائن آرٹ اور فیکلٹی آف ڈینٹسٹری۔ اس کے علاوہ سینٹرس میں اے جے قدوائی ماس کمیونی کیشن ریسرچ سینٹر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، مولانا محمد علی جوہر اکیڈمی آف انٹرنیشنل اسٹڈیز اور سینٹر فار کمپریٹیو ریلیجنس اینڈ سویلائزیشن کو خاص شہرت حاصل ہے۔ دیگر مراکز میں یونیورسٹی پالی ٹیکنیک،

ارجن سنگھ سینٹر فار ڈسٹینس اینڈ اوپن لرننگ، سینٹر فار انفارمیشن اینڈ ٹکنالوجی سینٹر فار کوچنگ اینڈ کیریر پلاننگ اور چائلڈ گائڈینس سینٹر بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو اگرچہ اعلیٰ تعلیم کے مرکز کی حیثیت سے قائم کیا گیا تھا مگر وسائل کی قلت کے سبب اس کا دائرہ کار شروع میں صرف ابتدائی اور ثانوی تعلیم تک محدود رہا اور بعد میں اس کی مرحلہ وار توسیع ہوتی رہی۔

جامعہ کی یہ توسیع اس کے اکابرین کے مقاصد کے عین مطابق ہوئی ہے جس کا ذکر سابق شیخ الجامعہ پروفیسر مشیر الحسن نے 30 اگست 2004 کو جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر کہا تھا کہ ہماری تمام تر کوششیں لوگوں کو محض ڈگریوں اور نوکریوں کے لئے تربیت دینا نہیں ہے، ہماری جدوجہد ایسے صاحب کردار افراد پیدا کرنے کی ہے جو ذاتی مفادات کی تکمیل کے محدود مقصد سے آگے بڑھ کر وسیع تر اجتماعی نصب العین تک رسائی کے طالب ہوں۔ ہمارے نصاب تعلیم کی تشکیل ذات اور مذہب کی دیواروں کو توڑنے، ایک روشن خیال ماحول پیدا کرنے اور ملک میں جو انتشار کا شکار ہے اتحاد و یکجہتی کے جذبے کی پرداخت کے مقاصد کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے نظام تعلیم کو معقول آزاد اور سائنسی انداز فکر کو فروغ دینا چاہیئے اور ہمارے سماج کی مشترکہ اقدار کے تحفظ و بقاء کا اہتمام کرنا چاہیئے۔

16.3 جامعہ ملیہ اسلامیہ کے چند اہم شعبہ جات کا تعارف

1. فیکلٹی آف ہیومنٹیز اینڈ لینگو نجیز:

یہ فیکلٹی، اردو، ہندی، انگریزی، تاریخ اور اسلامک اسٹڈیز وغیرہ کے شعبوں پر مشتمل ہے۔ جامعہ میں اردو زبان وادب اور تہذیب کو ہمیشہ ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہاں کا شعبہ اردو سارے ملک میں اس لحاظ سے ایک امتیازی حیثیت کا مالک ہے کہ اس کے نئے نصاب میں کلاسیکی عہد کے علاوہ جدید زمانے کی زبان وادب کے تمام رجحانات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح جامعہ کا شعبہ ہندی اس لحاظ سے اپنی ایک علیحدہ شناخت رکھتا ہے کہ یہاں ہندی اور اردو کی مشترک ادبی و ثقافتی روایت کے مطالعے اور تحقیق پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ شعبہ انگریزی میں دیگر موضوعات کے علاوہ تقابلی اور بین المضامین مطالعات کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ شعبہ تاریخ بھی جامعہ کا ایک اہم تعلیمی مرکز ہے جہاں عہد وسطیٰ اور جدید دور کی تاریخ کا خصوصی انتظام ہے اور یہ کوشش کی جاتی ہے کہ تاریخ کے سماجی، ثقافتی اور اقتصادی پہلوؤں کا مکمل احاطہ کیا جائے۔ اسلامک اسٹڈیز میں اسلامی تاریخ وثقافت کے ساتھ ساتھ اسلامیات کے بنیادی موضوعات تفسیر، حدیث، فقہ، کلام اور فلسفہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہاں دنیا کے بڑے مذاہب کے تقابلی مطالعے اور جدید دور میں اسلام کے مسائل نیز ہندوستان میں اسلام کے مختلف مسائل پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔

2. فیکلٹی آف سوشل سائنسیز:

اس فیکلٹی میں عمرانیات، سوشل ورک، سیاسیات، اقتصادیات، نفسیات اور کامرس کے شعبے شامل ہیں۔ عمرانیات کے شعبے میں بے روزگاری کے مسائل کے پیش نظر شہری مسائل، آبادی کے مسائل، عورتوں اور اقلیتوں کے مسائل کو خاص توجہ حاصل ہے۔ اس کے علاوہ مسلم سماج کا مطالعہ بھی اس شعبے کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ سوشل ورک کا شعبہ سماجی خدمات سے تعلق رکھتا ہے جہاں طلبہ کو اس

میدان میں نظری و عملی تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ شعبہ سیاسیات کے نصاب میں تیسری دنیا اور خاص طور پر ہندوستان کے مسائل کو سائنسی انداز سے سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جنوبی ایشیا، مغربی ایشیا اور افریقہ کے سماجی و سیاسی مسائل کے مطالعے کو بھی خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ شعبہ اقتصادیات میں ترقیاتی امور، منصوبہ بندی اور اقتصادی پالیسی کے مطالعے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

3. فیکلٹی آف ایجوکیشن:

ڈاکٹر ذاکر حسین نے استادوں کے مدرسے کی بنیاد 1938 میں رکھی تھی جس کا مقصد بیسک اسکولوں کے لئے اساتذہ کی تربیت کرنا تھا۔ دھیرے دھیرے اس مدرسے نے ایک پوری فیکلٹی کی شکل اختیار کر لی جسے سارے ملک میں شہرت اور اہمیت حاصل ہوئی۔ اس فیکلٹی کے تین شعبے ہیں۔ ٹیچر ٹریننگ اور غیر رسمی تعلیم کا شعبہ، تدریسی مطالعات کا شعبہ اور آرٹ ایجوکیشن کا شعبہ۔ اول الذکر شعبہ اساتذہ کی ٹریننگ کے فرائض انجام دیتا ہے۔ یہاں معذور طلبہ کی تعلیم و ابتدائی تربیت کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ تدریسی مطالعات کے شعبے میں تعلیم کے فلسفے اور سماجیات، تعلیمی نفسیات و تعلیمی تحقیق کے موضوعات پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ آرٹ ایجوکیشن کا شعبہ جامعہ کی مخصوص اسپرٹ کا آئینہ دار ہے۔ یہاں طلبہ کو ایک ایسا ماحول فراہم کیا جاتا ہے کہ جہاں ان کی فطری صلاحیتوں کو ابھرنے کا بھرپور موقع ملتا ہے۔

4. فیکلٹی آف نیچرل سائنسیز:

یہ فیکلٹی فزکس، کیمسٹری، بایو سائنسز، ریاضی اور جغرافیہ کے شعبوں پر مشتمل ہے۔ ان میں بی اے سے لے کر پی ایچ ڈی سطح تک تعلیم کا انتظام ہے۔ نصاب میں سائنسی تعلیم کے جدید ترین طریقوں پر زور دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مٹیریل ریسرچ، بایو ٹکنالوجی بنیادی اور اطلاقی ریاضی، فوئل سسٹم، ایروناٹیکل ریسرچ، عملی اور زرعی جغرافیہ جیسے موضوعات کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔

5. فیکلٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹکنالوجی:

یہ فیکلٹی سول انجینئرنگ، الیکٹریکل انجینئرنگ، الیکٹرانکس اینڈ کمیونی کیشن، میکینیکل انجینئرنگ اور اپلائیڈ سائنسز اینڈ ہیومنٹیز کے شعبوں پر مشتمل ہے۔ تمام شعبوں میں انڈر گریجویٹ اور ڈپلومہ کورسوں کے ساتھ پی ایچ ڈی سطح تک کی تعلیم دی جاتی ہے۔ شام کو پیشہ ورانہ کورس بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ نصاب میں ڈرافٹ مین شپ، الیکٹرونکس، ریفریجریشن، ایئر کنڈیشننگ وغیرہ کی تعلیم پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ اس فیکلٹی میں بزنس ایڈمنسٹریشن کے ماسٹرس کورس کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ آرکی ٹیکچرل انجینئرنگ اور ڈینسٹیری کی فیکلٹی بھی قائم کی گی ہیں۔

6. یونیورسٹی پالی ٹکنیک:

اس میں الیکٹرانکس، الیکٹریکل، میکنیکل اور سول انجینئرنگ اور انوائرمنٹل پالیوشن اینڈ کنٹرول انجینئرنگ میں ڈپلوما کورسس پڑھائے جاتے ہیں۔ یہاں پروفیشنل کورسوں کا بھی انتظام ہے۔

7. فیکلٹی آف لا:

یہ فیکلٹی 1989 میں قائم کی گئی تھی۔ بار کونسل آف انڈیا نے اسکے انڈر گریجویٹ کورس کو تسلیم کیا ہے۔ اس کے نصاب میں

سماجی، قانونی شعور، کنزیومر پروٹیکشن لاز، کارپوریٹ لاز، انوائرمنٹل لاز اور انسانی حقوق کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔

8. اے جے قدوائی ماس کمیونی کیشن ریسرچ سینٹر:

یہ مرکز یارک یونیورسٹی کناڈا کے اشتراک سے 1982 میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ ملک میں اپنے طرز کا واحد ادارہ ہے جہاں ماس کمیونی کیشن میں ایم اے کی ڈگری دی جاتی ہے۔ یہاں جدید ترین آڈیو، ویڈیو اور فلم ہارڈ ویئر موجود ہیں۔ اس مرکز کے نصاب میں ریڈیو، آڈیو وژول، ٹیلی ویژن اور فلم پروڈکشن کی تربیت شامل ہے۔ یہاں ماس کمیونی کیشن کے مختلف شعبوں میں ریسرچ کا انتظام بھی ہے۔

9. ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز:

اس ادارے کا قیام 1971 میں عمل میں آیا تھا جس کا مقصد مسلم دنیا میں تجدد اور روشن خیالی کی تحریکات کا مطالعہ اور مختلف مذاہب کا تقابلی مطالعہ کرنا ہے۔ یہ ادارہ انگریزی میں اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج، اردو میں اسلام اور عصر جدید اور ہندی میں ادھونک یوگ نام کے رسالے شائع کرتا ہے جن میں عہد جدید کے مختلف پہلوؤں اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے مطالعے و تجزیئے پر مبنی مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ سے اردو میں رسالہ جامعہ بھی شائع ہوتا ہے۔

10. مولانا محمد علی جوہر اکیڈمی آف انٹرنیشنل اسٹڈیز:

اس اکیڈمی میں تیسری دنیا کے ترقیاتی امور کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہاں کے ریسرچ پروجکٹوں اور تحقیقی مقالوں میں تیسری دنیا کے اہم رجحانات اور بین الاقوامی سیاسی تعلقات کو اہمیت دیجاتی ہے۔

11. سینٹر فار انفارمیشن اینڈ ٹکنالوجی:

انفارمیشن ٹکنالوجی کی تیز رفتار ترقی کے پیش نظر یہ مرکز انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ سطحوں پر سافٹ ویئر سسٹم اور کمپیوٹر اپلی کیشن کی تعلیم کا اہتمام کرتا۔ یہ یونیورسٹی کے کمپیوٹر نظام کو بھی چلاتا ہے اور یونیورسٹی اسٹاف کی کمپیوٹر ٹریننگ کا بھی انتظام کرتا ہے۔

12. سنٹر فار کوچنگ اینڈ کیریئر پلاننگ:

یہ کوچنگ سینٹر یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کی مدد سے تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتی طبقوں کو کوچنگ کی سہولت فراہم کرتا ہے تاکہ وہ مقابلہ جاتی امتحانوں میں حصہ لے سکیں۔ خاص کر سول سرویس کی کوچنگ میں اس سینٹر نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں طلبہ کو صحیح کیریئر کا انتخاب کرنے کے معاملے میں رہنمائی بھی دی جاتی ہے۔

16.3.1 جامعہ کی کارکردگی

جامعہ نے اپنے قیام کے نصب العین کے ایفائے عہد کے طور پر اپنی آغوش میں تعلیم و تربیت سے آراستہ ایسے افراد تیار کئے ہیں جن پر آنے والی نسلیں ہمیشہ فخر کریں گی۔ جامعہ کے ابنائے قدیم میں سے میر اکبر علی، ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی گورنر ہوئے۔ پیر الٰہی بخش اور ڈاکٹر محمود حسین تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے صوبہ سندھ میں وزیر تعلیم بنائے گئے اور شفیق الرحمٰن قدوائی حکومت دہلی کے وزیر تعلیم

منتخب ہوئے۔ ڈاکٹر محمود حسین، ڈاکٹر یوسف حسین، ڈاکٹر عبد الحلیم اور پروفیسر مشیر الحق وغیرہ کو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں چانسلر اور وائس چانسلر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اسی طرح کنور محمد اشرف، کمیونسٹ پارٹی، ڈاکٹر عبد الحمید قاضی مسلم لیگ، سی کرشنا آئر کانگریس اور معین الدین حارث شوشلسٹ پارٹی کے رہنما کی حیثیت سے مقبول ہوئے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ آج تعلیم کے نئے تقاضوں اور چیلنجوں کو قبول کرنے اور ان سے پوری طرح سے عہدہ بر آں ہونے کے لئے مکمل تیار ہے سابق شیخ الجامعہ پروفیسر مشیر الحسن نے کہا تھا کہ ہم صرف بڑے ہی نہیں ہوئے ہیں ہم ہر لحاظ سے بڑھے بھی ہیں۔ آج جامعہ میں ایک رواداری انہ ماحول ہے اور ایک دانشورانہ معاشرہ ہے اور ہم ایک متمول ورثے کے مالک ہیں۔

جامعہ کے چانسلر	جامعہ کے وائس چانسلر
1۔ حکیم اجمل خاں 1920-1929	1۔ مولانا محمد علی جوہر 1920-1923
2۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری 1928-1936	2۔ عبد المجید خواجہ 1923-1925
3۔ عبد المجید خواجہ 1936-1962	3۔ ڈاکٹر ذاکر حسین 1926-1948
4۔ ڈاکٹر ذاکر حسین 1963-1969	4۔ پروفیسر محمد مجیب 1948-1973
5۔ جسٹس محمد ہدایت اللہ 1969-1985	5۔ پروفیسر مسعود حسین خاں 1973-1978
6۔ خورشید عالم خاں 1985-1990	6۔ انور جمال قدوائی 1978-1983
7۔ ایس۔ ایم۔ ایچ۔ برنی 1990-1995	7۔ پروفیسر علی اشرف 1983-1989
8۔ خورشید عالم خاں 1995-2001	8۔ پروفیسر سید ظہور قاسم 1989-1991
9۔ فخر الدین ٹی خوراکی والا 2002-2011	9۔ پروفیسر بشیر الدین احمد 1991-1996
10۔ محمد احمد ذکی 2012-2017	10۔ جنرل محمد احمد ذکی 1997-2000
11۔ نجمہ ہبت اللہ 2017-2023	11۔ سید شاہد مہدی 2000-2004
12۔ سیدنا مفضل سیف الدین تا حال 2023	12۔ پروفیسر مشیر الحسن 2004-2009
	13۔ نجیب جنگ 2009-2013
	14۔ پروفیسر طلعت احمد 2014-2018
	15۔ پروفیسر نجمہ اختر 2019-2023

جامعہ پر تبصرے

جامعہ کو جاری رہنا ہے۔ اگر آپ اس کے مالی وسائل کے بارے میں متفکر ہیں تو میں کاسۂ گدائی لے کر نکلوں گا۔ (مہاتما گاندھی)

انہوں نے جامعہ کو اینٹ اینٹ جوڑ کر اور قربانیوں پر قربانیاں دے کر قائم کیا ہے۔ (سروجنی نائیڈو)

اس میں کئی ہندو طلبہ زیر تعلیم ہیں اور کئی ہندو اساتذہ اس کے عملے کا حصہ ہیں جو اس بات کی یقینی علامت ہے کہ یہ یونیورسٹی تنگ فرقہ وارانہ خطوط پر نہیں چلائی جارہی ہے۔ (ڈاکٹر پی سی رائے)

ہندو طلبہ کو اسلام سے اور مسلم طلبہ کو ہندومت سے واقف ہونا ضروری ہے۔ متحدہ ہندوستانی قومیت اسی افہام و تفہیم کے ذریعے پیدا ہو سکتی ہے۔ (حکیم اجمل خاں)

ہندوستان کے سب سے زیادہ ترقی پسند تعلیمی اداروں میں سے ایک۔۔۔۔۔ (رابندرناتھ ٹیگور)

ہم جامعہ والوں نے روز اول ہی سے ایک ایسا طرز عمل اختیار کیا ہے جو ایک لازمی شرط کے طور پر کام سے سچی لگن کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ جذبہ صرف انسانوں میں پایا جاتا ہے اسکیموں میں نہیں۔ (ڈاکٹر ذاکر حسین)

ہم نے طے کیا کہ مسلم یا غیر مسلم، ہر طالب علم کو اپنے مذہب اور اپنی اخلاقی و ثقافتی روایت کی نمائندگی کا سلیقہ سیکھنا چاہیئے اور اپنے آپ کو ایک مہذب، منکسر المزاج، غور و فکر کرنے والا اور باصلاحیت شخص بنا کر ایک مفید شہری بنانا چاہیئے۔ (پروفیسر محمد مجیب)

جامعہ ملیہ اسلامیہ کو ہماری قومی زندگی میں ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔ اس نے نہ صرف اعلیٰ تعلیم کا اہتمام کیا ہے بلکہ ایک مربوط تعلیمی خاکہ مرتب کر کے ثانوی تعلیم کے شعبے میں بھی اپنا ایک نقش قائم کیا ہے۔ (اندرا گاندھی)

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ملک اور اس کے باہر ایک ایسے ادارے کی حیثیت سے ایک ممتاز مقام پیدا کیا ہے جو بین الاقوامی ثقافتی اشتراک، سائنسی ترقی اور ادبی تخلیقیت کا آئینہ دار ہے۔ (یاسر عرفات)

اگر کسی کو عصر حاضر کی موجودہ قوتوں کو سمجھنے کی طلب ہے تو اسے لازماً جامعہ کو سمجھنا پڑے گا۔ (خالدہ ادیب خانم)

16.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- جامعہ ملیہ اسلامیہ تحریک عدم تعاون کے نتیجہ میں جدوجہد آزادی کی کوکھ سے جنم لینے والا ایک ایسا تعلیمی ادارہ ہے جو آزاد ہندوستان میں قومی یکجہتی کی نشانی اور متحدہ قومیت کا امین ہے۔
- اس کی سنگ بنیاد 29 اکتوبر 1920 کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کی مسجد میں مجاہد آزادی شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ہاتھوں رکھی گئی۔

- جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیان میں تحریک آزادی کے قومی رہنما مہاتما گاندھی، مولانا محمود حسن، مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ دہلی میں اس ادارے کو زندگی نو دینے میں عبدالمجید خواجہ،ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب نے اہم کردار ادا کیا۔
- مالی دشواریوں اور انتظامی ضرورتوں کے پیش نظر جامعہ ملیہ اسلامیہ کو 1925 میں علی گڑھ سے قرول باغ دہلی میں کرائے کی عمارتوں میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس ادارہ کو 1935 میں اوکھلا کے علاقہ جامعہ نگر میں اپنی مستقل عمارتوں میں منتقل کیا گیا جہاں آج جامعہ ملیہ اسلامیہ موجود ہے۔
- 1962 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کو یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کے تحت ڈیمڈ یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا اور اس کے بعد 1988 میں ہندوستانی پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے تحت مرکزی یونیورسٹی کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔
- جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے اہم مقاصد تھے: یہ تعلیم گاہ حکومت کے اثر سے آزاد قومی اور ملی مصالح کی پابند ہو، اس کی تعلیم میں دینی اور دنیوی، قدیم اور جدید عناصر کا صحیح امتزاج ہو اور یہ ملک کی آزادی اور ہندوستانی قومیت کی تحریک میں حصہ لے۔
- جامعہ ملیہ اسلامیہ جو 1920 میں چند خیموں میں وجود میں آئی تھی آج تقریباً 9 فیکلٹیز، 37 ڈپارٹمنٹ، 25 سینٹرس اور 6 اسکولوں پر مشتمل ہندوستان کی مایہ ناز یونیورسٹی ہے جہاں ابتدائی درجات سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کا باقاعدہ انتظام ہے۔
- جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنے قیام کے مقاصد کی تکمیل اور بانیان جامعہ کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرتے ہوئے اپنی آغوش میں تعلیم و تربیت کے ذریعہ ایسے افراد تیار کئے ہیں جن پر ملک و ملت کو ہمیشہ فخر رہے گا۔

16.5 نمونہ امتحانی سوالات

16.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام کہاں عمل میں آیا؟

(a). دہلی (b). لکھنؤ (c). علی گڑھ (d). حیدرآباد

2. جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد کس کے ہاتھوں رکھی گئی؟

(a). مولانا حسین احمد مدنی (b). مولانا ابوالکلام آزاد (c). مولانا محمود حسن (d). مولانا محمد علی جوہر

3. جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد کس سن عیسوی میں رکھی گئی؟

(a).1915 (b).1920ء (c).1925ء (d).1930ء

4. جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پہلے امیر الجامعہ (چانسلر) کا نام بتائیے؟

(a). حکیم اجمل خاں (b). جواہر لال نہرو (c). ڈاکٹر مختار احمد انصاری (d). ڈاکٹر ذاکر حسین

5. اس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ کہاں ہے؟

(a). علی گڑھ (b). دہلی (c). لکھنؤ (d). آگرہ

6. جامعہ ملیہ اسلامیہ کو سینٹرل یونیورسٹی کا درجہ کب دیا گیا؟

(a).1948ء (b).1962ء (c).1988ء (d).1920

7. جامعہ ملیہ اسلامیہ کا دستوری طور پر ذریعہ تعلیم کون سی زبان ہے؟

(a).ہندی (b). انگلش (c). عربی (d). اردو

8. جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پہلے وائس چانسلر کا نام بتائے؟

(a). ڈاکٹر ذاکر حسین (b). مولانا محمد علی جوہر (c). پروفیسر مشیر الحسن (d). مولانا ابوالکلام آزاد

9. جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام کس تحریک آزادی کے نتیجہ میں ہوا؟

(a). تحریک عدم تعاون (b). فرائضی تحریک (c). تحریک خلافت (d). ریشمی رومال تحریک

10. ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز سینٹر کس یونیورسٹی میں ہے؟

(a). علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (b). مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (c). جامعہ ملیہ اسلامیہ (d). جے۔این۔یو

16.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام کیوں عمل میں آیا؟ بیان کریں۔
2. جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خدمات اور کارکردگی پر روشنی ڈالیے۔
3. جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ جات کا تعارف پیش کیجیے۔
4. جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام میں بانیان جامعہ کی کوششوں اور قربانیوں کا تذکرہ کیجیے۔
5. متحدہ قومیت اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ میں جامعہ کے کردار کی وضاحت کیجیے۔

16.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. جامعہ ملیہ اسلامیہ پر ایک مضمون لکھیے۔
2. جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض ومقاصد کی وضاحت کیجیے۔
3. جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مختلف تاریخی مراحل پر روشنی ڈالیے۔

16.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.	جامعہ کی کہانی	:	عبدالغفار مدہولی
2.	نقوش جامعہ	:	غلام حیدر
3.	ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک اور جامعہ ملیہ اسلامیہ	:	شمس الرحمٰن محسنی

اکائی 17: احمد سرہندی

اکائی کے اجزا:

17.0 تمہید

17.1 مقاصد

17.2 شیخ احمد سرہندی

17.2.1 حسب ونسب و تعلیم

17.2.2 اکبر آباد

17.2.3 نقشبندیہ سلسلے میں بیعت

17.2.4 دعوت کی تبلیغ اور تربیت

17.2.5 شیخ احمد سرہندی کی شخصیت

17.2.6 جہانگیر اور شیخ احمد

17.2.7 گوالیار میں نظر بندی

17.2.8 شیخ احمد سرہندی کی کامیابی

17.2.9 دنیادار عالموں کے خلاف جہاد

17.2.10 تجدیدی کارنامہ

17.2.11 صوفیوں کی اصلاح

17.2.12 وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود

17.3 اکتسابی نتائج

17.4 کلیدی الفاظ

17.5 نمونہ امتحانی سوالات

17.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

17.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

17.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

17.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

17.0 تمہید

حضرت مجدد الف ثانی یعنی شیخ احمد سرہندی کا شمار بزرگوں میں ہوتا ہے۔ آپ نے برصغیر میں اسلام کے احیا اور اس کی بلندی کے لیے قابل قدر کوششیں کیں۔ مغل بادشاہ جہانگیر کے دور سے لے کر آج تک جتنی بھی تحریکیں یا مفکرین منظر عام پر آئے وہ کسی نہ کسی طرح سے احمد سرہندی کے فکروں سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو بے شمار ظاہری وباطنی نعمتوں سے سرفراز کیا تھا۔ آپ کے اندر بیک وقت کئی خوبیاں تھیں جس کی وجہ سے آپ کو "مجدد الف ثانی" کے لقب سے نوازا گیا۔ اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وقتاً فوقتاً ایسے اشخاص روئے زمین پر تشریف لائے جنہوں نے اس دنیا میں پھیلتی برائیوں کو روکنے کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا اور تجدید دین کی خدمات انجام دی۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی شیخ احمد سرہندی بھی ہیں۔ جنہوں نے برصغیر میں یہ خدمات انجام دی اور اس وقت دین اسلام کی تبلیغ کی جب اسلامی تشخص ناپید ہو چکا تھا اور اسلام وہندومت میں تفریق کرنا مشکل تھا۔ اس دور میں آپ نے بے شمار تجدیدی کارنامے انجام دیے۔

17.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ شیخ احمد سرہندی کے بارے تفصیل سے جان سکیں کہ کب اور کہاں پیدا ہوئے، کہاں سے تعلیم حاصل کی، اور اپنے دعوتی کارناموں کو کیسے وسعت دی، اس کے علاوہ انہوں نے اس دور میں جو کارنامے انجام دیے۔ مغل بادشاہ اکبر اور جہانگیر کے دور میں انہوں نے اسلام اور اس کی تعلیمات کو فروغ دینے کے لیے کیا کوششیں کی۔ اس کے علاوہ دنیادار عالم اور صوفی حضرات کی بھی اصلاح کی طرف توجہ دی۔ ان سب امور پر آپ کو آگاہی حاصل ہو گی۔

17.2 شیخ احمد سرہندی

17.2.1 حسب ونسب وتعلیم

شیخ احمد سرہندی شجرہ نسب 31 واسطوں سے خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ سے جاملتا ہے۔ آپ کابل کے ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ 971ھ /1564ء میں سرہند میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ عبد الاحد (و:1598ء) ایک بہت بڑے عالم شمار کیے جاتے ہیں۔ کتب معقول اور منقول کا درس دیتے، فقہ واصول فقہ میں بے مثال تھے۔ اس وقت کے بہت سے شیوخ نے آپ سے فیض حاصل

کیا۔ شیخ عبد الاحد کو سات اولادیں ہوئیں جس میں شیخ احمد سرہندی چوتھے نمبر پر ہیں۔ تمام بھائی علم و فضل والے تھے لیکن شہرت سب سے زیادہ شیخ احمد سرہندی کو نصیب ہوئی۔ اس وقت کے بڑے بزرگ شاہ کمال کیتھلی (و:1573ء) سے آپ کے والد محترم کا بڑا قریبی رشتہ تھا۔ شاہ کمال آپ سے بہت زیادہ الفت اور شفقت فرماتے، آپ کے ساتھ خصوصی معاملہ فرماتے۔ بچپن میں آپ ایک بار بیمار ہوگیے اور بدن بہت کمزور ہوگیا۔ والدہ ماجدہ کو فکر لاحق ہوئی اور آپ کو حضرت شاہ کمال کیتھلی کی خدمت میں پیش کیا اور دعا کی گزارش کی۔ شاہ صاحب نے فرمایا: "مطمئن رہو، اس بچے کی عمر دراز ہوگی، یہ عارف کامل و عامل ہوگا اور ہمارے تمہارے جیسے اس کے دامن سے نکلیں گے" (ص 191) شاہ کمال آپ کے والد شیخ عبد الاحد کو مجدد ہند کے بارے میں بہت ساری خوش خبری بھی دی تھی۔ دس سال کے تھے کہ شاہ کمال کیتھلی کا انتقال ہوگیا لیکن شیخ احمد سرہندی کو ان کی شکل و صورت اور جس جگہ والد محترم کے ساتھ اٹھتے بیٹھے وہ سب ذہن نشین تھا۔

ابتدائی تعلیم مکتب سے شروع ہوئی اور بہت کم عمر میں ہی قرآن شریف کا حفظ مکمل کرلیا۔ حفظ قرآن کے بعد والد ماجد کی خدمت میں تعلیم کا سلسلہ شروع کیا اور اپنے والد سے علوم عقلیہ و نقلیہ حاصل کیے۔ دوران طالب علمی ہی آپ کی ذہانت کا شہرہ عام ہونے لگا، مشکل بحثوں کو سمجھ کر آپ اسے آسان لفظوں میں پیش کردیتے۔ والد محترم کے علاوہ آپ نے اس وقت کے بڑے علمائے کرام کی بھی شاگردی اختیار کی۔ سیالکوٹ تشریف لے گیے جو اس وقت کا بہت بڑا تعلیمی مرکز تصور کیا جاتا تھا۔ مولانا کمال کشمیری سے (و:1017ھ) جن کو علوم نقلیہ پر دسترس حاصل تھا ان سے مشکل اور اعلیٰ کتابیں پڑھیں اور ان سے معقولات کی تکمیل کی۔ کچھ کتب حدیث شیخ یعقوب صرفی کشمیری سے (و:1003ھ) سے پڑھیں۔ اس کے علاوہ قاضی بہلول بدخشانی (جو حدیث و تفسیر میں بلند مرتبہ رکھتے تھے) سے تفسیر واحدی اور اس کی مولفات، تفسیر بیضاوی اور اس کی تفصیلات، بخاری شریف اور اس کی مولفات، ثلاثیات، ادب المفرد، افعال العباد، مشکوۃ اور شمائل ترمذی اور قصیدہ بردہ وغیرہ کی روایت واجازت حاصل کی۔ غرض سترہ سال کی عمر میں فراغت حاصل کرلی اور اپنے والد کے ساتھ ہی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور طویل زمانے تک طلبہ کو اپنے علم سے سیراب کرتے رہے۔ آپ نے عربی و فارسی میں تصنیف کی۔ ان میں رسالہ تہلیلیہ اور رسالہ ردمذہب شیعہ شامل ہے۔

17.2.2 اکبر آباد

اکبری دور حکومت میں آگرے کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ پایہ تخت ہونے کی وجہ سے علم و فن کے اساطین یہاں جمع ہوچکے تھے۔ شیخ احمد سرہندی جب آگرے تشریف لے آئے تو آگرہ ضلالت و گمراہی کا مرکز تھا اور مغل بادشاہ اکبر تخت پر جلوہ افروز تھا۔ قیام آگرہ میں آپ کو ابوالفضل اور فیضی کی صحبتیں بھی حاصل رہی اور بعض اختلافات ہونے کے باوجود بھی دونوں احمد سرہندی کا بہت احترام کرتے تھے۔ ایک دن حضرت مجدد ابوالفیض کے گھر پر تشریف لائے، جو اس وقت غیر منقطوطہ تفسیر (سواطع الالہام) لکھنے میں مصروف تھے۔ ابوالفضل نے جب مجدد کو دیکھا تو خوش ہوئے اور فرمایا کہ تفسیر میں ایک مقام پر غیر منقوط کے ذریعہ تفسیر و تاویل مشکل ہوگئی ہے، آپ نے ان مقامات پر آپ کی رہنمائی فرمائی جس سے فیضی آپ کا علمی اعتراف کیے بنا نہ رہ سکا۔

آگرے میں جب آپ کا قیام بڑھ گیا تو والد گرامی جن کی آنکھ آپ کو دیکھنے کو ترس رہی تھی ضعیفی اور کمزوری کے باوجود آپ نے

سرہند سے آگرے تک کا سفر کیا۔ آگرے کے ایک عالم نے جب آپ کے آنے کی وجہ دریافت کی تو فرمایا: بیٹے کی محبت میں گرفتار ہو کر یہاں آیا ہوں۔ کیوں کہ مجبوریوں کے باعث وہ نہیں آسکتا تھا۔ آگرے سے واپسی میں حضرت مجدد کو اپنے ساتھ سرہند لے گیے۔ راستے میں شہر تھانیسر (موجودہ کروکشیترا، ہریانہ) جب پہنچے تو وہاں کے رئیس (جن کو سلطان کا قرب حاصل تھا) نے جو احمد سرہندی کی خصوصیات واخلاق سے متاثر ہو کر اپنی لڑکی کا رشتہ مجدد کے لیے بھیجا جس کو آپ کے والد محترم نے قبول کیا۔ تھانیسر میں ہی نکاح کی رسم ادا کر کے بہو کو سرہند لے آئے۔ سرہند پہنچنے کے بعد آپ والد کی حیات تک ان کی خدمت کی اور ساتھ رہ کر فوائد باطنی حاصل کیے۔ والد محترم نے انتقال کے وقت اپنے تمام صاحبزادوں کو بلا کر اپنا وہ خرقہ خلافت سلسلہ سہروردیہ اور خرقہ خلافت چشتیہ جسے آپ نے شیخ عبدالقدوس گنگوہی(و:1537ء) سے حاصل کیا تھا اور خرقہ خلافت قادریہ جس کو آپ نے شاہ کمال کیتھلی سے حاصل کیا تھا یہ سارے خرقے شیخ احمد سرہندی کو عطا کر کے اپنا جانشین مقرر کیا۔

17.2.3 نقشبندیہ سلسلے میں بیعت

آپ کو حج بیت اللہ اور مدینہ کی زیارت کا شوق ہوا اور وہاں جانے کی رغبت نے آپ کو بے چین کر دیا لیکن والد محترم کی کبیر السن اور علالت کی وجہ سے چھوڑ کر جانا ممکن نہ تھا۔ جب 1007ھ میں والد ماجد کا انتقال ہو گیا تو پھر کوئی رکاوٹ سامنے نہ تھی غرض آپ نے حج بیت اللہ کے لیے رخت سفر باندھا اور سرہند سے نکل کر دہلی پہنچے۔ دہلی پہنچتے ہی علماء وفضلاء کا تانتا لگ گیا کیوں کہ آپ کے علم وفضل کا چرچا دہلی تک پہنچ چکا تھا اسی میں مولانا حسن کشمیری تھے جن سے احمد سرہندی کے پہلے سے مراسم تھے اور انہوں نے گفتگو کے دوران حضرت خواجہ باقی باللہ کے مرتبے اور قوت باطنی کا ذکر فرمایا۔ احمد سرہندی اپنے والد ماجد سے نقشبندیہ سلسلے کا ذکر سن چکے تھے۔ غرض مولانا حسن کشمیری کی رفاقت میں آپ خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خواجہ باقی باللہ نے بڑی شفقت ومہربانی کے ساتھ آپ کا استقبال کیا۔ خواجہ کی طبیعت میں بہت غیرت تھی وہ کسی کو خود اپنی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتے تھے لیکن خلاف معمول آپ نے فرمایا کہ آپ ہمارے یہاں چند روز ٹھہر جائیں۔ احمد سرہندی نے خواجہ باقی باللہ کی اس دردمندانہ گزارش پر رہنے کا فیصلہ کر لیا اور تھوڑے ہی وقفے میں آپ اوج کمال کو پہنچ گیے اور اپنے ہم عصروں اور ہم چشموں میں فائق بن گیے۔ خواجہ باقی باللہ نے بشارت دی کہ آپ کو مکمل طور پر نسبت نقشبندیہ حاصل ہو گئی تو آپ سرہند تشریف لے گیے۔

دوسری بار احمد سرہندی جب دہلی تشریف لائے تو باقی باللہ نے خلعت خلافت عطا کیا اور طریقت کی تعلیم وارشاد کی اجازت دی۔ خاص لوگوں کو تعلیم طریقت کے لیے آپ کے ساتھ کیا۔ آخری بار جب احمد سرہندی نے دہلی کا سفر کیا تو خواجہ باقی باللہ نے پرجوش طریقے سے استقبال کیا اور خوشخبری دی۔ اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ احمد سرہندی کی موجودگی میں کوئی میری طرف متوجہ نہ ہو۔ احمد کو رخصت کرتے وقت کہا: ”اب ضعف بہت معلوم ہوتا ہے، امید حیات بہت کم ہے، اور اپنے دونوں صاحبزادوں حضرت خواجہ عبداللہ اور حضرت خواجہ عبیداللہ کو جو اس وقت شیر خوار تھے، اپنے سامنے آپ سے توجہ دلائی اور فرمایا کہ ان کی ماؤں کو غائبانہ توجہ دیجیے، چنانچہ آپ نے توجہ دی اور توجہ کا اثر بھی اسی وقت ظاہر ہوا۔“

احمد سرہندی کچھ لمحے سرہند میں قیام فرما کر شیخ کے اشارے پر لاہور کے سفر کا قصد کیا۔ اس وقت دہلی کے بعد لاہور دوسرا مشہور علمی مرکز تھا۔ لاہور میں علماء و مشائخ نے آپ کا استقبال کیا۔ ابھی آپ لاہور ہی میں تھے کہ خواجہ باقی باللہ اس دنیا سے رخصت ہوگیے۔ جب آپ کو اطلاع ملی تو بے چینی کی کیفیت میں دہلی کا سفر کیا۔ راستے میں سرہند ہونے کے باوجود گھر نہ گیے بلکہ پہلے اپنے شیخ کی قبر پر حاضری دی۔ کچھ دن دہلی میں رک کر سرہند آئے۔ اس کے بعد صرف ایک مرتبہ دہلی گیے۔ آپ کی ہی کوششوں سے ہندوستان میں سلسلہ نقشبندیہ کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا۔

17.2.4 دعوت کی تبلیغ اور تربیت

حضرت خواجہ میر محمد نعمان بدخشی جو خواجہ باقی باللہ کے شاگرد تھے ان کو آپ نے برہانپور بھیجا اور انہوں نے کئی لوگوں کی اصلاح فرمائی، اس کے بعد حیدرآباد دکن بھیجا۔ جہاں بے شمار لوگ ان کی خانقاہ میں ذکر و مراقبے میں مشغول رہتے۔ اسی طریقے سے شیخ بدیع الدین سہارنپوری کو خلافت کی اجازت دے کر سہارنپور بھیجا پھر وہاں سے آگرہ جانے کا حکم دیا۔ آگرہ میں شیخ بدیع الدین کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور بہت سارے سلطنت کے ارکان آپ کے حلقے میں شامل ہوگیے۔ فوج کے ہزاروں لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان کے یہاں اتنی بھیڑ جمع ہونے لگی کہ بڑے بڑے امراء کو بمشکل ہی زیارت کرنے کا شرف حاصل ہو پاتا۔ غرض آپ کی زندگی میں ہندوپاک کے وسیع و عریض علاقے میں کسی جگہ کم یا زیادہ ان کے خلفاء و مریدین موجود تھے۔ اس کے علاوہ مختلف مقامات پر بہت سارے خلفاء کو تبلیغ کے لیے بھیجا۔ جس میں ترکستان، یمن، شام، روم، کاشغر، توران، بدخشاں اور خراسان کے علاقے اہم ہیں۔ اسی طریقے سے ہندوستان میں بھی دیگر مقامات پر اپنے خلفاء کو دعوت کے لیے بھیجا۔

17.2.5 شیخ احمد سرہندی کی شخصیت

جس مشکل اور پر فتن دور میں حضرت مجدد نے تجدیدی اور اصلاحی کارنامہ انجام دیا۔ آپ نے سلاطین اور بادشاہوں کے غلط رجحانات اور بے اعتدالیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کلمہ حق کو بلند کر کے معاشرے کو خطرناک نتائج اور تباہی سے بچالیا۔ آپ نے بے خوفی، بے غرضی، حق گوئی اور تربیت و عملی مثالوں کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں ہمت و حوصلہ پیدا کر دیا۔ شیخ احمد کے عہد میں ملک کے اندر بظاہر مسلمانوں کی حکومت تھی اور مغلیہ سلطنت پورے آب و تاب کے ساتھ عروج کی طرف رواں دواں تھی۔ آپ نے اپنی زندگی کا شروعاتی دور اکبر کے عہد میں گزارا اور جہانگیر کا عہد آپ نے پایا۔ سلطنت لا مذہبیت کے رنگ میں پوری طرح غوطہ زن تھی مگر ہندو مذاہب کے ساتھ مصالحت رکھتی تھی۔ اس بابت شیخ احمد سرہندی ایک مکتوب میں خان اعظم کو لکھتے ہیں: "اسلام کی غربت و کسمپرسی یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ کفار کھلم کھلا اسلام پر طعن اور مسلمانوں کی مذمت کرتے ہیں اور نڈر ہو کر ہر کوچہ و بازار میں کفر کے احکام جاری کرتے اور اہل کفر کی تعریف کرتے ہیں اور مسلمان اسلام کے احکام جاری کرنے سے روک دیے گیے ہیں اور شرائع کے بجالانے میں ان کی مذمت اور طعن و تشنیع کی جاتی ہے۔" (ص329) آپ کے دور میں کفر و شرک، ضلالت و گمراہی چاروں طرف تھی اور لوگ دین کی تعلیمات سے انکار کر رہے تھے۔ آپ نے توحید کا علم پھر سے بلند کیا۔

شیخ احمد سرہندی کا خیال تھا کہ لوگوں نے دوسرے مذہبوں کے عقائد کو آنکھ بند کر کے قبول کر لیا اور نبی پاک کی تعلیمات کو مسترد کر دیا۔ اسی وجہ سے وہ سیدھے راستے پر نہ چل کر بلکہ گمراہ کن تجربے کر کے برباد ہو گیے۔ حضرت مجدد کی ذات گرامی ہی کی کوششوں سے ہندوستان میں اسلام اور اس کی تعلیمات کو صحیح مقام مل سکا۔ مجدد الف ثانی کے علوم و معارف نے ہی ابنائے کفر و ضلال کے حلقہ میں بے چینی پیدا کر دی اور کتنے ہی سیاہ دلوں کو اسلام کی صحیح تعلیمات سے روشن کر دیا۔ غرض آپ کی کوششوں سے قفل شدہ سینے جو طالب حق سے نا آشنا ہو گیے تھے ان کو تسکین و استقامت پر جما دیا۔ اس دور کا سب سے بڑا اور بنیادی مرض ابتداع اور بدعت پسندی تھی جس سے عمل اور عقیدے دونوں کو کمزور کر دیا تھا اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مجدد کی تعلیمات میں اتباع سنت اور رد بدعت کا پہلو غالب نظر آتا ہے۔

17.2.6 جہانگیر اور شیخ احمد

اکبر بادشاہ کے فوت ہو جانے کے بعد نور الدین جہانگیر تخت پر بیٹھا۔ اکبر کے دور میں جس طرح اسلام اور اس کی تعلیمات میں ملاوٹ کی کوشش جس طاقت اور منصوبہ بندی سے کی گئی وہ غیرت مند مسلمانوں کو بے چین کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس بے چینی کے عالم میں احمد سرہندی کا نام سرفہرست ہے۔ احمد سرہندی اس کا قلع قمع کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ان کے ہاتھ کوئی سرا نہیں لگ رہا تھا جس سے وہ سلطنت کے رجحان اور اسلام و مسلمانوں کے بارے میں اس کی سیاست پر اثر انداز ہو سکیں۔ آپ نے ان لوگوں کو پیغامات بھیجنے شروع کیے جن کو سلطان کا تقرب حاصل تھا اور وہ احمد سرہندی سے بھی عقیدت رکھتے تھے۔ بظاہر جہانگیر کو اسلام سے کوئی دشمنی نہیں تھی اور نہ ہی اس کو کسی نئے دین و آئین کو جاری کرنے کا شوق تھا۔ احمد سرہندی نے جہانگیر کی طبیعت سے فائدہ اٹھا کر ان اثرات کو ختم کرنے کا ارادہ کیا جو اکبر کے دور حکومت میں وقوع پذیر ہوئے۔ لیکن یہ کام شروع بھی نہیں ہو پایا تھا کہ گوالیار میں قید و بندی کا واقعہ پیش آیا۔ گوالیار کی اسیری کئی وجوہات سے حضرت مجدد کی حیات اور اس زمانے کی اصلاحی و تجدیدی تاریخ کا اہم واقعہ ہے۔

ایک بار شرارت پسندوں نے مجدد الف ثانی کے مکتوبات میں تبدیلی کر کے کفریہ اور زندیقانہ باتیں مضمون میں شامل کر کے اس کی نقلیں ہندوستان و افغانستان کے عالم دین کو بھیج کر ان سے اس مضمون کی بابت فتوے طلب کیے گیے۔ حالانکہ شیخ احمد کے مخلصین ان سازشوں سے باخبر کرتے رہتے تھے لیکن آپ ان لوگوں کو لکھ کر بھیجتے کہ ان باتوں کی مطلق پرواہ نہ کرو اور اللہ کے ذکر میں مشغول رہو اور کبھی کبھار ان کو ان بہتانوں کا جواب بھی لکھ دیتے جو ان پر لگائے جاتے تھے۔ ان سازشوں کے اثر سے شیخ عبد الحق محدث دہلوی (م:1642) جیسی شخصیت بھی نہ بچ سکی۔ اس کے ساتھ بادشاہ اور دربار کے اراکین بھی متاثر ہوئے۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے تو اس کے رد میں مضامین بھی لکھ ڈالے۔ اس کے جواب میں شیخ احمد سرہندی نے اپنے مضمون کے اصل مخطوطے ان کو بھیجے اور کہا کہ اس طرح کی بات میں نے کبھی نہیں کہی ہے اور یہ میرے ایک مرید کی شرارت ہے جس نے مجھے ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ وہ شخص میری بد دعا سے بخارا میں ارتداد میں قتل کیا گیا۔ اس پر شیخ عبد الحق محدث نادم ہوئے اور رجوع کیا۔

17.2.7 گوالیار میں نظر بندی

اس سازش کا معاملہ اتنا بڑھا کہ بادشاہ جہانگیر بھی اس کے شکار ہوئے اور شیخ احمد سرہندی کو بلوا لیا۔ آپ نے بادشاہ کے دربار میں

جا کر اس کی تفصیل پیش کی اور کلی طور پر ان کو سمجھا دیا۔ اس کے بعد سازش کرنے والوں نے جب دیکھا کہ ہمارا پلان کامیاب نہ ہو سکا تو ان لوگوں نے دوسری تدبیر کی اور بادشاہ کو ورغلایا کہ حضور یہ شخص سلطنت کے لیے نقصان دہ ہے کیوں کہ ہزاروں وفادار مرید اپنے اطراف جمع کیے ہوئے ہیں۔ اس بات کا ڈر ہے کہ ملک کی سالمیت کو نقصان نہ پہنچا دے۔ یہ گھمنڈی انسان ہے کیوں کہ جب علمائے کرام نے سجدہ تعظیمی کو جائز قرار دے چکے ہیں تو یہ شخص اپنے مکتوبات میں اس کی مخالفت کرتا ہے۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ اس کو سجدہ تعظیمی کا حکم دیا جائے لیکن یہ اس پر عمل نہیں کرے گا۔ بادشاہ کے لیے سیاسی ڈر مذہبی ڈر سے زیادہ تھا کیوں کہ اس سے سلطنت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا اس لیے یہ بات بادشاہ کے دل میں بیٹھ گئی۔ شیخ احمد سرہندی کو دوبارہ بلایا گیا اور سجدہ تعظیمی کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس مطالبے کو شیخ احمد نے سرے سے خارج کر دیا اور فرمایا: ”سجدہ ازروئے نص قرآنی خالق کے لیے مخصوص ہے اس سے بڑھ کر حماقت اور بطالت کیا ہوگی کہ ایک مخلوق اپنے جیسی عاجز و محتاج مخلوق کو سجدہ کرے۔“ اس نافرمانی کے عوض میں شیخ احمد سرہندی کو سزائے موت سنائی گئی لیکن پھر اس کو غیر محدود مدت کے لیے قید کا حکم دیا گیا۔ شہزادہ خرم (شاہجہاں) جس کو شیخ احمد سرہندی سے عقیدت تھی اس نے اپنے خاص لوگوں کو اس مسئلے کی کاپی کے ساتھ بھیجا جس پر علمائے کرام آداب شاہی (یعنی سجدہ) کو جائز قرار دیا تھا۔ شہزادہ خرم نے گزارش کی کہ آپ صرف بادشاہ سے ملاقات کے وقت یہ کر لیں تو میں اس بات کی ذمہ داری لیتا ہوں کہ آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ شیخ احمد سرہندی نے فرمایا: ”جان بچانے کے لیے اگرچہ جائز ہے لیکن یہ رخصت ہے اور عزیمت اس میں ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ نہ کیا جائے۔“ نظر بندی کے دوران آپ نے اصلاح و تبلیغ کا کام جاری رکھا اور ان کی کوششوں سے کئی ہزار لوگ مسلمان ہو گیے۔ بحالت قید میں اس وقت تک خط و کتابت اور ملاقات پر پابندی عائد نہیں ہوتی تھی۔ یقینی طور پر پرچہ نویس جو ہر ایک بات کو بادشاہ تک پہنچایا کرتے تھے انہوں نے شیخ احمد کے خیالات اور آپ کے ارادوں سے بھی باخبر کیا ہو گا۔ ایک سال کا وقفہ گزرنے کے بعد بادشاہ اپنے کرتوت پر شرمندہ ہوا اور حضرت کو عزت و احترام کے ساتھ باہر نکالا گیا اور معذرت کی۔ اسی وجہ سے شیخ مجدد کی گوالیار نظر بندی ختم ہونے کے بعد جہانگیر ان کو اپنے ساتھ رکھا تا کہ اطمینان بخش ہو جائے کہ آپ سے سلطنت کو کوئی خطرہ تو نہیں۔ اس موقعہ سے آپ نے فائدہ اٹھاتے ہوئے بادشاہ کو نصیحت کی۔ بعد نماز مغرب خاص صحبت بادشاہ سے روزانہ رہتی تھی۔ کچھ عرصے بعد جہانگیر کو جب مجدد کے طور طریقے و طرز عمل سے مکمل طور پر اطمینان ہو گیا تو اس نے آپ کو آزادانہ طریقے پر رہنے کی اجازت دے دی۔

17.2.8 شیخ احمد سرہندی کی کامیابی

جہانگیر جب تخت نشین ہوا تو عرصے تک اکبری عہد کے رسم و رواج جاری و ساری رہے۔ عہد اکبری و جہانگیر کا شروعاتی دور اسلامی تعلیمات کے مطابق پریشان کن اور ظلم و جور کا دور تھا۔ لا مذہبیت اور بے اعتقادی انتہائی عروج پر تھی اس کے علاوہ غیر اسلامی رسم و رواج عام تھی جس کا دسواں حصہ بھی اس سے پہلے کے زمانے میں نہیں ملتا۔ اسلام کی علی الاعلان جو مخالفت ہوتی تھی جہانگیری عہد میں اس میں کمی ہوئی۔ یہاں تک کہ جہانگیر کی طبیعت خود شریعت اسلامی کی طرف راغب ہوئی۔ اس وقت میں علمائے کرام کی بھی تعداد کافی تھی اور ان لوگوں نے ایسے پر فتن دور میں اپنی تحریر و تقاریر سے دین و سماج کی خدمت کی۔ ان تحریروں اور نصیحتوں سے عوام الناس نے استفادہ بھی

کیا لیکن ایک شخص جس نے حکومت میں تبدیلی پیدا کی اور اپنے ارادے پر عمل پیرا ہو کر حکومت کے مدمقابل کھڑا ہوا۔ اپنے صبر و تقوی سے اسلامی تعلیمات کے سامنے حکومت کو جھکنے پر مجبور کر دیا وہ شخصیت شیخ احمد سرہندی کی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی کی کامیابی ہے کہ جہانگیر خصوصی مجلس میں آپ سے وعظ و نصیحت سنتا تھا۔ آپ نے قلم اور زبان کی کوششوں سے جہانگیر کے دربار سے شاہی آداب میں جو سجدہ تعظیمی کی روایت تھی اس کو ختم کرایا۔ شریعت کے خلاف جو قانون سلطنت میں رائج تھے اس کو منسوخ کروایا۔ پرانی اور کھنڈر مسجدوں میں پھر سے عبادت شروع کی گئی اور شرعی قانون کو نافذ کروایا۔ جہانگیر نے گناہوں سے توبہ کرتے ہوئے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔۔

17.2.9 دنیادار عالموں کے خلاف جہاد

وہ علمائے کرام جن کو دنیا کی جاہ و محبت تھی اور گمراہی کا سبب تھے ان کے خلاف محاذ کھولا۔ کیوں کہ یہ لوگ اہلیت اور خوف خدا سے عاری ہونے کی وجہ سے اجتہاد کرتے اس وجہ سے قرآن وحدیث کی صحیح رہنمائی میں اس کے معانی کو بدل کر نئے عقائد و خیال کو ایجاد کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ روز دین میں نئی نئی باتیں شامل کرتے۔ عہد اکبری میں اس کی بہت ساری مثالیں موجود ہے۔ کس طرح کے علمائے دین اکبر کے دربار سے جڑے ہوئے تھے آپ اس سے قیاس کر سکتے ہیں۔ ملا عبداللہ سلطان پوری جن کا عہدہ مخدوم الملک تھا۔ انہوں نے صرف حج پر نہ جانا پڑے اس لئے حج کی فرضیت کے ختم ہونے کا فتویٰ دیا۔ ملا بدایونی لکھتے ہیں: ”ایک مرتبہ محفل میں خان جہاں نے کہا کہ مخدوم الملک نے فتویٰ دیا ہے کہ ان دنوں حج پر جانا فرض نہیں بلکہ ایک طریقے سے گناہ ہے۔ جب لوگوں نے وجہ دریافت کی تو انہوں نے یہ دلیل دی کہ حج کے لیے خشکی کا راستہ تو گجرات اور عراق کا ہے جو قزلباشوں کی لوٹ مار سے پُر خطر ہے اور اگر سمندر کے راستے جائیں تو فرنگیوں سے پروانہ راہداری لینے کی ذلت اٹھانی پڑتی ہے۔ ان کے پروانہ راہداری پر صلیب کا نشان اور حضرت عیسیٰؑ و حضرت مریمؑ کی تصویر چسپاں رہتی ہے جو بت پرستی کی ایک شکل ہے اس لیے یہ دونوں راستے حج کے لیے بند ہیں اور ان دونوں صورتوں کے علاوہ اور کسی طریقے سے حجاز پہنچنا ممکن نہیں اس لیے فریضہ حج ساقط ہو چکا ہے۔۔۔ مخدوم الملک سے متعلق خان زمان نے ایک بات اور بتائی کہ وہ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے یہ حیلہ کرتا ہے کہ ہر سال کے اختتام سے قبل اپنا سارا مال و متاع اپنی بیوی کے نام ہبہ کر دیتا ہے اور اسی طرح دوسرے سال کے ختم ہونے سے پہلے وہ نیک بخت سارا مال و متاع اس کے نام منتقل کر دیا کرتی ہے۔ زکوٰۃ کی آدائیگی کے لیے جو کامل سال گذرنے کی شرط ہے چوں کہ اس طرح ہیر پھیر میں یہ شرط پوری نہ ہوتی تھی اس لیے ان پر زکوٰۃ فرض نہ ہوتی تھی۔“ (حضرت مجدد الف ثانی، ص292) علماء کے انتشار کی وجہ سے بادشاہ کی نظر اسلام کی عظمت کم تر ہوتی گئی۔ اکبر کی فطرت اور کچھ حالات کی وجہ سے اکبر نے اسلامی عقیدہ سے انکار کر کے بے دینی کی روش اختیار کی۔ بچپن سے جوانی تک دیکھا جائے تو اکبر ایک راستے پر نہیں رہا بلکہ اس کے نظریے اور اعتقاد میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں۔ طبیعت ہمیشہ نئی کھوج کی متلاشی رہی اسی وجہ سے غلط لوگوں کی صحبتوں نے اسے راہ راست سے بھٹکا دیا۔ شروعات میں وہ طلب حق کا طالب تھا اور اسی تلاش کے تحت وہ ہر مذہب کے معتقدوں سے ان کی تاریخ کو ادراک کرنے کی سعی کرتا لیکن درباری علماؤں نے سیدھے راستے پر گامزن کرنے کے بجائے اپنے مراتب و درجے کو بڑھانے کے لیے ایک دوسرے کی بے عزتی کرنے لگے۔ کسی مسئلے پر علماء کا ایک گروہ اسے حلال کہتا تو دوسرا گروہ اسے حرام قرار دیتا۔ انہی حرکتوں کی وجہ سے اکبر دین اسلام سے دل برداشتہ

ہو گیا۔ دربار میں دوسرے مذہب کے معتقدوں نے اس صورتحال سے خوب فائدہ اٹھایا اور اکبر کے ذہن کو انکار وانحراف میں تبدیل کر دیا۔

اسی مناسبت سے آپ نے ایک مکتوب جو صدر جہاں کے نام تحریر کیا تھا فرماتے ہیں: ''آپ کو معلوم ہے کہ زمانہ سابق میں جو فساد پیدا ہوا تھا وہ علماء کی ہی کم بختی سے ظہور میں آیا تھا اس بارے میں امید ہے کہ پورا پورا تتبع مد نظر رکھ کر علمائے دیندار کا انتخاب کر کے پیشدستی کریں گے علماء بد دین کے چور ہیں ان کا مقصود ہمہ تن یہ ہے کہ خلق کے نزدیک مرتبہ ورعب داب اور بزرگی حاصل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ ان کے فتنے سے بچائے۔'' (ص426)

17.2.10 تجدیدی کارنامہ

شیخ احمد سرہندی کے ذریعہ اسلام کی حفاظت و تقویت کا کام ہوا جس کو حدیث کی معروف اصطلاح میں ''تجدید'' کہا گیا ہے۔ ملا عبد الحکیم سیالکوٹی (و: 1657) نے کسی موقع پر شیخ احمد کو مجدد ثانی کے نام سے مخاطب کیا تھا۔ اس لقب کو عوام میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ آپ کی اصلاحی کوششوں اور کارناموں سے صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ اسلامی ممالک بھی متاثر ہوئے۔ آپ نے ایسے دور میں اپنی تحریک کی شروعات کی جب اسلامی تعلیمات کا اثر کم کرنے سے بات آگے بڑھ چکی تھی اور اسلام کو ہی ختم کرنے کی مختلف قسم کی کوششیں چل رہی تھی۔ دشمنان اسلام ایک منصوبہ بند طریقے سے سازشیں کر رہے تھے اور مخالفین کے یہ حملے چو طرفہ تھے۔ ایک جماعت ان لوگوں کی تھی جو دن بہ دن اسلام میں نئی رسم شروع کر رہے تھے۔ دوسری طرف صوفیوں کے گروہ نے عقائد اسلام کی تصویر بگاڑ رہے تھے۔ تیسرا گروہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب رسول و خلفائے راشدین کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ ایک گروہ یہود ونصاریٰ اور دوسرے غیر مذاہب کا جو دین اسلام کو مسترد کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ یہ تمام گروپ کا آپس میں متحد تھے اور بادشاہ کے دربار میں ان لوگوں کو رسائی حاصل تھی۔ بادشاہ وقت جلال الدین اکبر جو شروعاتی دور میں علماء وصوفیا کی صحبت میں رہتا تھا اس کو ان لوگوں نے اسلام کا مخالف ہی نہیں بلکہ غیر اسلامی احکام کو رائج کرنے والا بنا دیا۔ اکبر باقاعدہ طور پر علماء کی مجلسیں منعقد کرواتا اور ان سے فیضیاب ہوتا۔ انہی مجلسوں میں جب علمائے کرام ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرنے لگے اور ہر شخص خود کو افضل ثابت کرنے کی سعی کرنے گا۔ مذہب ومسلک کی رائے کے متعلق معاملہ اتنا بڑھ گیا کہ رسوا کیا جانا شروع ہو گیا اور کافر کے فتوے دیے جانے لگے۔ مسلکی معاملات جب حد سے تجاوز ہو گیے تو دین اسلام کو برا بھلا کہا جانے لگا۔ علماء کے آپسی انتشار و مختلف فیہ ہونے کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو بڑھنے کا موقع ملا۔ ان لوگوں نے صحیح باتوں کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جس کی وجہ سے اکبر جو ان پڑھ تھا اس نے علماء کی روز بحث ومباحثہ سے تنگ تھا اور اہل بدعت نے اس کو بڑی ہوشیاری سے دین اسلام سے متنفر کر دیا۔ اکبر نے پانچ یا چھ سالوں کے اندر اسلامی شریعت کو بہت چوٹ پہنچائی اور ان لوگوں کی اصلاح کے بجائے بگاڑ کی طرف اپنا قدم آگے بڑھایا اور ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی جس کو ''دین الٰہی'' کے نام سے موسوم کیا۔

حضرت مجدد الف ثانی نے اس مقاصد کے حصول کی کوشش شروع کی۔ سب سے پہلے آپ نے سلطنت کے اراکین وشاہی دربار سے شروعات کی اور جہانگیر کے عہد میں جتنے عالی مرتبہ اشخاص تھے ان کو اپنا مرید بنایا۔ آپ نے ان لوگوں کے دلوں میں اسلامی تعلیمات کی عظمت ومودت کا ایسا سبق پڑھایا کہ ان لوگوں کی زندگی کا مقصد واضح نظر آنے لگا۔ انہی ارکان کے توسط سے حکومت کی حرکات وسکنات

کو صحیح راستے پر گامزن کیا۔ کیوں کہ انہی لوگوں کے ہاتھوں میں سلطنت کا پورا کاروبار تھا اور ان کو مرتبہ حاصل تھا۔ یہ سلطنت کے اراکین جن کی خدمات سے مجدد الف ثانی تبدیلیاں لانے کی کوشش کر رہے تھے وہ لوگ آگرہ و قرب وجوار میں رہتے تھے اور شیخ احمد ان کو برابر ہدایات جاری کرتے رہتے۔ تعجب اس بات پر ہے کہ یہ ساری کوششیں اس وقت عمل میں آئیں جب آج کی طرح نہ تو موبائل یا سوشل نیٹورک موجود تھے اور نہ ہی خطوط ورسائل کا بہت بہتر سلسلہ تھا۔ ڈاک کا نظام تھا تو وہ بہت محدود تھا۔ اس کے باوجود آپ نے سرہند میں بیٹھ کر اپنی حکمت عملی سے حکومت کی مشینری کے سمت کو تبدیل کر دیا۔ انہی لوگوں کی مدد سے آپ نے بادشاہ تک کلمہ حق پہنچانے اور صحیح اسلامی تعلیمات کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ شیخ احمد سرہندی کے مکاتیب کا اگر آپ مطالعہ کریں تو اس بات کا اندازہ ہوگا کہ احمد سرہندی نے کس طریقے سے بادشاہ کے مصاحبوں اور ہم رازوں کو اپنی تعلیمات سے متاثر کیا تھا اور بعد میں انہی لوگوں نے شیخ کے اصلاحی کلام یا تعلیمات کو بادشاہ کے پاس پہنچا دیتے تھے۔ گویا یہ لوگ شیخ کا پیغام بادشاہ تک پہنچانے والے تھے۔ یہ تدبیر بہت کارگر ثابت ہوئی اور کچھ ہی دنوں کے بعد بادشاہ کی طبیعت اسلامی تعلیمات کی طرف راغب ہونے لگی۔ اس مقام تک پہنچنے میں کافی پریشانیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا کیوں کہ جب آپ درباری لوگوں کی اسلامی تعلیمات سے متاثر کر رہے تھے تو بعض عالموں نے جو آپ کو اور آپ کے مقاصد سے ناواقف تھے۔ ان لوگوں نے متعصب ہو کر اپنی پرانی چالوں سے جو ارباب حق کے لیے استعمال کرتے تھے آپ کے ساتھ بھی کیا۔ بعض نے کفر اور گمراہی کا فتویٰ لگا کر بادشاہ کو بدظن کرنے کی کوشش کی۔

17.2.11 صوفیوں کی اصلاح

صوفیوں کی ایک جماعت جو اسلامی تعلیمات سے گمراہ ہوگئی تھی اور اسلام کی شبیہ خراب کی تھی۔ آپ نے ان کے خلاف عملی، زبانی اور تحریری کوششیں کی۔ اس دور کے تمام صوفیائے کرام وحدت الوجود کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کا زیادہ تر وقت بے خودی کی کیفیت میں بسر ہوتا تھا اور وہ لوگ ہر وقت اس افکار کی ترویج واشاعت کرتے رہتے تھے۔ ان افکار کو قبولیت کی وجہ سے اکبر پر یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ "خدا کی پرستش کے بہت سے طریقے ہیں اور تمام مذاہب حقیقت پر مبنی ہیں، جب تمام موجودات مظاہر الٰہی ہیں تو بچھڑے اور ستارے کی صورت میں بھی خدا کی ہی پرستش ہوگی۔" اس عہد میں پورا ملک روحانی طور پر مفلسی کا شکار تھا اور کوئی بھی شخص ایسا نہ تھا جو عوام الناس کی صحیح طور پر رہنمائی کر سکے۔ گرچہ اکبر علمائے دین سے بدگمان ہو چکا تھا لیکن صوفیائے کرام کے متعلق وہ اچھی رائے رکھتا تھا اور یہ گمان کرتا کہ یہ لوگ تو ہمیشہ اللہ کی یاد میں مشغول رہتے ہیں اور اس کے علاوہ کوئی چیز ان کو عزیز نہیں۔ اسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چند نام نہاد صوفیوں نے تصوف کو نقصان پہنچایا۔ ان لوگوں نے حلول کے تعلق سے غیر مسلموں کے نظریے کی تائید کی اور اکبر کے سامنے دلائل کی بھرمار کر دی۔ غرض ان لوگوں کی طرف سے جتنے بھی فتنے اٹھائے گیے شیخ نے سب کو گمراہ کن اور الحاد وزندقہ قرار دیا اور ان صوفیائے کرام کی مراد ظاہر کی جو وحدۃ الوجود کے قائل ہیں۔

جو لوگ یہ کہتے تھے کہ ہر چیز خدا ہے یا یہ فقیر جب مکمل ہو جاتا ہے تو وہ خدا سے متحد ہو جاتا ہے اور اس کی ہستی گویا خدا کی ہستی میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ ان بھٹکے ہوئے صوفیوں کا یہ بھی ماننا تھا کہ اللہ کی عبادت اسی وقت ضروری ہے جب کہ معرفت نہ حاصل ہو اور معرفت

حاصل ہو جانے کی بعد اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ اسی طرح سے ان لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ انسان کا باطن صحیح ہونا چاہیے اور نماز، روزہ وغیرہ کی اللہ والوں کو ضرورت نہیں۔ غرض شیخ احمد سرہندی نے ان تمام برائیوں کو ختم کیا جو تصوف کے اندر داخل ہو گئی تھیں اور صاف ستھرا و نیک اسلامی تصوف دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کی بھی اصلاح فرمائی جو تصوف کا سرے سے انکار کرتے تھے۔

17.2.12 وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود

اسلامی تصوف میں وحدۃ الوجود (اس کا مطلب ہے کہ خدا کائنات ہے اور کائنات خدا۔ اس فلسفے کی بانی شیخ محی الدین ابن عربی ہیں) اور وحدۃ الشہود (کا مطلب یہ ہے کہ کائنات خدا کا پرتو ہے۔ مجدد الف ثانی کا کہنا تھا کہ: "کائنات و عالم چونکہ مرتبہ وہم میں بہر حال موجود ہے اس لئے نفی صرف شہود کی ہونی چاہیے، یہ وہ مقام ہے کہ جب سالک اللہ کے سوا کچھ نہیں دیکھتا چنانچہ اس وقت اس کی توحید یہ ہے کہ وہ مشہود صرف اللہ کو مانے اور انہیں صرف اللہ دکھائی دے رہا ہو) یہ نظریہ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں نظریوں میں تضاد نہیں بلکہ وحدۃ الشہود کا نظریہ وحدۃ الوجود کو مکمل کرتا ہے۔ جو وجود کی منزل پر نہیں چلا وہ شہود کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ حضرت مجدد بھی ان منزلوں سے گزر کر شہود کی منزل پر پہنچے۔ وحدۃ الشہود کے نظریے کا بانی شیخ احمد سرہندی کو تصور کیا جاتا ہے حالانکہ اس سے پہلے شیخ علاء الدین سمنانی (م:736ھ) کے یہاں بھی وجود اور شہود کی بحث ملتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شیخ احمد سرہندی نے اس تصور کو قاعدے سے پابندی کی ساتھ پیش کیا جس نے باقاعدہ ایک نظریہ کی صورت اختیار کر لی۔

17.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- شیخ احمد سرہندی شجرہ نسب 31 واسطوں سے خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ سے جاملتا ہے۔ آپ کابل کے ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ 971ھ /1564ء میں سرہند میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ عبد الاحد (و:1598ء) ایک بہت بڑے عالم شمار کیے جاتے ہیں۔
- جس مشکل اور پر فتن دور میں حضرت مجدد نے تجدیدی اور اصلاحی کارنامہ انجام دیا۔ آپ نے سلاطین اور بادشاہوں کے غلط رجحانات اور بے اعتدالیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کلمہ حق کو بلند کر کے معاشرے کو خطرناک نتائج اور تباہی سے بچا لیا۔ آپ نے بے خوفی، بے غرضی، حق گوئی اور تربیت و عملی مثالوں کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں ہمت و حوصلہ پیدا کر دیا۔
- شیخ احمد سرہندی کے ذریعہ اسلام کی حفاظت و تقویت کا جس کو حدیث کی معروف اصطلاح میں "تجدید" کہا گیا ہے۔ ملا عبد الحکیم سیالکوٹی (و:1657) نے کسی موقع پر شیخ احمد کو مجدد الف ثانی کے نام سے مخاطب کیا تھا۔ اس لقب کو عوام میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ آپ کی اصلاحی کوششوں اور کارناموں سے صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ اسلامی ممالک بھی متاثر ہوئے۔
- وحدۃ الشہود کے نظریے کا بانی شیخ احمد سرہندی کو تصور کیا جاتا ہے حالانکہ اس سے پہلے شیخ علاء الدین سمنانی (م:736ھ) کے

یہاں بھی وجود اور شہود کی بحث ملتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شیخ احمد سرہندی نے اس تصور کو قاعدے سے پابندی کی ساتھ پیش کیا جس نے باقاعدہ ایک نظریہ کی صورت اختیار کرلی۔

17.4 کلیدی الفاظ

خرقہ : گدڑی، پیوند لگا ہوا، کسی صوفی کا اونی لباس (وہ لباس جو شیخ مرید کو اپنا مرید کرنے کے بعد دے اور اس کو خلافت و اجازت عطا کرے)

17.5 نمونہ امتحانی سوالات

17.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. شیخ احمد سرہندی کا شجرہ نسب کس سے جا کر ملتا ہے؟

(a). حضرت ابو بکرؓ (b). حضرت عمرؓ (c). حضرت عثمانؓ (d). حضرت علیؓ

2. شیخ احمد سرہندی کہاں پیدا ہوئے؟

(a). سرہند (b). دیوبند (c). دہلی (d). آگرہ

3. شیخ احمد سرہندی کب پیدا ہوئے؟

(a). 1563ء (b). 1550ء (c). 1535ء (d). سب غلط

4. شیخ احمد سرہندی کو کس لقب سے نوازا گیا؟

(a). مجدد الف ثانی (b). مورخ (c). فلسفی (d). متکلم

5. شیخ احمد سرہندی نے نقشبندیہ سلسلے کی بیعت کس صوفی سے لی؟

(a). خواجہ باقی باللہ (b). مولانا حسن کشمیری (c). شیخ بدیع الدین (d). نعمان بدخشی

6. گوالیار میں نظر بندی کس کے عہد میں ہوئی؟

(a). جہانگیر (b). ہمایوں (c). بابر (d). سب صحیح

7. کس شہزادے کو شیخ احمد سرہندی سے عقیدت تھی؟

(a). شہزادہ خرم (b). داراشکوہ (c). اکبر (d). تمام غلط

8. وحدۃ الشہود نظریے کا بانی کون ہے؟

(a). شیخ احمد سرہندی (b). ابن عربی (c). معین الدین چشتی (d). ذوالنون مصری

9. وحدۃ الوجود نظریے کا بانی کون ہے؟

(a). شیخ احمد سرہندی (b). ابن عربی (c). معین الدین چشتی (d). ذوالنون مصری

10. دین الٰہی کی بنیاد کس نے رکھی؟

(a). جہانگیر (b). اکبر (c). اورنگ زیب (d). بہادر شاہ ظفر

17.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. شیخ احمد سرہندی کی ابتدائی زندگی پر روشنی ڈالیے۔
2. نقشبندیہ سلسلے میں بیعت کی روداد لکھیے۔
3. دعوت کی تبلیغ اور تربیت پر مضمون لکھیے۔
4. شیخ احمد سرہندی کی شخصیت کا جائزہ لیجیے۔
5. نظریہ وحدت الشہود پر نوٹ لکھیے۔

17.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. شیخ احمد سرہندی کی کامیابیوں کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
2. گوالیار میں نظر بندی کے واقعے پر مضمون لکھیے۔
3. عالموں اور صوفیوں کی اصلاح کے لیے شیخ احمد سرہندی نے کیا اقدامات کیے؟ بیان کیجیے۔

17.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

---

1. حضرت مجدد الف ثانی، مولانا سید زوار حسین، ادارہ مجددیہ، کراچی، 1975ء
2. تاریخ دعوت وعزیمت (جلد 4) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنو، 2008ء
3. تذکرہ مجدد الف ثانی، مولانا منظور محمد نعمانی، دارالاشاعت اردو بازار کراچی، 1977ء
4. سیرت مجدد الف ثانی، پروفیسر محمد مسعود احمد، امام ربانی فاؤنڈیشن کراچی، 2005ء

اکائی 18: شاہ ولی اللہ (حصہ اول)

اکائی کے اجزا:

18.0 تمہید

18.1 مقاصد

18.2 حالات زندگی

18.2.1 دینی و علمی خدمات

18.2.2 تعلیم و تدریس

18.2.3 تصنیف و تالیف

18.3 علوم قرآن کی اشاعت و خدمات

18.3.1 اصول ترجمہ

18.3.2 علم حدیث کا احیاء

18.4 اکتسابی نتائج

18.5 نمونہ امتحانی سوالات

18.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

18.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

18.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

18.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

18.0 تمہید

شاہ ولی اللہ دہلوی عالم اسلام کے عظیم ترین مفکروں میں سے ایک ہیں، اور برصغیر کے بلاشبہ جید عالم اور عبقری مفکر ہیں۔ اللہ نے

آپ کو نادر لیاقتوں اور صلاحیتوں سے نوازا تھا، دین کا فہم و ادراک نیز ان کے اظہار کا دلنشیں ملکہ بھی عطا تھا جو آپ کی تالیفات و تصنیفات کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ جس کے ذریعہ آپ نے ملت اسلامیہ کی تعلیمی و تربیتی رہنمائی کی جس کی بنا پر آپ وقت کے مجدد کہلائے۔ ان کی شہرت صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالم گیر ہے۔ عالم عرب میں بھی ان کی شہرت ہے اور یوروپ و امریکہ میں بھی ان کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ بلاشبہ اٹھارہویں صدی کے مجدد تھے اور تاریخ کے ایک ایسے دوراہے پر پیدا ہوئے جب زمانہ ایک نئی کروٹ لے رہا تھا، مسلم اقتدار کی سیاسی بساط لپیٹی جارہی تھی، عقلیت پرستی اور استدلالیت کا غلبہ ہو رہا تھا۔ اس وقت حضرت شاہ ولی اللہ نے کار تجدید انجام دیا اور اس کام کے لیے جدوجہد کی کہ مسلمان نئے زمانے سے کس طرح ہم آہنگ رہیں۔

18.1 مقاصد

اس یونٹ کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ طلباء شاہ ولی اللہ کی حالات زندگی، ان کی تعلیم و تعلم کے ساتھ ساتھ علمی خدمات کے دائرہ کار سے واقف ہوں۔

آپ یہ بھی جان سکیں گے کہ شاہ ولی اللہ نے علوم قرآن و تفسیر کی نشر اشاعت میں کن عوامل کو اختیار کیا، اور اس کے فروغ میں کن کن مصائب و پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔

نیز اس کا مقصد یہ ہے کہ شاہ صاحب کی زندگی پر تصوفانہ اثرات و اس کے معارف و علوم کی تشہیر میں آپ کا حصہ کیا رہا اس کی نشاندہی ہو سکے۔ نیز یہ بھی معلوم کیا جائے کہ شاہ صاحب نے علم تصوف میں کیا خدمات انجام دی ہیں اور اس کی اشاعت میں عملی اقدام کیا اٹھائے ہیں۔

18.2 حالات زندگی

شاہ ولی اللہ کا خاندان علم و فضل، تزکیہ و تصوف کا گہوارا تھا آپ کا پدری سلسلہ بتیس واسطوں سے حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا تھا اور مادری سلسلہ سے آپ علوی تھے۔ ان خاندانوں کی عظیم و کریم نسبت کے اثرات آپ کی شخصیت کے رگ و پے میں خاندانی طور سے موجود تھے، جس سے آپ کی پرورش و پرداخت اور ذہنی و فکری کار آفرینی کا امتزاج دکھائی پڑتا ہے۔ آپ کی پیدائش 4 شوال 1114 ہجری بمطابق 21 فروری 1703 عیسوی میں قصبہ پھلت، ضلع مظفر نگر، یوپی میں ہوئی۔ والد ماجد شاہ عبدالرحیم اپنے وقت کے بڑے عالم دین تھے آپ نے ابتدائی تعلیم والد ماجد سے حاصل کی نیز آپ کے علمی تفہم و ادراک میں والد ماجد کا کردار نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے شیخ محمد فاضل سندھی سے متن قرآن اور شیخ محمد افضل سیالکوٹی سے حدیث کا علم سیکھا۔ تصوف میں والد ماجد سے بیعت ہوئے اور چشتی طریق کے ساتھ ساتھ نقشبندی طریق کی تعلیمات حاصل کی مزید تربیت باقی باللہ کے صاحب زادہ خواجہ خرد سے لی۔ آپ نے سات سال کی کم عمر میں قرآن حفظ کر لیا تھا اور ساتھ ہی صرف و نحو، منطق و فلسفہ، تفسیر و حدیث، عربی ادب اور طب کے مروجہ علوم میں سترہ برس کی عمر تک دسترس حاصل کر لی تھی۔

18.2.1 دینی و علمی خدمات

شاہ ولی اللہ دہلوی کی دینی اور علمی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع و اہمیت کا حامل ہے۔ جس کا تعلق نہ صرف تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف سے ہے بلکہ اس میں عقائد و اخلاق، تہذیب و معاشرت، احیائے دین اور اصلاح امت سبھی شامل ہیں، مگر مجموعی طور پر ان میں علمی و دینی خدمات کے دو پہلو بڑے نمایاں نظر آتے ہیں:

1. پہلا، تعلیم و تدریس۔
2. دوسرا پہلو، تصنیف و تالیف کا ہے۔

18.2.2 تعلیم و تدریس

شاہ ولی اللہ صاحب نے سترہ سال کی عمر میں مروجہ علوم کی تعلیم سے فراغت حاصل کر لی تھی، اپنے والد محترم شیخ عبد الرحیم قدس سرہ کی وفات 1719ء کے بعد سترہ سال کی عمر میں ان کے جانشین کی حیثیت سے مدرسہ رحیمیہ دہلی میں مسند تدریس پر متمکن ہوئے اور تقریباً بارہ برس تک تفسیر و حدیث، فقہ و اصول فقہ، دینی اور عقلی علوم وغیرہ کا نہایت محنت اور جانفشانی کے ساتھ درس دیتے رہے۔ اس دوران اللہ تعالی نے آپ پر اپنا خاص کرم فرمایا اور حقائق قرآن و سنت، اسرار شریعت اور مقاصد دین کی سمجھ اور فہم عطا کی۔

بارہ سال درس و تدریس کے بعد شاہ صاحب حج کے ارادے سے حرمین شریفین کے لئے روانہ ہوئے۔ 1143ھ / 1732ء میں حج بیت اللہ کیا۔ حج ادا کرنے کے بعد مکہ مکرمہ میں اپنے خاص اوقات علماء و صلحاء اور محدثین کی خدمات میں رہے، پھر زیارت مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہو گئے جہاں پر آپ نے پورے ایک سال تک شیخ ابو طاہر محمد کردی اور دیگر مشائخ حرمین سے روایت حدیث کا علم حاصل کرتے رہے۔ ایک سال کا عرصہ گزار کر آپ حرمین شریفین سے واپس دہلی تشریف فرما ہوئے اور دوبارہ اپنے والد کی دی ہوئی ذمہ داری درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا، قیام حرمین شریفین کے دوران آپ پر حدیث کی اشاعت و اس کی تعلیمات کو فروغ دینے کا جذبہ کار فرما تھا اور اسی لئے دہلی واپس آنے کے بعد آپ نے اپنی تمام تر توجہ صرف علم حدیث کی تدریس پر مرکوز رکھی کیونکہ قیام حجاز کے دوران وہاں کے اساتذئے حدیث کی صحبت کی وجہ سے آپ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی افادیت و برتری کا تازہ اثر لے کر آئے تھے۔

درس و تدریس کے ابتدائی ایام میں آپ خود ہر فن کی کتابیں پڑھاتے تھے پھر دھیرے دھیرے زمانہ کی ضرورت و اپنی مصروفیات کی وجہ سے آپ نے درس و تدریس کو خاص اور منتخب شاگردوں تک محدود کر دیا تھا، اور خود کے لئے قرآن و حدیث کی تعلیمات کو چن لیا تھا، اسی کے ساتھ ساتھ آپنے اپنی زندگی کے آخری تیس برسوں میں اپنا زیادہ تر وقت عوام و اشخاص کی کردار سازی و شخصیت نوازی پر گزارا، جس کے لئے آپ نے ہر علوم اور فنون کے ماہرین کی ایک بڑی تعداد تیار کر دی تھی جو ہندوستان کے مختلف شہروں، قصبوں اور گاؤں میں جا کر انہیں قرآن و حدیث کا علم سکھاتے اور علوم اسلامی سے آگاہ کراتے تھے۔ آپ نے دھیرے دھیرے اپنی صلاحیتوں کو تصنیف و تالیف، ارشاد معارف گوئی اور قرآن و حدیث کی تدریس پر مرکوز کر دیا تھا اور دیگر علوم و فنون کے لئے اپنے شاگردوں میں سے ایک ایک شخص تیار کر کے متعلقہ فن کے طلباء ان کے سپرد کر دیئے۔

چنانچہ شاہ عبدالعزیز اپنے والد کے اس معمول کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حضرت والد ماجد از ہر یک فن شخصے تیار کردہ بودند و طالب ہر فن بادے می سپردند و خود مشغول معارف گوئی و نویسی بودند و حدیث می خواندند۔"

ترجمہ "حضرت والد ماجد نے ہر فن کے لئے ایک شخص تیار کیا اور متعلقہ فن کے طالب علم اس کے سپرد کر دیئے ، اور خود معارف گوئی، تصنیف و تالف اور درس حدیث میں مشغول ہوگئے۔"

حرمین سے واپسی کے بعد چونکہ آپ کی توجہ تدریسِ حدیث کی طرف زیادہ مائل ہوگئی تھی اس لئے مدرسہ رحیمیہ نے بھی باقاعدہ دارالحدیث کی شکل اختیار کرلی۔ درس حدیث کا سلسلہ اگرچہ آپ کے والد محترم نے بھی شروع کیا تھا مگر وہ جزوی طور پر تھا، اب یہی مدرسہ آپ کی خدمات حدیث کی وجہ سے دارالحدیث کہلانے لگا تھا۔ اس بابت پروفیسر غلام حسین جلبانی فرماتے ہیں:

"شاہ ولی اللہ محدث دہلوی صاحب وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ہندوستان میں ایک مستقل دارالحدیث کی بنیاد رکھی، جس کو آگے چل کر آپ کے لائق و فائق فرزند شاہ عبدالعزیز نے کامیابی سے ہمکنار کیا۔"

ہندوستان میں شاہ ولی اللہ سے پہلے بھی متعدد علماء و محدثین نے علم حدیث کے میدان میں اپنی خدمات انجام دیں ہیں مگر شاہ صاحب کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ آپ نے درس حدیث میں اختلافی مسائل پر بحث و مباحثہ کرنے کے بجائے ان پر غور و فکر کرکے ان کے درمیان تطبیق و ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس جدید اسلوب سے طلباء میں تنگ نظری دور ہوگئی اور اس سے بھی آگے بڑھ کر ان میں وسعت نظری اور تحقیق و جستجو کا جذبہ کارفرماں ہوا۔ شاہ صاحب کے درس و تدریس کا یہ اسلوب اسی طرح جاری و ساری رہا، اشاعت حدیث کے لئے قائم درس گاہ "مدرسہ رحیمیہ" اس قدر مقبول ہوئی کہ دور دراز سے تشنگان علم، علم حدیث کے فیض سے مستفید ہونے کے لئے جھنڈ در جھنڈ آنے لگے۔ چند ہی دنوں میں طلبہ کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہوا کہ مدرسہ رحیمہ میں قیام کی جگہ کم پڑنے لگی۔ چنانچہ اس وقت کے مغل بادشاہ "محمد شاہ" نے اس مدرسہ کی وسعت کے لئے شاہ جہاں آباد میں ایک حویلی عطا کی جہاں درس و تدریس کا کام انجام پاتا تھا۔ یہ حویلی اپنے دور کی نہایت عالی شان اور خوبصورت حویلی تھی، جو بعد میں شاہ عبدالعزیز کے مدرسہ کے نام سے مشہور ہوئی۔

شاہ ولی اللہ کی انتھک کوششوں کی بدولت علم حدیث نے اس قدر ترقی کرلی کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تحریک حدیث کو گویا صحیح رخ اور زندگی مل گئی۔ اسی سلسلہ میں بختیار حسن صدیقی لکھتے ہیں:

"شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی حدیث کی تعلیم کو عام کرنے کی کوششوں میں ایک نئی روح پھونکی۔ مدرسہ رحیمیہ میں حدیث کے درس کا خصوصی اہتمام کیا گیا اور ایسے علماء کی تربیت کی جنہوں نے ان کے بعد حدیث کا سلسلہ جاری رکھا یہاں تک کہ درس نظامی میں حدیث کو اسلامی علوم میں صحیح جگہ مل گئی۔"

شاہ صاحب کی تدریسی خدمات سے جو حضرات فیض یاب ہوئے اور ہندوستان واطراف میں علم دین کی اشاعت کے سلسلہ میں اپنی خدمات سرانجام دیں، ان میں آپ کے چاروں صاحب زادوں حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، حضرت شاہ رفیع الدین، حضرت شاہ عبد القادر اور حضرت شاہ عبد الغنی کے علاوہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی، شاہ محمد عاشق پھلتی، خواجہ محمد امین، علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی صاحب تاج العروس شرح قاموس، مولانا رفیع الدین مراد آبادی وغیرہ ایسے اساطین علم ہیں جنہوں نے پورے ہندوستان کو قال اللہ اور قال الرسول ﷺ کے آواز سے معمور کر دیا۔

18.2.3 تصنیف و تالیف

علم و حکمت کی تلاش میں بے قرار طبیعت، شاہ ولی اللہ کو حجاز کے سفر پر لے گئی، جہاں آپ نے الجیریا، ترکی اور دیگر مسلم ممالک کے سماجی حالات کا مطالعہ کیا۔ وطن واپسی کے بعد آپ نے اپنے نظریات کی ترویج کے لیے مختلف مراکز بھی قائم کیے۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں آپ نے علوم اسلامی کے ہر موضوع قرآن، حدیث، فقہ، تصوف اور علم کلام وغیرہ کے ساتھ ساتھ سماجیات و تاریخی موضوعات پر تقریباً ایک سو پانچ (105) کتابیں تصنیف کیں۔ جن سے آپ کی تبحر علمی اور علمی بصیرت ظاہر ہوتی ہے جن میں "فتح الرحمٰن فی ترجمہ القرآن"، "الزہراوین"، "مصفی اور مسوی شرح موطا امام مالک"، "تراجم ابواب بخاری"، "انسان العین فی مشائخ الحرمین"، "قرۃ العینین فی تفصیل الشیخین"، "الانصاف فی بیان اسلوب الاختلاف"، "عقد الجید فی احکام الاجتہاد و التقلید"، "البدور البازغہ"، "الطاف القدس"، "القول الجمیل"، "الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ"، "اللمعات"، "شفاء القلوب"، "الخیر الکثیر"، "التفہیمات الالٰہیہ"، "فیوض الحرمین"، "تحفۃ الموحدین"، "الدر الثمین"، "تاویل الاحادیث"، "انفاس العارفین"، "سرور المحزون"، "فتح الودود"، "العطیۃ الصمدیہ"، "الفوز الکبیر"، "حجۃ اللہ البالغہ"، "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء"، وغیرہ جیسی علمی کمالات، اعلیٰ تحقیقات، استنباطات، اور اجتہادات نیز دلائل و توضیحات کے ایسے نکات موجود ہیں جو آپ کی تبحر علمی کے شاہد ہیں۔ تصنیفی خدمات کے باب میں آپ کا غیر معمولی کارنامہ یہ ہے کہ منطق اور فلسفے کی موشگافیوں کو حل کرنے کے لئے حاشیوں پر حاشیے لکھنے کا جو رواج تھا اس کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے حقیقی مسائل کی طرف توجہ دلائی۔

شاہ ولی اللہ پر دین میں قدامت پرستی کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب وہ قرآن کی طرف رجوع اور اسلامی روایت سے رہنمائی کی بات کرتے ہیں، تو اِس عمل سے ان کا مقصد اِجتہاد کی اہمیت واضح کرنا ہوتا ہے۔ اِجتہاد، دین کی متواتر تشریح کا وہ عمل ہے جِس کے ذریعے اسلام ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ شاہ ولی اللہ سمجھتے تھے کہ اسلام کی آفاقیت کو بحال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اُسے ایک مخصوص علاقے کی تعبیر اور پیرہن میں قید کرنے سے بچایا جائے۔ اس تعبیر کو شاہ ولی اللہ کے پیروکار اہلِ علم عرب قومیت (یا عرب رسم و رواج) کے نام سے بیان کرتے ہیں۔

18.3 علوم قرآن کی اشاعت و خدمات

شاہ صاحب کی علمی خدمات میں ان کا عظیم کارنامہ عوامی سطح پر قرآن کے فہم کو عام کرنا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس وقت کی رائج

علمی، ادبی اور دفتری زبان فارسی میں "فتح الرحمٰن" کے نام سے قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔ ترجمہ قرآن کا یہ عظیم کام انہوں نے محض علمی ذوق کی تسکین یا تصنیفی مشغلہ کے طور پر نہیں کیا تھا، بلکہ اس کا مقصد صرف اور صرف کتاب ہدایت کی ترویج واشاعت اور عام لوگوں کو قرآن کی طرف متوجہ کرنا تھا، تاکہ وہ فاسد خیالات، غلط رسم ورواج جو اس وقت مسلمانوں میں رائج ہو چکے تھے اس کا ازالہ کر سکیں۔ شاہ صاحب نے فتح الرحمن کے مقدمہ میں مسلمانوں کے جن ابتر سماجی حالات اور بے مقصد روزمرہ مشاغل کی نشاندہی کی ہے ، اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا کوئی طبقہ ایسا نہیں تھا جس کی زندگی فساد یا بگاڑ کا شکار نہ ہو۔ عام طور پر قرآن وحدیث سے اعراض اور بے توجہی پائی جاتی تھی، پڑھے لکھے لوگوں کی مجالس آرائی اور حلقہ بندیوں کا رواج عام تھا لیکن ان حلقوں میں صرف قصے کہانیوں، صوفیاء کے ملفوظات، مشہور فارسی شعراء کے اشعار اور حکماء وفلاسفہ کے اقوال کا چرچا ہوتا تھا۔

چنانچہ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"چناں کہ یاران سعادت مند مثنوی مولانا جلال الدین، گلستاں شیخ سعدی و منطق الطیر شیخ فرید الدین عطار وقصص فارابی و نفحات مولانا عبد الرحمٰن وامثال آں نقل مجلس دارند، چہ باشد اگر ایں ترجمہ رابہماں اسلوب درمیان آرند وحصہ از مشاغل خاطر بادراک آں گمارند۔ گر آں شغل باکلام اولیآء است ایں بر شغل کلام اللہ واگر آں مواعظ حکیماں است مواعظ احکم الحاکمین است۔"

ترجمہ "جس طرح یہ لوگ مثنوی جلال الدین اور گلستان شیخ سعدی، یا منطق الطیر شیخ فرید الدین عطار، یا فارابی کے قصے، یا جامی کی نفحات یا اس جیسی دیگر کتابوں کی مجلس لگاتے ہیں۔ اس طرح اس ترجمہ کو بھی رواج دیں اور تھوڑی سی توجہ اس کے اوپر غور وفکر میں بھی صرف کریں۔ چونکہ اگر وہ کلام اولیاء سے شغف ہے تو یہ کلام اللہ کا شغف ہے، وہ اگر حکیموں کے مواعظ ہیں تو یہ احکم الحاکمین کے مواعظ ہیں۔"

شاہ صاحب کے وقت میں دینی مدارس میں علم صرف ونحو اور منطق وفلسفہ جیسے علوم کو عروج حاصل تھا اور جو لوگ قرآن و حدیث کے داعی تھے ان کا موضوع بحث بھی فقہ اور فتاوٰی سے زیادہ کچھ نہ تھے۔ اور اس وقت یہ چلن بھی عام تھا کہ عوام قرآن وحدیث کی تعلیم کو از خود نہیں سمجھ سکتی اور نہ ہی اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ خود سے قرآن وحدیث کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اس سلسلہ میں شاہ صاحب خود فتح الرحمٰن کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:

"اب تک قرآن کے مطالب سمجھنا صرف عربی تفاسیر پر منحصر تھا جسے علماء اپنا ہی حصہ سمجھتے تھے اور عوام کلام الٰہی کا منشاء اور فطرۃ اللہ کا مفہوم سمجھنے سے محروم اور بے نصیب تھے، بس طوطے کی طرح قرآن مجید پڑھا جاتا تھا۔"

ایسے حالات میں شاہ صاحب نے ضروری سمجھا کہ سرچشمہ ہدایت ہونے کی حیثیت سے قرآن کریم کے مقام ومرتبہ کے ساتھ ساتھ اس کی تعلیمات کو عوام کے لئے عام کیا جائے تاکہ لوگوں کے دل ودماغ میں اس کی عظمت ومقام اور فیض یابی کی ضرورت و اہمیت نقش ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنی کتب ورسائل میں مختلف مقامات پر قرآن مجید کے مقام ومرتبہ کی وضاحت کا خاص

اہتمام فرمایا ہے، علم قرآن کو اعظم العلوم، اجل العلوم اور ابجل العلوم سے تعبیر کیا ہے۔

ایک اور مقام پر آپ یہ خیال ظاہر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے انہیں جن نعمتوں سے نوازا ہے ان میں سے سب سے بڑی نعمت فہم قرآن ہے، اور یہ کہ اس کمترین امت پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت سے احسانات ہیں ان میں سے عظیم احسان قرآن کی تبلیغ ہے اور وہ اس طور پر کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کی تلقین قرن اول کو فرمائی درجہ بہ درجہ اس خاکسار کو بھی اس کی روایت و درایت سے حصہ ملا۔"

شاہ صاحب اپنے زمانہ کے حالات سے بہت اچھی طرح باخبر تھے اور آپ یہ بات بھی جانتے تھے کہ عوام قرآن سے کس قدر دور ہے چنانچہ آپ نے اس بات پر خاص توجہ دی کہ لوگوں کو قرآن کے قریب لایا جائے اور اس سے حصول رہنمائی کی ترغیب و تشویق کے لئے ضروری ہے کہ اس کا ترجمہ مروجہ زبان میں ہی کیا جائے۔ اس لئے آپ نے قرآن مجید سے لوگوں کا تعلق مضبوط کرنے، فہم قرآن کو عام کرنے اور براہ راست استفادہ کی سہولت بہم پہنچانے کے لئے اپنے فارسی ترجمہ میں وہ زبان استعمال کی جو آپ کے عہد میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی، شاہ صاحب کے فارسی ترجمہ کے پس منظر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"الغرض شاہ صاحب نے سفر حجاز سے واپسی کے پانچ سال بعد یہ فیصلہ کہ ہدایت عالم، اصلاح عقائد اور اللہ تعالیٰ سے طاقت ور رابطہ پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ قرآن مجید کی ہدایات کی براہ راست اشاعت و تبلیغ سے زیادہ مؤثر نہیں ہو سکتا اور اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے قرآن مجید کا فارسی ترجمہ و اشاعت۔"

شاہ صاحب نے جب یہ ترجمہ کیا تو اس وقت کے علماء بہت ناراض ہوئے کہ کلام اللہ میں اپنی رائے اور نکات شامل کر رہا ہے، آپ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا:

"میں ان طالب علموں سے کہتا ہوں جو اپنے آپ کو علماء کہتے ہیں کہ اللہ کے بندو! تم یونانیوں کے علوم کے طلسم اور صرف و نحو کی دلدل میں پھنس کر رہ گئے ہو؟ تم نے سمجھ لیا ہے کہ علم اسی کا نام ہے؟ حالانکہ علم تو قرآن مجید کی آیاتِ محکمہ، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ثابتہ کا نام ہے۔"

گویا یہ ترجمہ برصغیر میں عوامی سطح پر قرآن فہمی کو عام کرنے کی پہلی کاوش تھی۔ اس کی چند خصوصیات پر شاہ صاحب نے خود مقدمہ فتح الرحمن پر روشنی ڈالی ہے۔ ترجمہ کے ساتھ ساتھ اکثر مقامات پر فوائد بھی تحریر کئے گئے ہیں جو نہایت مختصر مگر مشکل مسائل کی گرہ کشائی میں بے مثل ہیں۔ اس ترجمہ قرآن کی سعی جمیلہ کا یہ فائدہ ہوا کہ عام لوگ قرآن خوانی کے مرحلہ سے نکل کر فہم قرآن کے شعور سے روشناس ہوئے۔ لادینی، ضعیف الاعتقادی، فاسد خیالات، غلط رسوم و رواج، فسق و فجور اور شرک و بدعات جو مسلمانوں میں رائج ہو چکے تھے ان کا خاتمہ ہوا۔ ظلم و جہالت کی صورت حال میں کافی حد تک نہ صرف تبدیلی آئی بلکہ قرآن فہمی کی اشاعت کا رجحان بھی عام

ہوا اور درس قرآن کی مجالس کا انعقاد ہونے لگا۔ اس رجحان کے اثرات بعد کے ادوار میں بھی محسوس کئے گئے ہیں۔ ہندوستان میں غالباً پہلی مرتبہ قرآن فہمی کی جو تحریک شاہ صاحب نے چلائی تھی غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ موجودہ اردو زبان کے اکثر تراجم و تفاسیر میں اس کے اثرات نمایاں طور پر موجود ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کی یہ کوشش رنگ لائی اور پھر دیگر زبانوں میں بھی قرآن کے ترجمے ہوئے اور آج دنیا کی کوئی قابل ذکر زبان ایسی نہیں ہے جس میں قرآن مجید کا ایک دو ترجمہ موجود نہ ہو۔ شاہ صاحب کے ترجمہ قرآن کا عظیم الشان فائدہ یہ ہوا کہ گھر گھر قرآن مجید کے معانی و مطالب کا چرچا ہو گیا۔ عام مرد و عورت، بوڑھے اور جوان تک اس سے آشنا ہو گئے، اور انہیں اس کا یقین کامل ہو گیا کہ قرآن صرف بے سوچے سمجھے پڑھ لینے اور پھر ایک خوبصورت جزدان میں لپیٹ کر رکھ دینے اور اس طرح اس کے ذریعہ برکت و ثواب حاصل کرنے کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ قرآن اس لئے پڑھے کہ اسے سمجھ کر غور و فکر کے ساتھ پڑھا جائے اور پھر اس کو زندگی کا حقیقی راہنما بنا کر اس کے احکام و مسائل پر بھی عمل کیا جائے۔

مولانا عبد الماجد دریابادی لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں قرآن فہمی کا چرچا آج جو کچھ نظر آرہا ہے، اور یہ اردو، انگریزی اور دوسری زبانوں میں جو بیسیوں ترجمے شائع ہو چکے ہیں، ہو رہے ہیں یا آئندہ شائع ہوں گے۔ ان سب کے اجر کا جزو اعظم یقیناً حضرت شاہ صاحب کے حسنات میں لکھا جائے گا۔ یہ سارے چراغ اسی چراغ سے روشن ہوئے ہیں۔ اگر اس کی ابتداء آپ اپنے ہاتھوں سے نہ کرتے تو نہ شاہ رفیع الدین کا اردو ترجمہ وجود میں آتا، نہ شاہ عبد القادر کا، اور متاخرین کا تو ذکر ہی کیا۔ جو شخص امت کے بے شمار نسلوں کے لئے اتنی بڑی رحمت کا دروازہ کھول گیا، اس کے اجر بے حساب کا حساب اور فرد بے نہایت کا اندازہ ہی کون کر سکتا ہے"۔

ڈپٹی نذیر احمد صاحب جنہوں خود بھی قرآن مجید کا ترجمہ کیا تھا۔ شاہ صاحب کی اس خدمت قرآنی کے بارے میں اپنے ترجمہ قرآن کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"یہ بزرگ زمانے کے حالات پر کیسی وسیع نظر رکھتے تھے کہ 1150ھ باپ نے فارسی ترجمے کی ضرورت معلوم کی، پھر سو نہیں، دو سو نہیں، صرف پچیس برس کے بعد ان کے بیٹے شاہ عبد القادر کو معلوم ہوا کہ عام مسلمان فارسی بھی کم سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اردو ترجمہ کیا جو "موضح القرآن" کے نام سے مشہور ہے اور اردو کا سلیس ترجمہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ فی الواقع اپنے وقت کا نہایت آسان ترجمہ تھا، جب ایک ہی خاندان کے تین تین بزرگوں نے قرآن کے ترجمے کئے، ایک فارسی شاہ ولی اللہ صاحب کا، اور دو اردو، ایک شاہ عبد القادر اور ایک شاہ رفیع الدین کا، تو اب ہر ایک کو ترجمے کا حوصلہ ہو گیا۔ مگر خاندان شاہ ولی اللہ کے سوا کوئی شخص مترجم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ وہ ہرگز قرآن کا مترجم نہیں، شاہ ولی اللہ اور ان کے بیٹوں کے ترجموں کا مترجم ہے کہ انہیں کے کئے ہوئے ترجموں میں کچھ رد و بدل اور تقدیم و تاخیر کر کے جدید ترجمہ کا نام دے دیا"۔

18.3.1 اصول ترجمہ

شاہ صاحب نے ترجمے اور تفسیر فتح الرحمٰن کے علاوہ اصول ترجمہ پر ایک مقدمہ بھی لکھا ہے جو مختصر ہونے کے باوجود بڑا بصیرت افروز اور عالمانہ ہے، ابتدا میں لکھتے ہیں :

ویقول الفقیر الٰی رحمۃ اللہ الکریم ولی اللہ بن عبد الرحیم ایں رسالۃ است در قواعد ترجمہ مسماۃ بالمقدمہ فی قوانین ترجمہ کہ در وقت تسوید ترجمہ قرآن قلم بہ ضبط آں جاری شد۔

ترجمہ اور قرآن مجید کی اشاعت و تبلیغ کے راستہ میں جو چٹان حائل ہوگئی تھی، شاہ صاحب جیسی عظیم المرتبت ہستی کے اقدام سے یہ بلاء دور ہوگئی اور راستہ صاف ہوگیا۔ اسلام کی تاریخ میں اس طرح کے واقعات مسلسل رونما ہوتے رہے ہیں کہ کسی مسلم الثبوت اور بلند شخصیت نے کسی اسلامی تعلیمات کو صحیح انداز میں پیش کرنے کا آغاز کر دینے سے بہت سی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں سے نجات ملی اور شاہ راہ عام کھل گئی۔ امام ابو الحسن اشعری کا متکلمانہ مباحث میں حصہ لینا اور عقلی استدلال سے کام لینا، حجۃ الاسلام امام غزالی کا فلسفے کا مطالعہ اور اس کی تنقیح و تردید اور ایسے بہت سے اقدامات جو اپنے عہد کی ضرورت کے مطابق اسلام کی حفاظت یا مدافعت میں کیے گئے، اس کی روشن مثالیں ہیں۔

ترجمہ فتح الرحمن کے علاوہ علوم قرآن پر شاہ صاحب کی درج ذیل کتابیں ہیں:

1. مقدمہ فتح الرحمن: فتح الرحمن فی ترجمۃ القرآن یہ ترجمہ برصغیر میں عوامی سطح پر قرآن فہمی کو عام کرنے کی پہلی کاوش تھی۔ اس کی چند خصوصیات پر شاہ صاحب نے خود مقدمہ فتح الرحمن پر روشنی ڈالی ہے۔ ترجمہ کے ساتھ ساتھ اکثر مقامات پر فوائد بھی تحریر کئے گئے ہیں جو نہایت مختصر مگر مشکل مسائل کی گرہ کشائی میں بے مثل ہیں۔

2. الفوز الکبیر فی اصول التفسیر: یہ فارسی زبان میں اصول تفسیر پر انتہائی اہم، مختصر مگر جامع رسالہ ہے۔ جس میں شاہ صاحب نے فہم قرآن میں دشواریوں کے اسباب اور ان کا حل، قرآن مجید کے علوم خمسہ، تاویل، حروف مقطعات، اصول ناسخ و منسوخ پر نہایت مفید اور بصیرت افروز گفتگو کی ہے۔ یہ مختصر اور جامع کتاب بڑی بڑی مجلدات سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ اس کے کئی اردو اور عربی تراجم ہو چکے ہیں، دینی مدارس اور جامعات کے تعلیمی نصاب میں پڑھائی جاتی ہے۔ اصول تفسیر پر کوئی چیز عام طور پر نہیں ملتی، صرف چند اصول و قواعد تفاسیر کے مقدمے میں یا اپنا تصنیف بیان کرنے کے لیے بعض مصنفین چند سطروں میں لکھ دیتے ہیں، شاہ صاحب کی کتاب "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" بھی اگرچہ مختصر ہے لیکن پوری کتاب سراسر نکات و کلیات ہے، اور در حقیقت ایک جلیل القدر عالم کی جس کو فہم قرآن کے مشکلات کا علمی تجربہ ہے، ایک قیمتی اور نادر بیاض ہے۔ اس کی قدر وہی لوگ جان سکتے ہیں جن کو ان مشکلات سے واسطہ پڑا ہو۔ بعض اصول جو شاہ صاحب نے اپنے ذوق و وجدان اور فہم قرآن کی بنا پر لکھ دیے ہیں، دوسری کتابوں کے سینکڑوں صفحات کے مطالعے سے حاصل نہیں ہوسکتے، اسی رسالے کے مقدمے میں شاہ صاحب کا یہ فرمانا حرف بحرف صحیح ہے کہ:

"فقیر ولی اللہ بن عبد الرحیم کہتا ہے جب اللہ نے اس فقیر پر کتاب اللہ کے فہم کا دروازہ کھولا تو اس کی خواہش ہوئی کہ بعض مفید

نکات جن میں لوگوں کو تدبر قرآن میں مدد ملے گی ایک مختصر رسالے میں لکھ دیے جائیں عنایت خداوندی سے امید ہے کہ طالب علموں کے لیے ان قواعد کے فہم کے بعد فہم مطالب قرآن کی ایسی کشادہ راہ مل جائے گی کہ اگر مطالعہ تفاسیر اور مفسرین (جن کی تعداد آج کل بہت ہی کم ہے) سے رجوع کرنے میں ایک عمر بھی گزاریں گے تب بھی فہم قرآن سے ایسا ربط پیدا نہ کر سکیں گے۔"

قرآن کے مضامین و مقاصد، اس کے طرز اسلوب کی خصوصیت اور انسانی تالیفات خصوصاً متاخرین کی کتب درسیہ سے اس کے اختلاف و امتیاز اور شان نزول سے متعلق چند لفظوں میں جو کچھ لکھا ہے، آج اس میں ممکن ہے کوئی ندرت نہ معلوم ہو لیکن بارہویں صدی میں یہ قطعاً نئے خیالات تھے اور آج بھی کتنے حلقوں میں یہ خیالات نامانوس ہیں۔ شان نزول کی روایتوں کی کثرت اور ان کی اہمیت پر زیادہ زور دینے سے (جو قرون متاخرہ کا شعار بن گیا تھا) قرآن کریم کے مضامین وقصص اور مواعظ و عبر سے ہر زمانے میں جو فائدہ اٹھانا چاہیے اور اپنے اپنے زمانے وحالات پر ان کا جس طرح انطباق ہونا چاہیے، اس میں بڑا فرق ہو گیا تھا، شاہ صاحب کی اس تحقیق و تنقیح سے وہ پردہ ہٹ جاتا ہے اور قرآن مجید کا جمال جہاں آرا سامنے آجاتا ہے، الفوز الکبیر کے باب اوّل میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"عام مفسرین نے ہر ایک آیت کو خواہ مباحثہ کی ہو یا احکام کی ایک قصہ کے ساتھ ربط دیا ہے، اور اس قصہ کو اس آیت کے لیے سبب نزول مانا ہے لیکن حق یہ ہے کہ نزول قرآنی سے مقصود اصلی نفوس بشریہ کی تہذیب اور ان کے باطل عقائد اور فاسد اعمال کی تردید ہے۔ اس لیے آیات مناظرہ کے نزول کے لیے متکلمین میں عقائد باطلہ کا وجود اور آیات احکام کے لیے ان میں اعمال فاسدہ اور مظالم کا شیوع اور آیات تذکیر کے نزول کے لیے ان کا بغیر ذکر آلاء اللہ و ایام اللہ اور موت و واقعات بعد الموت کے بیدار نہ ہونا، اصلی سبب ہوا۔ خاص واقعات کو جن کے بیان کرنے کی عام مفسرین نے زحمت اٹھائی ہے، اسباب نزول میں چنداں دخل نہیں ہے، مگر سوائے چند آیات کے جن میں کسی ایسے واقعے کی جانب اشارہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یا اس سے پیشتر واقع ہوا ہو"۔

3. فتح الخبیر بمالابد من حفظہ فی علم التفسیر: یہ رسالہ عربی زبان میں ہے، جس میں قرآن مجید کے مشکل و غریب لغات کو آسان انداز میں حل کیا گیا ہے۔ آیات قرآنی کی تمام ماثور تفاسیر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے منقول ہیں جمع کی گئی ہیں۔ اس میں غریب القرآن کے ساتھ ساتھ اسباب نزول پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

4. تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء: یہ کتاب عربی زبان میں ہے، اس میں انبیائے کرام کے معجزات جو قرآن مجید میں بیان کئے گئے ہیں وہ مذکور ہیں، جنہیں عام طور پر خرق عادت تصور کیا جاتا ہے، ان کی تاویلات و توجیہات اور مخفی اسباب بیان کئے گئے ہیں۔ شاہ صاحب نے ان تمام معجزات کا مطابق فطرت ہونا ثابت کیا ہے۔

18.3.2 علم حدیث کا احیاء

حدیث، قرآن مجید کے بعد دوسری اہم اساس و بنیاد اور اسلامی فکر و قانون کا منبع و سرچشمہ ہے۔ مذاہب عالم میں اسلام کو جو جامعیت، وسعت، ہمہ گیری اور انسانی وسائل کے احاطہ کی صلاحیت اور زندگی کے ہر گوشہ کے لئے راہنمائی اور رہبری کی قدرت اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگی کے لئے جو قانونی لچک حاصل ہے وہ دراصل حدیث ہی کے اس گرانقدر اور عظیم ذخیرہ کی بدولت ہے۔

برصغیر میں علم حدیث کا احیاء شاہ صاحب کا دوسرا بڑا کارنامہ ہے۔ علم حدیث کے سلسلہ میں جو خدمت انہوں نے انجام دی ہے، اس پر برصغیر ہمیشہ آپ کا مرہون منت رہے گا۔ ان کے دور میں ہندوستان کے مدارس میں حدیث کی تدریس کا رواج بہت کم تھا۔ آپ بنیادی طور پر ایک عظیم محدث تھے، اس لئے وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کے لئے علم حدیث سے آگاہی کس قدر اہم اور ضروری ہے۔ چنانچہ 1732ء میں سفر حج سے واپسی کے بعد انہوں نے خود کو علم حدیث کی تدریس و اشاعت کے لئے وقف کر دیا اور باقی تمام عمر اسی میں گزار دی۔

شاہ صاحب نے علم حدیث کو تمام علوم کا معتمد علیہ سرمایہ، سرتاج اور دیگر دینی فنون کی اساس و بنیاد قرار دیا ہے۔

ان کے نزدیک علم حدیث کی کیا اہمیت ہے اس کا اندازہ ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے اپنی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں ذکر فرمائے ہیں:

"آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال، افعال اور کسی عمل پر خاموشی ہمارے لئے نشان راہ ہے۔ جن کی روشنی میں ہم خدا کی خوشنودی حاصل کرنا چاہیں تو منزل تک پہنچنے میں کوئی شک باقی نہیں رہ جاتا۔ اس راہ کے راہی کے لئے راہ راست سے بھٹک جانے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ جس نے آپ کی حدیث پر عمل کیا یقیناً اس نے راہ پالی، اور جس نے منہ موڑا وہ گمراہ ہوا۔ اس پر عمل کرنے میں بڑی بھلائی ہے اور عمل نہ کرنے میں سخت نقصان کا باعث ہے"۔

علم حدیث پر آپ کی حسب ذیل کتب لائق ذکر ہیں:

1. المسویٰ شرح الموطا: یہ مؤطا امام مالک کی عربی شرح ہے۔ اس میں شاہ صاحب نے احادیث کو اپنے مزاج کے مطابق نئی ترتیب سے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب آپ کے اختیار کردہ طریقہ درس حدیث کا نمونہ ہے۔ شرح میں وہ اسلوب اختیار کیا ہے جو طالب علم کے لئے آسان اور دل نشین ہو۔ حدیث سے مستنبط مسائل اور امام مالک دیگر ائمہ کرام کے مناسب تعقبات نہایت لطیف اشاروں میں بیان کئے ہیں۔

2. المصفیٰ شرح مؤطا: یہ مؤطا امام مالک کی فارسی شرح ہے۔ اس میں شاہ صاحب نے احادیث اور آثار کو الگ الگ کر دیا ہے۔ اقوال امام مالک کو مناسب طریقہ سے بیان کیا ہے اور ساتھ دیگر فقہاء کے اقوال بھی نقل کئے ہیں، اور احادیث پر مجتہدانہ انداز میں بحث کی ہے۔

3. شرح تراجم ابواب صحیح البخاری: یہ رسالہ عربی زبان میں ہے، جس میں آپ نے امام بخاری کے قائم کردہ عنوانات ابواب کی تشریح اور توجیہ اس طرح بیان کی ہے کہ ان کے ذیل میں دی ہوئی احادیث سے ابواب کی مناسبت صحیح طور پر سمجھ میں آجاتی ہے اور کوئی ابہام باقی نہیں رہتا۔

4. حجۃ اللہ البالغۃ: یہ شاہ صاحب کی نہایت معرکۃ الاراء عربی تصنیف ہے۔ اس میں آپ نے تعلیمات اسلام کو فطرت اور احکام دینی کو مبنی بر عدل ثابت کیا ہے۔ ہر حکم الٰہی اور امر شریعت کے اسرار اور مصالح نہایت بلیغ اور مدلل انداز میں بیان کئے ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کو عقل اور علم جدید کے جس میزان پر پرکھنے کا رجحان بیسویں صدی میں شروع ہوا، اس پر عملی کام شاہ صاحب اپنی اس کتاب میں اٹھارہویں صدی میں کر چکے تھے جب کہ ابھی عقلیت کے رجحان کے کوئی آثار نظر نہ

آتے تھے۔اس کتاب کے پہلے حصہ کی ساتویں بحث میں ،طبقات کتب حدیث ،حدیث کو سمجھنے کے طریقے ، مختلف احادیث میں تطبیق وغیرہ پر محققانہ بحث موجود ہے۔

5. الارشاد الیٰ مہمات الاسناد: یہ رسالہ عربی میں ہے۔ جس میں شاہ صاحب نے اپنے اساتذہ اور شیوخ حجاز کا ذکر کیا ہے اور ان کی سند حدیث پر گفتگو کی ہے۔

6. الاربعین: یہ چالیس احادیث کا مجموعہ ہے۔، جسے شاہ صاحب نے عوام میں حدیث کا ذوق پیدا کرنے کے لئے مرتب فرمایا تھا۔

7. الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین: عربی میں یہ رسالہ اس نوع حدیث پر لکھا گیا ہے ، جو مسلسلات کے نام سے مشہور ہیں۔

18.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- شاہ ولی اللہ کا خاندانی سلسلہ نسب فاروقی تھا اور آپ کا نانیہالی سلسلہ نسب علوی تھا جس سے آپ کے اندر علم وحکمت کے ساتھ ساتھ بردباری، تفہیم علوم قرآن وحدیث اور رشد وہدایت وطریقت کے عہدے پر فائز ہوئے۔
- ہم نے سیکھا کہ شاہ ولی اللہ نے قرآنی تعلیمات کو اپنے وقت کے لحاظ سے اور عوام کی علمی وفنی اور لسانی صلاحیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے عام کیا اس کی نشر اشاعت میں بھرپور حصہ لیا اور اسے لوگوں کی ہدایت کے لئے عام فہم زبان میں "فتح الرحمٰن" کے نام سے پیش کر دیا۔

نیز ہم نے یہ بھی جانا کہ علم حدیث کی نشرواشاعت میں شاہ صاحب کی خدمات نہایت اہمیت کی حامل ہیں، انہوں نے درس وتدریس کے ذریعہ علماء اور عوام میں حدیث کی طرف رغبت پیدا کی نیز انہیں اس پر عمل پیرا ہونے کی دعوت بھی دی۔

18.5 نمونہ امتحانی سوالات

18.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. شاہ ولی اللہ یوپی کے کس ضلع میں پیدا ہوئے؟

(a). مظفر نگر (b). دہلی (c). رامپور (d). دیوبند

2. شاہ ولی اللہ کے ترجمہ قرآن کا نام بتائیے؟

(a). بیان القرآن (b). ترجمان القرآن (c). فتح الرحمٰن (d). تفسیر القرآن

3. قیام مکہ و مدینہ میں شاہ ولی اللہ نے سب سے زیادہ کس مشہور عالم دین سے کسب فیض کیا؟

(a). شیخ ابو طاہر محمد کردی (b). شیخ عصام الدین (c). عبد الحق محدث دہلوی (d). شیخ محمد افضل

4. حجۃ اللہ البالغہ کے مصنف کا نام بتایئے؟

(a). شاہ عبد الحق دہلوی (b). شاہ ولی اللہ (c). شاہ عبد الرحیم (d). شاہ عبد العزیز

5. الفوز الکبیر کس فن سے متعلق ہے؟

(a). علم کلام (b). تصوف (c). علم حدیث (d). علم تفسیر

6. شاہ ولی اللہ کے والد کا نام بتایئے؟

(a). شاہ عبد الرحیم (b). شاہ عبد الحق (c). شاہ محمد افضل (d). شاہ عبد العزیز

7. المسویٰ من الموطا کس فن سے متعلق کتاب ہے؟

(a). علم تفسیر (b). علم حدیث (c). علم کلام (d). علم تصوف

8. شاہ ولی اللہ کا پدری سلسلہ نسب کس مشہور صحابی تک پہنچتا ہے؟

(a). حضرت عمرؓ (b). حضرت ابو بکرؓ (c). حضرت عباسؓ (d). حضرت علیؓ

9. شاہ ولی اللہ اپنے والد کے قائم کردہ مدرسہ رحیمیہ میں کتنے برس کی عمر سے درس و تدریس میں مشغول ہو گئے تھے؟

(a).12 برس (b).15 برس (c).17 برس (d).30 برس

10. مدرسہ رحیمیہ کس لئے مشہور ہوا؟

(a). علم حدیث کی اشاعت کے لئے (b). قرآن کی تعلیم کے لئے

(c). صوفیانہ تعلیمات کے لئے (d). عصری تعلیم کے لئے

18.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. شاہ ولی اللہ کی حالات زندگی پر مختصر نوٹ لکھیے۔
2. شاہ ولی اللہ کے سفر حرمین پر روشنی ڈالیے۔
3. علم حدیث پر شاہ صاحب کی جملہ تصانیف کا جائزہ لیجیے۔
4. قرآنیات کے باب میں شاہ ولی اللہ کی تصانیف پر مضمون قلم بند کیجیے۔
5. شاہ صاحب کی تدریسی زندگی پر نوٹ لکھیے۔

18.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. ترجمہ قرآن فتح الرحمٰن کی افادیت واہمیت پر نوٹ لکھیے۔
2. الفوز الکبیر کے حوالے سے شاہ ولی اللہ کی تفسیری خدمات کا جائزہ لیجیے۔
3. علم حدیث کے فروغ میں آپ کی کوششوں پر روشنی ڈالیے۔

18.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.	حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی: شخصیت وحکمت کا ایک تعارف	:	پروفیسر یاسین مظہر صدیقی
2.	شاہ ولی اللہ دہلوی کی قرآنی خدمات (مقالات سمینار)	:	مرتبہ، پروفیسر یاسین مظہر صدیق، پروفیسر ظفرالاسلام
3.	امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار ونظریات	:	مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی
4.	شاہ ولی اللہ حیات وافکار	:	ظفر احمد نظامی
5.	تذکرہ شاہ ولی اللہ	:	مولانا سید مناظر احسن گیلانی

اکائی 19: شاہ ولی اللہ (حصہ دوم)

اکائی کے اجزا:

19.0 تمہید

19.1 مقاصد

19.2 فقہ اور اصول فقہ میں خدمات

19.3 علم تصوف میں خدمات

19.4 علم کلام میں خدمات

19.5 حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کی تحریک

19.5.1 ولی اللّٰہی افکار

19.5.2 سیاسی اصول اور شہریوں کے بنیادی حقوق

19.5.3 اقتصادی اصول

19.5.4 دارالحرب کا فتویٰ

19.6 اکتسابی نتائج

19.7 نمونہ امتحانی سوالات

19.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

19.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

19.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

19.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

19.0 تمہید

پچھلی اکائی میں آپ نے شاہ ولی اللہ دہلوی جو عالم اسلام کے عظیم ترین مفکروں میں سے ایک ہیں ان کی شخصیت کا تعارف اور ان کے علوم قرآن وحدیث کے تئیں خدمات کا مطالعہ کیا۔ آپ نے جانا کہ شاہ صاحب کی ہمہ گیر شخصیت کو اس دور کے مروجہ ہر علوم میں کمال حاصل تھا۔ اس اکائی میں ہم ان کی دیگر علوم کی خدمات سے متعارف ہوں گے جن میں فقہ۔ تصوف، اور علم کلام وغیرہ شامل ہیں۔

19.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ شاہ ولی اللہ کی فقہی خدمات سے واقفیت حاصل کر سکیں اور ان کے صوفیانہ رجحان اور اس سلسلے میں ان کی کتب کے بارے میں آگاہی حاصل کر سکیں۔ اسی طرح شاہ ولی اللہ کی علم کلام کے سلسلے میں افکار کا جائزہ لے سکیں۔ نیز اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ ان کی تحریک اور ان کے سیاسی اور اقتصادی اصولوں کے بارے میں بھی جان سکیں گے۔

19.2 فقہ اور اصول فقہ میں خدمات

فقہ کے میدان میں بھی شاہ صاحب کی علمی اور دینی خدمات قابل قدر اور بے مثال ہیں۔ ہندوستان ابتدائے زمانہ ہی سے فقہ حنفی کا مرکز رہا ہے، بلکہ ہندوستان میں اس فقہی مذہب کو اکثر مسلم حکومتوں کی سرپرستی بھی حاصل رہی ہے۔ کیونکہ ہندوستان کے سلاطین کا سرکاری مذہب حنفی تھا اور وہ اس مذہب کے جید علماء وفقہاء کی مجالس میں پیش آنے والے مسائل پر تبادلہ خیال کیا کرتے تھے۔ مثلاً بیت المال کے معاملات، باغی اور بد نظمی کرنے والے حاکموں کی سزاؤں کے قوانین، بیت المال میں سلطان کے حصے اور اسلامی حکومت میں ہندوستان کی قانونی حیثیت کے بارے میں بحث وغیرہ۔ عہد مغلیہ میں سلاطین نے میدان فقہ میں سب سے اہم کام "فتاویٰ عالمگیری" کی تالیف کی شکل میں کیا جو اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں انجام دی گئی۔ تاہم اس ملک میں فقہ حنفی کے علاوہ دیگر مذاہب فقہ کے لوگ بھی موجود تھے۔

شاہ ولی اللہ کی تعلیم وتربیت بھی حنفی ماحول میں ہوئی تھی، اور خاندانی طور پر آپ فقہ حنفی سے ہی وابستہ تھے۔ فتاوٰی عالمگیری کی تدوین میں آپ کے والد گرامی شاہ عبدالرحیم نے بھی فقہاء کی مجلس میں کچھ عرصہ تک شامل رہ کر اپنی خدمات انجام دی تھی۔ والد صاحب کی وفات کے بعد دوران تدریس اور قیام حجاز کے ایام میں آپ کو حنفی مسلک کے علاوہ دوسرے مسالک کو بھی قریب سے دیکھنے اور پڑھنے کا موقع ملا جس کی بنا پر آپ کی نظر میں وسعت پیدا ہوئی۔ اگرچہ آپ خود فقہ حنفی کے پیروکار تھے مگر آپ کی نظر میں دوسرے مکاتب فقہ یکساں اہمیت کے حامل تھے۔

شاہ صاحب کا دور فقہی رجحانات کے حوالے سے جمود، تعصب اور تنگ نظری کا دور تھا۔ ایک فقہی مسلک کے لوگ دوسرے فقہ کے پیروکاروں کو برداشت کرنے کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ مدارس عربیہ میں بھی فقہ کا عنصر اس قدر غالب تھا کہ گویا شریعت کے

بنیادی ماخذ قرآن و سنت کی ثانوی حیثیت تھی۔ اس حوالے سے اختر امام عادل لکھتے ہیں:

"شاہ صاحب کے دور میں جو جمود، تعصب، تنگ نظری اور غالی تصورات پیدا ہو گئے تھے، ان کی بنا پر دیگر مذاہب کے مطالعہ و تحقیق بلکہ احترام کی روایت بھی اٹھتی جارہی تھی.... شاہ صاحب نے محسوس کیا کہ اس جمود اور تنگ نظری کا سبب مطالعہ و تحقیق اور وسعت نظری کی کمی ہے۔ اگر اہل علم تمام مذاہب فقہیہ کا منصفانہ مطالعہ کریں، اور ان کے بنیادی ماخذ تک پہنچنے کی کوشش کریں تو مذاہب کے درمیان اس درجہ تفریق و امتیاز کا جو احساس پایا جاتا ہے اس میں کمی آجائے گی، اور اسلاف باہم فکری و نظری اختلافات کے باوجود جس رواداری اور اکرام و احترام کا مظاہرہ فرماتے تھے وہ دوبارہ قائم ہو"۔

شاہ صاحب کے زمانہ میں علماء کا ایک گروہ ایسا تھا جو اجتہاد کا مخالف اور اسے ناجائز تصور کرتا تھا اور تقلید جامد پر مصر تھا، نیز فقہی جزئیات کو نصوصِ کتاب و سنت کا درجہ دے رکھا تھا۔ اس کے برعکس دوسرا طبقہ تقلید کو ممنوع گردانتا تھا اور اس پر عمل پیرا علماء پر کفر کا فتوہ لگتا تھا۔ ایسے حکمت و تفہم سے عاری علماء و عوام کے دور میں آپ نے اجتہاد و تقلید کے اس باب میں اعتدال کی راہ دکھائی اور ان کے دائرہ کار اور حدود کو متعین کیا، اور اس حقیقت کو واضح کیا کہ اجتہاد ممنوع نہیں بلکہ اس کا سلسلہ قیامت تک جاری و ساری رہے گا۔ ہر دور میں ایسے باصلاحیت افراد پیدا ہوں گے جو اجتہادی عمل کو جاری رکھیں گے۔ لیکن اجتہاد ہر کس و ناکس کا کام نہیں اس کے لئے کچھ شرائط ضروری ہوتی ہیں۔ اس طرح آپ نے تقلید کو انسان کی فطری ضرورت قرار دیا کہ جن لوگوں میں اجتہاد کی مطلوبہ صلاحیت موجود نہیں، ان کے لئے تقلید کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ علماء پر زور دیا کہ جزئیات و مسائل کا صرف مطالعہ کرنے کے بجائے کتاب و سنت کے ساتھ ان کا ربط اور موازنہ کرتے رہنا چاہئے۔ حدیث کی روشنی میں مسالک اربعہ کے درمیان تطبیق و توفیق کی حتی الوسع کوشش کرنی چاہئے۔

شاہ صاحب کے نزدیک چاروں فقہی مسالک برابر ہیں، اور ہر ایک کی اپنی خصوصیت ہے۔ ان کے فقہی اختلافات دلائل پر مبنی ہیں۔ بیشتر اختلافات محض اولیٰ اور راجح کی تعیین کے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو نصیحت کی ہے کہ مسائل میں ان علماء محدثین کی پیروی کریں جو فقہ و حدیث کے جامع ہوں۔

اس موضوع پر شاہ صاحب نے درج ذیل رسالے مرتب فرمائے ہیں:

1. عقد الجید فی بیان احکام الاجتہاد والتقلید: اس عربی رسالہ میں آپ نے اجتہاد اور تقلید کے مسئلہ پر نہایت محققانہ اور منصفانہ بحث کی ہے۔ علمی انداز میں دلائل کے ساتھ اجتہاد و تقلید کے بارے اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔
2. الانصاف فی بیان سبب الاختلاف: اس رسالہ میں آپ نے احکام شرعیہ کے متعلق صحابہ کرام، تابعین، ائمہ مجتہدین کے باہمی اختلافات کے اسباب اور اس کی تاریخ بیان کی ہے، اور ہر گروہ کی افراط و تفریط پر تنقید کی ہے۔
3. رسالہ در مذہب فاروق اعظم: حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالی عنہ کے اجتہادات اور فتاویٰ پر مشتمل ہے۔ اس رسالہ میں انہوں نے کتاب الخراج قاضی ابو یوسف، کتاب الام امام شافعی، سنن دارمی، صحیحین، سنن و جوامع صحاح ستہ سے اجتہادات حضرت عمر جمع کئے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے حجۃ اللہ البالغہ اور اپنی دیگر تصنیفات میں بھی فقہی ابحاث درج کی ہیں۔

19.3 علم تصوف میں خدمات

تصوف ان کیفیات کا علم ہے ، جن کے ذریعے نفس کا تزکیہ ، اخلاق کا تصفیہ اور ظاہر و باطن کی تعمیر ہوتی ہے، تاکہ انسان ابدی سعادت حاصل کر سکے۔اس سے تعلق باللہ قائم کرنے، آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے، اخلاق حسنہ کو اختیار کرنے، اخلاق رذیلہ کو ترک کرنے، ظاہر و باطن کی اصلاح اور ہر معاملہ میں رضائے الٰہی کی طلب اور اس پر راضی رہنے کا درس ملتا ہے۔

شاہ صاحب نے تصوف کے میدان میں بھی اپنے علم و حکمت کے شانہ بشانہ خدمات انجام دی ہیں۔ آپ نے اپنی کتابوں میں تصوف اور احسان کی تعلیمات کے بارے میں قدرے وسعت سے لکھا ہے۔ اپنی شہرہ آفاق کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" جو آپ نے شریعت کے اسرار و حکم، مقاصد و اغراض، احادیث کی توضیح میں لکھی ہے، اس کی دوسرے حصہ میں ارکان اسلام مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کی حقیقت پر بھرپور تشریح بیان کرنے کے بعد "مبحث فی ابواب من الاحسان" کے تحت آپ نے تصوف کے مسائل کا بھرپور احاطہ کیا ہے۔ شاہ صاحب جمہور صوفیاء کی طرح طریقت کو شریعت کے تابع سمجھتے ہیں۔ احکام الٰہی کی بجا آوری کے نتیجے میں باطنی کیفیات و نتائج کو "احسان" کا نام دیتے ہیں۔

شاہ صاحب کا دور جاہل صوفیاء اور علماء سوء سے خالی نہ تھا۔ ایک طرف علماء نے منطق و فلسفہ کی لایعنی مباحث کو علمیت کا معیار قرار دیا ہوا تھا، تو دوسری طرف صوفیاء نے کرامات و شعبدہ بازی کو تصوف کی معراج سمجھ رکھا تھا۔ یہ دونوں طبقے دین کے نام پر دنیا پرستی کے فروغ میں پیش پیش تھے۔ شاہ صاحب نے ان دونوں طبقوں پر ان کے غلط طریقہ کار کی وجہ سے کڑی تنقید کی ہے۔ اپنی کتاب "التفہیمات الالٰہیہ" میں غلط کار علماء اور نام نہاد صوفیاء اور بے علم مشائخ کی اولادوں کو تحریر و تقریر کے ذریعے ان کی کوتاہیوں اور غلط روش پر متنبہ کیا ہے۔ چنانچہ "التفہیمات الالٰہیہ" میں پیرزادوں سے فرماتے ہیں:

"اے وہ لوگو! جو اپنے آباء کے رسوم کو بغیر کسی حق کے پکڑے ہوئے ہو، میرا آپ سے سوال ہے کہ آپ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ٹکڑوں، ٹولیوں میں بٹ گئے ہو، ہر ایک اپنے اپنے راگ اپنی منڈلی میں الاپ رہا ہے۔ جس طریقے کو اللہ تعالیٰ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے نازل فرمایا تھا اور اپنے لطف و کرم سے جس راہ کی طرف رہنمائی فرمائی تھی، اسے چھوڑ کر ہر ایک مستقل پیشواء بن گیا ہے، اور لوگوں کو اپنی طرف بلا رہا ہے۔ اپنے آپ کو راہ یافتہ اور رہنما سمجھتے ہو، حالانکہ خود گم کردہ اور بھٹکانے والے ہو۔ ہم ایسے لوگوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے جو لوگوں کو صرف اس لئے مرید کرتے ہیں تاکہ ان سے ٹکے وصول کریں۔ ایک نیک علم سیکھ کر دنیا بٹورتے ہو، کیونکہ جب تک دیندار لوگوں کی شکل و شباہت اور طرز و انداز، نہ اپنائیں دنیا حاصل نہیں ہو سکتی۔ نہ میں ان لوگوں سے راضی ہوں جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بجائے خود اپنی طرف بلاتے ہیں اور اپنی مرضی کی پابندی کا لوگوں کو حکم دیتے ہیں۔ یہ لوگ بٹ مار اور راہزن ہیں۔ ان کا شعار دجالوں، کذابوں قتالوں اور ان لوگوں میں ہے جو فتنہ اور آزمائش کے شکار ہیں"۔

شاہ صاحب نے تصوف کے میدان میں پائے جانے والے غلط نظریات اور افراط و تفریط میں درستگی اور اصلاح کی کوشش

بھی فرمائی ہے۔ مثلاً:

1. بعض متاخر صوفیاء کے ہاں ایسے اقوال ملتے ہیں، جن سے لگتا ہے یہ انسان کو ملک مقرب پر فضیلت دیتے ہیں۔ لیکن شاہ صاحب نے اس کی تردید کی ہے۔
2. ''الولایۃ افضل من النبوۃ'' ولایت نبوت سے افضل ہے۔ اس عقیدہ کا رد کیا ہے۔
3. شیخ کی اندھی تقلید کی بھی مخالفت کی ہے۔ اگر کوئی شیخ کسی ناجائز کام کا حکم دے تو حکم کی تعمیل نہ کی جائے۔
4. حلول واتحاد کے عقیدہ کو خالصتاً غیر اسلامی قرار دیا ہے، اور اس کا بھرپور رد کیا ہے۔
5. صوفیاء کے ہاں ظاہر و باطن کی جامعیت کا جو فقدان ہے، اس پر تنقید کی ہے اور ظاہر اور باطن دونوں کی تطہیر و تعمیر پر زور دیتے ہیں۔
6. حد سے تجاوز کرنے والے متقشف قسم کے زاہدوں پر سخت تنقید کی ہے۔
7. تصوف میں شامل ہو جانے والے غلط نظریات اور افراط و تفریط سے بچنے کی تلقین کی ہے۔
8. صوفیاء کی غلط تاویلات کو غیر شرعی اور ناپسند قرار دیتے ہیں۔
9. ہر وہ فلسفہ جس کی کوئی اصل قرآن وحدیث میں نہیں ملتی، سختی سے اس کی مخالفت کرتے ہیں۔
10. آپ کے نزدیک تصوف اور روحانی فکر کی اساس و بنیاد قرآن وسنت پر استوار ہے۔

شاہ صاحب فلسفہ آمیز، خرافات واوہام، غلط نظریات اور افراط و تفریط سے آلودہ مروجہ تصوف کی جتنی شدت کے ساتھ نفی اور تنقید کرتے ہیں اتنی ہی شدت کے ساتھ درست اور اسلامی تصوف کی وابستگی پر زور بھی دیتے ہیں۔ تصوف کو انسان کی اخلاقی اور روحانی ترقی کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اپنی کتاب ''الطاف القدس'' میں چار اخلاقی اصولوں کو تصوف کا مدار قرار دیتے ہیں:

1. پہلا اصول طہارت کا ہے، جس کی روح یہ ہے کہ باطن منور اور پاکیزہ ہو، اور انشراح و اطمینان کی دولت سے مالا مال ہو۔ افکار پریشاں، نظریات ژولیدہ، جزع فزع اور فریاد وماتم سے دور و مبرا ہو۔
2. دوسرا اصول تواضع کا ہے جو جبروت سے آشنائی پیدا کرتا ہے۔ عبادات، اذکار اور تلاوت کے ذریعے قلب میں سوز و گداز، فراتنی اور خاکساری کا محرک بنتا ہے۔ اس سے انسان کے اندر خشوع و خضوع کا وصف پیدا ہوتا ہے۔
3. تیسرا اصول سخاوت کا ہے جس کے دائرہ میں زہد و قناعت، جود و سخا، تواضع وانکساری، صبر و شکر، لینت و نرمی کی صفات پیدا ہوتی ہیں۔
4. چوتھا اصول عدالت ہے، جس میں عدل اجتماعی، تدبیر منزل اور اصلاحی امور شامل ہیں۔ (20)

شاہ صاحب نے تصوف کے متعلق درج ذیل کتابیں تصنیف کی ہیں:

1. الطاف القدس: یہ کتاب تصوف واحسان کے اسرار ورموز، لطائف نفس، اور روحانی حقائق و معارف پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا

مرکزی موضوع "لطائف نفس" ہے۔ اس کتاب کا شمار تصوف کی اہم کتابوں میں ہوتا ہے۔

2. ہمعات: یہ فارسی زبان میں تاریخ تصوف، فلسفہ تصوف اور اصطلاحات تصوف پر ایک شاہکار تصنیف ہے۔ جس میں تصوف کے چار ادوار اور ان میں رونما ہونے والے تغیرات و حالات کا جامع ذکر ہے۔ نیز اس میں طبقات صوفیا، ان کے مراتب اور نسبتوں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

3. لمعات: یہ فارسی زبان میں سات لمعات پر مشتمل تصوف کی اہم ترین کتاب ہے۔ اس میں بھی تصوف و کلام کی اہم ابحاث اور مسائل مثلا ابداع خلق، تدبیر، وحدۃ الوجود، وحدۃ الشہود، وجود فی الخارج، وجود فی الاعیان، عالم مثال، شخص اکبر وغیرہ بیان کئے گئے ہیں۔

4. سطعات: یہ فارسی زبان میں چھیالیس سطعات پر مشتمل تصوف کی جامع کتاب ہے۔ ہر سطعہ میں تصوف کے اہم اور دقیق مسئلہ پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب میں تجلیات الٰہیہ کے اہم مباحث اور تصوف کی اصطلاحات مثلا وحدۃ الوجود، عام خاص، اخص الخواص، انسان کامل، ذات بحت، شخص اکبر وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔

5. البدور البازغہ: یہ کتاب عربی زبان میں ہے، جو فلسفہ اور تصوف کے حقائق و معارف پر مشتمل ہے۔

6. التفہیمات الالٰہیہ: یہ کتاب تصوف اور سلوک کے مقالات پر مشتمل ہے۔ مقالات عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں ہیں، یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ تصوف اور سلوک کی باتوں کے ساتھ ساتھ اپنے دور کی خرابیوں، عیوب و نقائص کی نشاندہی کے ساتھ معاشرے کے ہر طبقے کو اصلاح کی تاکید کی گئی ہے۔

7. الخیر الکثیر: یہ کتاب عربی زبان میں ہے، اس کا موضوع فلسفہ دینی ہے۔ خزائن حکمت سے بھرپور اور اپنے موضوع پر بے نظیر کتاب ہے۔ ولایت کی حقیقت اور اس کے اقسام، اہل صفا کے مسالک و طرق، ذات اسماء الٰہی کی حقیقت اور مسئلہ وحدت الوجود پر عارفانہ اور فلسفانہ بحث کی گئی ہے۔

19.4 علم کلام میں خدمات

عقائد اور اس سے متعلق مباحث اور دلائل کو جاننے کا نام علم کلام ہے۔ اس میں وجود باری تعالیٰ، صفات الٰہیہ، انبیاء کرام کی بعثت، معجزہ اور کرامت وغیرہ امور سے متعلق عقلی و نقلی دلائل کی روشنی میں بحث کی جاتی ہے۔ اس علم کی بدولت آدمی کے عقائد پختہ ہوتے ہیں، اور اسلامی عقائد کو غیر اسلامی اور کفریہ عقائد سے ممتاز کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کا ایک مقصد اسلامی عقائد اور نظریات میں پیش آنے والی خرابیوں اور توہمات کو اصل دین کی بنیاد سے الگ رکھنا بھی ہے تاکہ دین ویسا ہی رہے جیسا کہ دور رسالت مآب ﷺ میں تھا۔ یہ علم عقل کی روشنی میں اسلام کے بنیادی عقائد مثلا توحید، رسالت، عدل، نبوت، قیامت وغیرہ کی وضاحت اثبات اور ان عقائد پر ہونے والے اعتراضات اور شبہات کا جواب دیتا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے دور میں ہندوستان کے مدارس میں منطق و فلسفہ کا بڑا زور اور چرچا تھا، گویا اس فن کے بغیر کوئی شخص

عالم اور دانشور نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر یہ منطق و فلسفہ، عقلی موشگافی، لفظی بازی گری اور لا حاصل بحثوں کے سوا کچھ اہم نہ تھا، اور اسلامی فلسفہ محض ایک قصہ پارینہ بن چکا تھا۔ آپ نے اپنے دور کی عام روش سے ہٹ کر ایک نئے انداز سے فلسفیانہ بحثوں کا رخ اسلامی عقائد و عبادات، اخلاق و معاشرت، سیاست و معیشت کی حکمت اور اسرار و رموز کے انکشاف کی طرف موڑا اور دین کی کلیات سے لے کر جزئیات تک کو عقلی انداز میں پیش کیا۔ ان کی شہرہ آفاق اور مہتم بالشان کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" اول تا آخر شریعت کے مبادی اور احکام کی حکمتوں اور مصالح سے معمور ایک روشن اور زندہ جاوید کتاب ہے۔

مشہور مؤرخ شیخ محمد اکرام نے شاہ صاحب کو "جدید علم کلام" کا موجد قرار دیا ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں ایک جدید علم الکلام کی ابتداء کی ہے اور آنے والے لوگوں کے لئے غور و فکر کا ایک بہت بڑا میدان پیش کیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب "رود کوثر" میں لکھتے ہیں:

"واقعہ ہے کہ ایک لحاظ سے آپ اسلامی ہندوستان کے سب سے پہلے متکلم ہیں۔ عباسیہ دور میں علم کلام اس لئے وجود میں آیا تھا کہ اسلامی خیالات کو یونانی فلسفہ کے مطابق ثابت کرے، دور جدید میں سر سید اور ان کے رفقاء کی کوشش تھی کہ وہ اسلامی مذہب و فلسفہ کو جدید سائنس اور نیچر سے ہم آہنگ قرار دیں۔ شاہ صاحب اس قسم کے متکلمین میں سے نہیں لیکن اسلامی تعلیمات کو انسانی دنیا کے بنیادی واقعات اور اصولوں سے ہم آہنگ ثابت کرنے کی کوشش ضرور ان کی تصانیف میں ہے۔ ان کی مشہور تصنیف "حجۃ اللہ البالغۃ" میں یہ کوشش خاص طور پر نمایاں ہے۔ اس میں انہوں نے اسلامی احکام کی مصلحتیں بیان کر کے ثابت کیا ہے کہ یہ احکام فلاح انسانی کے لئے بے حد مفید ہیں، اور ان کی غرض و غایت ہی انسانی فلاح و تہذیب ہے۔ شاہ صاحب نے اس کتاب اور دوسری تصانیف میں ایسی باتیں کہی ہیں جن سے متکلمین کی ترجمانی ہوتی ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ کے دیباچہ میں شاہ صاحب کا یہ مشہور فقرہ "مصطفوی شریعت کے لئے وقت آ گیا ہے کہ برہان اور دلیل کے پیراہنوں میں ملبوس کر کے اسے میدان میں لایا جائے" ایک نئے علم کلام کا پیغام نہیں تو اور کیا ہے؟۔

علامہ شبلی نعمانی فرماتے ہیں:

ترغیبات و ترہیبات کے متعلق جو کچھ شریعت میں وارد ہے وہ ہنسنے کے قابل باتیں ہیں۔ غرض منکرین اس قسم کے بہت سے اعتراضات کرتے ہیں، ان کے جواب کے لئے ضروری ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ شریعت کی تمام باتیں عقل کے موافق ہیں۔ "حجۃ اللہ البالغہ" جس میں انہوں نے شریعت کے حقائق اور اسرار بیان کئے ہیں در حقیقت علم کلام کی روح رواں ہے۔ علم کلام در حقیقت اس کا نام ہے کہ مذہب اسلام کی نسبت یہ ثابت کیا جائے کہ وہ منزل من اللہ ہے۔ مذہب دو چیزوں سے مرکب ہے عقائد اور احکام، شاہ صاحب کے زمانے تک جس قدر تصانیف لکھی جا چکی تھیں وہ صرف پہلے حصہ کے متعلق تھیں، دوسرے حصہ کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ شاہ صاحب پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس موضوع پر کتاب لکھی۔ خود دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ "جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن مجید کا معجزہ عطا ہوا تھا جس کا جواب عجم و عرب سے نہ ہو سکا، اسی طرح آپ کو جو شریعت عطا ہوئی تھی وہ بھی معجزہ تھی۔ کیونکہ ایسی شریعت کا وضع کرنا جو ہر طرح پر، ہر لحاظ سے کامل ہو طاقت انسانی سے باہر ہے۔ اس لئے جس طرح قرآن مجید کے معجزہ ہونے پر بہت سی

کتابیں لکھی گئیں ضروری ہے کہ اس معجزہ کے متعلق بھی مستقل تصنیف لکھی جائے" پھر لکھتے ہیں کہ "اہل بدعت نے اکثر اسلامی مسائل کے متعلق یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ عقل کے خلاف ہیں مثلا وہ کہتے ہیں کہ عذاب قبر، حساب، پل صراط، میزان کو عقل سے کیا تعلق ہے؟ رمضان کے اخیر دن کا روزہ واجب ہو اور شوال کی پہلی تاریخ کا حرام؟ اس کے کیا معنی؟

علامہ شبلی نعمانی فرماتے ہیں:

"شاہ صاحب نے یہ دو غرضیں جو بیان کی ہیں، علم کلام کے اہم المقاصد ہیں اور اس لحاظ سے ہم ان کی کتاب کو دراصل علم کلام کی کتاب قرار دیتے ہیں"

شاہ صاحب نے جن مہتم بالشان مسائل کلامیہ پر اپنی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں بحث کی ہے وہ حسب ذیل ہیں:

1. انسان مکلف کیوں بنایا گیا ہے؟ یعنی اس کو اوامر و نواہی کی کیوں تکلیف دی گئی ہے۔
2. خدا کی عادت یا فطرت میں تغیر و تبدیلی نہیں ہوتی۔
3. روح کی حقیقت
4. جزاو سزا کی حقیقت
5. واقعات قیامت کی حقیقت
6. عالم مثال
7. نبوت کی حقیقت
8. تمام مذاہب کی اصل ایک ہے
9. اختلاف شرائع کے اسباب
10. ایک ایسے مذہب کی ضرورت جو تمام مذاہب قدیم کا ناسخ ہو۔

شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کے علاوہ اپنی ایک اور عربی تصنیف "البدور البازغہ" میں بھی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، امور الٰہیات اور انسان کی جبلی اور اجتماعی زندگی سے متعلق فلسفیانہ رنگ میں بحث کی ہے۔ اسی طرح "الخیر الکثیر" میں بھی علم کلام کے مختلف مضامین توحید، رسالت، قرآن احوال و مراتب، شریعت کے نشو و نما اور ارتقاء سے بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کا انداز بحث بھی فلسفیانہ ہے۔

19.5 حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کی تحریک

حضرت شاہ ولی اللہ نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو سلطنتِ مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ طوائف الملوکی ڈیرہ ڈالے ہوئے تھی اور فرنگی تاجر کمپنیاں دھیرے دھیرے مغل حکمرانوں کی جگہ لینے کے لیے آگے بڑھ رہی تھیں۔ سلطنتِ مغلیہ کا روز افزوں زوال اور فرنگی کمپنیوں کا

بڑھتا ہوا اثر ورسوخ شاہ صاحب کے سامنے تھا۔ فرنگی جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کو شہید کر کے 1757ء میں بنگال پر قبضہ کر چکے تھے۔ حیدر آباد دکن، اودھ اور میسور پر فرنگی کی للچائی ہوئی نظریں صاف دکھائی دے رہی تھیں، ایسے میں شاہ صاحب نے سلطنتِ مغلیہ کے بوسیدہ کھنڈرات کو سہارا دینے کے بجائے "فک کل نظام" (ہمہ گیر انقلاب) کا نعرہ لگایا۔

شاہ صاحب یہ سمجھ چکے تھے کہ مغلیہ سلطنت کے دن گنے جا چکے ہیں، اس کو سہارا دینے یا اس کی اصلاح کی توقع رکھنے کے بجائے اس ترقی پذیر قوت کے مقابلے کی تیاری کرنی چاہیے جو سلطنتِ مغلیہ کی جگہ لینے والی ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب نے ایسا ہی کیا۔ فرنگی کے تسلط کو ایک یقینی امر سمجھتے ہوئے اس دور رس نگاہ رکھنے والے مردِ درویش نے فرنگی کے مقابلے میں ایک فکری و علمی مکتبِ فکر کی بنیاد رکھی۔

19.5.1 ولی اللّٰہی افکار

حضرت شاہ ولی اللہ نے سب سے پہلے قرآن کریم کا اس وقت کی مروجہ زبان فارسی میں ترجمہ کیا اور ان کے فرزند حضرت شاہ عبد القادر اور حضرت شاہ رفیع الدین نے اسے اردو کا جامہ پہنایا۔ اس کے ساتھ ہی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے آنے والے دور کے مسائل کو محسوس کرتے ہوئے انقلاب فرانس سے پچاس سال قبل اور کارل مارکس کی پیدائش سے 100 سال قبل انسان کے جمہوری، معاشرتی و اقتصادی حقوق کی قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر شاہ صاحب کی تعلیمات کا مختصر سا خلاصہ پیش کر دیا جائے جو ان کی معرکۃ الآرا تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" اور دیگر تصانیف سے ماخوذ ہے۔

19.5.2 سیاسی اصول اور شہریوں کے بنیادی حقوق

شاہ ولی اللہ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ علم وفن اور قرآن وحدیث کی تشہیر و تدوین میں گزارا تھا لیکن وہ عملی میدان سے بے خبر نہ تھے انہوں نے ضرورت پڑنے پر تحریک شروع کی جو لوگوں کے درمیان کافی مقبول و معروف ہوئی، جس میں شاہ صاحب نے عوام کو قرآن سے جوڑنے اور ان میں اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کی جہت دکھائی۔ اس سلسلہ میں شاہ صاحب نے اسلام کے چند سیاسی اصولوں اور شہریوں کے بنیادی اصول کو بھی پیش کیا ہے تاکہ مسلم معاشرہ کی صحیح تصویر عوام کے سامنے آسکے، وہ فرماتے ہیں:

1. زمین کا مالک حقیقی خدا ہے، باشندگانِ ملک کی حیثیت وہ ہے جو کسی مسافر خانے میں ٹھہرنے والے لوگوں کی ہوتی ہے ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حقِ انتفاع (فائدہ اٹھانے کا حق) میں کسی دوسرے کی دخل اندازی قانوناً ممنوع ہے۔
2. سارے انسان برابر ہیں۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے آپ کو مالکِ ملک، ملک الناس مالکِ قوم یا انسانوں کی گردنوں کا مالک سمجھے، نہ کسی کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی صاحب اقتدار کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرے۔
3. ریاست کے سربراہ کی وہ حیثیت ہے جو کسی وقف کے متولی کی ہوتی ہے۔ وقف کا متولی اگر ضرورت مند ہو تو اتنا وظیفہ لے سکتا ہے کہ عام باشندہ ملک کی طرح زندگی گزار سکے۔

4. روٹی، کپڑا، مکان اور ایسی استطاعت، کہ نکاح کر سکے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کر سکے بلا لحاظ مذہب و نسل ہر ایک انسان کا پیدائشی حق ہے۔

5. مذہب، نسل یا رنگ کے کسی تفاوت کے بغیر عام باشند گان کے لیے ملک کے معاملات میں یکسانیت کے ساتھ عدل و انصاف، ان کے جان و مال کی حفاظت، حق ملکیت میں آزادی، حقوقِ شہریت میں یکسانیت ہر باشندۂ ملک کا بنیادی حق ہے۔

6. زبان اور تہذیب کو زندہ رکھنا ہر ایک فرقہ کا بنیادی حق ہے۔

19.5.3 اقتصادی اصول

1. دولت کی اصل بنیاد محنت ہے۔ مزدور اور کاشت کار قوت کاسبہ (کمانے والی قوت) ہیں۔ باہمی مدنیت (شہریت) کی روحِ رواں باہمی تعاون ہے۔ جب تک کوئی شخص ملک و قوم کے لیے کام نہ کرے ملک کی دولت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔

2. جوا، سٹہ اور عیاشی کے اڈے ختم کیے جائیں جن کی موجودگی میں تقسیم دولت کا صحیح نظام قائم نہیں رہ سکتا اور بجائے اس کے کہ قوم اور ملک کی دولت میں اضافہ ہو، دولت بہت سی جیبوں سے نکل کر ایک طرف سمٹ آتی ہے۔

3. مزدور کاشت کار اور جو لوگ ملک اور قوم کے لیے دماغی کام کریں، دولت کے اصل مستحق ہیں۔ ان کی ترقی و خوشحالی ملک اور قوم کی ترقی اور خوش حالی ہے، جو نظام ان قوتوں کو دبائے وہ ملک کے لیے خطرہ ہے اس کو ختم ہو جانا چاہیے۔

4. جو سماج محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے اور مزدوروں اور کاشت کاروں پر بھاری ٹیکس لگائے، قوم کا دشمن ہے، اس کو ختم ہو جانا چاہیے۔

5. ضرورت مند (مجبور) مزدور کی رضامندی قابل اعتبار نہیں جب تک اس کی محنت کی وہ قیمت ادا نہ کی جائے جو امدادِ باہمی کے اصول سے لازم ہوتی ہے۔

6. جو پیداوار یا آمدنی تعاون باہمی کے اصول پر نہ ہو وہ خلاف قانون ہے۔

7. کام کے اوقات محدود کیے جائیں۔ مزدوروں کو اتنا وقت ضرور ملنا چاہیے کہ وہ اخلاقی و روحانی اصلاح کر سکیں اور ان کے اندر مستقبل کے متعلق غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔

8. تعاونِ باہمی کا بہت بڑا ذریعہ تجارت ہے، لہٰذا اس کو تعاون کے اصول پر ہی جاری رہنا چاہیے۔ پس جس طرح تاجروں کے لیے جائز نہیں کہ وہ بلیک مارکیٹ یا غلط قسم کی کمپیٹیشن سے تعاون کی روح کو نقصان پہنچائیں ایسے ہی حکومت کے لیے درست نہیں کہ بھاری ٹیکس لگا کر تجارت کے فروغ و ترقی میں رکاوٹ پیدا کرے یا رخنہ ڈالے۔

9. وہ کاروبار جو دولت کی گردش کو کسی شخص یا طبقہ میں منحصر کر دے، ملک کے لیے تباہ کن ہے۔

10. وہ شاہانہ نظام زندگی جس میں چند اشخاص یا چند خاندانوں کی عیش و عشرت کے سبب دولت کی صحیح تقسیم میں خلل واقع ہو، اس کا مستحق ہے کہ اس کو جلد از جلد ختم کر کے عوام کی مصیبت ختم کی جائے اور ان کو مساویانہ زندگی کا موقع دیا جائے۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے آئندہ جدوجہد کے لیے فکری بنیادیں مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ جماعت بندی بھی شروع کر دی۔ دہلی میں

ہیڈ کوارٹر قائم کیا۔ متعدد شاگردوں اور خصوصاً اپنے خاندان کے افراد کو خصوصیت کے ساتھ تربیت دی۔ مولانا عاشق مظفر نگریؒ، مولانا نور اللہ میر ٹھیؒ، مولانا محمد امین کشمیریؒ، مولانا مخدوم لکھنویؒ، مولانا حسین احمد ملیح آبادی اور مولانا شاہ ابو سعید بریلویؒ پر مشتمل خصوصی گروپ قائم کیا۔ دہلی کے علاوہ (1) تکیہ شاہ علم اللہ رائے بریلی (2) نجیب آباد (3) لکھنؤ (4) اور مدرسہ ملاّ معین الدین ٹھٹھہ سندھ بھی اسی تحریک کے مراکز تھے۔

19.5.4 دارالحرب کا فتویٰ

شاہ صاحب تحریک کے لیے فکری بنیادیں فراہم کر کے اور اس فکر کی بنیاد پر عملی جدوجہد کے لیے مختلف مراکز پر تربیتی مراکز قائم فرما کر اس دنیا سے رخصت ہوئے اور آپ کی جانشینی کا اعزاز آپ کے فرزند حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے حصہ میں آیا۔ شاہ عبد العزیزؒ نے ایک سعادت مند بیٹے کی حیثیت سے اپنے عظیم باپ کے ورثہ کو سینے سے لگایا اور تحریک کو آگے بڑھانے کی تگ و دو میں مصروف ہو گئے۔ شاہ صاحب کے دور کا سب سے بڑا اور تاریخ ساز کارنامہ وہ فتویٰ ہے جو آپ نے دہلی میں انگریزوں کی فرمانروائی عمل میں آنے کے بعد جاری کیا اور جس میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر فرنگی کے خلاف جہاد کا اعلان فرمایا۔ یہی فتوی بعد میں آزادی کی تمام مسلم تحریکوں کے لیے بنیاد بنا۔ یہ فتویٰ فتاوی عزیزیہ میں موجود ہے اور اس میں حضرت شاہ عبد العزیزؒ نے اعلان کیا:

1. چونکہ شہری آزادیاں سلب ہو چکی ہیں۔
2. قانون سازی کے اختیارات عیسائیوں کے ہاتھ میں ہیں اور
3. مذہب کا احترام ختم کر دیا گیا ہے اس لیے ہندوستان دارالحرب ہے اور جہاد فرض۔

اس فتویٰ کی پاداش میں شاہ عبد العزیز صاحب کو جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑا ان کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آپ کو دو مرتبہ دہلی بدر کیا گیا اور ایک بار آپ کو اہل خاندان سمیت شاہدرہ (دہلی) تک پیدل آنا پڑا۔ ایک روایت ہے کہ ان مظالم کی وجہ سے آپ آخر عمر میں نابینا ہو گیے تھے، لیکن عظیم باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے تحریک ولی اللّٰہی کی قیادت آپ نے جاری رکھی اور ظلم و جبر آپ کے قدموں کو ڈگمگا نہ سکا۔ حضرت شاہ صاحب نے تعلیم و تربیت، تبلیغ و وعظ اور روحانی سلسلہ کے علاوہ باقاعدہ جنگی تربیت بھی شروع کرا دی تھی۔ آپ ہی کی ہدایت پر شاہ ابو سعید بریلوی کے نواسے سید احمد شہید کو امیر علی خاں والیٔ ٹونک کی فوج میں بھرتی کرایا گیا، جہاں حضرت شہید نے نہ صرف مکمل فوجی تربیت حاصل کی بلکہ فرنگی کے خلاف مختلف معرکوں میں حصہ بھی لیا۔

شاہ ولی اللہ کی فکر و حکمت میں امتزاج، ندرت اور جامعیت کے شاندار عناصر ملتے ہیں جو خالص فکر اسلامی کا طرۂ امتیاز ہیں۔ آپ کی علمی و فکری تحریک نے ہندوستان کو ذبو حالی اور علمی کم مائیگی سے علم و حکمت کی طرف متوجہ کیا۔ طوائف الملوکی میں گم علماء کو نکال کر صحیح شریعت پر عمل پیرا ہونے کے اسباب مہیا کرا دئے اور اپنی تحریک کے ذریعہ قرآن، حدیث، فقہ اور اجتہاد میں ہم آہنگی پیدا کر دی۔ لوگوں کو قرآن سے جڑنے کے لئے راستہ ہموار کئے اور حدیث رسول کی اشاعت میں اپنی زندگی وقف کر دی، یہی وہ خدمات ہیں جن کی وجہ سے آج بھی شاہ ولی اللہ کا نام ہندوستان کے ان علماء میں لیا جاتا ہے جنہوں نے یہاں اسلام کی صحیح تصویر پیش کی اور اسے عمل کے لئے آسان بنایا۔

19.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- شاہ صاحب کے نزدیک چاروں فقہی مسالک برابر ہیں، اور ہر ایک کی اپنی خصوصیت ہے۔ ان کے فقہی اختلافات دلائل پر مبنی ہیں۔ بیشتر اختلافات محض اولیٰ اور راجح کی تعیین کے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو نصیحت کی ہے کہ مسائل میں ان علماء محدثین کی پیروی کریں جو فقہ وحدیث کے جامع ہوں۔
- ہم نے جانا کہ شاہ صاحب کی تصوف کے میدان میں گراں قدر خدمات ہیں۔ تصوف کے سلسلے میں شاہ صاحب کے افکار کے مطابق آپ کے نزدیک تصوف اور روحانی فکر کی اساس وبنیاد قرآن وسنت پر استوار ہے اور ہر وہ فلسفہ جس کی کوئی اصل قرآن و حدیث میں نہیں ملتی، آپ سختی سے اس کی مخالفت کرتے ہیں۔
- ہم نے پڑھا کہ شاہ صاحب ہندوستان کے سب سے پہلے متکلم ہیں۔ ان کی مشہور تصنیف "حجۃ اللہ البالغۃ" میں انہوں نے اسلامی احکام کی مصلحتیں بیان کر کے ثابت کیا ہے کہ یہ احکام فلاح انسانی کے لئے بے حد مفید ہیں، اور ان کی غرض وغایت ہی انسانی فلاح وتہذیب ہے۔ شاہ صاحب نے اس کتاب اور دوسری تصانیف میں ایسی باتیں کہی ہیں جن سے متکلمین کی ترجمانی ہوتی ہے۔
- ہم نے اس بات کو سمجھا کہ جب سلطنت مغلیہ روبہ زوال تھی اس وقت شاہ صاحب نے عملی میدان تحریک شروع کی جو لوگوں کے درمیان کافی مقبول ومعروف ہوئی، جس میں شاہ صاحب نے عوام کو قرآن سے جوڑنے اور ان میں اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کی جہت دکھائی۔ اس سلسلہ میں شاہ صاحب نے اسلام کے چند سیاسی اصولوں اور شہریوں کے بنیادی اصول کو بھی پیش کیا ہے تاکہ مسلم معاشرہ کی صحیح تصویر عوام کے سامنے آسکے۔
- نیز ہم نے اس بات سے بھی آگاہی حاصل کی کہ شاہ صاحب نے صرف علمی اور فکری پیمانے سے ہی اپنی خدمات درج نہیں کروائیں بلکہ عملی طور پر سیاسی میدان میں قدم رکھا اور ولی اللہی تحریک کی فکری بنیادیں فراہم کرکے اور اس فکر کی بنیاد پر عملی جدوجہد کے لیے مختلف مراکز پر تربیتی مراکز قائم کیے۔
- شاہ ولی اللہ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ علم وفن اور قرآن وحدیث کی تشہیر وتدوین میں گزارا تھا لیکن وہ عملی میدان سے بے خبر نہ تھے انہوں نے ضرورت پڑنے پر تحریک شروع کی جو لوگوں کے درمیان کافی مقبول ومعروف ہوئی، جس میں شاہ صاحب نے عوام کو قرآن سے جوڑنے اور ان میں اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کی جہت دکھائی۔
- تحریک کے لیے فکری بنیادیں فراہم کرکے اور اس فکر کی بنیاد پر عملی جدوجہد کے لیے مختلف مراکز پر تربیتی مراکز قائم فرما کر حضرت شاہ ولی اللہ اس دنیا سے رخصت ہوئے اور آپ کی جانشینی کا اعزاز آپ کے فرزند حضرت شاہ عبدالعزیز کے حصہ میں آیا۔ شاہ عبدالعزیز نے ایک سعادت مند بیٹے کی حیثیت سے اپنے عظیم باپ کے ورثہ کو سینے سے لگایا اور تحریک کو آگے بڑھانے کی تگ ودو میں مصروف ہوگئے۔

19.7 نمونہ امتحانی سوالات

19.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. عقد الجید فی بیان احکام الاجتہاد والتقلید کس موضوع کی کتاب ہے ؟

(a). قرآن (b). اصول تفسیر (c). حدیث (d). فقہ

2. البدور البازغہ اس کتاب کا موضوع کیا ہے ؟

(a). قرآن (b). حدیث (c). فقہ (d). تصوف

3. شاہ صاحب اپنی کتاب "الطاف القدس" میں کتنے اخلاقی اصولوں کو تصوف کا مدار قرار دیتے ہیں ؟

(a). چار (b). پانچ (c). سات (d). نو

4. شاہ صاحب کی کونسی کتاب عربی زبان میں تصنیف کی گئی ؟

(a). ہمعات (b). سطعات (c). لمعات (d). البدور البازغہ

5. شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کے علاوہ اپنی کس تصنیف میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، امور الٰہیات اور انسانی زندگی سے متعلق فلسفیانہ رنگ میں بحث کی ہے ؟

(a). البدور البازغہ (b). الفوز الکبیر (c). دلالۃ الاحکام (d). سب غلط

6. شاہ ولی اللہ تحریک کا ہیڈ کوارٹر کہاں واقع تھا؟

(a). دہلی (b). کیرالا (c). ممبئی (d). سندھ

7. شاہ صاحب کے تحریک کے مراکز کہاں پر قائم تھے ؟

(a). رائے بریلی (b). سندھ (c). لکھنو (d). سب صحیح

8. شاہ صاحب کے نزدیک چاروں فقہی مسالک کی کیا حیثیت ہے ؟

(a). چاروں صحیح اور برابر ہیں (b). فقہ حنفی کو فوقیت حاصل ہے

(c). فقہ شافعی کی فوقیت کے قائل ہیں (d). فقہ حنبلی سب سے اہم ہے

9. کس مشہور مورخ نے شاہ صاحب کو جدید علم کلام کا موجد قرار دیا ہے ؟

(a). شیخ محمد اکرام (b). شبلی نعمانی (c). سرسید (d). ابوالفضل

10. ہندوستان کو دارالحرب ہونے کا فتوی کس نے دیا؟

(a). شاہ ولی اللہ (b). شاہ عبد العزیز (c). شاہ عبد القادر (d). شاہ رفیع الدین

19.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. فقہی میدان میں شاہ صاحب کی خدمات پر ایک تبصراتی نوٹ تحریر کیجیے۔
2. شاہ ولی اللہ کے صوفیانہ افکار کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔
3. علم کلام اور فلسفہ کے کن مباحث کو شاہ ولی اللہؒ نے اپنی کتابوں میں شامل کیا ہے؟
4. شاہ ولی اللہ کی تحریک کا تعارف کروائیں۔
5. شاہ ولی اللہ کے سیاسی اور سماجی افکار کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں۔

19.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. شاہ ولی اللہ کے فقہی رجحانات اور تصانیف پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔
2. تصوف، کلام اور فلسفے کے متعلق شاہ صاحب کے افکار کا جائزہ پیش کیجیے۔
3. شاہ ولی اللہ کی تحریک کے اسباب و نتائج کا اس وقت کے سیاسی پس منظر میں جائزہ پیش کیجیے۔

19.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی: شخصیت و حکمت کا ایک تعارف : پروفیسر یاسین مظہر
2. شاہ ولی اللہ دہلوی کی قرآنی خدمات (مقالات سمینار) : مرتبہ، پروفیسر یاسین مظہر صدیق، پروفیسر ظفر الاسلام
3. امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار و نظریات : مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی
4. شاہ ولی اللہ حیات و افکار : ظفر احمد نظامی
5. تذکرہ شاہ ولی اللہ : مولانا سید مناظر احسن گیلانی

اکائی 20: شبلی نعمانی

اکائی کے اجزا:

20.0 تمہید
20.1 مقاصد
20.2 شبلی نعمانی
20.2.1 حسب ونسب
20.2.2 ولادت
20.2.3 تعلیم وتربیت
20.2.4 تعلیمی اسفار
20.2.5 تحصیل علوم حدیث
20.2.6 وکالت کی تعلیم وملازمت
20.2.7 علی گڑھ سے وابستگی
20.2.8 علی گڑھ کے اثرات
20.2.9 کالج پر مولانا کے اثرات
20.3 تصنیفات
20.4 مستشرقین کے متعلق علامہ شبلی کی آراء
20.5 نظریہ تعلیم
20.6 دارالمصنفین
20.7 اکتسابی نتائج
20.8 نمونہ امتحانی سوالات

20.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
20.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
20.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
20.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

20.0 تمہید

انیسویں صدی میں اسلامی تہذیب وثقافت جدید تمدن ومعاشرت خاص کر مغربی تہذیب کے آگے دم توڑ رہی تھی۔ خلافت عثمانیہ اپنے وجود وبقاء کی جنگ لڑ رہی تھی، مغربی طاقتیں مسلم سلطنتوں کا یکے بعد دیگرے خاتمہ کر رہی تھیں۔ امت مسلمہ سیاسی، سماجی، اقتصادی ومعاشرتی بحران کا شکار تھی۔ ایسے حالات میں اللہ تعالی نے اپنے دین حنیف کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس وعدے کا مکمل ہونا بالکل برحق ہے۔ لیکن تکمیل وعدے کے لیے ظاہری تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے اللہ تعالی نے ہر زمانے میں اس ضرورت کے مطابق ایسے اشخاص پیدا کرتا ہے جو اس ضرورت کو مکمل کر کے دین الہی کی حفاظت کا کام کرتے ہیں۔ ایسے ہی اشخاص میں علامہ شبلی نعمانی کا شمار ہوتا ہے۔

20.1 مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ علامہ شبلی نعمانی کی حیات اور ان کی خدمات سے واقف ہوں گے۔ آپ جانیں گے کہ شبلی نعمانی کے افکار کیا تھے اور کس طرح انہوں نے معرکۃ الآراء کتابیں تصنیف کی۔ اسی طرح آپ دارالمصنفین کے قیام اور اس کی وجوہات کے بارے میں مطالعہ کریں گے۔

20.2 شبلی نعمانی

20.2.1 حسب ونسب

شمالی ہندستان کے صوبہ اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ میں بندول نامی گاؤں میں راجپوتوں کی آبادی تھی جس کے مورث اعلی تقریبا پانچ سو برس قبل مسلمان ہوئے تھے۔ اسی خاندان میں مولانا شبلی نعمانی کی پیدائش ہوئی۔ مولانا کے دادا کا نام منشی شیخ حسن علی تھا ان کے چار بیٹے تھے، شیخ حبیب اللہ، شیخ مجیب اللہ، شیخ عجیب اللہ اور شیخ نجیب اللہ۔ مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ تھے۔ شیخ حبیب اللہ نے ابتدائی تعلیم کے بعد فارسی کی پڑھائی کی اور اس میں خاص ذوق پیدا کیا۔ اس زمانے میں فارسی اور ابتدائی عربی کی تعلیم کے بعد لوگ قانون کا امتحان دیتے تھے، چونکہ شیخ صاحب کے گھر میں زمینداری اور مقدمات و قانون عدالت کا چرچہ تھا، لہذا دستور کے مطابق وکالت کی بھی تعلیم حاصل

کی۔ اس پیشے میں ان کو ایسا فروغ ہوا کہ ضلع کے چوٹی کے وکیلوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ شیخ حبیب اللہ نے نیل کا بزنس بھی کیا اور دیسی شکر کے کارخانے قائم کیے تھے۔ مولانا کی والدہ ماجدہ نہایت نیک اور دیندار بی بی تھیں، تہجد تک ناغہ نہیں کرتی تھیں۔ ان دونوں سے اللہ نے ان کو چار بیٹے اور ایک بیٹی عطا کی۔ ان چاروں بھائیوں میں علامہ شبلی سب سے بڑے تھے۔

20.2.2 ولادت

مولانا شبلی نعمانی کی ولادت ذیقعدہ 1273ھ بمطابق جون 1857 میں عین اس ہنگامہ خیز زمانے میں ہوئی جو عام طور سے غدر کے نام سے مشہور ہے۔ والدین نے بچے کا نام محمد شبلی رکھا۔ غالباً یہ نام ان کے تصوفانہ ذوق کا پتہ دیتا ہے، شبلی مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ شبلی بغدادی کی طرف منسوب ہے۔ ابتدائی تحریروں میں مولانا اپنا نام محمد شبلی ہی لکھتے تھے، بعد میں صرف شبلی کر دیا اور نام کے ساتھ نعمانی لکھنے لگے۔ نعمانی کا لقب مولانا نے خود سے نہیں اختیار کیا بلکہ ان کے استاذ مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی رکھ دیا۔ کیونکہ علامہ شبلی اپنے آپ کو حنفی کہلانا موجب فخر سمجھتے تھے اور ان کے استاذ بھی حنفی تھے اس لیے نعمانی ان کا لقب پڑ گیا۔

20.2.3 تعلیم وتربیت

مولانا کا بچپن بہت ناز ونعم میں گزرا، فطرۃ ذہین تھے اور حافظہ بھی قوی تھا، اس لیے ابتداء سے ہی دوران تدریس اساتذہ کی دلچسپی کا مرکز بنے رہتے تھے۔ اس وقت روایتی طور پر آپ کے والد نے انہیں علم دین کی خدمت کے لئے وقف کیا۔ بڑی دھوم سے اپنے بیٹے کا مکتب کرایا، قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہی حاصل کی، ان کے گاؤں کے قریب جیراج پور کے ایک بزرگ حکیم عبداللہ صاحب مولانا شبلی کے پہلے مدرس تھے چنانچہ مولانا نے ابتدائی تعلیم ان ہی سے پائی۔ اساتذہ کی فہرست میں مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی کا نام اہم ہے بلکہ مولانا کی تعلیم کا حقیقی سلسلہ مولانا فاروق صاحب کے حلقہ تلمذ سے شروع ہوتا ہے۔ مولانا فاروق صاحب بڑے منطقی آدمی تھے وہ منطق کی نظری تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کی عملی مشق بھی کراتے تھے۔ جس کے نتیجے میں مولانا شبلی اپنی تحریر وتقریر میں منطقی ترتیب کے خوگر اور مناظروں کے مشتاق ہو گئے تھے، اور منطق وفن مناظرہ کے اصول سے ان کا ہر قدم اٹھتا تھا اور پڑتا تھا۔ مولانا فاروق ان دنوں غازی پور میں تھے وہیں پر مولانا شبلی حصول تعلیم کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ بعد میں علامہ اعظم گڑھ واپس آ گئے تھے اور مدرسہ عربیہ اعظم گڑھ سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔ شاگرد کی کشش استاذ کو بھی یہیں مدرسہ عربیہ کھینچ لائی جہاں مولانا فاروق صاحب اس مدرسہ کے مدرس اول منتخب ہوئے۔

20.2.4 تعلیمی اسفار

علامہ شبلی نے درسیات کی تکمیل اگرچہ مولانا فاروق ہی سے کر لی تھی، لیکن ان کے ذوق علمی نے ان کو دوسرے خرمنوں کی خوشہ چینی پر آمادہ کیا، ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ادب، فقہ، اور حدیث کے جو اساتذہ اپنے اپنے فن میں یگانہ عصر سمجھے جاتے، ان سے بھی استفادہ کرنے کا شوق دامن گیر ہوا۔ اس زمانے میں مدارس کا رواج کم تھا، زیادہ تر مشاہیر علماء اپنے قیام کی جگہ پر اپنا اپنا حلقہ درس لگاتے تھے۔ اس وقت یونیورسٹیاں یہی حلقہ درس ہوتی تھیں۔ ابتدا میں مولانا نے لکھنو کا سفر کیا لیکن جلد ہی وہاں سے رامپور گئے جہاں اس

وقت دو باکمال ہستیاں اپنے اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے۔ معقولات میں مولانا عبد الحق خیر آبادی اور فقہ میں مولانا ارشاد حسین مجددی۔ معقولات میں مولانا فاروق کے فیض سے خود علامہ شبلی کی اتنی بصیرت ہو چکی تھی کہ جس پر کسی مزید اضافہ کی توقع محض امید موہوم تھی۔ اس لئے علامہ نے صرف مولانا ارشاد حسین کے شرف تلمذ پر اکتفاء کیا۔ جن سے علامہ نے فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ علامہ شبلی کو مولانا ارشاد صاحب کی وسعت نظر، اصابت رائے، اور مجتہدانہ ظرف نگاہی کا اعتراف ہمیشہ رہا۔ رامپور سے تحصیل علم کے بعد مولانا کو مولانا فیض الحسن سے عربی ادب کی تعلیم کا ذوق پیدا ہوا۔ اس وقت مولانا فیض الحسن اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ابتداء میں علامہ کے والد کو اتنے طویل سفر پر بھیجنے میں تذبذب ہوا لیکن بعد میں انہوں نے اجازت دیدی۔ لاہور میں علامہ شبلی کو تلمذ کے لئے صرف اتنا وقت ملتا تھا جتنی دیر مولانا فیض الحسن صاحب کو کالج سے اپنے گھر میں پہنچنے میں صرف ہوتا تھا کیونکہ فیض الحسن صاحب ملازمت کی وجہ سے زیادہ وقت نہیں دے پارہے تھے اور کالج کے کاموں میں ہی مصروف رہتے تھے۔ اسی دوران مولانا فیض الحسن کو دوماہ کے لئے تعطیل ملی اور وہ سہارنپور چلے گئے، ناغہ نہ ہونے کے خیال سے شاگرد نے بھی سہارنپور کا سفر کیا اور استاذ کی معیت میں رہ کر کسب علم کیا۔ علامہ شبلی نے مولانا فیض الحسن صاحب سے عربی ادبیات کی کتابیں پڑھیں جن میں جمہرۃ العرب اور حماسہ قابل ذکر ہیں اس کے علاوہ استاذ کا سب سے بڑا فیض قرآن پاک کی معجزانہ فصاحت وبلاغت کی نکتہ شناسی تھی، مولانا شبلی میں یہ ذوق اخیر عمر تک رہا۔

20.2.5 تحصیل علوم حدیث

اس زمانے کا دستور تھا کہ جب طلبہ ہر قسم کے علوم وفنون سے فراغت پالیتے تھے، تب حدیث پڑھتے تھے، اسی اصول پر مولانا شبلی نے دوسرے تمام علوم سے فراغت پاکر حدیث کی طرف توجہ فرمائی اور جس طرح انہوں نے دوسرے علوم وفنون کی تعلیم کے لئے ان ہی اساتذہ کا انتخاب کیا جو اس فن میں ماہر تھے، اسی طرح حدیث کے لئے بھی انہوں نے اس زمانہ کے سب سے نامور محدث مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری کا انتخاب کیا۔ مولانا احمد علی کی سند واجازت علم حدیث میں مولانا شاہ عبد القادر دہلوی اور مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی مہاجر سے ملتی ہے وہ اپنے وقت میں ہندوستان کے سب سے بڑے محدث تسلیم کئے جاتے تھے۔ مولانا شبلی نے ان سے ہی درس حدیث وسند حاصل کی۔

20.2.6 وکالت کی تعلیم وملازمت

مولانا کے والد کی یہ خواہش تھی کہ مذہبی علوم کی تحصیل کے بعد وہ وکالت کا پیشہ اختیار کریں کیونکہ ان کے نزدیک درس وتدریس کا شغل اقتصادی نقطہ نظر سے مناسب نہیں ہے لہذا وہ کسب معاش کی طرف متوجہ ہوں اور اس کے لئے مولانا کے والد کی نگاہ میں وکالت کا پیشہ موزوں نظر آیا۔ مگر خود مولانا کی بلند فطرت اور ذوق سلیم کو یہ چیز کھٹکتی تھی۔ بہر حال بادل ناخواستہ انہوں نے 1881 میں وکالت کا امتحان پاس کر لیا۔ وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد اپنے والد کے اصرار سے وہ وکالت پر آمادہ تو ہو گئے مگر اس عزم وارادہ کے ساتھ کہ ایک حرف بھی حق وصداقت کے سوا زبان یا قلم سے نہ نکلے گا، ظاہر ہے کہ ضلع کی وکالت ان شرائط کے ساتھ نبھ نہیں سکتی تھی، چنانچہ چند دنوں کے تجربہ نے خود مولانا کے والد پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ اس ورع وتقوی کے ساتھ ان سے یہ وکالت کا پیشہ جو قدم قدم پر رنگ

آمیزی کا محتاج ہے، چل نہیں سکتا۔

20.2.7 علی گڑھ سے وابستگی

سرسید کی تحریک سے متاثر بہت سے مسلمان جدید تعلیم کی طرف توجہ دے رہے تھے، انہیں میں علامہ کے والد شیخ حبیب اللہ بھی تھے، انہوں نے اپنے بیٹے مہدی حسن کو انگریزی پڑھانا شروع کیا اور ان کو علی گڑھ کالج کے اسکول میں تعلیم کے لئے بھیجا۔ 1881 میں ان سے ملنے کے لئے شیخ حبیب اللہ اور ساتھ میں علامہ شبلی بھی علی گڑھ تشریف لے گئے۔ علامہ سرسید کی مدح میں عربی کا ایک قصیدہ بھی لکھ کر لے گئے، جس میں سرسید کی طرف دو باتوں کی تعریف ہے، ایک ان کے حسب و نسب و سیادت کی، اور دوسرے ان کے قومی کاموں کی، سرسید نے اس قصیدہ کو دیکھا تو اس کے تیور، زبان، اور طرز ادا کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے، اور قصیدہ کو اپنے اخبار علی گڑھ گزٹ میں چھپوا دیا۔

اس واقعہ کے سال ڈیڑھ سال بعد کالج کے مشرقی زبانوں کے ایک معلم کی ضرورت محسوس ہوئی، اس عہدہ پر تقرری کے لئے علامہ شبلی نے بھی درخواست بھری۔ خوش قسمتی سے ان کی تقرری کالج میں بحیثیت اسسٹنٹ عربک پروفیسر کے عہدہ پر جنوری 1883 میں ہوئی۔ مولانا کی اس کامیابی میں ڈپٹی محمد کریم صاحب اور مولوی سمیع اللہ خان نے معاونت کی تھی۔ علی گڑھ میں تعلیم و تدریس کے علاوہ علامہ نے شعر و شاعری کے ذوق پر توجہ مرکوز کی، جلد ہی ان کی شاعری کا چرچہ کالج کے احاطہ میں گونجنے لگا، خاص طور سے ان کی مثنوی ”صبح امید“ جس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی پر درد داستان کی شرح کے بعد سرسید کی نئی تحریک کی کامیابی پر ایک نئی صبح امید کے طلوع کی خوش خبری سنائی، مثنوی بار بار چھپی اور مقبول عام ہوئی۔

علی گڑھ سے وابستگی کے بعد مولانا شبلی اب ایسی آب و ہوا میں تھے، جہاں ہر طرف نئے خیالات، نئے جذبات، زمانہ کے نئے اثرات، قدیم و جدید کی آمیزش کے نئے انقلابات گرد و پیش تھے۔ ان اثرات اور جذبات کی نیرنگیوں میں حق و باطل اس طرح ملے ہوئے تھے کہ ان کے علیحدہ کرنے کے لئے غیر معمولی بصیرت کی ضرورت تھی۔ بحمد اللہ کہ مولانا میں یہ بصیرت موجود تھی۔

اب تک جدید تعلیم کے محاسن و معائب کی خبریں علامہ شبلی سنتے آئے تھے، لیکن علی گڑھ میں ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس کا بر ملا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”یہاں آکر میرے تمام خیالات مضبوط ہوگئے۔ معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے، مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں، یہاں ان چیزوں کا ذکر تک نہیں آتا، بس خالی کوٹ پتلون کی نمائش گاہ ہے“۔ اس بے باکانہ اظہار و بیان سے معلوم ہوگا کہ نئی تعلیم کی ظاہری چمک دمک سے ان کی آنکھیں خیرہ نہیں ہوئیں اور حق و باطل کی تمیز کی پوری بصیرت ان میں موجود تھی۔

20.2.8 علی گڑھ کے اثرات

علی گڑھ سے وابستگی کے بعد مولانا شبلی کے افکار و خیالات پر مثبت اثرات مرتب ہوئے جن کو علامہ نے بہت جلد قبول کر لیا، ان

میں سب سے پہلی چیز ملت کی بربادی کا درد اور احساس ہے، ان کی نظمیں ورنگین ترانے جو اب تک حسن وعشق کی جھوٹی کہانیوں سے لبریز ہوتے تھے، اب قوم وملت کے عشق سے خوں افشاں ہونے لگے، مسلمان کیا تھے اور کیا ہوگئے؟ یہ احساس ان کی قومی نظموں کا موضوع بن گیا۔

علی گڑھ تحریک کا دوسرا اثر ان پر یہ ہوا کہ انگریزی تعلیم کی ضرورت ان پر واضح ہوگئی، اپنے عزیزوں اور برادری کے لوگوں کو اس کی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کا کام انہوں نے خود شروع کیا، اپنے عزیزوں کے نام خطوط لکھ کر انگریزی تعلیم کی طرف انہماک اور اس کے حصول کی تاکید پر ابھارا، 1883 میں نیشنل اسکول کے نام سے ایک انگریزی مدرسہ شہر اعظم گڑھ میں قائم کیا، خود سیکریٹری ہوئے، اور عزیزوں کو ممبر بنایا، ان کے والد بزرگوار، اور دوسرے عزیزوں وہمدردوں نے اس کی امداد میں شرکت کی۔ اس کی عمارت اور تعمیر کے لئے اپنے خاندان کی ملکیت سے زمین دلوائی۔ یہ اسکول صرف ایک ماسٹر اور تین طالب علموں سے شروع ہوا۔ بعد میں ترقی کی راہوں پر گامزن ہوا اور 1846 میں ڈگری کالج کا درجہ حاصل کیا، فی الحال یہ "شبلی نیشنل کالج" اعظم گڑھ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا نے اپنے گاؤں میں بھی ایک اسکول قائم کیا تھا لیکن وہ آگے نہ بڑھ سکا۔

علامہ شبلی نے علی گڑھ آنے کے بعد تاریخ کا مطالعہ پورے انہماک سے شروع کیا، خاص طور سے سرسید کے کتب خانہ میں عربی وجغرافیہ کی وہ نادر کتابیں ان کی نظر میں آئیں جو یورپ یا مصروشام اور قسطنطنیہ میں چھپی تھیں، تو ان کی آنکھیں کھل گئیں، اور یہیں سے تاریخ اسلام کے مطالعہ کا نیا دور شروع ہوا، جس کی ابتداء ڈاکٹر لائٹنز کی کتاب "سنین اسلام" کے مطالعہ سے شروع ہوا، جو عربی وفارسی کے مشہور عالم اور اورینٹل کالج لاہور کے بانی اور پرنسپل تھے۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے علامہ کو پہلے پہل ایک مکمل تاریخ لکھنے کا خیال آیا اور پھر گھٹ کر تاریخ بنی عباس تک محدود رہ گیا، لیکن یہ کام اتنا لمبا تھا کہ اس کو چھوڑ کر ہر خاندان کے ایک ایک ہیرو کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا اور اس کو ناموران فرمان روایان اسلام سے موسوم کیا۔ نیز علی گڑھ ہی وہ مقام تھا جہاں اس وقت مشرق ومغرب کے اساتذہ یکجا تھے، اور ایک دوسرے کے خیالات ومعلومات سے متاثر ہو رہے تھے، علامہ شبلی کو بھی کالج آکر سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ ان کو یورپ کے خیالات اور علمی تحقیقات سے آگاہی کا موقع ملا، اس کے لئے سب سے پہلا مواد سرسید کے کتب خانہ سے ان کو ہاتھ آیا، اس کے بعد خوش قسمتی سے اس وقت کالج میں پروفیسر آرنلڈ جیسا ایک انگریز عالم یہاں موجود تھا، پروفیسر آرنلڈ نے علامہ شبلی کو جدید اصول سے آگاہ کیا، یہ بتایا کہ جدید علمی مجلس کے کیا ساز وسامان ہیں، قدیم علوم پر کیا کیا اعتراضات اور حملے ہیں، علامہ شبلی کی صداقت اور قوت دماغی یہ تھی کہ وہ جدید اصول کے طمطراق سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ ان پر اطمینان سے غور کیا، جو اصول عمدہ تھے ان کو اخذ کیا، بلکہ اپنی زندگی کا رہبر بنایا اور نمائشی چیزوں کو رد کر دیا۔

20.2.9 کالج پر مولانا کے اثرات

محمڈن کالج علی گڑھ اپنے طرز کا پہلا کالج تھا، جس میں انگریز، ہندو، مسلمان ہر قسم کے استاد اور شاگرد تھے، ایسے ماحول میں ایک روایتی قسم کا عالم دین، جس نے جدید طرز زندگی، انگریزی زبان اور انگریزوں کی صحبت سے بالکل ناآشنا ہو، وہ یکایک آیا اور پورے ماحول میں

رہ کر اس طرح سب میں سما گیا کہ وہ کہیں سے بیگانہ نہیں ہونے پایا، یہ بجائے خود ایک کمال ہے، اور کالج نے قدیم وجدید کی اس ہم آہنگی اور تعاون سے بڑا فائدہ اٹھایا، اور وہ چپقلش اور کشاکش نہ ہونے پائی جس کا ہونا ایسے ماحول میں ضروری تھا۔

علامہ شبلی نے نئے علوم وفنون کے اہل کمال سے مرعوب ہونے کے بجائے، انہوں نے نہ صرف اپنی بلکہ علماء اسلام کی قدر ومنزلت کو بڑھا دیا، اور اپنے قدیم وعلوم وفنون کے مرتبہ کو اتنا اونچا کیا کہ پروفیسر آرنلڈ اور دوسرے انگریز پروفیسروں کو ان کی تحصیل پر مجبور کر دیا، اور ایسے زمانہ میں جب کہ کالج میں ہر طرف نئے علوم وفنون، مسائل اور نئی تحقیقات کی بارش ہو رہی تھی، اس مسلسل بارش کے طوفان میں علامہ شبلی نعمانی ہی تھے جو اسلامی علم وفن کے منارہ کو اس مضبوطی سے اپنی جگہ پر جمائے ہوئے تھا کہ اس کو اس طوفان خیز سیلاب سے کوئی خطرہ نہ رہا۔

کالج پر مولانا کا ایک اور اثر جو پڑا وہ پرانے علوم، فارسی ادب، اور عربی زبان کا ذوق پیدا کرنا تھا، حالانکہ ایک نئے طرز کے ادارہ میں پرانے علوم اور زبان وادب کو جگہ دینا ایک مشکل کام تھا، لیکن علامہ نے اس مشکل کام کو ایسا انجام دیا کہ کئی ہونہار طلبہ نے ان علوم میں ناموری حاصل کی، جن میں مولوی حمید الدین صاحب، مولوی بہادر علی صاحب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا نے کالج کے طلبہ کو درس قرآن دینا شروع کیا، اور اس درس کو ایسا دلچسپ بنا دیا کہ طلبہ بڑی توجہ سے اس کو پڑھنے لگے، اور ان میں قرآن پاک کا ذوق پیدا ہونے لگا۔ نیز طلبہ میں ذات پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حسن عقیدت اور واقفیت پیدا کرنے کے لئے عربی میں سیرت کا ایک مختصر رسالہ "بدء الاسلام" لکھا اور وہ کالج کے نصاب تعلیم میں داخل ہوا، اسی سلسلہ میں مولانا نے کالج میں میلاد کی مجلسوں کی بنیاد ڈالی، شروع شروع میں یہ جلسہ خود اپنے بنگلے پر کرتے تھے، خود سیرت نبوی ﷺ کے کسی پہلو پر تقریر کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان جلسوں سے دلچسپی بڑھنے لگی، تو 30 اکتوبر 1891 میں سیرت ومیلاد کا پہلا جلسہ عام نہایت شان وشوکت سے سالار منزل میں ہوا، اور کچھ عرصہ بعد اسٹریچی ہال میں ہونے لگا۔

انگریزی کے طالب علموں میں جہاں کی فضا ہی کچھ اور ہوتی ہے، مذہبی رنگ پیدا کرنا کتنا مشکل کام تھا، مگر مولانا نے کالج میں اس کام کو جس طرح انجام دیا وہ ان کی ذہانت اور بردباری کا مظہر ہے۔ اس طرح سے مولانا نے نہ صرف کالج کے اثرات کو قبول کیا بلکہ خود بھی کالج کے ماحول پر بہت سے اثرات مرتب کئے، جس میں طلبہ کو مذہب سے وابستہ کرنا اور ان میں دلچسپی پیدا کرنا علامہ شبلی کی زندگی کا اعزازی پہلو ہے۔

20.3 تصنیفات

علامہ شبلی کو قیام علی گڑھ میں اس بات کا ادراک ہو گیا تھا کہ اسلام کی خدمت کا صحیح راستہ جو اس زمانے کے لحاظ سے موزوں نظر آرہا تھا وہ تصنیف کا راستہ تھا کیونکہ یورپ کی چیرہ دستی کا جو رعب مسلمانوں پر چھا گیا تھا اور جس کے مقابلے میں ان کو نہ صرف اپنا حال بلکہ ماضی تک تاریک نظر آرہا تھا، اس کو دور کرنے اور اس کا تریاق ٹھیک اسی طرز میں تھا جس کو استعمال کر کے اہل مغرب نے مسلمانوں پر اپنا

رعب قائم کیا تھا۔اس وقت یورپ کے اہل قلم اور مصنفین کا کارنامہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنی تاریخ پر جو ناز تھا اس کو مٹانے کے لئے اسلام، سلاطین اسلام، اور علوم اسلامیہ کی طرح طرح کی برائیاں لکھ کر لوگوں میں پھیلارہے تھے، تا کہ مسلمانوں کی نئی پودھ کو اپنی قوم سے نفرت ہونے لگے، اور ان کے قومی غرور کو ایسا صدمہ پہونچے کہ ان کے دماغ سے امت سے محبت و اخوت ہمیشہ کے لئے مضمحل ہو جائیں، چنانچہ ان کی تدبیر کارگر ہو چلی تھی، اور خود مسلمانوں کو اپنی تاریخ سے گھن آنے لگی تھی، اور یورپ کی ترقیوں کو دیکھ کر ان کو چکاچوندھ لگ رہی تھی، علامہ شبلی نے ان کی اس تدبیر کو سمجھا، اور اسی کے مقابلہ کے لئے اپنی قلم کو جنبش دی۔

اس سلسلہ میں مولانا نے اپنی پہلی تصنیف جس کا نام "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" ہے 1887 میں لکھی، جب یہ مضمون عوام الناس کے ہاتھوں میں پہنچا تو خوب اس کی پذیرائی ہوئی اور ہر عام وخاص میں مقبول ہوا۔اس میں علامہ نے مسلمانوں کے طریقہ تعلیم، اور اسلامی مدرسوں کے نام، خصوصیات وحالات بیان کئے ہیں۔ یہ ملک میں اپنی نوعیت کی پہلی چیز تھی۔

اس کے بعد اردو کی دوسری نئی طرز کی سوانح عمری "المامون" ہے، جو 1887 میں شائع ہوئی۔ یہ مولانا شبلی کی پہلی مستقل تصنیف ہے، جو ان کے نامور فرمانروایان اسلام کی پہلی کڑی ہے، اس کو تاریخ بنوعباس کا نچوڑ کہنا چاہیے، یہ تصنیف ایسی مقبول ہوئی کہ تین مہینے میں اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔اس کے بعد علامہ کی ایک اور نایاب تصنیف "سیرۃ النعمان" 1891 میں چھپی۔ یہ کتاب درحقیقت مولانا کے اسی ذوق وشوق کی دوسری شکل ہے، جو ان کو حضرت امام ابو حنیفہؒ اور فقہ حنفی سے ہمیشہ سے تھا۔اس کے علاوہ انہوں نے اسکندریہ کے کتب خانہ پر ایک مضمون لکھا جس میں یورپی مصنفین کے اس الزام کی تردید کی جس میں یہ کہا گیا تھا کہ اسکندریہ کا مشہور کتب خانہ مسلمانوں نے جلا کر خاکستر کر دیا تھا، علامہ شبلی نے اس الزام کی تردید کی اور اپنے مضمون "کتب خانہ اسکندریہ" میں یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں کی فتح سے پہلے ہی کتب خانہ برباد ہو چکا تھا۔

"الفاروق" علامہ شبلی کی ان نادر تصانیف میں سے ہے جس سے علامہ کی علمی لیاقت و قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔علامہ نے اس کتاب میں خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کی سیرت مبارکہ کے گوشے کھول کر بیان کیا ہے، خلیفہ کی مثالی شخصیت، انتظامی صلاحیت، اور دوسری تمام طرح کی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ حضرت عمر کے تعلق سے مستشرقین کے جو اعتراضات تھے ان کو بھی مولانا نے رد کیا ہے۔اس تصنیف کے بعد مولانا کی شہرت کا آفتاب نصف النہار کو پہنچ چکا تھا۔انگریز حکومت نے بھی ان کی پذیرائی میں 1894 میں انہیں شمس العلماء کے خطاب سے نوازا۔

علامہ شبلی کی تصنیفات میں سب سے اہم اور یگانہ روزگار کتاب "سیرۃ النبی" ہے، یہ اس ذات پاک کی سیرت ہے جس کی سوانح عمری ایسی لکھی جانی چاہیے جس سے صاحب سوانح کا پایہ اونچا نظر آئے، اسی جذبہ کے تحت علامہ شبلی نے سیرۃ النبی لکھنے کا ارادہ کیا گو یہ کام بہت مشکل تھا کیونکہ ہم مسلمانوں کے دلوں میں سرور کائنات ﷺ کی عقیدت اور مرتبہ اتنا بلند ہے کہ کوئی کتاب اس کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتی، اس لئے سیرت کی کوئی کتاب مشکل سے ہی معیار پر اتر سکتی ہے۔اس مشکل کے باوجود سیرت کی ضرورت کے لئے مسلمانوں کی طرف سے بار بار رہ رہ کر آوازیں بلند ہوتی تھیں اور علامہ شبلی ان کو سن کر چپ رہ جاتے تھے، لیکن جدید تعلیم جس تیزی کے ساتھ پھیل رہی

تھی، مذہبی بے خبری بھی اسی قدر بڑھتی چلی جارہی تھی جس کی روک تھام کی بڑی ضرورت تھی، اس ضرورت کا احساس مولانا کو اس وقت ہوا جب مستشرقین کی کتابیں سیرت رسول ﷺ پر طرح طرح کی بدگمانیاں پھیلارہی تھیں خاص کر علم جدید کے نوجوان طبقہ کو وہ بہت متاثر کررہی تھیں چنانچہ علامہ نے اس ضرورت کو پورا کرنے کا اعلان 1912 میں کیا۔

اس کتاب کو علامہ نے بڑی تحقیق و تلاش و جستجو سے لکھی ہے، اس کے لئے مولانا نے قدیم مصادر کی جانب رجوع کیا، جس میں تاریخ طبری، سیرت ابن ہشام، ابن کثیر، تفسیر فتح البیان، طبقات ابن سعد وغیرہ قابل ذکر ہیں، مولانا نے اپنی کتاب "سیرت النبی ﷺ" میں تحقیقی طریقہ کار اختیار کیا ہے، جس میں ذات محمد ﷺ کے متعلق جو غلط بیانیاں یا خدشات پھیل رہے تھے مولانا نے ان کا مسکت جواب دیا ہے، مثلا مرگولوس جو آکسفورڈ میں عربی کا پروفیسر تھا اس کی کتاب "لائف آف محمد" میں یہ دعوی کیا گیا ہے کہ عبد المطلب، مطلب کے غلام تھے، کعبہ آنحضرت ﷺ سے صرف 100 سال پہلے کی عمارت ہے، علامہ نے اس کا رد کیا ہے اور جن رواۃ پر موصوف پروفیسر نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا ان رواۃ کی نقد و جرح کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ روایات ناقابل اعتبار ہیں جن پر مرگولوس نے تکیہ کیا ہے۔ لیکن افسوس کہ مولانا اپنے سیرت کے مسودے کو مکمل نہ کر سکے اس سے پہلے ہی انہوں نے دار فانی سے دار اجل کی طرف لبیک کہہ دیا۔ لیکن اپنی وفات سے پہلے انہوں نے یہ وصیت کر دی تھی کہ یہ مسودے حمید الدین اور سید سلیمان کے سپرد کر دئے جائیں، ان دو کے سوا کسی اور کو ہرگز نہ دئے جائیں۔ اس سیرت کے مسودہ کو بعد میں ان کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے علامہ کی خواہش کے مطابق مکمل کیا۔

ان کتابوں کے علاوہ مولانا کی دیگر اہم کتابیں "الغزالی"، علم الکلام، الکلام، سوانح مولانا روم، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

20.4 مستشرقین کے متعلق علامہ شبلی کی آراء

مولانا شبلی کا دور مسلمانوں کی تنزلی کے دور سے متعلق ہے، اس دور میں یورپ کے مستشرقین نے مسلمانوں کی تصنیفات کو پڑھ کر اور ان کے علوم کو سیکھ کر اسلام اور مسلمانوں کے علوم، تمدن و تاریخ کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا، اور ان کے یہ اعتراضات بڑی تیزی کے ساتھ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سرایت کر رہے تھے۔ علامہ شبلی نے یورپ کے مصنفین کے سحر کو توڑنے کا عزم مصمم کیا۔

مولانا شبلی کا کام متعدد وجوہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے، ان میں سب سے اہم تو یہ ہے کہ مولانا جن معترضین کا جواب دینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے وہ ان پڑھ مشنریوں میں نہ تھے، اور نہ مناظرانہ یا الزامی جواب ان کے لئے کافی تھے، ان کے جواب دینے کے لئے ضرورت یہ تھی کہ ایک ایک کونہ سے نادر کتابوں کی تلاش اور ورق گردانی کی جائے، ان کے بتائے ہوئے حوالوں کی غلطی اور کمزوری بتائی جائے، اور اس کے بالمقابل اسلامی علوم وفنون اور تاریخ وتمدن کے شاندار واقعات اور اہم کارناموں کو ابنائے زمانہ کے سامنے لایا جائے، تاکہ اسلام کی تاریخ و تمدنی عظمت اور علمی جلالت سب کے سامنے آجائے، جس سے قوم کے افسردہ دلوں میں از سر نو تازگی اور امنگ بھی پیدا ہو، اور دشمنوں کو اپنے اعتراضات کی بے مائیگی کا بھی اندازہ ہو۔ علامہ شبلی نے ان امور کو مطمح نظر رکھا، اس کی ابتداء انہوں نے مستشرقین کے علمی لیاقت سے کی تاکہ ان کی کتابوں پر اعتماد اور رشک کرنے والوں کو پتہ چل جائے کہ وہ کس نوعیت کا علم رکھتے ہیں۔

1. یورپ کی پیغمبر اسلام سے ابتدائی واقفیت

علامہ شبلی نے پیغمبر اسلام سے متعلق ان مغربی مصنفین کی معلومات کا احاطہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یورپ ایک مدت تک اسلام کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا، جب اس نے جاننا چاہا تو مدت دراز تک عجب حیرت انگیز مفتریانہ خیالات اور توہمات میں مبتلا رہا، مثلاً عیسائیوں کے نزدیک ہر مسلمان مشرک وبت پرست تھا اور حسب ترتیب مسلمانوں کے تین خدا تھے، ماہوم یاماہون یامافومیڈ (یعنی محاٹد) دوسرا اُپلین اور تیسر اٹرماگان، لیکن یہ تمام تر خیالات ودعوے محض بہتان اور افتراء پردازی پر منحصر تھے۔ بعد میں جب یورپ کا نشاۃ ثانیہ ہوا تو اس وقت سنے سنائے عامیانہ خیالات کے بجائے کسی قدر تاریخ اسلام اور سیرت پیغمبر ﷺ کی بنیاد عربی تصانیف کی بنیاد پر قائم کی گئی، اگرچہ موقع بہ موقع معلومات سابقہ کے استعمال سے بھی پرہیز نہیں کیا گیا۔ اس دور سے چونکہ یورپ نے مذہبی اشخاص کے شکنجے سے نجات پائی اور اس کے مذہبی اور سیاسی امور الگ ہوگئے، اس بناء پر اسلام کے متعلق مصنفین کی دو جماعتیں الگ ہوگئیں، پہلی جماعت میں عوام اور مذہبی اشخاص تھے جبکہ دوسری جماعت میں محقق اور غیر متعصب لوگ تھے۔

یہی وہ زمانہ تھا جب عربی زبان کی تاریخی تصنیفات کا ترجمہ یوروپی زبانوں میں ہو رہا تھا، اس سلسلہ میں سب سے پہلے ارپی نیوس، مارگولیتھ، ایڈورڈ پوکاک اور ہاٹنجر قابل ذکر ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ اتفاقاً یا قصداً ان مستشرقین نے جن عربی تاریخوں کا ترجمہ کیا وہ اکثر ان مسیحی مصنفین کی تصنیفات تھیں جو قرون ماضیہ میں اسلامی ممالک کے باشندے تھے۔ جیسے سعید بن بطریق اوٹیکوس المتوفی 939ء جو اسکندریہ کا پیٹریارک تھا اور ابن العمید المکین المتوفی 1273ء جو سلاطین مصر کا ایک درباری تھا۔ ابن العمید المکین کی تاریخ، طبری اور ذیل طبری کا خلاصہ ہے، ارپی نیوس نے جو ہالینڈ کا ایک مستشرق تھا، لاطینی ترجمہ کے ساتھ لیڈن سے اس کا ایک ٹکڑا شائع کیا، جو ابتدائے رسالت سے دولت اتابکیہ تک کے واقعات پر مشتمل ہے، المکین کے نام سے اس کتاب کے حوالے یورپ کی ابتدائی اسلامی تصنیفات میں نہایت کثرت سے آتے ہیں۔

اٹھارہویں صدی کے اخیر تک یورپ کی سیاسی قوت، اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہوگئی تھی جس نے "اورینٹلسٹ" کی ایک کثیر تعداد پیدا کر دی تھی، مستشرقین کی اس جماعت نے حکومت کے اشارے سے مشرقی زبانوں کے مدارس کھولے، مشرقی کتب خانوں کی بنیادیں ڈالیں، ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم کیں، مشرقی تصنیفات کی طبع واشاعت کے سامان پیدا کئے اورینٹل تصنیفات کا ترجمہ شروع کیا۔ اس کام میں ہالینڈ نے پہل کی اور اپنے مقبوضہ جزائر مشرق میں 1778ء میں ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی، اس کی تقلید دوسری سامراجی قوتوں نے بھی کی، انگریزوں نے بھی 1788ء میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی، اس کے بعد 1795ء میں فرانس نے مشرقی زندہ زبانوں (عربی، فارسی، ترکی) کا دارالعلوم قائم کیا اور آخر کار ان مدارس اور سوسائٹیوں کی تقلید سے تمام ممالک یورپ میں اس قسم کی درس گاہیں اور انجمنیں جاری ہوگئیں، عام یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے پروفیسروں اور کتب خانوں کا وجود لازمی سمجھا جانے لگا۔ مسلمانوں کے یہاں عربی زبان میں سیرت ومغازی کی جو کتابیں محفوظ تھیں، وہ ایک ایک کرکے باستثنائے چند اٹھارہویں صدی کے اواخر سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ میں چھپ گئیں اور ان میں سے اکثر کا یوروپین زبانوں میں ترجمہ ہو گیا، ان اصل تاریخی تصنیفات اور ان کے تراجم کی

اشاعت، ممالک اسلامیہ اور یورپ کے تعلقات، مذہبی منافرت کی کمی اور آزادانہ تحقیقات کی خواہش، ان تمام چیزوں نے یورپ میں مصنفین تاریخ اسلام اور سوانح نگاران پیغمبر عرب ﷺ کا ایک کثیر التعداد گروہ پیدا کر دیا۔

2. مستشرقین یورپ کے گروپ

مصنفین یورپ تین قسموں میں منقسم کئے جاسکتے ہیں: پہلا وہ گروپ جو عربی زبان اور اصل ماخذوں سے واقف نہیں، ان لوگوں کا سرمایہ معلومات اوروں کی تصانیف اور تراجم ہیں، ان کا کام صرف یہ ہے کہ اس مشتبہ اور ناکامل مواد کو قیاس اور میلان طبع کے قالب میں ڈھال کر دکھائیں، تعجب ہوتا ہے کہ ان میں بعض (مثلاً گبن صاحب) ایسے صائب الرائے اور انصاف پرست ہیں کہ راکھ کے ڈھیر میں سے بھی سونے کے ذرے نکال سکتے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت قلیل ہے۔

دوسرا گروپ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو عربی زبان، علم ادب اور تاریخ فلسفہ اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں، لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے ناآشنا ہیں، ان لوگوں نے سیرت یا مذہب اسلام پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی، لیکن ضمنی موقعوں پر عربی دانی کے زعم میں اسلام یا شارع اسلام کے متعلق نہایت دلیری سے جو کچھ چاہتے ہیں لکھ جاتے ہیں، مثلاً جرمن کا مشہور فاضل سخاؤ جس نے طبقات ابن سعد شائع کی ہے، اس کی وسعت معلومات اور عربی دانی سے کون انکار کرسکتا ہے، بیرونی کی کتاب الہند کا دیباچہ اس نے اس تحقیق سے لکھا ہے رشک کے قابل ہے، لیکن اسی دیباچہ میں اسلامی امور کے متعلق ایسی باتیں لکھ جاتا جس کو پڑھ کر بھول جانا پڑتا ہے کہ یہ وہی محترم شخص ہے جس کو ابھی ہم نے دیکھا تھا، نولدیکی (جرمنی) نے قرآن مجید کا خاص مطالعہ کیا ہے، لیکن انسائیکلوپیڈیا (جلد16) میں قرآن پر جو اس کا آرٹیکل ہے، جابجانہ صرف اس کے تعصب، بلکہ اس کی جہالت کے راز پنہاں کی بھی پردہ دری کرتا ہے۔

تیسرا گروپ ایسے مستشرقین کا ہے جنہوں نے خاص اسلامی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے، مثلاً پامر صاحب یا مار گولیتھ صاحب، ان سے ہم بہت کچھ امید کرسکتے تھے، لیکن باوجود عربی دانی، کثرت مطالعہ، تفحص کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں۔ مار گولیتھ نے مسند امام احمد ابن حنبل کی 6 ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے اور ہم دعوی سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہم سری کا دعوی نہیں ہوسکتا، لیکن پروفیسر موصوف نے آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے، دنیا کی تاریخ میں اس سے زیادہ کوئی کتاب، کذب وافتراء اور تاویل وتعصب کے لئے پیش نہیں کرسکتی، اس کا اگر کوئی کمال ہے تو یہ ہے کہ سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی واقعہ کو جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہوسکتا صرف اپنی طباعی کے زور سے بد منظر بنا دیتا ہے۔ اسی طرح سے علامہ شبلی ڈاکٹر اسپر نگر، جرمنی کا مشہور عربی داں، کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ موصوف کئی سال تک مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے، لکھنؤ میں آکر شاہی کتب خانہ کی رپورٹ لکھی جو ہماری نظر سے گزری ہے، حافظ ابن حجر کی کتاب ''کتاب الاصابہ فی احوال الصحابہ'' اول اول انہوں نے تصحیح کر کے کلکتہ میں شائع کرائی، لیکن جب آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری پر ایک مستقل ضخیم کتاب 3 جلدوں میں لکھی تو ہم حیرت زدہ رہ گئے۔

3. مستشرقین کی غلط کاریوں کے اسباب

یوروپین مصنفین کی غلط کاریوں کی بڑی وجہ تو وہی ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب ہے، لیکن علامہ شبلی کے نزدیک بعض وجوہ اور بھی ہیں جن کی بنا پر ہم ان کو معذور رکھ سکتے ہیں: پہلی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تمام تر سرمایہ استناد صرف سیرت و تاریخ کی کتابیں ہیں، مثلا مغازی واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد ابن اسحاق، تاریخ طبری وغیرہ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم شخص اگر آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری مرتب کرنا چاہے گا تو عام قیاس یہی رہبری کریگا کہ اس کو تصنیفات سیرت کی طرف رجوع کرنا چاہیے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ سیرت کی تصنیفات میں سے ایک بھی نہیں جو استناد کے لحاظ سے بلند رتبہ ہو، بہرحال مصنفین سیرت سے قطع نظر، سیرت کی روایتیں زیادہ تر جن لوگوں سے مروی ہیں مثلا سیف، سری، ابن سلمہ، ابن نجیح عموما ضعیف الروایۃ ہیں، اس لئے عام اور معمولی واقعات میں ان کی شہادت کافی ہو سکتی ہے لیکن وہ واقعات جن پر مہتم بالشان مسائل کی بنیاد قائم ہے، ان کے لئے یہ سرمایہ قابل قبول نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری کے یقینی واقعات وہ ہیں جو حدیث کی کتابوں میں بہ روایات صحیحہ منقول ہیں، یورپین مصنفین اس سرمایہ سے بالکل بے خبر ہیں اور ایک آدھ کوئی مثلا مارگولیتھ تو اولا وہ اس فن کا ماہر نہیں اور ہو بھی تو تعصب کی ایک چنگاری سیکڑوں خرمن معلومات کو جلانے کے لئے کافی ہے۔

دوسری بڑی وجہ یہ کہ یورپ کے اصول تنقیح شہادت اور ہمارے اصولِ تنقیح میں سخت اختلاف ہے، یورپ اس بات کو بالکل نہیں دیکھتا کہ راوی صادق ہے یا کاذب، اس کے اخلاق وعادات کیا ہیں، حافظہ کیسا ہے؟ اس کے نزدیک یہ تحقیق و تدقیق نہ ممکن ہے، نہ ضروری ہے، وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ راوی کا بیان بجائے خود قرائن اور واقعات کے تناسب سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں، فرض کرو ایک جھوٹے سے جھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے جو قرائنِ موجودہ اور گردوپیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے، بیان بالکل مسلسل ہے اور کہیں سے نہیں اکھڑتا تو یورپ کے مذاق کے موافق واقعہ کی صحت تسلیم کرلی جائے گی۔

بخلاف اس کے مسلمان مورخ اور خصوصا محدثین اس کی پروا نہیں کرتے کہ خود روایت کی کیا حالت ہے، بلکہ سب سے پہلے وہ یہ دیکھتے ہیں کہ "اسماء رجال" کے دفتر تحقیقات میں اس شخص کا نام ثقہ لوگوں کی فہرست میں درج ہے کہ نہیں، اگر نہیں ہے تو ان کے نزدیک اس کا بیان بالکل ناقابل اعتنا ہے، بخلاف اس کے اگر ثقہ راوی نے کوئی واقعہ بیان کیا تو گو قرائن اور قیاسات کے خلاف ہو اور گو بظاہر عقل کے مطابق بھی نہ ہو لیکن اس کی روایت قبول کرلی جائیگی۔ اس اختلاف اصول نے یوروپین تصنیفات پر بہت بڑا اثر پیدا کیا، مثلا اہل یورپ واقدی کے بیان پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ واقدی کا بیان نہایت مسلسل اور مربوط ہوتا ہے، جزئیات کی تمام کڑیاں باہم ملتی چلی جاتی ہیں، واقعات میں کہیں خلا نہیں ہوتا، جو چیزیں کسی واقعہ کو دلچسپ بنا سکتی ہیں سب موجود ہوتی ہیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ یہی باتیں اصلی راز کی پردہ دری کرتی ہیں، جو روایتیں سو برس سے زیادہ زمانہ تک محض زبانوں پر رہیں، اس میں قدر استقصائے جزئیات ممکن نہیں، یہ البتہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح تاریخی افسانے لکھے جاتے ہیں چند واقعات کا ذخیرہ سامنے رکھ کر قیاس و قرائن اور معلومات عامہ کے ذریعہ سے اس سادہ خاکہ کو نقش و نگار سے کامل کر دیا جائے، لیکن یہ جرات صرف واقدی کر سکتا ہے، محدثین اس سے معذور ہیں۔ تاہم

اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر موقعہ پر محض راوی کا ثقہ ہونا کافی نہیں، ثقات بھی غلطی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ درایت کے جو اصول محدثین نے قائم کئے ہیں اور بعض جگہ وہ خود بھول جاتے ہیں، ان کی نہایت سختی کے ساتھ پابندی کی جائے۔

4. یوروپین مصنفین کے اصول مشترکہ

علامہ شبلی کے نزدیک مستشرقین جب آنحضرت ﷺ کے اخلاق کے متعلق جو نکتہ چینیاں کرتے ہیں، یا ان کی کتابوں سے جو نکتہ چینیاں خود بخود ناظرین کے دل میں پیدا ہوتی ہیں، ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ: آنحضرت ﷺ کی زندگی مکہ معظمہ تک پیغمبرانہ زندگی ہے، لیکن مدینہ میں جا کر جب زور و قوت حاصل ہوتی ہے تو دفعتاً پیغمبری بادشاہی سے بدل جاتی ہے اور اس کے جو لوازم ہیں یعنی لشکر کشی، قتل، انتقام، خوں ریزی، خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں، اس کے علاوہ کثرت ازدواج اور عورتوں کی طرف میلان، مذہب کی اشاعت جبر و زور سے، لونڈی غلام بنانے کی اجازت اور اس پر عمل، دنیاداروں کی سی حکمت عملی اور بہانہ جائی۔ یہ وہ امور ہیں جن کو سامنے رکھ کر اہل یورپ پیغمبر اسلام اور اسلامی تعلیمات پر نقد و جرح کرتے ہیں۔

20.5 نظریہ تعلیم

مولانا سے پہلے علماء پر مدرسیت اتنی چھاگئی تھی کہ ان کی نظر درسی کتابوں اور ان کے شروح و حواشی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، زیر درس کتابوں کے علاوہ کسی نئی کتاب کا دیکھنا، کسی اور علم و فن سے استفادہ، قلمی کتابوں کی تلاش اور نوادر کتب کے مطالعہ کا شوق عموماً ناپید تھا، علامہ کو اللہ تعالی نے یہ ذوق فطرت عنایت فرمایا انہوں نے ہر علم و فن کی بکثرت کتابیں مطالعہ کیں، نوادر کتب بہ کثرت بہم پہنچائے، کتب خانے چھانے، دنیا کے کونے کونے سے مطبوعات منگوائے، ادب، فتوح، تاریخ، فلسفہ، منطق، کلام کا بڑا سرمایہ جمع کیا اور اپنی تصنیفات و مضامین میں ان کے حوالے دئے، طلبہ اور علماء کو ان کے مطالعہ کی ترغیب دی اور اپنے شاگردوں اور ہم نشینوں میں اس کا ذوق پیدا کیا، اور پھر جب ان کو کامل یقین ہو گیا کہ مدرسے کے نصاب میں اصلاح کی ضرورت ہے تو باقاعدہ اپنا نظریہ تعلیم پیش کیا۔

1. ندوۃ العلماء میں شرکت

انیسویں صدی کے اواخر میں ملک بھر میں طوفان اٹھ رہے تھے، ان سے حساس مسلمانوں کے دل مضطرب تھے، مدارس و مکاتب کا پرانا سلسلہ ٹوٹ رہا تھا، انگریزی اسکول اور کالج میں مسلمان لڑکے کھنچ رہے تھے، حکومت کے اثر سے عیسائیت کا چرچہ تھا مشنریوں کے جال ہر جگہ پھیلے تھے، مسلمانوں اور عیسائیوں میں مناظروں کی گرم بازاری تھی، دونوں طرف سے رسالے لکھے جا رہے تھے، یورپ کے نئے خیالات سیلاب کی طرح امڈے چلے آرہے تھے، عام علماء زیادہ تر پڑھنے پڑھانے میں مصروف، کچھ معمولی معمولی چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھے تھے، اور خواص تقلید و عدم تقلید، قرأت فاتحہ، آمین بالجہر اور رفع یدین کے مسئلوں میں ایسے گتھے تھے کہ مناظرہ، مجادلہ اور مجادلہ مقاتلہ بن گیا تھا، خدا کے گھر لڑائی کے میدان بن گئے تھے، مدرسوں میں پرانا فرسودہ طریقۂ درس جاری تھا، جو زمانہ کے انقلاب سے بیکار اور نئے زمانہ کے لئے قوم کے نئے رہبر اور رہنما پیدا کرنے سے قاصر تھا۔

اس صورت حال میں حسن اتفاق سے چند مفکر ملت نے مدرسہ ٔفیض عام کانپور کے جلسہ ٔ دستار بندی کے موقع پر 1892ء میں اس سنگین اور ہنگامہ خیز دور میں قوم کی طرف توجہ مبذول کی، اور پہلی بار علماء کی مجلس (ندوۃالعلماء) کے انعقاد کا تصور آیا، جس کا مقصد اس صورت حال سے نمٹنے کا حل تلاش کرنا تھا، اسی مدرسہ فیض عام کانپور کے آئندہ اجلاس 24.22.23 اپریل 1894ء میں علامہ شبلی نعمانی کو بھی شرکت کی درخواست موصول ہوئی جس کو انہوں نے قبول کر لیا۔ وہ ایک تاریخی اجلاس تھا جس میں فرقہ واریت سے پرے ہر طبقہ کے علماء اس میں شامل تھے، علماء حنفی کے علاوہ اہل حدیث میں سے مولوی ابراہیم آروی، مولوی محمد حسین بٹالوی، شیعہ مجتہدین میں مولوی غلام الحسنین شریک جلسہ تھے۔ اس جلسہ میں علامہ شبلی نے ندوۃالعلماء کا دستور العمل پیش کیا، جس میں کچھ تجاویز پیش ہوئیں: پہلی تجویز یہ تھی کہ موجودہ طریقہ ٔتعلیم قابل اصلاح ہے۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ مدارس اسلامیہ کے مہتمم ہر سال ندوۃالعلماء کے اجلاس میں شریک ہوں یا اپنے کسی مدرس یا وکیل کو بھیجیں، تیسری تجویز یہ تھی کہ جو مدارس اسلامیہ جابجا قائم ہیں ان کو کسی بڑے مدرسہ مثلاً دیوبند وغیرہ سے الحاق کیا جائے۔ ان تجاویز میں مدرسوں کا طریقہ تعلیم اور اس کی اصلاح نہایت اہمیت کا حامل ہے، اس کا دوسرا پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ موجودہ حالات کو مد نظر رکھ کر دیکھا جائے تو مدارس کے نصاب میں کچھ کوتاہیاں ہیں جن کو دور کرنا ضروری ہے۔

2. تبدیلِ نصاب کی کوشش

اکتوبر 1902ء میں ندوہ کا سالانہ جلسہ امرتسر میں ہوا، ندوہ کا یہ سب سے پہلا جلسہ تھا جس میں علامہ شبلی نے اپنے خیالات کو ایک موزوں شکل میں پیش کیا، تبدیل نصاب کا مسودہ اور اس کی ترکیب بھی پیش کی، علامہ کے نزدیک، درجہ ٔمتوسط سال سوم میں سے ''ملا حسن''، ''رسالہ میر زاہد''، ''ملا جلال''، ''قاضی مبارک''، ''صدرا''، سب خارج کر دینا چاہئے، ان کے بجائے ''شرح مطالع'' کے بعض حصے، ''حمد اللہ''، شرح ہدایۃ الحکمت از خیر آبادی، ''رسائل ابن رشد مطبوعہ مصر''، ''حماسہ''، ''اعجاز القرآن باقلانی''، اور ہدایۃ معاملات (بشرط گنجائش) ہونا چاہئے۔ درجہ متوسط سال دوم میں سے ''میبذی'' (یہ سب سے زیادہ لائق کتاب ہے) ''شرح عقائد نسفی''، ''تشریح الافلاک'' خارج ہونی چاہئے، موطا امام محمد، سبعہ معلقہ، جلالین قائم رہنا چاہئے، اور ''رسائل اربعہ امام غزالی''، ''الفوز الاصغر لابن مسکویہ'' مطبوعہ ٔ بیروت پڑھانا چاہئے۔ درجہ متوسط سال اول میں مشکاۃ کی ضرورت نہیں، ''مختصر المعانی'' قطعاً خارج کر دینا چاہئے، اور ''حسن التوسل فی صناعۃ الرسل'' مطبوعہ مصر اس کے بجائے رکھنا چاہئے، منتقی الابحر کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

درجہ ابتدائی سال سوم میں ''تلخیص'' اور 'دیوانِ علی' (جو محض موضوع ہے) بالکل خارج، مشکاۃ کی بھی ضرورت نہیں، حدیث کا فن مستقل اخیر میں رکھا جائیگا۔ درجہ ابتدائی سال دوم اور سال سوم سے 'شافیہ' 'کافیہ' 'شرح جامی' قطعاً خارج، ان کی جگہ اس درجہ میں ہدایۃ النحو لانا چاہئے اور ''مفصل زمخشری'' کا اضافہ کرنا چاہئے، نیز کلیلہ ودمنہ از ابن المقفع مطبوعہ بمبئ کو بھی داخل نصاب کرنا چاہئے۔

علامہ شبلی کی خواہش تھی کہ روایتی نصاب میں جو خامیاں وقت کے ساتھ پیدا ہو گئیں تھیں ان کو دور کیا جائے، منطق اور کلام کی جو کتابیں تھیں ان کی جگہ ایسے مضمون شامل کرنا چاہئے جو ماڈرن زمانے کے حساب سے موزوں اور مناسب ہو۔ نحو و صرف پر زیادہ وقت لگانے کے بجائے ان کی جگہ عربی ادب پر زور دینا چاہئے۔ لیکن ان کی یہ خواہش مکمل طور پر روبہ عمل میں نہ لائی جا سکی یہاں تک کہ ان کو دار العلوم

ندوۃ العلماء کی معتمدی پیش کی گئی۔

3. دارالعلوم ندوۃ العلماء کی معتمدی 1905ء-1913ء

علامہ شبلی کا نام ندوہ کے معتمد کی حیثیت سے سب سے پہلے مارچ 1903ء کو بمقام شاہجہاں پور مولانا غلام محمد صاحب نے جلسۂ انتظامیہ میں پیش کیا اور ارکان مجلس نے بالاتفاق منظور کر لیا اور طے ہوا کہ مولانا شبلی سے درخواست کی جائے کہ وہ لکھنو آکر قیام کریں مگر وہ ان دنوں نہ آسکے، لیکن بعد میں حیدرآباد سے استعفی دے کر وہ لکھنو آگئے اور گولہ گنج میں اس عمارت میں جو "خاتون منزل" کے نام سے جاتی تھی، قیام کیا اور سب سے پہلا کام بحیثیت معتمدی کے نصاب کا اجراء کرنا تھا۔

4. جدید نصاب کا اجراء

دارالعلوم ندوۃ العلما کے قیام کا اصلی مقصد پرانے نصاب کی جگہ ایک نیا نصاب نافذ کرنا تھا جو روایتی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید ضرورتوں پر بھی پورا اترے، اور ایسے افراد کی ایک جماعت تیار کرنا تھا جو جدید چیلنجز کا مقابلہ کر سکے، انہی مقاصد کے پیش نظر علامہ شبلی نے بحیثیت معتمد سب سے پہلے نصاب میں جو غیر ضروری یا کم اہم مضامین پڑھائے جاتے تھے ان کو درس سے نکال کر ان کی جگہ کچھ نئے مضامین کو نصاب میں شامل کیا، مثلاً ادب اور فن بلاغت کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا گیا، فلسفہ جدیدہ میں "دروس الادلیہ" رکھی گئی جس میں سائنسی بحثیں ہیں، اسرار شریعت میں حجۃ اللہ البالغہ کو نصاب میں شامل کیا گیا، انگریزی زبان ضروری قرار دی گئی، ہندی اور سنسکرت کا درجہ بھی قائم کیا گیا جس کا مقصد ہندوستانی تہذیب و تمدن سیکھ کر اس کی صحیح ترجمانی اور آریوں کے بیجا اعتراضات کا رد کرنا تھا۔

الغرض علامہ شبلی جو نصاب چاہتے تھے، مجموعی طور پر اس میں عربی ادب، فن بلاغت اور تنقید کے علاوہ علوم اسلامیہ: تفسیر، علوم القرآن، عقائد و فلسفہ، اور اسرار شریعت سے متعلق بعض نئی کتابیں تھیں، جدید علوم میں انگریزی اور جدید فلسفہ و سائنس کی کتابیں۔ وہ جدید تعلیم کی تحصیل مسلمانوں کے لئے ضروری تو خیال کرتے تھے مگر اس میں ایسا انہاک پسند نہیں کرتے تھے، جو طلبہ کو دینی تعلیم سے غافل اور اپنی تاریخ و تہذیب سے بیگانہ کر دے، اس لئے علامہ کے تصور میں صرف ایسے کتب دینیات کی ضرورت ہے جس میں اسکول سے کالج تک کے قابل تین طرح کی کتابیں ہوں: عقائد، فقہ، اور تاریخ اسلام۔

اسکول کلاسوں میں صرف فقہ، تاریخ اسلام اور سادہ عقائد کی تعلیم ہو، کالج کی کلاسوں میں امام غزالی، ابن رشد اور شاہ ولی اللہ کی چند مختص تصنیفات خود عربی زبان میں پڑھائی جائیں، مزید برآں ان کی رائے یہ بھی تھی کہ دینیات کے نتائج امتحانات کو انگریزی تعلیم کے نتائج کی طرح لازمی قرار دیا جائے اور دو چار طلبہ کو وظائف دے کر ڈگری حاصل کرنے کے بعد اعلی درجہ کی تعلیم دی جائے۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی دین و دنیا کی خلیج پاٹنا اور قدیم و جدید کا ڈانڈا ملانا چاہتے تھے، کیونکہ ان کے نزدیک موجودہ دور میں نہ محض قدیم تعلیم سے مسلمانوں کے مسائل اور ضرورتوں کا حل ہے اور نہ صرف تعلیم جدید ہی ان کے دکھ و درد کی دوا ہے، دونوں کے مجموعے اور آمیزش میں ہی ان کے مسائل اور پریشانوں کا حل ہے۔

20.6 دارالمصنفین

دارلمصنفین ایک علمی و تحقیقی ادارہ ہے جو بھارت کے صوبہ اتر پردیش کے مشرقی ضلع اعظم گڑھ میں واقع ہے، اس ادارے کا قیام علامہ شبلی نعمانی کا دیرینہ خواب تھا، جس کے قیام کی تجویز سب سے پہلے 1910ء میں پیش کی گئی تھی، علامہ شبلی کے نزدیک قومی و مذہبی ضروریات میں جس قدر ایک قومی مدرسہ، ایک قومی کالج، ایک قومی یونیورسٹی کی ضرورت ہے، اسی قدر ایک کتب خانہ اعظم کی بھی ضرورت ہے، اگر مسلمانوں کے مذہب، مسلمانوں کے علوم، مسلمانوں کی قومی تاریخ کو زندہ رکھنا ہے، تو ضروری ہے کہ ایک ایسا کتب خانہ تیار کیا جائے، ایک ایسی اکیڈمی بنائی جائے جس میں علوم مذہبی کے متعلق نادر اور بیش بہا تصانیف موجود ہوں، جس میں مسلمانوں کے خاص ایجاد کردہ علوم وفنون کا کافی سرمایہ ہو، جس میں ہر فن کے متعلق وہ تمام کتابیں موجود ہوں جو اس فن کے دورِ ترقی کے مدارج ہیں، جس میں قدماء کے عہد کی یادگاریں ہوں، اور ان سب باتوں کے ساتھ کتب خانہ کسی کا ذاتی نہ ہو بلکہ وقف عام ہو تاکہ تمام ہندوستان کے مسلمان اور بالخصوص مصنفین اور اہل قلم اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

اس ادارے کے قیام کے لئے علامہ شبلی نے رات دن ایک کر دیا لوگوں سے وظائف کی مانگ کی۔ خود جتنی سکت اور حیثیت تھی اس ادارے میں صرف کر دی، اس کے لئے اپنے آبائی جائداد سے زمین وقف کی، دارالمصنفین کی تعمیر کا کام بھی شروع ہو گیا تھا، لیکن ابھی وقف نامہ ہی زیر تحریر تھا کہ 18 نومبر 1914ء کو اس ادارے کی تکمیل کی حسرت لئے ہوئے ملت کا یہ نیر تاباں غروب ہو گیا، لیکن ان کے لائق شاگردوں کے ہاتھوں سے یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔

فی الحال دارالمصنفین میں دارلتصنیف، دارالاشاعت، دارالطباعت اور شعبہ 'رسالہ معارف' اوردارالکتب جیسے شعبے ہیں، دارلمصنفین میں عربی، فارسی، انگریزی، اور اردو کی بہت سی نادر کتابوں کا مجموعہ ہے، ان میں احیاء العلوم، فتاوی عالمگیری، شرح نہج البلاغہ، کتاب المیزان، یہ کتابیں عربی زبان میں ہیں۔ فارسی زبان کی نادر کتابوں میں اکبر نامہ، مونس الارواح، کلیات کلیم، تاریخ فرشتہ، قصص العجائب، تزک جہانگیری، مدارج النبوۃ قابل ذکر ہیں۔

20.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- علامہ شبلی نعمانی ایک یگانہ روزگار محقق اور مصنف، ایک بے مثال سوانح نگار، ایک عظیم فلسفی اور مفکر، ایک مایہ ناز ماہر تعلیم اور معلم ہونے کے ساتھ ایک ایسے عالم دین تھے، جن کی فکر و نظر آج بھی حاملین علوم نبوت کے لئے مشعل راہ کا کام کر رہی ہے۔
- علامہ کی زندگی کا سب سے عظیم کارنامہ مدارس کے نصاب تعلیم کی اصلاح تھی، اسی اصلاح اور ان کی گوناگوں شخصیت کا نتیجہ تھا کہ امت کو علامہ سید سلیمان ندوی، عبد السلام ندوی، مسعود عالم ندوی اور ابوالحسن علی ندوی جیسے ممتاز عالم دین میسر ہوئے، ان کا تجویز کردہ نصاب اگر باقی رہتا تو افراد کی ایسی جماعت تیار ہو جاتی جو امت کے لئے مشعل راہ کا کام کرتی، لیکن بدقسمتی سے قدامت

پرست گروپ نے ان کی اصلاحات کی مخالفت کی۔

- علامہ شبلی کا دوسرا اہم کام مستشرقین کے جال کو توڑنا تھا، مصنفین یورپ جس قدر تاریخ کو غلط انداز میں پیش کر کے عالم اسلام کی ممتاز شخصیتوں پر بہتان ترازی اور تنقید کا نشانہ بنائے ہوئے تھے، علامہ نے ان تمام باطل پروپیگنڈے کی قلعی کھول دی، ان کی بہتان ترازیوں کا پردہ فاش کیا، سیرۃ النبی، الفاروق، النعمان جیسی سوانحی تاریخ لکھ کر اسلام، پیغمبر اسلام اور دیگر عمودی شخصیات کا دفاع کیا۔

20.8 نمونہ امتحانی سوالات

20.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. علامہ شبلی نعمانی کے والد کا کیا نام تھا؟

(a). محمد الیاس (b). شیخ حبیب اللہ (c). احمد الیاس (d). الیاس اختر

2. مندرجہ ذیل میں سے کون سی جگہ علامہ شبلی کی جائے پیدائش تھی؟

(a). بندول (b). آگرہ (c). لکھنؤ (d). مئو

3. علامہ شبلی نعمانی نے علم حدیث کس حاصل کیا؟

(a). مولانا احمد علی (b). مولانا فاروق چریا کوٹی (c). فیض الحسن (d). ارشاد حسین

4. علامہ شبلی نے اپنے والد کے اصرار پر کونسا پیشہ اختیار کیا؟

(a). بینک کاری (b). معلم (c). کلرک (d). وکالت

5. مندرجہ ذیل میں سے کون سی کتاب علامہ شبلی کی نہیں ہے؟

(a). المامون (b). الفاروق (c). احیاعلوم الدین (d). الکلام

6. مولانا کے کس شاگرد نے ان کی سیرۃ النبی کی تکمیل کی تھی؟

(a). سید سلیمان ندوی (b). مسعود ندوی (c). عبد السلام ندوی (d). سب غلط

7. علامہ شبلی کس سن میں دار العلوم ندوۃ العلما کے معتمد بنے؟

(a). 1905ء (b). 1906ء (c). 1904ء (d). سب غلط

8. شبلی نعمانی کس سن میں علی گڑھ سے وابستہ ہوئے؟

(a). 1883ء (b). 1880ء (c). 1881ء (d). 1885ء

9. مولانا شبلی نے ابتدائی تعلیم کس سے حاصل کی؟

(a). عبدالحق خیر آبادی (b). مولانا فاروق چریاکوٹی (c). ارشاد حسین (d). فیض الحسن

10. علامہ شبلی نے کس سن میں علی گڑھ سے علیحدگی اختیار کی؟

(a). 1997ء (b). 1998ء (c). 1999ء (d). 1996ء

20.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. علامہ شبلی کی ابتدائی تعلیم پر مختصر نوٹ تحریر کریں۔
2. قیام علی گڑھ میں مولانا پر کالج کے اثرات قلم بند کریں۔
3. علامہ شبلی کے نزدیک مستشرقین کے اصول مشترکہ کیا ہیں؟
4. علامہ کی تصانیف پر مختصرا روشنی ڈالیں۔
5. علامہ شبلی کے نزدیک انگریزی کی تعلیم کیوں ضروری ہے۔

20.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. مستشرقین سے متعلق علامہ شبلی کی خدمات واضح کریں۔
2. مولانا شبلی کا نظریہ تعلیم کیا تھا وہ کیوں روایت اور جدیدیت کو ساتھ رکھنا چاہتے تھے؟
3. دارالمصنفین کے مقصد قیام اور اس کی اہمیت پر ایک جامع نوٹ تحریر کریں۔

20.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. حیات شبلی : مولانا سید سلیمانی ندویؒ
2. سیرۃ النبی ﷺ : مولانا شبلی نعمانیؒ
3. علامہ شبلی نعمانی (معنویت کی بازیافت) : ڈاکٹر شباب الدین
4. علامہ شبلی نعمانی بحیثیت سوانح نگار : ڈاکٹر صفیہ بی

اکائی 21: اشرف علی تھانوی

اکائی کے اجزا:

21.0 تمہید

21.1 مقاصد

21.2 مولانا اشرف علی تھانوی

21.2.1 سوانحی خاکہ

21.2.2 تعلیم وتربیت سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی کا نقطہ نظر

21.2.3 تعلیم وتربیت کا مقصد

21.2.4 خواتین کی تعلیم سے متعلق مولانا کا نقطہ نظر

21.2.5 مولانا اشرف علی تھانوی کا سیاست سے متعلق نقطہ نظر

21.2.6 تصوف سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی کا نقطہ نظر

21.2.7 مولانا اشرف علی تھانوی اور اجتہاد و تقلید

21.3 اکتسابی نتائج

21.4 نمونہ امتحانی سوالات

21.4.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

21.4.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

21.4.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

21.5 تجویز کردہ اکتسابی مواد

21.0 تمہید

بیسویں صدی کے عظیم مصنف و مصلح کی حیثیت مولانا اشرف علی تھانوی کی رہی ہے، آپ کی زندگی کی جہتیں مختلف تھیں، آپ ایک معلم بھی تھے، اور ایک واعظ وخطیب بھی، ایک مصنف بھی تھے تو ایک مرشد و مصلح بھی، آپ مسلم سماج کی کمزوریوں اور برائیوں سے بھرپور واقف بھی تھے تو ایک حکیم اور دانا کی طرح ان برائیوں کے خاتمہ اور ازالہ کے طریقوں سے واقف بھی تھے اور ہر مسئلہ سے متعلق آپ کی ایک فکر تھی اور ایک واضح نظریہ تھا، جس پر آپ نے اپنی مختلف تقریروں اور تحریروں میں روشنی ڈالی ہے اور اس کے نکات سے گفتگو کی ہے۔ اگر آپ کی فکری جہتوں اور نوعیتوں کی درجہ بندی کریں تو درج ذیل اہم عناوین سامنے آتے ہیں:

1- تعلیم وتربیت، 2- تصوف، 3- سیاست، 4- تقلید واجتہاد۔

ان اہم عناوین کے تحت مختلف ذیلی عناوین ہیں، جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہر مسئلہ میں مجتہدانہ رائے رکھتے تھے اور اپنی تحریر وتقریر میں اس کا اظہار فرماتے تھے۔

مزید برآں آپ کے شاگردوں اور مریدوں نے آپ کی فکری اور اصلاحی کوششوں کو دنیا کے مختلف ملکوں اور علاقوں تک وسعت دی۔

21.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد جدید دور کے ایک اہم مفکر و مصلح مولانا اشرف علی تھانوی کے افکار و نظریات اور اصلاحات سے طلبا وطالبات کو متعارف کرانا ہے، انہوں نے برصغیر ہند کو اپنی فکر اور اصلاح کا مرکز بنایا، درس وتدریس، وعظ وخطابت اور بیعت وارشاد کے ذریعہ سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں اور بدعات وخرافات کی اصلاح کی کوششیں کیں اور اس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبا وطالبات نہ صرف مولانا اشرف علی تھانوی کی شخصیت سے واقف ہوں گے، بلکہ آپ کی فکری واصلاحی کوششوں سے بھی متعارف ہوں گے۔

21.2 مولانا اشرف علی تھانوی

21.2.1 سوانحی خاکہ

مولانا اشرف علی تھانوی ضلع مظفر نگر اتر پردیش۔ یوپی کے ایک قصبہ تھانہ بھون میں 1280ھ مطابق 9 ستمبر 1863 عیسوی کو پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم وتربیت گھر پر ہوئی، یوپی کے شہر میرٹھ میں قرآن کریم حفظ کیا اور فارسی کی تعلیم حاصل کی، پھر تھانہ بھون واپس آئے اور مولانا فتح محمد صاحب سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند سہارنپور یوپی میں داخلہ لیا اور 1301 ہجری میں فضیلت کی سند حاصل کی۔

اپنی ظاہری و باطنی اصلاح کے لئے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت ہوئے اور ریاضت و مجاہدہ کے بعد خلافت سے سرفراز ہوئے، درس و تدریس کے لئے مدرسہ فیض عام کانپور کا انتخاب کیا اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے، 14 سال تک اسی مدرسہ میں درس دیتے رہے، پھر وہاں سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن تھانہ بھون واپس آ گئے اور تصنیف و تالیف اور بیعت وارشاد کا سلسلہ شروع کیا اور اپنے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے خانقاہ کو از سرے نو آباد کیا اور مدرسہ اشرفیہ کے نام سے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی۔

جن لوگوں نے اپنی ظاہری و باطنی اصلاح کے لئے آپ سے رجوع کیا وہ اپنے وقت کے مختلف میدانوں کی نامور شخصیات تھیں، جن میں علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مفتی محمد شفیع اور مولانا ابرار الحق ہردوئی وغیرہ قابل ذکر ہیں، ان حضرات کے علاوہ ہزاروں لوگ آپ سے بیعت ہوئے اور اپنی اصلاح کی۔

مولانا اشرف علی تھانوی ایک عظیم مصنف بھی تھے، آپ کی تصنیفات کی تعداد سو سے متجاوز ہے، جو مختلف موضوعات سے متعلق ہیں۔ جن میں سے چند کتابوں کے نام یہ ہیں: بیان القرآن، اشرف الجواب، بوادرالنوادر، اصلاح الرسوم، اغلاط العوام، احکام اسلام عقل کی نظر میں، الحیلۃ الناجزہ للحلیلۃ العاجزہ۔

تصنیف و تالیف کے علاوہ، عوام کی اصلاح و تربیت کے لئے آپ نے وعظ وارشاد کا سلسلہ بھی جاری کیا، چنانچہ آپ کے مواعظ اور ملفوظات کی تعداد سو جلدوں کے قریب ہیں۔

آپ کی وفات 16 رجب 1362 ہجری مطابق 20 جولائی 1943 کو ہوئی، آپ کی نماز جنازہ مولانا ظفر احمد عثمانی نے پڑھائی، اور تھانہ بھون کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

21.2.2 تعلیم و تربیت سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی کا نقطہ نظر

تعلیم و تربیت سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ تعلیم و تربیت کا مقصد انسان کو آدمی بنانا ہے، اگر تعلیم و تربیت سے انسان آدمی نہیں بن پاتا ہے، تو پھر تعلیم و تربیت اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں ناکام ہے۔

الافاضات الیومیہ میں مولانا اشرف علی تھانوی کا یہ قول منقول ہے:

"بزرگ بننا آسان ہے، مگر انسان بننا بڑا مشکل، میرے یہاں آدمیت کی تعلیم ہوتی ہے"۔

اسی طرح مولانا کا یہ قول بھی انتہائی اہم ہے کہ شاہ صاحب بننا آسان ہے، ملک التجار بننا آسان ہے، بزرگ بننا آسان ہے، قطب بننا آسان مگر انسان بننا مشکل۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے تعلیم آدمیت کی وضاحت بھی کی ہے، آپ نے فرمایا: تعلیم آدمیت سے مراد اصلاح احوال ہے۔ اور آدمیت کا خلاصہ آپ نے ان الفاظ میں کی ہے کہ "آدمیت کا حاصل یہ ہے کہ اپنے سے دوسروں کو اذیت نہ پہنچے"۔

21.2.3 تعلیم وتربیت کا مقصد

مولانا اشرف علی تھانوی کا نقطہ نظر یہ تھا کہ آدمیت کی تشکیل کے بعد ضروری ہے کہ صالح معاشرہ کا وجود عمل میں آئے، چنانچہ معاشرہ کی اصلاح اور صالح معاشرہ کے قیام کے لئے آپ نے بھرپور کوششیں کیں اور معاشرہ پر پڑی رسوم ورواج اور بدعات وخرافات کی دبیز چادروں کو ہٹا کر معاشرہ کی تجدید کا کام کیا اور اس میدان میں کامیابی نے آپ کے قدم چومے، چنانچہ آپ خود فرماتے تھے:

مجدد ملت تو خیر کیا، لیکن مجدد معاشرت میں ضرور ہوں۔

صالح معاشرہ کو وجود میں لانے کے لئے آپ نے تین کام کئے:

1. لوگوں کے شعور کو بیدار کرنے کے لئے پند وموعظت کا سلسلہ شروع کیا، آپ کے خطبات ومواعظ اس کثرت سے ہوتے کہ آپ کے مواعظ کتابی شکل میں خطبات حکیم الامت کے نام سے ستائیس جلدوں میں شائع ہوئی ہیں۔
نیز آپ کے منتشر ملفوظات اور بیانات اصلاح امت کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوئی ہیں۔
اسی طرح اشرف السوانح کے ایک باب کا عنوان ہی اصلاح معاشرت ہے۔
2. خطبات ومواعظ اور پند ونصائح کے علاوہ مولانا نے بیعت وارشاد کا سلسلہ بھی شروع کیا اور مختلف لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے تزکیہ باطن کیا اور پھر آپ کے مجاز وخلفاء اور مریدین نے اصلاح معاشرہ کے اس سلسلہ کو دنیا کے مختلف خطوں تک دراز کیا۔
3. آپ نے عوام کی اصلاح اور صالح معاشرہ کے قیام سے متعلق کئی کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں چند مشہور کتابوں کے نام یہ ہیں: اغلاط العوام، بہشتی زیور اور الحیلۃ الناجزہ وغیرہ۔

مزید برآں مولانا اشرف علی تھانوی کا معمول یہ تھا کہ درس وتدرس سے زیادہ توجہ تہذیب اخلاق پر دیتے تھے۔

مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں:

"مجھ کو علم کے پڑھانے لکھانے کا اتنا زیادہ اہتمام نہیں ہے، جس قدر تہذیب اخلاق ودیانت کا، کیونکہ لکھنے پڑھنے کا اہتمام تو ہر جگہ ہوتا ہے، لیکن اخلاق کی طرف کسی کا خیال بھی نہیں"۔

نیز فرماتے ہیں:

"کسی سے کوئی حرکت خلاف تہذیب سرزد ہو، اس کا اس لئے اچھی طرح تدارک کیا جاتا ہے کہ اس میں اوروں کو تکلیف ہوتی ہے"۔

مولانا اشرف علی تھانوی تعلیم وتربیت میں انسانی نفسیات واحساسات کا بھی پورا خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد میاں صدیقی لکھتے ہیں:

مولانا تھانوی نے لوگوں کی تعلیم و تربیت اور ذہنی و فکری اصلاح کا جو طریقہ اپنایا وہ عام ڈگر سے ہٹ کر تھا، ان کا طریقہ کار انسانی جبلت و فطرت اور نفسیات کے عین مطابق تھا۔

مولانا اشرف علی تھانوی طلبا کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

بس تم تین باتوں کا التزام کر لو، پھر میں ٹھیکہ لیتا ہوں اور ذمہ دار ہوتا ہوں کہ تمہیں استعداد علمی حاصل ہو جائے گی: اول یہ کہ جو سبق پڑھنا ہو، اس کا مطالعہ ضرور کر لیا جائے، اور مطالعہ مشکل کوئی کام نہیں، کیونکہ مطالعہ کا مقصود صرف یہ ہے: معلومات اور مجہولات متمیز ہو جائیں، بس اس سے زیادہ کاوش نہ کرے، دوم پھر سبق کو استاد سے اچھی طرح سمجھ کر پڑھ لے، بلا سمجھے آگے نہ چلے، اگر اس وقت استاد کی طبیعت حاضر نہیں، تو کسی دوسرے کسی وقت سمجھ لے، سوم اس کے بعد ایک بار خود بھی مطلب کی تقریر کرے، بس ان تینوں التزامات کے بعد پھر بے فکر رہے، چاہے یاد رہے یا نہ رہے، ان شاء اللہ استعداد ضرور پیدا ہو جائے گی، یہ تینوں باتیں تو درجہ وجوب میں ہیں اور ایک بات درجہ استحباب میں ہے، وہ یہ ہے کہ کچھ آموختہ بھی روزانہ دہرا لیا کرے۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا انگریزی زبان کے تعلق سے یہ خیال اور مشاہدہ تھا کہ انگریزی زبان کی تعلیم کے بعد لوگوں پر انگریزی تہذیب کا اثر غالب ہو جاتا ہے، اور لوگ دین کے فرائض سے بھی غافل ہو جاتے ہیں چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

آج کل تعلیم جدید کے متعلق علما پر اعتراضات کیا جاتا ہے کہ یہ تعلیم جدید سے روکتے ہیں، حالانکہ میں کہتا ہوں کہ اگر تعلیم جدید کے یہ آثار نہ ہوتے جو علی العموم اس وقت اس پر مرتب ہو رہے ہیں، تو علما ہر گز اس سے منع نہ کرتے۔

ایک مجلس میں آپ نے ارشاد فرمایا: انگریزی تعلیم سے مسلمانوں کے عقائد متاثر ہو رہے ہیں، جس سے ان کے ایمان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

البتہ جب مولانا کو انگریزی تعلیم کی افادیت کا اندازہ ہوا، تو آپ نے انگریزی تعلیم کے حصول کے لئے تین چیزوں کو ضروری قرار دیا:

1. اول اپنے مذہب کی تعلیم حاصل کرو، کسی عالم کے مشورہ سے کورس مقرر کرو۔
2. دوسرے علما کی صحبت میں آمد و رفت کو۔
3. تیسرے غیر جنس کی کتابوں سے احتراز کرو اور علما حقانی کی کتابیں مطالعہ میں رکھو۔

21.2.4 خواتین کی تعلیم سے متعلق مولانا کا نقطہ نظر

مولانا اشرف علی تھانوی عورتوں کی تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں: میں عورتوں کی تعلیم کا مخالف نہیں، مگر اس تعلیم کا ضرور مخالف ہوں جو یہ لوگ عورتوں کو دیتے ہیں۔

چنانچہ آپ نے عورتوں کی تعلیم کے مقصد سے بہشتی زیور لکھا، جس میں زندگی کے ان تمام شعبوں سے متعلق احکام و مسائل لکھے،

جن کا جاننا عورتوں کے لئے بے حد ضروری ہے، اس کتاب میں مولانا نے احکام و مسائل کے علاوہ اسلامی تاریخ، خانگی امور اور طبابت جیسے موضوعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

نیز مولانا نے کتاب کے شروع میں خوش خط لکھنے کے قواعد کے ساتھ خطوط نویسی کے آداب بھی لکھے ہیں۔

البتہ مولانا اشرف علی تھانوی مغربی تہذیب کی تعلیم و تعلم کو مرد و عورتوں کے لئے یکساں طور پر مضر سمجھتے تھے۔

عورتوں کے پردہ کے تعلق سے مولانا کا نقطہ نظر یہ تھا کہ پردہ عورتوں کی تعلیم و ترقی کے لئے رکاوٹ کے بجائے مدد گار اور معاون ہے، آپ فرماتے تھے:

تعلیم یافتہ ہونے یا غیر تعلیم یافتہ ہونے میں پردہ یا بے پردگی کو کوئی دخل نہیں، بلکہ اس میں بڑا دخل توجہ کو ہے، اگر کسی قوم کو عورتوں کی تعلیم پر توجہ ہو تو وہ پردے میں بھی تعلیم دے سکتے ہیں، ورنہ بے پردگی میں بھی کچھ نہیں ہو سکتا، بلکہ غور کیا جائے تو پردہ میں تعلیم زیادہ ہو سکتی ہے، کیونکہ تعلیم کے لئے یکسوئی اور اجتماع خیال کی ضرورت ہے، اور وہ گوشہ تنہائی میں زیادہ حاصل ہوتی ہے۔

21.2.5 مولانا اشرف علی تھانوی کا سیاست سے متعلق نقطہ نظر

اسلام نے جس طرح زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق ہدایات دی ہیں اور اصول وضابطے مقرر کیے ہیں۔ سیاست سے متعلق بھی اصول مقرر کیے ہیں اور بعض معاملات سے متعلق تو تفصیلی ہدایت دی ہیں۔ سیاست اور شریعت کے تعلق سے مولانا اشرف علی تھانوی کا نقطہ نظر یہ تھا کہ شریعت اور سیاست کے درمیان تلازم ہے، دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا ہے، آپ فرماتے ہیں:

جس طرح طریقت کو شریعت سے الگ نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح شریعت اور سیاست کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اللہ تعالی کے احکام کو نافذ کرنے میں حکومت معاون ہوتی ہے۔

آپ فرماتے ہیں: ”حکومت کو فروغ دین سہل ہے“۔

البتہ آپ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ حکومت اسلام کا مقصد نہیں ہے، بلکہ حکومت دین کے احکام کے نفاذ کا وسیلہ ہے، مولانا فرماتے ہیں: دیانات مقصود بالذات ہے اور سیاست وجہاد مقصود اصلی نہیں ہے۔

21.2.6 تصوف سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی کا نقطہ نظر

تصوف سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ تصوف شریعت کا پانچواں جز ہے، آپ فرماتے ہیں:

”شریعت“ کے پانچ اجزاء ہیں، پانچواں جز تصوف ہے، جسے شریعت میں اصلاح نفس کہتے ہیں، آج کل لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تصوف کے لیے بیوی، بچوں اور دوسری دنیاوی امور کو چھوڑنا پڑتا ہے، یہ بالکل غلط ہے، یہ جاہل صوفیوں کا مسئلہ ہے، جو تصوف کی حقیقت کو نہیں جانتے۔

تصوف کے سلسلے میں آپ کے اس قول سے بھی آپ کے نقطہ نظر کی وضاحت ہوتی ہے، فرماتے ہیں:

حقیقت تصوف کی صرف علم بالعمل ہے اور عمل وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمایا ہے اور جو سالک کے اختیار میں ہے، اس کے علاوہ سب چیزیں زائد ہیں۔

ایک جگہ آپ فرماتے ہیں: تصوف کوئی نئی چیز نہیں ہے، بلکہ یہی نماز، روزہ تصوف ہے، اور یہی اعمال مقصود ہیں، مجاہدہ کی ضرورت صرف نماز روزہ کو نماز روزہ بنانے کے لئے ہے،۔

ایک جگہ آپ فرماتے ہیں: تصوف کا خلاصہ صرف علم مع العمل ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی کی تحریروں سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ تصوف مولانا کے نزدیک شریعت پر عمل ہی کا نام ہے۔

تصوف کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں:

تصوف کا مقصد نفس کی اصلاح اور دل کی صفائی ہے، لیکن بعد میں تصوف میں باہر سے اتنی چیزیں آگئی ہیں کہ تصوف کا مقصد پس پردہ چلا گیا ہے۔

تصوف کے مقاصد پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:

اصل مقصد حق تعالی کو راضی کرنا ہے، جس کا ذریعہ ہے شریعت کے حکموں پر پورے طور سے چلنا، ان حکموں سے بعض متعلق ظاہر کے ہیں، جیسے نماز، روزہ، حج، زکوۃ........ اور بعض متعلق باطن کے ہیں، جیسے خدا سے محبت رکھنا، خدا سے ڈرنا، خدا کو یاد رکھنا، دنیا سے محبت نہ ہونا، خدا کی مشیت پر راضی رہنا، حرص نہ کرنا، عبادت میں دل کا حاضر رکھنا، دین کے کاموں کو اخلاص سے کرنا، کسی کو حقیر نہ سمجھنا، خود پسندی نہ کرنا، غصہ کو ضبط کرنا، وغیرہ اس اخلاق کو سلوک کہتے ہیں۔

مولانا کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک تصوف ان کیفیات کو پیدا کرنے کا نام ہے، جن کو قرآن نے تزکیہ سے تعبیر کیا ہے اور احادیث میں احسان، زہد اور رقاق جیسے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

صوفیا سلوک کی راہ طے کرنے اور باطن کی اصلاح کے لئے بیعت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ بیعت کا مطلب ہے عہد وپیماں یعنی باطن کی اصلاح کا طالب کسی مرشد کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے اور عہد وپیمان کرتا ہے کہ وہ فرائض کی ادئیگی کی پوری کوشش کرے گا اور حرام چیزوں سے اجتناب کرے گا، یہی بیعت کی اصل اور روح ہے۔

کتب احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام بھی اس طرح کی بیعت کیا کرتے تھے، چنانچہ بخاری شریف میں ہے کہ حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی فرماتے ہیں: میں نے نماز کے قائم کرنے، زکاۃ کے ادا کرنے اور ہر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کرنے پر حضرت محمد ﷺ سے بیعت کی۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا بھی نقطہ نظریہ ہے کہ تصوف میں بیعت ضروری ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ یہ یقین صحیح ہے کہ بیعت طریقت کی ضرورت عام نہیں ہے، لیکن اس میں دھوکہ ہوتا ہے کہ باوجود اس

خاص حالت کے پھر بھی نفس میں بعض امراض خفیہ ہوتے ہیں کہ وہ بدون تنبیہ شیخ محقق عارف کے سمجھ میں نہیں آتا، اس لئے تعلق شیخ ہی سے ضروری ہوتا ہے۔

ایک جگہ بیعت کی ضرورت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

نفس میں کچھ امراض ہوتے ہیں، ان کا علاج کتابوں میں لکھا ہے، لیکن پھر بھی طبیب کی ضرورت ہوتی ہے، اسی درجہ نفسانی امراض کے معالجہ میں شیخ یعنی معلم کی ضرورت ہوتی ہے۔

بیعت کے لئے یہ ضروری ہے کی سلوک کا طالب کسی ایسے مرشد کا انتخاب کرے جو کامل ہو۔

مولانا مرشد کامل کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

تو پہچان اس کی یہ ہے کہ وہ شریعت کا ضروری علم رکھتا ہو، کسی شیخ کامل کی تربیت کے خلاف پر اصرار نہ کرتا ہو، سنت کا پابند ہو، اپنے متعلقین پر شفقت کرتا ہو، احتساب میں کمی نہ کرتا ہو، جس میں یہ سب باتیں جمع ہوں وہ کامل ہے۔

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے نزدیک بیعت شیخ کامل کے ہاتھوں پر ہی کی جاسکتی ہے، اور شیخ کامل کے لئے ضروری ہے کہ دین کے ضروری احکام سے واقف ہو اور اپنے مریدوں کا احتساب بھی کرتا ہو اور غلط باتوں پر تنبیہ بھی کرتا ہو۔

21.2.7 مولانا اشرف علی تھانوی اور اجتہاد و تقلید

اسلام ایک آفاقی اور عالمگیر مذہب ہے، جو رہتی دنیا تک پوری دنیا کے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن وحدیث کے نصوص محدود ہیں، جب کہ روز بروز پیدا ہونے والے مسائل غیر محدود، اس لئے اجتہاد کا جاری رہنا اور ہر نو پید مسائل کو حل کرنے کے لئے اجتہاد کرنا ایک ضروری امر ہے۔ البتہ ان اصول و قواعد کی اتباع کرنا ضروری ہے، جو سلف صالحین اور ائمہ کرام سے منقول ہو، تاکہ انسان نفس کی خواہشات اور سہولت پسندی سے محفوظ رہتے ہوئے احکام کی پابندی کرے۔

اجتہاد کا مفہوم:

اجتہاد کا لفظ جہد سے مشتق ہے، جس کے معنی مشقت و کلفت کے ہیں۔ اس لئے کسی ایسے کام میں پوری پوری کوشش صرف کرنے کو اجتہاد کہتے ہیں، جس میں مشقت و کلفت ہو۔

شریعت کی اصطلاح میں اجتہاد یہ ہے کہ احکام شرعیہ کی تحقیق کے لئے وہ آخری درجہ کی سعی کی جائے کہ بظاہر اس سے زیادہ سعی اور کوشش ممکن نہ ہو۔

تقلید کا مفہوم:

تقلید لغت میں قلادہ ڈالنے کو کہتے ہیں، اونٹ کے گلے میں قربانی کے لیے جو علامت کے طور پر پٹہ ڈالا جاتا ہے، اس کو بھی تقلید کہا جاتا ہے۔

شریعت کی اصطلاح میں تقلید اس شخص کی بات کو دلیل وحجت طلب کیے بغیر مان لینے کا نام ہے، جس کی رائے بذات خود حجت شرعی نہیں ہے۔اس تعریف کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی کے علاوہ کسی شخص کی بات کو دلیل طلب کیے بغیر تسلیم کر لینے کو تقلید کہتے ہیں۔

چنانچہ مولانا اشرف علی تھانوی نے اجتہاد اور تقلید دونوں پر ہی گفتگو کی ہے، اور اعتدال کا راستہ اپنایا ہے۔

چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

اجتہاد سے جس طرح حکم کا استنباط جائز ہے، اسی طرح اجتہاد سے حدیث کو معلل سمجھ کر مقتضائے علت پر عمل کرنا، جس کا حاصل احکام وصفیہ کا تعین ہے، مثل احکام تکلیفیہ کے یا احد الوجوہ پر محمول کرنا یا مطلق کو مقید کر لینا اور ظاہر الفاظ پر عمل نہ کرنا حدیث کی مخالفت یا ترک نہیں ہے، اس لئے ایسا اجتہاد بھی جائز ہے، اور ایسے اجتہاد کی تقلید بھی جائز ہے.

مولانا اشرف علی تھانوی کے اس اقتباس سے درج ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

1. قرآن وحدیث کے نصوص میں اجتہاد اور غور وفکر کر کے حکم معلوم کرنا اور حکم کا استنباط کرنا جائز ہے۔
2. اجتہاد اور غور وفکر کر کے علت نکالنا اور اس علت کے مطابق حکم معلوم کر کے اس پر عمل کرنا جائز ہے۔
3. اور اس علت کے مطابق فرض، واجب، سنت حرام یا مکروہ کا حکم لگانا یا کسی حدیث کا حکم مطلق ہے تو اس کو مقید کرنا یا علت کی وجہ سے نصوص قرآن وحدیث کے ظاہری معنی پر عمل نہ کرنا یہ سب جائز ہیں، اسی طرح اس کی تقلید کرنا بھی جائز ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنی کتاب الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد میں مختلف احادیث سے دلائل بھی ذکر کئے ہیں اور اپنے نقطہ نظر کو ثابت کیا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں: حکم غیر منصوص محتمل وجوہ مختلفہ میں مجتہد کے لیے اجتہاد اور غیر مجتہد کے لیے تقلید جائز ہے۔
مولانا اشرف علی تھانوی نے تقلید کے جائز ہونے پر متعدد احادیث سے استدلال کیا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی تقلید کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: کسی کا قول محض اس حسن ظن پر مان لینا کہ یہ دلیل کے موافق بتلائے گا اور اس سے دلیل کی تحقیق نہ کرنا۔

تقلید کے جواز پر مولانا نے صحابی کے عمل سے استدلال کیا ہے، مولانا فرماتے ہیں:

سلیمان بن یسار سے روایت ہے کہ حضرت ابو ایوب انصاری حج کے لیے نکلے، جس وقت مکہ کی راہ میں جنگل میں پہنچے تو اونٹنیاں کھو بیٹھے اور یوم النحر میں جب کہ حج ہو چکا تھا، حضرت عمر کے پاس آئے اور یہ سارا قصہ بیان کیا، آپ نے فرمایا: جو عمرہ والے کیا کرتے ہیں، اب تم بھی وہی کرو۔

مولانا اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو صحابہ اجتہاد نہ کر سکتے تھے وہ مجتہدین صحابہ کی

تقلید کرتے تھے۔

اجتہاد پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا اشرف تھانوی لکھتے ہیں: جس شخص کو قوت اجتہاد حاصل نہ ہو اس کو اجتہاد کرنے کی اجازت نہیں اور ممکن ہے کہ ایک شخص حافظ حدیث ہو اور مجتہد نہ ہو۔

مولانا نے اپنے اس قول کی تائید میں حضرت عدی بن حاتم کی حدیث نقل کی ہے کہ آپ نے حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ۔ کی عام تفسیر کرتے ہوئے ایک ڈورا سفید ایک ڈوراسیاہ لے کر رکھ لیا۔

اس پوری حدیث کو نقل کرنے کے بعد مولانا لکھتے ہیں: باوجودیکہ یہ صحابی اہل زبان تھے، مگر بوجہ قوت اجتہاد نہ ہونے کے فہم مراد قرآن میں غلطی کی، کیونکہ ان کی غلطی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعنوان مزاح انکار فرمایا۔

تقلید شخصی پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا اشرف علی لکھتے ہیں: تقلید شخصی ثابت ہے۔ آگے مزید لکھتے ہیں: اس زمانے میں بہ اعتبار غالب حالات لوگوں کے تقلید شخصی ضروری ہے۔ اور آگے ضروری کی تشریح وجوب سے کی ہے، مطلب یہ ہے کہ مولانا اشرف علی کے نزدیک تقلید شخصی واجب ہے۔

تقلید میں افراط و تفریط درست نہیں ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا نقطہ نظریہ ہے کہ جس طرح تقلید کا انکار قابل ملامت ہے، اسی طرح اس میں غلو و جمود بھی موجب مذمت ہے۔ تقلید میں افراط و تفریط کی وضاحت مولانا کرتے ہوئے فرماتے ہیں: تقلید مجتہد کی اس کو شارح و بانی احکام سمجھ کر نہیں کی جاتی بلکہ اس کو مبین احکام اور موضع شرائع و مظہر مراد اللہ و رسول اللہ اعتقاد کرکے کی جاتی ہے، پس جب تک کوئی امر منافی ورافع اس اعتقاد کا نہ پایا جائے گا اس وقت تک تقلید کی جاوے گی اور جس مسئلہ میں کسی عالم وسیع النظر، ذکی الفہم، منصف مزاج کو اپنی تحقیق سے یا کسی عامی کو کسی ایسے عالم سے بشرطیکہ متقی بھی ہو بشہادت قلب معلوم ہو جاوے کہ اس مسئلہ میں راجح دوسری جانب ہے تو دیکھنا چاہیے کہ اس مرجوح جانب میں بھی دلیل شرعی سے عمل کی گنجائش ہے یا نہیں؟ اگر گنجائش ہو تو ایسے موقع پر جہاں احتمال فتنہ و تشویش عوام کا ہو اور مسلمانوں کو تفریق کلمہ سے بچانے کے لیے اولی یہی ہے کہ اس مرجوح جانب پر عمل کرے۔

مولانا اشرف علی تھانوی کی اس تحریر سے درج ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

کسی مجتہد کی تقلید اس لیے نہیں کی جاتی کہ وہ مجتہد نبی ہے، یا شریعت سازی کا اس کو اختیار حاصل ہے، بلکہ اس اعتقاد سے کی جاتی ہے کہ اللہ نے یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکم دیا ہے مجتہد اس کو بیان کرنے والا اور واضح کرنے والا ہے۔

اگر کسی عالم کو جو وسیع النظر ہو، معلوم ہو کے کسی مسئلہ میں مجتہد کے قول کے بالمقابل دوسرا قول راجح ہے تو بھی اگر مجتہد کے قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہے تو مجتہد ہی کے قول پر عمل کیا جائے گا، تاکہ فتنہ پیدا نہ ہو اور عوام تشویش میں مبتلا نہ ہو۔

21.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- دور جدید کے ایک عظیم مفکر و مصلح کے حالات زندگی اور مختلف میدانوں میں ان کی خدمات سے واقف ہوئے۔
- تعلیم سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی کے نظریات سے آپ واقف ہوئے کہ تعلیم کا مقصد آدمی بنانا ہے کہ اس سے کسی کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے، اور نیک اور صالح معاشرہ کا قیام ہو سکے۔ نیز معلم کو چاہئے کہ دوران تعلیم طالب علم کے نفسیات کا خیال رکھے، اور آپ اس بات سے بھی واقف ہوئے کہ مولانا عورتوں کی تعلیم کے مخالف نہیں ہیں، اور نہ پردہ کو تعلیم کے لئے رکاوٹ سمجھتے ہیں، بلکہ مولانا کا خیال یہ ہے کہ پردہ تعلیم کے لئے معاون ہے، کیوں کہ پردہ سے یکسوئی حاصل ہوتی ہے۔
- آپ مزید اس بات سے بھی واقف ہوئے کہ مولانا اشرف علی تھانوی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ سیاست دین سے الگ کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ دین کا ایک حصہ ہے، نیز مولانا کا خیال یہ بھی ہے کہ حکمرانوں کے لئے دین کا فروغ اور اس کی اشاعت سہل ہے
- اسی طرح آپ اس سے بھی واقف ہوئے کہ مولانا اشرف علی تھانوی کے نزدیک تصوف شریعت کا ایک حصہ ہے۔ اور مولانا کے نزدیک تصوف کا مقصد نفس کی اصلاح اور دل کی صفائی ہے۔
- اجتہاد و تقلید کے مفہوم سے آپ واقف ہوئے۔ اجتہاد و تقلید سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی کے نقطہ نظر سے آپ واقف ہوئے کہ مولانا کے نزدیک قرآن وحدیث کے نصوص میں اجتہاد اور غور وفکر کر کے حکم معلوم کرنا اور حکم کا استنباط کرنا جائز ہے۔
- اجتہاد اور غور وفکر کر کے علت نکالنا اور اس علت کے مطابق حکم معلوم کر کے اس پر عمل کرنا جائز ہے۔ اور اس علت کے مطابق فرض، واجب، سنت حرام یا مکروہ کا حکم لگانا یا کسی حدیث کا حکم مطلق ہے تو اس کو مقید کرنا یا علت کی وجہ سے نصوص قرآن وحدیث کے ظاہری معنی پر عمل نہ کرنا یہ سب جائز ہیں، اسی طرح اس کی تقلید کرنا بھی جائز ہے۔
- جس شخص کو قوت اجتہاد حاصل نہ ہو اس کو اجتہاد کرنے کی اجازت نہیں اور ممکن ہے کہ ایک شخص حافظ حدیث ہو اور مجتہد نہ ہو۔
- مولانا اشرف علی تھانوی کے نزدیک اس زمانے میں بہ اعتبار غالب حالات لوگوں کے تقلید شخصی ضروری ہے۔

21.4 نمونہ امتحانی سوالات

21.4.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. مولانا اشرف علی تھاوی کی سن پیدائش کیا ہے؟

(a).1880 (b).1905 (c).1863 (d).1977

2. اشرف الجواب کے مصف کانام بتایئے۔

(a). ابوالاعلی مودودی (b). سرسید (c). ابوالکلام آزاد (d). اشرف علی تھانوی

3. مولانااشرف علی تھانوی خواتین کی تعلیم کے مخالف تھے۔

(a). درست ہے (b). غلط ہے

4. "حکومت کو فروغ دین سہل ہے" یہ کس کا قول ہے؟

(a). سید قطب (b). جمال الدین افغانی (c). حسین احمد مدنی (d). اشرف علی تھانوی

5. مولانااشرف علی تھانوی کن کے خلیفہ تھے؟

(a). قاسم نانوتوی (b). رشید احمد گنگوہی (c). امداداللہ مہاجر مکی (d). یعقوب نانوتوی

6. مولانااشرف علی تھانوی نے کس مدرسہ میں تدریس کے فرائض انجام دیئے؟

(a). مدرسہ فیض عام کانپور (b). دارالعلوم دیوبند (c). دارالعلوم ندوۃ العلما (d). مدرسہ امینیہ دہلی

7. مولانااشرف علی تھانوی کے نزدیک تعلیم کا مقصد کیاہے؟

(a). مہذب شہری بنانا (b). انسان کو آدمی بنانا (c). حکومت کے اہل بنانا (d). ان میں سے کوئی نہیں

8. مولانااشرف علی تھانوی تعلیم کے لیے پردہ کو رکاوٹ سمجھتے تھے؟

(a). صحیح (b). غلط

9. مولانااشرف علی تھانوی کی تاریخ وفات بتایئے۔

(a). 1970 (b). 1943 کو ہوئی (c). 2005 (d). 1920

10. مولانااشرف علی تھانوی کے نزدیک شریعت کا پانچواں جز کیاہے؟

(a). سیاست (b). معیشت (c). تصوف (d). عبادت

21.4.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. مولانااشرف علی تھانوی کی زندگی پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. صالح معاشرہ کے قیام سے آپ کیا سمجھتے ہیں، وضاحت کیجیے۔
3. خواتین کی تعلیم سے متعلق مولانااشرف علی تھانوی کا نظریہ بیان کیجیے۔
4. سیاست سے متعلق مولانااشرف علی تھانوی کا نظریہ بیان کیجیے۔

5. تصوف سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی کے نقطہ نظر کی وضاحت کیجیے۔

21.4.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. مولانا اشرف علی تھانوی کی حیات و خدمات پر ایک مضمون لکھیے۔
2. تعلیم سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی کے فکر و نظر سے بحث کیجیے۔
3. تصوف اور سیاست سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی کے نقطہ نظر پر ایک مضمون لکھیے۔

21.5 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.	اشرف السوانح	:	عزیز الحسن مجذوب اور مولوی عبد الحق
2.	بیس بڑے مسلمان	:	مرتبہ مولانا عبد الرشید ارشد
3.	حکیم الامت نقوش و تاثرات	:	مولانا عبد الماجد دریابادی
4.	ڈاکٹر محمد اقبال اور مولانا اشرف علی تھانوی افکار کا تقابلی مطالعہ	:	ایم فل اقبالیات مقالہ نگار محمد یونس مینو
5.	الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد	:	مولانا اشرف علی تھانوی

اکائی 22:   محمد اقبال

اکائی کے اجزا:

22.0 تمہید

22.1 مقاصد

22.2 ڈاکٹر علامہ محمد اقبال

22.2.1 یورپ کا تعلیمی سفر

22.3 مغربی زندگی کے اقبال پر اثرات

22.4 اقبال کے سیاسی و علمی افکار

22.4.1 اقبال کا ملّی تصور

22.4.2 اقبال کے نزدیک ریاست کا تصور

22.4.3 علامہ اقبال اور تصوّف

22.4.4 اقبال کا نظریۂ تعلیم

22.5 اکتسابی نتائج

22.6 نمونہ امتحانی سوالات

22.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

22.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

22.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

22.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

22.0 تمہید

اسلام کی جس طرح سیاسی تاریخ روشن اور تابناک ہے، اسی طرح اس کی علمی اور فکری تاریخ بھی انتہائی سنہری اور شاندار رہے، اہل علم اور مفکرین کی خدمات اور کارناموں پر اسلامی تاریخ کے صفحات گواہ ہیں، علامہ محمد اقبالؒ اسلام کی اس ساڑھے چودہ سو سالہ علمی وفکری تاریخ کے وارث اور امین ہیں، وہ بنیادی طور پر ایک شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں؛ لیکن حقیقت میں شاعری ان کی تجدیدی واصلاحی خدمات کے لئے ایک وسیلہ اور ذریعہ رہے، وہ ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ایک فلسفی، مفکر، ماہر قانون اور مصلح ہیں، ان کی شاعری تعمیری اور اصلاحی ہے، ان کے سماجی، سیاسی اور تعلیمی افکار ونظریات نے کئی نسلوں کو متاثر کیا ہے اور کر رہے ہیں، ان کی شاعری میں جہاں ماضی کی شاندار روایتوں کا بصیرت مندانہ تذکرہ ہے وہیں حال کا احتساب اور مستقبل کی تعمیر کا خاکہ بھی ہے، ان کے افکار میں فکر وعمل کی دعوت ہے، ان کا پیغام جہد مسلسل، فکر ونگاہ کی وسعت اور عزم وارادہ کی بلندی ہے۔ اس اکائی میں ان کے ذاتی حالات، تعلیم وتربیت کے مراحل، اور عملی مشاغل کے تذکرہ کے ساتھ ان کی شاعری، ان کے افکار ونظریات اور خدمات پر روشنی ڈالی جائے گی۔

22.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ علامہ اقبال کے حالات، ان کی علمی وتعلیمی خدمات اور ان کے افکار ونظریات سے واقف ہوسکیں گے، اسی طرح آپ اس اکائی کے مطالعہ سے ڈاکٹر محمد اقبال کی شاعری اور اس میں موجود پیغام سے بھی آگاہ ہوپائیں گے۔

22.2 ڈاکٹر علامہ محمد اقبال

ولادت اور تعلیم وتربیت

اقبال پنجاب کے شہر سیالکوٹ میں 1877ء میں پیدا ہوئے، ان کا خاندان کشمیری برہمنوں کا خاندان تھا، دوسو سال قبل ان کے اجداد میں سے ایک فرد نے اسلام قبول کیا تھا، ان کا خاندان ایک دیندار گھرانہ تھا، ان کی ولادت سے قبل ان کے والد نے ایک خواب دیکھا تھا جس میں ان کی آئندہ کی زندگی کی کامیابیوں اور کمالات کی طرف اشارہ تھا، خود ان کے والد شیخ نور محمد ایک بزرگ اور صوفی انسان تھے، اگرچہ زیادہ مالدار نہیں تھے لیکن شہر میں اپنی مذہبی اور اخلاقی پاکیزگی کی وجہ سے قابل احترام سمجھے جاتے تھے۔

ان کے والد کا رجحان چونکہ تصوف کی جانب کافی تھا، اسی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے ایک دینی ومذہبی ماحول میں تربیت پائی، ان کے والد نے ان کی دینی تربیت میں کوئی کمی نہیں رکھی، ناظرہ قرآن کی تعلیم ملا غلام حسن کے پاس شروع ہوئی، کم عمری سے ہی ان کے اندر قرآن کی تلاوت کا شوق پیدا ہوگیا تھا اور روزانہ پابندی سے تلاوت قرآن کیا کرتے تھے، ان کی والدہ بھی ایک دیندار اور عبادت گزار خاتون تھیں، جس کا اقبال کی تربیت اور ان کے اخلاق وکردار پر بہت مثبت اثر پڑا۔

محمد اقبال کی ابتدائی تعلیم قدیم طرز پر مکتب سے شروع ہوئی، لیکن بعد میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے سیالکوٹ کے مشن

اسکول میں داخل ہوئے، شروع سے ہی ذہین اور تعلیم میں نمایاں تھے، تمام درجات کے امتحانات میں اعلیٰ نمبرات سے کامیاب ہوئے اور کئی درجات میں سرکاری وظیفہ کے ساتھ کامیابی حاصل کی، ڈاکٹر صاحب کی خوش قسمتی رہی کے اسی اسکول میں فارسی اور عربی کے مدرس مولوی میر حسن مرحوم تھے، مولوی صاحب کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے اچھے تعلیمی تعلقات قائم ہوگئے، مولوی صاحب موصوف کی شخصیت خالص علمی شخصیت تھی، ان کو عربی، فارسی اور اردو کے بے شمار اشعار یاد تھے، جنھیں وہ تعلیم کے دوران برملا پڑھا کرتے تھے، جس سے طلبہ میں اچھا خاصہ شعری ذوق پیدا ہو جاتا تھا، ادبیات ان کا خاص موضوع تھا، ڈاکٹر صاحب نے ان کی تعلیم وصحبت سے کافی فائدہ اٹھایا، ڈاکٹر اقبال کے اندر عربی وفارسی زبان کی جو صلاحیت پیدا ہوئی اور شعر وسخن کا جو ذوق پیدا ہوا وہ انہیں مولوی میر حسن مرحوم کی تعلیم اور صحبت کا نتیجہ ہے۔ اقبال بعد کو چل کر جب اردو اور فارسی میں شاعری کرنے لگے تھے تب اپنے انہیں استاد سے شاعری میں مشورہ اور اصلاح بھی لیا کرتے تھے، اقبال کی بنیادی شعری وفکری ذوق کی تشکیل اور منطق، فلسفہ اور لسانیات سے دلچسپی میں مولوی میر حسن کا بنیادی کردار رہا۔

علامہ اقبال کی اعلیٰ تعلیم

اقبال نے 1891ء میں مڈل اور 1893ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی نمبرات سے پاس کیا، جس پر انہیں تمغہ اور وظیفہ سے بھی نوازا گیا، اس وقت اسکاچ مشن اسکول میں انٹر میڈیٹ کی کلاسز بھی شروع ہو گئیں اور اس کا نام اسکاچ مشن کالج ہو گیا، اس لئے انٹر کی تعلیم انہوں نے وہیں جاری رکھی، 1895ء میں انٹر میڈیٹ کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لئے اقبال کو لاہور جانا پڑا۔

بی-اے کی ڈگری کے لئے اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا، انہوں نے انگریزی اور فلسفہ کے علاوہ عربی زبان وادب کا انتخاب کیا، اس لئے بعض کلاسز کے لئے انہیں اورینٹل کالج بھی جانا پڑتا تھا، یہ ڈگری انہوں نے 1897ء میں حاصل کی اور 1899ء میں فلسفے میں ایم-اے کیا، خوش قسمتی سے اس زمانہ میں گورنمنٹ کالج لاہور میں مسٹر آرنلڈ پروفیسر تھے، ڈاکٹر اقبال نے بی-اے اور ایم-اے میں فلسفہ کا اختیاری مضمون لیا تھا، پروفیسر آرنلڈ کی صحبت میں فلسفہ کے موضوع سے انہیں خاصی دلچسپی پیدا ہوگئی، 1904ء میں آرنلڈ ملازمت سے سبکدوش ہو کر واپس انگلستان چلے گئے تو اقبال کو اس کا بے حد افسوس ہوا، جس پر انہوں نے "نالۂ فراق" کے عنوان سے ایک نظم بھی کہی، جس میں انہوں نے اس علمی ذوق کا خاص طور پر ذکر کیا جو آرنلڈ کی صحبت میں انہیں حاصل ہوا تھا۔ اقبال نے ایم-اے کی تعلیم کے دوران ہی وکالت کا امتحان بھی پاس کرنے کی کوشش کی تھی جس میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے تھے، اور بالآخر انہیں لندن جاکر وکالت میں کامیابی حاصل ہوئی۔

شعر گوئی کا آغاز

اقبال کی طبیعت کم عمری سے ہی شعر گوئی کی طرف مائل تھی، سید میر حسن کی سرپرستی میں انہیں جو ماحول میسر آیا اس نے ان کے اندر شعر کہنے کا شوق پیدا کر دیا، میٹرک کے زمانہ سے ہی انہوں نے شاعری شروع کر دی تھی، میٹرک کے بعد وہ اپنی غزلیں رسالوں کو بھیجنے لگے، 1894ء میں ان کی ایک غزل شائع ہوئی تھی جس کا مقطع ہے

گرم ہم پر کبھی ہوتا ہے وہ بت گر اقبال　　　حضرت داغ کے اشعار سنا دیتے ہیں

غالب گمان یہ ہے کہ اقبال 1894ء کے آس پاس داغ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو چکے تھے، داغ نے حیدر آباد میں اصلاح سخن کا دفتر قائم کرر کھا تھا جس کا باقاعدہ عملہ تھا اور ڈاک سے موصول ہونے والی غزلیں اصلاح دے کر واپس بھیجی جاتی تھیں، اقبال نے دوری کے باوجود داغ سے فیض اٹھایا اور 1896ء میں تو انہوں نے اس تعلق کا فخر کے ساتھ ذکر کیا

مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخن داں کا

اقبال اپنے استاد داغ سے ملاقات کا شوق رکھتے تھے مگر کبھی ملاقات ہو نہ سکی۔

کچھ عرصہ کے بعد علامہ اقبال جب اعلیٰ تعلیم کے لئے لاہور پہنچے تو اس علمی ادبی مرکز میں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو ابھرنے اور تربیت پانے کا سنہری موقع ہاتھ آیا، یہاں جگہ جگہ شعر و شاعری کی محفلوں کا چرچا تھا، مرزا ارشد گورگانی دہلوی اور میر ناظم لکھنوی جیسے پختہ کلام اور استادی کا مرتبہ رکھنے والے شاعر یہاں موجود تھے اور ان اساتذہ شعر نے ایک مشاعرے کا سلسلہ شروع کیا تھا، جو ہر ماہ بازارِ حکیماں میں منعقد ہوتا رہا، اقبال بھی اپنے شاعرانہ ذوق کی تسکین کی خاطر اس مشاعرے میں شریک ہونے لگے، اس طرح مرزا ارشد گورگانی سے وہ بحیثیت شاعر کے متعارف ہوئے اور رفتہ رفتہ انہوں نے مرزا صاحب سے اپنے شعروں پر اصلاح بھی لینی شروع کر دی، اس زمانہ میں وہ صرف غزلیں کہا کرتے تھے۔ اور یہ غزلیں چھوٹی بحروں میں سادہ، خیالات کا اظہار لئے ہوئی تھیں، البتہ شوخی اور بے ساختہ پن سے اقبال کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اظہار ضرور ہو جاتا تھا، بازار حکیماں کے ایک مشاعرے میں انہی دنوں اقبال نے ایک غزل پڑھی جس کا ایک شعر یہ تھا

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے　　　قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اس شعر کا سننا تھا کہ محفل مشاعرہ میں موجود سخن سنج اصحاب پھڑک اُٹھے اور مرزا ارشد گورگانی نے اسی وقت پیشن گوئی کی کہ اقبال مستقبل کے عظیم شعراء میں سے ہوں گے۔

شاعری کی شہرت

اقبال کی شاعری کا چرچا شروع شروع میں بازار حکیماں کے مشاعروں تک محدود تھا، یا پھر لاہور کے کالجوں کی ادبی مجالس میں انہیں شاعر کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا، لیکن زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ شہر کی ادبی مجالس میں انہیں ایک خوش گو اور خوش فکر نوجوان شاعر کی حیثیت سے پہنچانا جانے لگا، انہی دنوں انہوں نے غزل کے ساتھ ساتھ نظم پر بھی توجہ کی، ایک ادبی مجلس میں انہوں نے اپنی اولین نظم "ہمالہ" سنائی تو اسے بہت پسند کیا گیا، چنانچہ اقبال کی یہ پہلی تخلیق تھی جو اشاعت پذیر ہوئی، شیخ عبد القادر نے اسی زمانہ میں اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لئے اپنا پہلا مشہور رسالہ "مخزن" جاری کیا تھا- اس کے پہلے شمارے میں اپریل 1901ء میں اقبال کی یہ نظم شائع ہوئی یہ گویا ان کی باقاعدہ شاعری کا آغاز تھا، ان کے پہلے مجموعہ کلام "بانگ درا" کی اولین نظم یہی ہے، اور اسی نظم کے چھپنے کے بعد ان کی شہرت روز بروز پھیلتی چلی گئی۔

جب اقبال انجمن حمایت اسلام کے بڑے بڑے جلسوں میں نظمیں پڑھنے لگے تو ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی، 1900ء کے

جلسے میں اقبال نے نظم "نالۂ یتیم" اپنے مخصوص انداز میں پڑھی اور سامعین پر سحر طاری کردیا، 1904ء کے اجلاس میں اقبال نے نظم "تصویر درد" پڑھی تو حالی نے دس روپے بطور انعام کے دیئے، نظم کے اختتام پر خواجہ حسن نظامی ایسے بے اختیار ہوئے کہ انہوں نے اپنا عمامہ اقبال کے سر پر رکھ دیا۔

مسٹر آرنلڈ کی تعلیم و تربیت اور ان کی صحبت کے نتیجہ میں علامہ اقبال کے اندر اعلی تعلیم کا جو شوق پیدا ہوا تھا وہ بڑھتا ہی رہا، جس کی تکمیل کے لئے وہ خود یورپ جانا چاہتے تھے، لیکن ایم-اے ہونے کے بعد وہ پہلے اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ، فلسفہ اور سیاست مدن کے لکچرار مقرر ہوئے، پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے، تین سال کی اس تدریس کے بعد یورپ میں اعلی تعلیم کے حصول کی خواہش میں لکچررشپ سے استعفی دے دیا۔

22.2.1 یورپ کا تعلیمی سفر

1905ء میں ملازمت سے رخصت لیکر انگلستان کا رخ کیا، وہاں پہنچ کر کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا، وہاں ان کی ملاقات میک ٹگارٹ جیسے فلسفی سے ہوئی جو اس زمانہ میں فلسفی کی حیثیت سے بے حد شہرت حاصل کرچکا تھا، پھر فارسی ادب کے مشہور مؤرخ اے-جی براؤن اور "اسرار خودی" کے مترجم ڈاکٹر نکلسن سے ملاقات ہوئی، میک ٹگارٹ کے لکچرز سے انہوں نے فلسفیانہ خیالات کے اظہار کا سائنٹفک انداز سیکھا، براؤن اور نکلسن سے ملاقات کا انہیں یہ فائدہ ہوا کہ انہوں نے گھر پر فارسی کا جو علم حاصل کیا تھا اس میں پختگی آگئی۔ کیمبرج میں ان کا زیادہ تعلق پروفیسر وارڈ سالے اور پروفیسر براؤن سے رہا، کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفۂ اخلاق میں اور میونخ یونیورسٹی جرمنی سے "میٹافزکس آف پرشیا" یعنی ایرانی الٰہیات پر ایک مقالہ لکھ کر پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی، پھر جرمنی سے واپس آکر لندن میں بیرسٹری کے امتحان کی تیاری میں مصروف ہوگئے اور بیرسٹر بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، 6 مہینے تک لندن یونیورسٹی میں پروفیسر آرنلڈ کے قائم مقام کی حیثیت سے عربی کے لکچرار بھی رہے، اور اس زمانہ میں وہاں اقبال نے تقریر و خطابت کا مشغلہ بھی جاری رکھا، عام خطابات اور تقریروں کے علاوہ انہوں نے خصوصیت کے ساتھ اسلام کی علمی و ثقافتی تاریخ پر بھی لکچرز دیئے، پھر سیاسیات واقتصادیات میں امتیاز پیدا کرنے بعد 1908ء میں وطن واپس ہوئے۔

22.3 مغربی زندگی کے اقبال پر اثرات

اقبال فلسفیانہ دماغ رکھتے تھے، غور و فکر ان کا مزاج تھا، انہوں نے یورپ کے بے باک رنگین ماحول، آزاد فضاؤں اور مخلوط سماج میں وقت گزارا، لیکن اپنی بنیادی فکر اور تربیت کو کبھی فراموش نہیں کیا، آزادی کی بے راہ روی، مخلوط معاشرے کی تباہ کاریاں، وطنی قومیت کی خود غرضیاں کھلی آنکھوں دیکھیں، اقبال نے فرنگی تہذیب کی بنیادی کمزوریوں، اس کے دبتے ہوئے پہلوؤں اور اس عنصری فساد اور بگاڑ کو دیکھ لیا تھا، جو اس کی طبیعت اور بنیاد میں موجود ہے، انہوں نے دیکھا کہ مغربی تہذیب سے متاثر ذہن مذہب اور اخلاقی وروحانی اقدار کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہے، انہوں نے فساد قلب و نظر کو اس تہذیب کی روح کی ناپاکی کا ثمر بتایا ہے، جس نے اس سے قلب سلیم کی دولت چھین

لی:

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب　　　　کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید　　　　ضمیر پاک وخیال بلند وذوقِ لطیف

وطنی قومیت سے سرشار اقبال کا اب نشہَ قومیت اتر چکا تھا، اسلامی اخوت اور ملی قومیت نے وطنی قومیت کی جگہ لے لی تھی، جغرافیائی اتحاد کے بجائے اسلامی وحدت ان کا نصب العین بن چکی تھی، اسلام کے معاشرتی قانون اور اسلام کا شخصی کردار اس کی فکر کا حصہ بن چکے تھے، ایسے تمام انفرادی اور معاشرتی تصورات سے وہ دل برداشتہ ہوگئے تھے جو انسانی سعی و عمل کی راہ میں حائل ہوسکتے ہیں، کشمکش حیات میں فکری اور عملی کارکردگی کے حامی تھے، غرض یہ کہ یورپ کے مطالعے نے ان کے دل ودماغ اور فکر و نظر میں ایک مثبت انقلاب پیدا کر دیا تھا۔

اس دور مادیت اور مغربی تہذیب وتمدن کی ظاہری چمک دمک سے اقبال کی آنکھیں خیرہ نہ ہوسکیں، حالانکہ اقبال نے یورپ کے مذہب بیزار اور آزاد ماحول میں وقت گزارا، اس کی وجہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اقبال کی وہی والہانہ محبت، جذبہَ عشق اور روحانی وابستگی تھی، اور بلاشبہ ایک حب صادق اور عشق حقیقی ہی قلب و نظر کے لئے ایک اچھا محافظ اور پاسبان بن سکتا ہے، اقبال کا یہ شعر اس سلسلہ میں بہت ممتاز ہے:

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے　　　　غبارِ راہ کو بخشا فروغ وادی سینا

مغربی تہذیب کے بارے میں کہتے ہیں:

خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوہَ دانش فرنگ　　　　سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

عذابِ دانش حاضر سے باخبر ہوں میں　　　　کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

یورپ سے واپسی کے بعد اقبال سیالکوٹ سے لاہور منتقل ہوگئے اور وہاں عملی زندگی کا آغاز کیا، وکالت شروع کرنے کے بعد انہیں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ سے فلسفے کی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے تاریخ کی لکچر رشپ کی پیش کش ہوئی مگر انہوں نے قبول نہیں کیا، اسی سال دوبارہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے استاد کی ضرورت پیش آئی تو اقبال نے یہ ذمہ داری قبول کرلی، لیکن اس کے ساتھ وکالت بھی جاری رکھی۔ اسی طرح مختلف یونیورسٹیوں اور تعلیمی و تحقیقی اداروں کے لئے اپنی خدمات دیتے رہے، اور شاعری بھی جاری رکھی۔ ان کے اکثر اوقات غور وفکر، تصنیف یا شاعری میں صرف ہوتے تھے، وہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے، اسی کے ایک جلسہ میں انہوں نے "شکوہ" اور دوسرے جلسہ میں "جوابِ شکوہ" پڑھی جو ایک قومی نظم کی حیثیت اختیار کرگئی اور جسے بے مثال مقبولیت ملی، انہی دنوں آپ نے "ترانہَ ہندی" اور "ترانہَ ملی" لکھا، دونوں ترانوں کو خوب شہرت حاصل ہوئی اور دونوں قومی اور ملی محفلوں کے افتتاح کے لئے قومی ترانہ سمجھے جانے لگے۔

سر کا خطاب

شاعری میں علامہ اقبال کی شہرت پہلے ہی سے تھی اور اب یہ شہرت اور بھی زیادہ ہو گئی تھی، البتہ اس کا دائرہ صرف ہندوستان تک محدود تھا، لیکن یورپ سے واپس آنے کے بعد انہوں نے اپنی شاعری کا رخ بالکل بدل دیا، پہلے وہ اپنے وطن کی زبان اردو میں عام قومی اور وطنی نظمیں لکھا کرتے تھے لیکن اب انہوں نے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی شاعری شروع کر دی، اور اس سلسلے میں سب سے پہلے ایک فلسفیانہ مثنوی ''اسرار خودی'' لکھی، جو 1915ء میں شائع ہوئی اور اس مثنوی کے لکھنے کے بعد انہوں نے ایک فلسفی شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی لیکن ہندوستان اور یورپ پر اس مثنوی کا اثر مختلف پڑا، اس مثنوی میں اقبال نے خودی کی تربیت اور تکمیل کے اصول بتائے اور جو فلسفہ یا تعلیم خودی کو ضعیف کرنے والی تھی اس کی تردید کی تھی، بطور خاص انگلستان میں اس مثنوی کو نہایت مقبولیت حاصل ہوئی اور 1918ء میں پروفیسر نکلسن نے جو اس سے پہلے دیوان شمس تبریز اور کشف المحجوب کا انگریزی ترجمہ کر چکے تھے، اقبال سے اس مثنوی کے ترجمہ کرنے کی اجازت چاہی اور اجازت کے بعد 1919ء میں جب یہ ترجمہ شائع ہوا تو غالباً پہلی بار مغربی دنیا اقبال کے خیالات سے واقف ہوئی اور بہت سے انگریز اہل علم نے ان کی طرف توجہ کی، مشہور نقاد ادب مسٹر اے-ایم فارسٹر نے انگلستان کے نامور ادبی رسالہ اتھینیم میں اس پر ایک مفصل تبصرہ کیا، اسی طرح کیمبرج کے پروفیسر ڈکسن نے رسالہ نیشن ویکلی میں اس مثنوی پر تبصرہ لکھا۔

اسی ترجمہ اور اس پر تبصروں سے اقبال کو یورپ میں جو شہرت حاصل ہوئی انگریزی گورنمنٹ پر بھی اس کا اثر پڑا اور اس نے جنوری 1923ء میں ان کو سر کا خطاب عطا کیا۔

22.4 اقبال کے سیاسی و علمی افکار

22.4.1 اقبال کا ملّی تصور

علامہ اقبال فرد کو قطرہ سے اور قوم کو دریا سے تشبیہ دیتے ہیں، اس لیے ان کے نزدیک قوم میں دریا ہی کی طرح وسعت بھی ہونی چاہئے، اور یہ وسعت صرف اس طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ قومیت کی بنیاد روحانی اصول پر قائم کی جائے، لیکن موجودہ دور میں ملک و نسب اور رنگ وروپ کے امتیازات کی بنا پر قومیت کا جو محدود نظریہ قائم کیا گیا ہے وہ وطنیت کے جغرافیائی حد بندی کے مادی تخیل سے پیدا ہوا ہے اس لیے اس نے دنیا کے سامنے ایک مادی بت کھڑا کر دیا ہے، جس کی پرستش دنیا کی تمام قومیں کر رہی ہیں اور دنیا کی تمام قوموں کے ساتھ مسلمان بھی اس غیر اسلامی تصور کے فریب کا شکار ہیں، اقبال کہتے ہیں:

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور　　　ساقی نے بنالی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور　　　تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے　　　جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اقبال کی شاعری میں ملی تصور کا آغاز سفر یورپ کے بعد یعنی 1908ء سے باضابطہ شروع ہوتا ہے، جب وہ یورپ میں تھے تبھی

انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ یورپ کا جو ظاہری چہرہ ہے وہ کچھ اور ہے اور باطنی چہرہ کچھ اور ہے، قیام یورپ کے زمانہ میں ان کی شاعری میں ایک خوش آئند مگر عظیم انقلاب پیدا ہو گیا، انہوں نے مغربی تہذیب وسیاست کو بہت نزدیک سے دیکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں کے مفاسد ان پر بخوبی واضح ہو گئے، اور ان پر یہ حقیقت کھل گئی کہ یہ قومیت و وطنیت بنی آدم کے حق میں کبھی مفید نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کی بنیاد تعصب اور تنگ نظری پر ہے، اور مغربی تہذیب کی بنیاد مادیت پرستی اور خدا کے انکار پر ہے۔

اس عرصہ میں انہوں نے اسلامی اصول اور اسلامی تاریخ کا بہت غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کیا، جب انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ آئندہ اپنی شاعری کو اسلامی مقاصد کے حصول کے لیے اور امت مسلمہ کی سربلندی کے لیے وقف کر دیں گے تو قدرتی طور پر ان کی شاعری میں "پیغام" کا رنگ پیدا ہو گیا، جو 1908ء سے لیکر 1938ء تک ان کی ہر تصنیف اور ہر نظم میں نظر آتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی قوم کے اندر جوش وولولہ پیدا کرنے والی نظمیں لکھیں اور مسلمانوں کو ان کے شاندار ماضی سے آگاہ کیا، نظم صقلیہ اسی مقصد کے لئے لکھی گئی تھی، اسی طرح "بلاد اسلامیہ" کے نام سے لکھی ہوئی اپنی نظم میں قوم مسلم کی زبوں حالی اور شکست خوردگی پر آنسو بہاتے ہیں اور اس امید کا اظہار کرتے ہیں کہ اس تاریکی کے بعد صبح نو ضرور ہو گی جب اس امت کو بام عروج نصیب ہو گا۔

"ترانۂ ملّی" در اصل وطنیت(Nationalism) کے عقیدہ کی تردید ہے، پہلے اقبال پر وطن کی محبت کا تصور غالب تھا اور اسی تصور کے تحت انہوں نے "ترانۂ ہندی" نظم لکھی تھی، جب انہوں نے یورپ کا سفر کیا اور وہاں سے واپسی ہوئی اور انہوں نے یورپ میں وطنیت کے تعلق سے جو خرابیاں اور اس کی تباہ کاریاں دیکھیں تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ وطن کے نام پر لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آرہے ہیں، بالآخر وہ اس نظریہ سے رجوع کر کے خالص اسلامی نظریۂ وحدت وملیّت کی طرف مائل ہو گئے اور انہوں نے پھر "ترانۂ ملّی" کے نام سے نظم لکھی۔ اور ترانہ ہندی میں جو وطنیت کا تصور پیش کیا تھا اس کی جگہ ملیّت اور اسلامی وحدت کا نیا تصور پیش کیا، اس نظم کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا　　　مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اقبال نے اپنی اس فکر کے اظہار کے لئے متعدد نظمیں کہیں، اور مختلف عنوانات اور موضوعات کے تحت اپنی اس فکر کا اظہار کیا، ان نظموں میں سے چند اہم یہ ہیں: "وطنیت"، "شکوہ" اور "جواب شکوہ"، "خطاب بہ جوانانِ اسلام"، "غرہ شوال یا ہلال عید"، "شمع وشاعر"، "طلوع اسلام" اور "مسلم" وغیرہ۔

"حضور رسالت مآبؐ میں" ایک طرح سے بانگ درا کی جان ہے، اس نظم میں اقبال نے اپنے درد دل کا مکمل اظہار کیا ہے، مسلمانوں کے تمام دکھوں کا مداوا اس نظم میں نظر آتا ہے، تمام دنیا کے مسلمانوں کو انہوں نے ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا کہ "**إنما المؤمنون إخوة**"۔ یعنی تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، اور پوری دنیا میں بسنے والی امت ایک جسم کی مانند ہے اور اس کا ایک ایک فرد جسم کے ایک ایک عضو کی طرح ہے۔

22.4.2 اقبال کے نزدیک ریاست کا تصور

اقبال محض سیاسی مفکر ہی نہ تھے بلکہ ہندوستان کی آزاد قومی اور وطنی ریاست کی تشکیل کے لیے ملک میں جو جدوجہد ہو رہی تھی اس کے عینی شاہد، اس میں شریک اور اقلیت کے موقف کے ترجمان اور اس کے خدوخال کے تعمیری نقاد تھے، اقلیت وا کثریت کے حساس فرقہ وارانہ ماحول میں ان کی عملی سیاست کا محور بڑی حد تک مسلم اقلیت تھی، اس کا مستحکم دستوری تحفظ، مستقل اور منفرد تہذیبی وجود، باعزت زندگی، اس کے شہری اور وطنی حقوق کی حمایت ان کی سیاسی سرگرمیوں کا میدان تھے، جس میں وہ صرف راہی نہ تھے بلکہ قائد اور رہنما بھی تھے، ریاست کے متعلق ان کا اپنا خاص زاویہ نظر تھا، موجودہ ریاستوں، ان کی تشکیل کے طریقوں، ان کے مقاصد، ان کے اقتدار اور ان کے طرز حکمرانی پر انہوں نے جو نقد کیا اس کا بیشتر حصہ اپنی جگہ تعمیری اہمیت کا حامل ہے، ریاست کے قومی، اشتراکی، راسمالی، لادینی اور کلیسائی جمہوریت واستبدادیت کے نظریوں پر وقتاً فوقتاً ان کی تنقید ایک نئے نظریۂ ریاست کی تشکیل کی ضرورت کا تقاضا تھی، مسلم اکثریت کے صوبے کی ہندوستان کے وفاق میں تشکیل کی تجویز پھر اس کے حصول کی جدوجہد اسی تقاضے کا عملی جواب تھا، اقبال کی یہ نصب العینی ریاست جو عالم انسانیت کی عام فلاح وبہبود ہے، اس کی ساخت میں انہوں نے ریاست کے مختلف نظریوں کو مدغم کرنے کی کوشش کی ہے، یہ ریاست بیک وقت دینی بھی اور عہد حاضر کی دنیوی تقاضوں سے ہم آہنگ بھی، دوسرے لفظوں میں جمہوری بھی، یہ متحرک ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ بنیادی نقطوں پر جامد ہے، اس میں اخلاقی قدروں کی اپنی خاص جگہ ہے، ایک لحاظ سے یہ صرف مسلمانوں کی ملی ریاست ہے اور ایک لحاظ سے خالص انسانی اور آفاقی، اقبال کی یہ ریاست اپنے نصب العین، اپنے فرائض، اپنے طریق حکمرانی اور اپنے اصول ساخت کے اعتبار سے ''اسلامی ریاست'' ہے۔

22.4.3 علامہ اقبال اور تصوّف

اقبال کی ابتدائی تعلیم وتربیت جس ماحول میں ہوئی تھی اس کا تقاضا یہ تھا کہ تصوف اور دینی مسائل سے انہیں گہری دلچسپی پیدا ہو جاتی، یہی ہوا، اقبال میں اسلام کی محبت شروع ہی سے ایسی رچ بس گئی کہ عمر وعلم کے اضافے کے ساتھ اس میں پختگی پیدا ہوتی گئی، حتی کہ ان کی شخصیت رفتہ رفتہ ایک عظیم اسلامی مفکر کے سانچے میں ڈھل گئی، تصوف سے متاثر ہونے اور اس کی روحانی منزلوں کے قائل ہونے کے باوجود انہوں نے ایسے تصوف کے خلاف آواز بلند کی جو شریعت کی نفی کرتا ہو، یا جس سے قرآن ورسالت کے دیے ہوئے اصولوں پر ضرب پڑتی ہو، یہ حقیقت ہے کہ انہیں قرآن پاک اور آنحضرت ﷺ کی ذات مبارک سے ایسی والہانہ وابستگی تھی کہ وہ زندگی کے مسائل پر غور وفکر کرتے وقت کسی ایسی بات کی تائید نہیں کر سکتے تھے جس سے توحید ورسالت کے عقیدے سے انحراف کی صورت پیدا ہوتی ہو۔

علامہ اقبال کی شاعری میں جس صوفیانہ مسلک کے آثار ملتے ہیں، وہ رسمی یا رائج تصوف نہیں، اس کی بنیاد خالص اسلامی تصوف اور اسلام کی حرکی روح (Dynamic Sprit) پر ہے۔ چنانچہ اقبال کا سارا کلام اسی Dynamic Sprit کی تشریح اور تفسیر ہے، اور یہی اقبال کے تصوف کا امتیازی نشان ہے، اس مسلک میں اقبال نے ان صوفیا سے اکتساب فیض بھی کیا ہے، جو زندگی کے اس مثبت نظریہ کے علمبردار ہیں اور خود بھی اپنے حکیمانہ نظریات سے اس نظریہ کو تقویت دی اور پروان چڑھایا۔

اقبال تصوف کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، انہوں نے صوفیانہ ادب سے خاصا استفادہ کیا ہے، شبستری کی ''گلشن راز'' کا جواب لکھا، یہاں تک کہ جلیل القدر صوفی شاعر و مفکر رومی ہی کو اپنا روحانی پیشوا تسلیم کیا اور مشہور صوفی حسین بن منصور حلاج کو ''جاوید نامہ'' میں بڑا رتبہ عطا کیا، بعض صوفی اکابر اور ان کی ارادات روحانی سے استناد بھی کیا اور ان کی صداقت کو تسلیم کیا۔ اسلام رہبانیت کا مخالف ہے، اقبال صوفیائے کبار سے اپنی عقیدت کے باوجود جہاں کہیں فکر و نظر کا کوئی پہلو غیر اسلامی اور منافی حیات دیکھتے ہیں وہاں بے باکانہ ان کی مخالفت بھی کرتے ہیں:

دمِ عارف، نسیم صبح دم ہے　　　　اسی سے ریشہ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسر　　　　شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

اقبال عملی تصوف کے اس حصے کے منکر نہیں ہیں جس کا تعلق پاکیزگی، طہارت، حلال روزی کمانے، ریاکاری سے بچنے اور ان اخلاق وعبادات سے ہے جن کا ثبوت آنحضرت ﷺ کے عمل اور قرآن سے ملتا ہے، اقبال ان صوفیانہ تعلیمات کے خلاف تھے جو حیات کش اور عمل کی زندگی سے گریز سکھانے والی اور بے عملی کی تلقین کرنے والی تھیں۔

22.4.4　اقبال کا نظریۂ تعلیم

اقبال کو جدید تعلیم کو مذہب سے بیگانہ رکھنا گوارا نہیں تھا، الحاد سے ان کی یہ بیزاری محض دینداری کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ اس کے تحت چند فلسفیانہ تاریخی حقائق بھی پوشیدہ ہیں، زندگی محض علم کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے عمل بھی ایک ضروری چیز ہے اور انسان میں عمل کا جوش اور اس کا ولولہ صرف مذہب سے پیدا ہو سکتا ہے، اس کے علاوہ تعلیم ایک اجتماعی چیز ہے، اس کا مقصد انتشار پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ اتحاد واتفاق پیدا کرنا ہے؛ لیکن چوں کہ ملت اسلامیہ کی بنیاد دینی اور روحانی اصول پر قائم ہے اس لئے جب تک اس کی تعلیم میں دینی اور روحانی عناصر شامل نہ ہوں اس کا اجتماعی وجود قائم نہیں رہ سکتا، موجودہ تعلیم سے جو الحاد پھیل رہا ہے اس سے سخت بیزاری ظاہر کرتے ہیں:

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر　　　　لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم　　　　کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

اقبال ایسی تعلیم کی پرزور تردید کرتے ہیں جس کا مطمح نظر صرف روزگار اور وسائل معاش کا حصول ہو، جس سے انسان میں زندگی کے بلند عزائم اور اعلی مقاصد پیدا نہ ہوتے ہوں، اقبال کی یہ سنجیدہ رائے ہے کہ تعلیم جدید نے نئی نسل کی صرف عقلی اور ظاہری تربیت سے اعتناء اور قلب وروح کی نشو ونما، روحانی ارتقاء، اخلاق کی پاکیزگی اور تزکیۂ نفس سے غفلت کرکے اس پر سب سے بڑا ظلم کیا، وہ جب مسلم نوجوانوں کو اسلام کے بجائے دوسرے فلسفوں سے متاثر اور مرعوب دیکھتے ہیں تو فطری طور پر انہیں صدمہ ہوتا ہے، اقبال کی نگاہ میں اس ذہنی انحطاط کی ایک وجہ حد سے بڑھی ہوئی مادہ پرستی اور اسباب طلبی ہے، اور عہدوں، ملازمتوں، اونچی کرسیوں کو تعلیم کا مقصد اصلی سمجھنا ہے، وہ کہتے ہیں کہ بے مقصد افراد کے لیے علم دوائے نافع نہیں سمّ قاتل ہے، اور ایسی رزق سے موت بہتر ہے:

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی　　　　جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

جس علم کو علامہ علم کی آخری منزل کہتے ہیں وہ گمان کا حاصل نہیں ایقان کا حاصل ہے، اور ایقان محض اس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ انسانی ذات مربوط اور مکمل ہو یعنی حواس سے لیکر وجدان تک تمام صلاحیتیں ایک نقطہ پر مرتکز ہو جائیں، بندۂ مومن کے پاس ایقان ہوتا ہے جب کہ دوسروں کے پاس محض گمان، اقبال کی نظر میں اصل علم وہ ہے جس کی تصدیق دماغ اور دل دونوں سے ہو، جس میں مشاہدات حکیم اور تجلیات کلیم دونوں ہمکنار ہوں، وجدان کی تصدیق اور عشق کی تائید کے باعث علم قوت و حرکت و عمل سے بہرہ ور ہوتا ہے اور زندگی میں عملی طور پر جاری و ساری ہوتا ہے، اقبال کے نزدیک ایسے علم کا کوئی تصور نہیں جو حرکی اور عملی نہ ہو، مگر حرکت و عمل کے معنی جاہ طلبی اور دنیا داری نہیں، اس کے معنی تسخیر کائنات اور تسخیر فطرت ہے یعنی آفاق پر انفس کی فتح ہے، آفاق پر انفس کی فتح ایسے ہی افراد حاصل کر سکتے ہیں جو شعورِ ذات رکھتے ہوں، انسانی زندگی کا ارتقا دراصل اسی شعورِ ذات کا ارتقاہے۔

اقبال اور اجتہاد

حقیقت ہے کہ علامہ محمد اقبال نے اپنی زندگی کا طویل عرصہ اسلامی تہذیب وثقافت، اسلامی تاریخ اور اسلامی فکر و اصول و نظریات کے مطالعہ میں گزارا، جس کے نتیجہ میں انہیں اسلام کی اصل فکر کا فہم حاصل ہوا اور اس سلسلہ میں انہیں گہری بصیرت حاصل ہوئی۔ اقبال اسلام کی ابدیت اور حقانیت پر کامل یقین رکھتے تھے، اور ان کو یقین حاصل تھا کہ اسلام کا نظام قانون ابدی اور ہر زمانہ اور ہر قسم کے حالات میں رہنمائی کی صلاحیت رکھتاہے، لیکن دنیا بھر کے ملکوں کی تہذیبوں اور ثقافتوں کو قریب سے دیکھنے اور عصر حاضر کے فکری اور تہذیبی چیلنج کو سمجھنے کے بعد وہ شدت سے اس کی ضرورت محسوس کرتے تھے کہ زمانے کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے اسلام کی فکر، اس کے قوانین اور اس کے فلسفہ کی ایسی تشریح اور اس انداز میں ترجمانی کی جائے کہ جو جدید دنیا کے چیلنجز کا مقابلہ بھی کر سکے اور نئے ذہن کو اسلام کی طرف مائل بھی کر سکے، موجودہ دور کے سوالات کا اسلام تشفی بخش جواب دے سکے، اور آج کے زمانہ کے سماجی، سیاسی و فکری مسائل کا حل پیش کر سکے، جس سے اسلام کی یہ خصوصیت تمام قوموں کے سامنے واضح ہو سکے کہ اسلام کسی خاص علاقہ یا کسی خاص قوم کے لئے نہیں بھیجا گیا۔

لیکن بنیادی طور پر قدرت نے اقبال کو ایک دل دردمند عطا کیا تھا جو ملت اسلامیہ کی غلامی اور مغلوبیت پر کڑھتا تھا، خدا نے انہیں چشم بینا اور روشن دماغ عطا کیا تھا، وہ فکر و نظر کی دنیا کو پرکھنے کے لئے اپنے فلسفیانہ دماغ سے ملت اسلامیہ کے زوال کے اسباب و محرکات کا جائزہ لے سکتے اور اس کا تجزیہ بھی کر سکتے تھے، انہیں اس بات کا ادراک تھا کہ ماضی کی تاریخ سے بے جا عقیدت اور اس کے مصنوعی احیاء سے ملت کے زوال اور انحطاط کا علاج نہیں ہو سکتا، ان کے نزدیک ملت اسلامیہ کی آزادی اور احیاء کے لئے اولاً سیاسی غلامی کی زنجیروں کو توڑنا ہو گا اور پھر نو آزاد مملکتوں کی تعمیر کے لیے انفرادی درجے کے اجتہاد کے بجائے اجتماعی کے ادارے قائم کرنا ہو گا، مستقبل کی جدید آزاد اسلامی ریاستوں کے لیے وہ اس اجتہاد کا وجود اور وجوب پارلیمنٹ کو قرار دیتے ہیں جسے ثقہ علمائے دین کی رہنمائی میسر ہو، ان کے نزدیک ملت اسلامیہ کے احیاء اور بقا دونوں کا راز اجتہاد کے بند دروازے کو کھولنے میں مضمر ہے، اپنے اس احساس کو وہ ایک علامتی شعر میں یوں

بیان کرتے ہیں:

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند   اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

علامہ اقبال کی شخصیت بحیثیت ایک مفکر کے بہت نمایاں اور ممتاز ہے، وہ بنیادی طور پر فکر اسلامی کے نقیب اور اس کے پر جوش ترجمان تھے، انہوں نے علم و فکر کی تجدید کی دعوت دی، موجودہ دور کے الحادی اور مادہ پرستانہ افکار و نظریات سے مقابلہ کے لئے انہوں نے جدید علم کلام کی تشکیل پر بھی زور دیا اور اس کا خاکہ بھی پیش کیا، اسلام پر تہذیبی و فکری لحاظ سے امت اسلامیہ کا اعتماد از سر نو بحال کرنے کی کامیاب کوشش کی، اپنے فلسفیانہ و مفکرانہ دلائل، تاریخی حوالوں اور مضبوط عقلی و نقلی اور شرعی و منطقی طرز فکر سے اہل علم اور اصحاب عقل و شعور کے ذہنوں کو اپیل کیا، اور امت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے لیے نہایت بیش قیمت عملی و فکری سرمایہ عطا کیا، اپنی بلند آہنگ شاعری کے ذریعہ اقبال نے افسردہ دلوں میں ایک جان ڈال دی اور امید، بلند ہمتی، عزم و استقلال، بلند نگاہی اور ایمان و یقین کا لافانی درس دیا، اقبال نے اپنی شاعری اور موثر انداز و اسلوب کے ذریعہ عقل اور دل دونوں کو بیک وقت متاثر کیا۔

علامہ اقبال کی تصنیفات

اردو کلام کے مجموعے: بانگ درا-1924ء، بال جبریل-1935ء، ضرب کلیم-1936ء، ارمغان حجاز (حصہ اردو) 1938ء

فارسی کلام کے مجموعے: اسرار خودی-1915ء، رموز بے خودی-1918ء، پیام مشرق-1923ء، زبور عجم 1927ء، جاوید نامہ-1932ء، مسافر-1934ء، مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق-1936ء، ارمغان حجاز-1938

نثری تصانیف: علم الاقتصاد-1904، The Development of Metaphysics in Persia، Six Lectures،

The Reconstruction of Religious Thought in Islam

علامہ اقبال 21 اپریل 1938ء مطابق 20 صفر 1357ء کو طویل علالت کے بعد اپنے گھر جاوید منزل لاہور میں انتقال فرما گئے اور لاہور کی بادشاہی مسجد کے پہلو میں سپرد خاک کئے گئے۔

22.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- علامہ اقبال ایک بلند پایہ شاعر، فلسفی، ماہر قانون اور مصلح تھے۔
- علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعہ ایسے افکار پیش کئے جنہوں نے پوری قوم کو متاثر کیا اور ان کو دعوت فکر و عمل دیا۔
- اقبال نے مسلم نوجوانوں کو ماضی کی عظمتوں کے گیت بھی سنائے، حال کی اصلاح اور مستقبل کی تعمیر کا راز بتایا۔
- اقبال نے اپنی طاقت ور فکر اور موثر شاعری کے ذریعہ امت مسلمہ کو قرآن اور اسلامی طرز حیات سے وابستہ ہونے کی تلقین کی۔

22.6 نمونہ امتحانی سوالات

22.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. علامہ اقبال کی پیدائش کہاں ہوئی؟

(a). کشمیر (b). لاہور (c). سیالکوٹ (d). دہلی

2. علامہ اقبال کی قبر کس شہر میں ہے؟

(a). ممبئی (b). لاہور (c). کلکتہ (d). کراچی

3. علامہ اقبال کے والد پیشے کے اعتبار سے کیا کرتے تھے؟

(a). طبیب (b). وکیل (c). تاجر (d). صوفی

4. علامہ اقبال کو کس استاد کی صحبت میں سب سے پہلے فلسفہ سے دلچسپی پیدا ہوئی؟

(a). پروفیسر آرنلڈ (b). پروفیسر براؤن (c). پروفیسر نکلسن (d). پروفیسر میک ٹگارٹ

5. علامہ اقبال کو سر کا خطاب کب ملا؟

(a). 1915 (b). 1930 (c). 1923 (d). 1905

6. جاوید نامہ کس زبان میں ہے؟

(a). عربی (b). فارسی (c). اردو (d). پنجابی

7. علامہ اقبال کس سے اپنی شاعری کی اصلاح لیا کرتے تھے؟

(a). ذوق (b). حالی (c). داغ (d). غالب

8. مولوی میر حسن مرحوم کو کس موضوع سے زیادہ دلچسپی تھی؟

(a). ریاضی (b). شعر و شاعری (c). تاریخ (d). سماجیات

9. اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ کس نے کیا تھا؟

(a). آرنلڈ (b). براؤن (c). نکلسن (d). علامہ اقبال

10. اقبال کی وفات کس سنہ میں ہوئی؟

(a). 1925ء (b). 1947ء (c). 1915 (d). 1938ء

22.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. علامہ اقبال کی ابتدائی تعلیم پر روشنی ڈالیے۔
2. علامہ اقبال کے تصور ریاست پر مختصراروشنی ڈالیے۔
3. علامہ اقبال کے سفر یورپ کی روداد اختصار کے ساتھ قلم بند کیجیے۔
4. علامہ نے شعر گوئی کا آغاز کس طرح کیا؟ مختصر تحریر کیجیے۔
5. اقبال کے نظریۂ تعلیم پر مختصر نوٹ لکھیے۔

22.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. اقبال اور تصوف کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
2. اقبال کے نزدیک تصورِ ملی کا جائزہ تفصیل سے لکھیے۔
3. اجتہاد سے متعلق اقبال کی فکر پر تفصیلی مضمون قلم بند کیجیے۔

22.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

---

1. اقبال کامل از مولانا عبد السلام ندوی، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ 2009ء
2. اقبال: شاعر و مفکر از نور الحسن نقوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ 2000ء
3. افکارِ اقبال از محمد عبد السلام خاں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی 1991ء
4. معارف فکر اقبال از طالب حسین ہاشمی، بک کارنر جہلم پاکستان 2020ء

اکائی 23: ابوالکلام آزاد (حصہ اول)

اکائی کے اجزا:

23.0 تمہید

23.1 مقاصد

23.2 حالات زندگی

23.2.1 ابتدائی حالات

23.2.2 مولانا کے اخلاق اور ذاتی حالات

23.2.3 ادبی و علمی زندگی کے حالات

23.2.4 سرگرم سیاسی زندگی کے حالات

23.2.5 مولانا کی وفات

23.3 مولانا آزاد کی صحافتی خدمات

23.4 اکتسابی نتائج

23.5 کلیدی الفاظ

23.6 نمونہ امتحانی سوالات

23.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

23.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

23.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

23.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

23.0 تمہید

مولانا ابو الکلام آزاد اپنے وقت کی ایک عبقری شخصیت تھے، آپ نے تنہا اتنا کام کیا ہے جتنا پورا ایک ادارہ اور انجمن مل کر کرتی ہے، وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، علم کی وسعت اور تنوع انسائیکلوپیڈیا جیسا تھا، عملی میدان میں زبان بیان دونوں کے ماہر تھے، نثر و نظم دونوں ہی میں طبع آزمائی کی، علم کے آسمان میں ایک کہکشاں کی طرح تھے، ادب، سیاست، سماجیات، قرآنیات و دنیات، زبانوں میں اردو، عربی، فارسی غرض متعدد موضوعات پر ماہرانہ انداز میں کام کیا ہے، وہ اپنی افتاد طبع، اپنے فکر و تصور، اپنے رجحانات و میلانات میں تنوع رکھتے تھے، بیک وقت ان کے جملہ خصائص کا احاطہ کرنا مشکل ہے، اگر وہ کسی ایک میدان میں ٹھہر جاتے تو اس میدان کے امام شمار ہوتے۔

ذہانت کے ساتھ ساتھ بے پناہ حافظہ کے مالک، کتابوں کے دوست، مطالعہ کے مجنون، گمشدہ اسلاف کی یادگار، عیب بینی اور عیب چینی سے متنفر، قرآن کے مفسر، آزادی کی جدوجہد کے سالار، مستقبل کے نباض، بولتے تو پھول جھڑتے، مطالب کے فرش پر الفاظ کا رقص ہوتا، چاروں طرف سحر پھیل جاتی، 1857ء کے بعد آپ کی شخصیت نے مسلمانوں کو عمل کے میدن کی طرف بلایا اور خوف و رعب سے باہر نکلنے کی دعوت دی۔

آپ نے ایک مخصوص عقائد و افکار کے ماحول میں آنکھیں کھولیں، آپ کے لئے ایک خاص طرح کی تربیت کا سارا سامان مہیا کیا گیا، لیکن ان کی فطرت سلیم نے اس ماحول کا اثر اور تربیت قبول کرنے سے انکار کر دیا،، تقلید و رسوم کی بندشوں کو توڑ دیا، آباء و اجداد کے طریق کے بجائے خود اپنا راستہ بنایا اور ایک ایسے میدان کا انتخاب کیا جس نے آپ کی شخصیت کو تاریخ میں ہمیشہ ہمیش کے لئے درج کر دیا۔

23.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد مولانا ابو الکلام آزاد کی زندگی اور ان کی صحافتی خدمات کو جاننا ہے، آپ ایک عبقری اور موسوعی شخصیت تھے، آپ کی زندگی کی مختلف جہات ہیں، اس اکائی کو پڑھ کر آپ کو مولانا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے آگاہی حاصل ہوگی۔

23.2 حالات زندگی

قد طویل نہ قلیل، متوسط القامت، اکہرا بدن، نازک الجثہ،، سرخ و سپید رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، آخری عمر میں رنگ دار عینک کے شیشے ان کا غلاف تھے، اسی طرح پیشانی کی شکنوں اور آنکھوں کی لہروں سے پتہ چلانا مشکل تھا کہ ان کے ذہنی پس منظر میں کیا ہے، چہرہ کتابی، داڑھی کچی، آواز میں جمال و جلال، عجم کے حسن طبیعت اور عرب کے سوزدروں کی تصویر، طبیعت باغ و بہار، فطرت کم آویز، مزاج میں سطوت، عوام سے بے نیاز، خلوت پسند، فقر و استغناء کے پیکر، صبر جمیل کا مجسمہ، گفتگو کے بادشاہ، علم کے بحر ناپید کنار، خطابت کے شہسوار اور قلم کے دھنی، یہ تھی مولانا ابو الکلام آزاد کی سیرت و صورت کی ایک مختصر تصویر۔

23.2.1 ابتدائی حالات

مولانا آزاد کا سلسلہ نسب شیخ جمال الدین سے ملتا ہے، شیخ جمال الدین ایک ممتاز عالم دین اور بزرگ تھے، اکبر کے دور حکومت میں آپ ہندستان کے شہر آگرہ تشریف لائے، بعد میں دہلی میں سکونت پذیر ہوئے، شہنشاہ اکبر آپ کی علم، سچائی اور بزرگی سے متاثر تھا، لیکن جب اکبر کے دور حکومت میں دین الٰہی کے فتنہ نے سر اٹھایا تو آپ نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور حق پر قائم رہے۔

آپ کے والد کا نام خیر الدین اور والدہ کا نام عالیہ بیگم تھا، والد پشتینی دہلوی تھے، مشہور کوچہ پنڈت کے رہنے والے تھے، 1857ء کے غدر کے بعد انہیں وطن چھوڑنا پڑا اور حجاز کی طرف ہجرت کرلی، مولانا ابو الکلام آزاد کی پیدائش مکہ میں 1888ء میں ہوئی، آپ کا اصل نام محی الدین احمد تھا جو بعد میں کئی مراحل سے گزر کر ابو الکلام آزاد ہو گیا، ان کے والد انہیں فیروز بخت بھی پکارتے تھے، آپ کی تین بہنیں اور ایک بڑے بھائی ابو نصر غلام یسین تھے۔

آپ کا بچپن مکہ اور مدینہ میں بسر ہوا، مکہ میں آپ کے والد کا مکان دینی تعلیم کا ایک بڑا مرکز تھا، ابتدائی تعلیم آپ نے والد سے ہی حاصل کی، مکہ چھوڑنے سے پہلے ناظرہ قرآن مکمل کر لیا، کئی ایک سورتیں بھی زبانی یاد کرلی تھیں، حرم میں اس وقت شیخ حسن سب سے بڑے قاری تھے، ان سے قرأت کا سبق لیا، اس کے بعد مولوی نذیر حسین امیٹھوی، شمس العلماء سعادت حسن اور دیگر علماء سے بھی استفادہ کیا، مولانا محمد حسین شاہ سے ترمذی شریف کا درس لیا، اسی طرح درس نظامیہ سولہ یا پندرہ سال کی عمر میں ہی مکمل کر لیا، لکھنو کے مشہور طبیب باقر حسین سے طب سیکھی۔

مولانا جب سات برس کے تھے تبھی آپ کے والد ہندوستان کلکتہ منتقل ہو گئے، آپ کے والد کا تعلق تصوف اور خانقاہ سے تھا، آپ بڑے پایہ کے صوفی اور بڑے مقبول اور ہر دلعزیز پیر تھے، کلکتہ اور بمبئی کے اطراف میں ان کے مریدوں کی ایک خاصی بڑی تعداد تھی، اپنے بڑے بیٹے کو اپنی جانشینی کے لئے تیار کر رہے تھے، مگر اکیس سال کی عمر ان کا انتقال ہو گیا، آپ کے والد پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا، بڑے بیٹے کے انتقال کے بعد وہ مولانا ابو الکلام آزاد کو اپنے راستے پر چلانا چاہ رہے تھے اور ان کو توجہ اور تخلیہ کی تلقین کرتے تھے، ابتدا میں مولانا کی طبیعت کا رنگ بدلا، اور عام دوستوں کی صحبتوں کو خیر آباد کہہ دیا، جب مولانا خیر الدین کا انتقال ہوا تو ان کے مریدوں نے آپ کو سجادہ نشین بنانا چاہا، مگر اس وقت تک مولانا کی طبیعت بدل چکی تھی اور وہ تصوف سے بے زار ہو چکے تھے، مولانا نے حجرے میں بیٹھنے والی زندگی کو پسند نہیں کیا۔

بچپن ہی سے مطالعہ کا شوق تھا، لہٰذا مختصر سی ہی عمر میں مختلف علوم میں مہارت حاصل کرلی تھی، دس سال کی عمر تک پہونچتے پہونچتے آپ کتابوں کی رسیا ہو گئے، اردو، فارسی، عربی، ترکی، علم نجوم، طب اور قرأت وغیرہ علوم پر دسترس حاصل ہو گئی تھی، پندرہ برس کی عمر میں درس نظامی مکمل کر لیا، آپ کی علمی وسعت کو دیکھ کر لوگ حیرت و استعجاب میں مبتلا ہو جاتے تھے، آپ کے والد بچوں کی تربیت کے سلسلے میں بہت سخت تھے، گھر کی چہار دیواری سے باہر جانے کے اجازت نہیں تھی، غالباً یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنا مشغلہ کتب بینی کو بنا لیا، اگرچہ اپنی خاندانی روایت کے مطابق انہوں نے دینی تعلیم حاصل کی تھی، لیکن وہ اسی پر مطمئن نہیں ہو گئے، انہوں نے وسیع اور گونا گوں

مطالعہ سے اس میں اضافہ کیا، اور دوسروں کی تقلید پر قناعت نہیں کی بلکہ اپنے غور وفکر سے اپنی ایک الگ راہ نکالی، حافظہ اتنا قوی تھا کہ جو پڑھا اس کا بیشتر حصہ محفوظ ہوگیا، آپ کی شادی ابتدائی عمر میں ہی ہوگئی تھی، آپ کے والد کے مریدوں میں ایک صاحب مولوی آفتاب الدین تھے، ان کا ایک بیٹا اور پانچ بیٹیاں تھیں، ان میں سے ایک بچی کا نکاح آپ کے بڑے بھائی ابو نصر سے ہوا، سب سے چھوٹی بیٹی زلیخا بیگم کا نکاح آپ سے ہوا، 1942ء مولانا کی زوجہ محترمہ کا اس وقت انتقال ہوا جب آپ احمد نگر کے قلعہ میں قید میں تھے، آپ نے زندگی میں بہت سارے اتار چڑھاو دیکھے لیکن اس حادثہ سے آپ جتنے افسردہ ہوئے کسی اور سے نہ ہوئے۔

23.2.2 مولانا کے اخلاقی اور ذاتی حالات

آپ ہمیشہ وقت کے بڑے پابند رہے، کھانے اور سونے کے معمول میں بھی نظام الاوقات میں خلل گوارہ نہ تھا، آپ شروعات میں خوش خوراک تھے، آخری عمر میں غذائیت کم ہوگئی تھی اور دوپہر کا کھانا بھی بند کر دیا تھا، انوع واقسام کے کھانے کا شوق نہ تھا، جو بھی آسانی سے دستیاب ہو جاتا کھالیتے، آپ کے معمول میں تھا کہ صبح تین یا چار بجے اٹھ جاتے تھے، صبح کی چائے خود ہی بناتے، نوکروں کو اس کی تکلیف نہیں دیتے تھے، رات میں جلد کھانا کھا کر دس بجے تک سو جاتے، آپ حد درجہ خلوت پسند تھے، کسی کے ہاں نہ جاتے اور نہ کسی کو بلاتے، اسی وجہ سے معاصرین آپ سے ناراض رہتے، پابندی اوقات کا یہ عالم تھا کہ ایک دن پانچ بجے شام گاندھی جی آگئے، مولانا کو خبر ملی تو اپنی جگہ سے ہلے نہیں، فرمایا اس وقت ملنے سے معذور ہوں، کل صبح نو بجے تشریف لائیں، گاندھی جی بھی ہشاش بشاش لوٹ گئے، اور اگلے دن نو بجے تشریف لائے۔

آپ خوش پوشاک تھے، مشرقی لباس جو علماء کا لباس ہے پہننا پسند کرتے تھے، ابتداء میں ترکی کا یورپین لباس پہنتے تھے، الہلال کے ابتدائی دور تک عمامہ بھی باندھتے، پھر شروانی پہننی شروع کر دی، کانگریس میں آئے تو کھدر کا لباس پہننے لگے، آخر میں کھلی قمیص، تنگ پیجامہ اور چست شروانی میں منتقل ہوگئے، آپ صوم وصلاۃ کے پابند تھے، جیل میں ہوں یا بڑے بڑے اجلاس میں جب کبھی نماز کا وقت آتا تو اٹھ کر چلے جاتے، قرآن کریم سے خصوصی شغف تھا، جب کہیں تلاوت سنتے تو آپ پر گریہ وزاری کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ مولانا نے کبھی بھی شرافت نفسی اور غیرت مندی کا دامن نہیں چھوڑا، تحریک پاکستان کے دوران لیگیوں نے آپ سے انتہائی زیادہ بدسلوکی اور بدتمیزی کی، لیکن مولانا کبھی بھی غصہ میں آپے سے باہر نہیں ہوتے اور حد درجہ ان کی بات کا جواب دینے سے اجتناب کرتے، ہر بات ناپ تول کر کرتے، افراط وتفریط اور غیض وغضب سے دور رہتے، آپ معاملات میں صفائی رکھنا فرض جانتے تھے، جس سے قرض لیتے اس کو مقرر تاریخ پر چیک بھجوا دیتے، بصورت دیگر جب تک قرض ادا نہ کرلیتے بے چین رہتے۔ مولانا چاہتے تو ان کے لئے روپے پیسے کی کمی نہ تھی، اکثر ہندو، مسلم اور پارسی آپ کے قدموں میں دولت کا ڈھیر لگانے کے لئے تیار رہتے تھے، لیکن آپ کسی کی مالی مدد قبول نہ کرتے، انتہائی محتاجگی کے دوران قرض لے لیتے، اور پیسہ آنے کے بعد اسے فوراً لوٹا دیتے، تقریباً دس سال وزارت میں رہے، وفات پائی تو جو کپڑے پہنے تھے ان میں پیوند لگے ہوئے تھے، اور بینک بیلنس صرف چند روپئے تھا، سفارشوں سے ہمیشہ احتراز کرتے تھے، بے جا سفارش کو مستحقین کی حق تلفی گردانتے تھے، ایک بار ان کے بہنوئی نے خواہش کی وہ کلکتہ کارپوریشن کے چیف ایگزیکوٹو افسر بننا چاہتے ہیں اور مولانا سے سفارش

کی درخواست کی، لیکن مولانا نے سختی سے مسترد کر دیا۔

23.2.3 ادبی و علمی زندگی کے حالات

ابتدائی عمر ہی سے ادبی زندگی کا آغاز کر دیا تھا، جب آپ کی عمر بمشکل گیارہ برس کی تھی شعر گوئی شروع کر دی تھی، لہذا شروع میں داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کی، مگر دو یا تین غزلوں کے بعد امیر مینائی کی شاگردی اختیار کر لی، پھر ان کو بھی چھوڑ کر مولانا محمد ظہر احسن شوق نیموی سے اصلاح لی، شاعری سے آپ نے کافی شہرت حاصل کی، آپ نے اردو اور فارسی دونوں ہی زبانوں میں شاعری کی، مشاعروں کا چسکہ پڑ گیا اور ہر مشاعرے میں داد حاصل کرتے، شاعری میں آزاد تخلص اختیار کیا، اور مولوی ابو الکلام آزاد دہلوی ہو گئے، شاعری نے آپ کی خطابت کو ایک نیا رنگ دے دیا، اردو اور فارسی کے ہزاروں اشعار آپ کو یاد تھے، اسے آپ اپنی خطابت میں برجستہ استعمال کرتے تھے، شاعری سے ہی آپ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا، لیکن شعر گوئی کے لئے بہت زیادہ سنجیدہ نہیں ہوئے اور بہت جلد شاعری سے آپ کا دل اچاٹ ہو گیا، غالبا انہیں یہ محسوس ہو گیا تھا کہ شاعری ان کا میدان نہیں ہے، لسان الصدق جب 1903ء میں جاری کیا تو شاعری سے تقریبا دستبردار ہو گئے، لہذا وہ پھر شاعری چھوڑ کر نثر نگاری کی طرف متوجہ ہو گئے۔

20 نومبر 1903ء میں ایک ماہوار پرچہ "لسان الصدق" جاری کیا، اس جریدہ کا مقصد جیسا کہ انہوں نے خود اس میں لکھا تھا، سوشل ریفارم یعنی مسلمانوں کی اصلاح کرنا، ترقی اردو یعنی اردو زبان کے علمی لٹریچر کو وسیع کرنا، علمی مذاق کی اشاعت، تنقید یعنی اردو تصنیفات پر منصفانہ ریویو تھا۔ اس وقت مولانا کی عمر پندرہ برس کی تھی، یہ بھاری مقصد اس عمر میں محض ایک دعوی نہیں تھا بلکہ آنے والے دنوں میں اس پرچہ نے ان مقاصد کی مکمل نمائندگی کی، اپنے مضمون کے معیار اور دلکش انداز تحریر کی وجہ سے جلد ہی یہ پرچہ صف اول کے پرچوں میں شامل ہو گیا، اور آپ کی شہرت دور دراز تک پھیل گئی، اجنبی شخص جب آپ کی تحریریں پڑھتا تو اسے کوئی بڑا، عمر دراز اور طویل تجربہ کا حامل عالم سمجھتا تھا، لیکن آپ نے کم سنی ہی میں یہ شہرت حاصل کر لی تھی۔

مولانا آزاد اپنے عہد کے ایک بلند پایہ خطیب بھی تھے، بچپن ہی میں گھر والوں کے ساتھ تقریر کی مشق کرتے تھے، انہوں نے خطابت کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا، اپنی تقریروں میں قوم کو بیداری، سیاسی شعور، ملت کی اصلاح اور ملک کی آزادی کی بات کی، نوجوانی میں ہی آپ بحیثیت خطیب بھی مشہور ہو چکے تھے، مولانا کی تحریر اور ان کی تقریر ان کی تحریر ہوتی، وہ گفتگو کرتے تو معلوم ہوتا کہ کتاب کے ورق الٹ رہے ہوں، تقریر نہایت مربوط اور مرتب ہوتی، طبی نسخوں کے اجزاء کی طرح ایک ایک لفظ ناپ تول کر بولتے، عبد الرزاق ملیح آبادی کہتے ہیں کہ آپ کو جب املا کرنا ہوتا تو بولتے جاتے اور میں لکھتا جاتا، ہر روز یہی طریقہ کار تھا، جہاں چھوڑ دیتے، اگلے دن یہ معلوم کئے بغیر کہ کہاں چھوڑا تھا اگلا حصہ لکھوانا شروع کر دیتے، جس طرح لکھتے تھے اسی طرح بولتے تھے، پر شکوہ الفاظ، پر ہیبت فقرے، قرآن کی آیات اور برجستہ اشعار، پھر وقت کے ساتھ جیسے جیسے قلم بدلتا رہا ویسے ویسے زبان میں تغیر آتا رہا۔ انجمن حمایت اسلام اس دور کا مشہور ادارہ تھا، اس کے سالانہ جلسے ہوا کرتے تھے، اہل انجمن صاحب علم حضرات کو دعوت دے کر تقریر کے لئے بلایا کرتے تھے، 1904ء کے سالانہ جلسے میں آپ کو تقریر کے لئے لاہور بلایا گیا، لوگ آپ کو غائبانہ میں ایک عمر رسیدہ بزرگ عالم سمجھتے تھے، مگر جب سامنے پندرہ سولہ سال

کے اس لڑکے کے سامنا ہوا تو لوگوں کو بہت ہی حیرت ہوئی، اسی موقع پر مولانا حالی سے آپ کی ملاقات ہوئی، کم سنی میں اس علمی معیار کو دیکھ کر مولانا حالی آپ کو بہت پسند کرتے تھے، اور ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے۔

23.2.4 سرگرم سیاسی زندگی کے حالات

مولانا نے ایک ایسے خاندان میں آنکھیں کھولیں تھیں جہاں ہر طرف مریدوں کا ہجوم لگا رہتا تھا، بنگال و ممبئی میں لاکھوں مرید تھے، پیسوں کی بھی کوئی کمی نہ تھی، والد صاحب کے انتقال کے بعد جانشینی آپ ہی کے حصے میں آئی، آسانی سے آپ عیش کی زندگی گزار سکتے تھے، لیکن ان سب چیزوں سے آپ بے زار تھے، والد کے انتقال کے بعد چار سال بچی ہوئی آمدنی سے زندگی گزاری، اسی دوران بعض قیمتی چیزوں کو فروخت کر کے "الہلال" جاری کیا، 1912ء سے 1920ء "الہلال" اور "البلاغ" پریس معاش کا ذریعہ تھا، جب یہ پرچہ بند ہو گئے تو اس کی پریس بیچ کر جو روپیہ ملا اسی سے زندگی گزاری، 1916ء کو قانون دفاع ہند کے تحت بنگال بدر کئے گئے اور رانچی میں نظر بند کر دئے گئے، یہ آپ کی پہلی قید تھی، اس نظر بندی کے دوران آپ نے تذکرہ اور بعض دوسری کتابیں تصنیف کیں، 1920ء میں اس قید سے رہا کئے گئے، اس دوران حکومت نے نظر بندی کا الاونس دے رکھا تھا، اور کتابوں کی فروخت سے گزارا ہوتا تھا۔

1920ء میں رہا ہوئے تو گاندھی جی سے ملاقات ہوئی اور آپ کانگریس میں شامل ہو گئے پھر زندگی بھر کانگریس ہی میں رہے، اور ملکی سیاست کے سربر آوردہ رہنماوں میں شامل ہو گئے۔ تحریک عدم تعاون میں دو سال قید ہوئے، اس وقت بھی آپ کا گزر بسر "البلاغ" پریس ہی کے ذریعہ یا چھوٹی موٹی کتابوں کی فروخت پر تھا، پھر پریس بیچ کر چند گائیں اور بھینس خرید کر ایک پنجابی دوست کے حوالہ کر دی اور اسی سے روزہ مرہ کے اخراجات پورے ہوتے تھے، 1930ء میں کانگریس کی نمکین ستیہ گرہ میں بحیثیت صدر گرفتار ہوئے دو سال قید ہوئی 1932ء میں رہا ہوئے، 1931ء میں ترجمان القرآن کی فروخت سے تھوڑی آمدنی ہوئی، 1936ء میں دوسری جلد کی اشاعت ہوئی، 1932 سے 1938 تک بھی مالی حال درست نہ ہوئے، آپ اپنے وقت میں امام الہند تھے مگر زندگی افلاس کی گزاری، 15 فروری 1940 کو کانگریس کی صدارت کا الیکشن ہوا، آپ کے حریف مسٹر ایم این رائے کو 1864 کے مقابلے میں 183 ووٹ ملے اور 21 مارچ کو رام گڑھ میں کانگریس کی صدارت کا چارج لیا، آپ کا دور صدارت کانگریس کی تاریخ کا انتہائی نازک اور سب سے زیادہ طویل رہا، آپ ہی کی زیر صدارت کانگریس نے آزادی وطن کی فیصلہ کن اور آخری لڑائی لڑی، آپ نے سب سے پہلے انفرادی ستیہ گرہ شروع کی جنوری 1941ء کو دہلی سے کلکتہ جاتے ہوئے گرفتار کر لئے گئے اور 4 دسمبر 1941ء کو رہا کر دیا گیا، آپ ہی زیر صدارت 8 اگست 1942ء کو کانگریس نے کوئٹ انڈیا تحریک شروع کی، جس سے قصر برمنگھم بھی لرز اٹھا، لہذا 1942ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی سمیت مولانا احمد نگر کے قلعہ میں قید کر دئے گئے، یہاں آپ 1945ء تک مقید رہے، آخر کار برطانیہ نے ہندستان کی آزادی کا اعلان کر دیا، اور 24 اگست 1946ء کو ہندستان میں ایک عارضی حکومت وجود میں آ گئی، اس طرح آپ کی چھ برس کے زیر صدارت ہندستان جنگ آزادی کے تمام مراحل طے کئے، آپ کے بعد پنڈت نہر جولائی 1946ء کو کانگریس کی صدارت کا چارج لیا، اور جب عارضی حکومت بنائی گئی پنڈت نہرو نے آپ کو اپنی کابینہ میں وزیر تعلیم بنایا اور آپ آخری عمر تک اس عہدہ پر رہ کر ملک کی خدمت کرتے رہے۔

اپنی پوری زندگی میں آپ دس سال سات ماہ قید میں رہے، قید کے دوران آپ نے متعدد کتابیں لکھیں، غبار خاطر، ترجمان القرآن کے بعض مقامات وہیں لکھے، 1946ء میں "غبار خاطر" حالی پبلشنگ ہاوس سے چھپی، غالباً دس ہزار روپیہ حاصل ہوئے، دوسرا ایڈیشن مکتبہ آزاد کے زیر اہتمام شائع ہوا، اس ایڈیشن کی رائلٹی سے پچیس ہزار روپئے ملے، اور 1947ء سے 1958ء اپنی رحلت تک ہندستان کی مرکزی حکومت میں وزیر تعلیم رہے، لیکن اپنی تنخواہ کا تین چوتھائی غریب الحال اور بے سہارا بیواؤں کو وظائف میں دیتے رہے اور باقی ایک چوتھائی میں کوٹھی کے اخراجات پورے کرتے رہے۔

23.2.5 مولانا کی وفات

11 فروری 1958ء کو آل انڈیا ریڈیو نے خبر دی کہ مولانا علیل ہوگئے ہیں، اس رات کابینہ کی میٹنگ سے لوٹے تھے تو ہشاش بشاش تھے، کسی مرض کا شائبہ نہ تھا، حسب معمول سویرے اٹھے اور غسل خانہ گئے تو یکایک فالج نے حملہ کردیا، پنڈت جواہر لال نہرو اور رادھا کرشنن فوراً پہونچے، ڈاکٹروں کی ٹیم بھی پہونچ گئی، مولانا بے ہوشی کے عالم تھے، ڈاکٹروں نے علاج شروع کیا، لیکن صحت بہتر نہ ہورہی تھی، 21 فروری کو حالت اور بھی خراب ہوگئی، آخر کار 22 فروری ایک بجے شب مولانا کی روح پرواز کرگئی، پنڈت نہرو خبر سنتے ہی دس منٹ میں پہنچ گئے اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، انہیں یاد آیا کہ آج ہی صبح مولانا نے انہیں خدا حافظ کہا تھا، پورا ملک سوگوار ہوگیا، تمام سرکاری عمارتوں کے پرچم سرنگوں کردئے گئے، پورا ہندوستان غم میں ڈوب گیا، صبح چار بجے میت کو غسل دیا گیا، پھر تمام ہی وزراء اور بڑے سرکاری افسروں نے پھول چڑھائے، پنڈت نہرو کا خیال تھا کہ مولانا کے جنازہ میں بہت زیادہ لوگ نہیں آئیں گے، لیکن جب جنازہ انڈیا گیٹ اور ہارڈنگ برج سے ہوتا ہوا دریا گنج کے علاقہ میں پہنچا تو پانچ لاکھ افراد اکٹھا ہو چکے تھے، مولانا احمد سعید دہلوی صدر جمعیت علماء ہند نے دو بج کر پچاس منٹ پر نماز جنازہ پڑھائی اور لحد میں اتارا اور جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان پارک میں دفن کئے گئے۔

23.3 مولانا آزاد کی صحافتی خدمات

بچپن ہی میں مولانا ابو الکلام آزاد مختلف علوم میں مہارت حاصل کر چکے تھے اور تصنیف و تالیف کے میدان میں قدم رکھ چکے تھے، گیارہ برس کی عمر ہی میں شعر گوئی شروع کردی تھی، ان کی وسیع علمی شخصیت اس کی متقاضی تھی کہ وہ کسی ایسے پلیٹ فارم کا انتخاب کریں جہاں وہ آسانی کے ساتھ اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کرسکیں، لہذا صحافت سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا تھا، لہذا صحافت کے میدان میں مختلف حیثیتوں سے کام کیا، بعض جرائد خود آپ کی ملکیت تھے، لیکن ادارتی کاموں کی ذمہ داری دوسروں کی تھی، بعض اخبارات مولانا کی نگرانی میں نکلتے تھے، لیکن مولانا کا ان سے مالکانہ و مدیرانہ تعلق نہ تھا، بعض رسائل کے وہ نہ مالک تھے اور نہ ہی مدیر، لیکن ادارتی کاموں کی ذمہ داری انہوں نے خود سنبھال رکھی تھی، بعض رسائل کے مولانا مدیر تھے لیکن ان کے مالک نہ تھے، بعض رسائل میں نائب مدیر کی حیثیت سے کام کیا، ان گوناگوں حیثیتوں سے کام کرنے کی وجہ سے مولانا کو اخبارات کے ہر طرح کے کاموں کا تجربہ ہوگیا تھا، اور ان چیزوں نے انہیں کامیاب صحافی بنانے میں بہت مدد کی تھی۔

نیرنگ عالم: ابتداء میں مولانا کو شاعری کا شوق تھا، یہ شوق اتنا بڑھا کہ ایک رسالہ نکالنے کا ارادہ کیا، مولانا کہتے ہیں کہ ہم نے بے سروسامانی کے عالم میں پچاس روپئے کا انتظام کیا، لیتھو کا ایک پریس "ہادی پریس" کے نام سے ہریسن روڈ کلکتہ میں تھا، والد مرحوم کی بعض چیزیں وہاں چھپا کرتی تھیں، ہم نے فوراً اعلان شائع کر دیا، اور اس کا نام "نیرنگ عالم" تجویز کیا، مشہور شعراء سے نظمیں اور غزلیں منگوائی گئیں۔ اس پرچہ اشاعت کا زمانہ طے کرنا کافی مشکل ہے، کیوں کہ اس کے پرچے اب دستیاب نہیں ہیں، البتہ اندازاً یہ ماہ جون 1899ء کا زمانہ ہے۔

احسن الاخبار: یہ اخبار کلکتہ کے ایک کتب فروش اور مصطفائی پریس کے مالک عبد الغفور کلکتہ سے نکالا کرتے تھے، مولانا چوں کہ کلکتہ ہی میں مقیم تھے، لہذا ان کا اکثر اس کے آفس میں جانا ہوتا تھا، اس وقت تک مولانا کو تحریر کی کافی مشق ہو چکی تھی، لہذا آپ اپنے مضامین اسی میں شائع کراتے تھے، اس اخبار کے تبادلے کے نتیجہ میں عرب ممالک کے بہت سارے مجلات آیا کرتے تھے، اس سے مولانا ابوالکلام آزاد کو عرب ممالک کی خبریں ملنا زیادہ آسان ہو گئیں، عرب صحافی اور علماء کے آراء وخیالات سے واقفیت حاصل ہوئی، خصوصی طور پر علامہ رشید رضا المصری کے رسالہ "المنار" سے کافی متاثر ہوئے، اسی کے ساتھ عربی زبان پر ان کی پکڑ بھی مضبوط ہوئی، عربی اخبارات کے مضامین، خبروں کا انتخاب، ترجمہ، رسالوں کتابوں پر ریویو، نیز اخبار وحوادث پر بحث و نظر وغیرہ مختلف قسم کے مضامین لکھنے کا موقع ملا۔

لسان الصدق: مولانا نے اس پرچہ کو شائع کرنے سے پہلے بھی متعدد اخبارات ورسائل میں کام کیا، لیکن ان سب میں یہ اپنی علمی وادبی شہرت کی بنا پر نہایت اہمیت کا حامل ہے، یہ پرچہ مولانا کی صحافتی زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، اپنے خیالات وافکار کے اظہار کے لئے انہوں نے "لسان الصدق" نومبر 1903ء میں جاری کیا، اس وقت آپ کی عمر پندرہ برس سے زائد نہ تھی، لیکن اسلوب کی بلندی اور مضامین کی علمیت سے اکثر پڑھنے والوں کو یہ گمان ہوتا کہ مصنف کوئی معمر بزرگ ہے، کیوں کہ اس کے مقاصد بھی انتہائی بلند تھے، جس میں اردو کا فروغ، اصلاح معاشرہ، تنقیدی مضامین کی اشاعت، لوگوں میں علمی مذاق کو پیدا کرنا، مختلف اہم کتابوں پر ریویو لکھنا شامل تھا، اس کی علمی وادبی معیار کو دیکھ کر انجمن ترقی اردو نے اسے اپنا آرگن قرار دیا، لسان الصدق تقریباً اٹھارہ مہینہ تک جاری رہ سکا، چوں کہ مولانا اکثر سفر میں رہتے تھے، جس کی وجہ سے اس پرچہ کی باضابطہ اشاعت پر کافی اثر پڑا، بعض اوقات دو مہینہ میں صرف ایک شمارہ شائع ہوا، اس طرح نو شمارے جاری ہونے کے بعد یہ پرچہ بند ہو گیا۔

الندوہ: لسان الصدق نکالنے کے دوران آپ کی علامہ شبلی نعمانی سے خط وکتابت ہونے لگی، بمبئی میں ملاقاتیں بھی رہیں، علامہ شبلی مولانا ابوالکلام آزاد کے علمی ذوق، وسعت مطالعہ اور ذہنی صلاحیت سے کافی متاثر ہوئے، علامہ شبلی "الندوہ" کی ادارت کے لئے کسی معاون کی ضرورت کو محسوس کر رہے تھے، لہذا 1905ء میں علامہ شبلی نے انہیں لکھنؤ آنے کی دعوت دی تا کہ وہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے ماہانہ رسالے "الندوہ" کی ادارت سنبھالیں، یہ ایک خالص علمی وتحقیقی پرچہ تھا، اور ندوۃ العلماء کا ترجمان ہونے کے نتیجہ میں اس کی ادارت ایک بڑی اہم ذمہ داری تھی، لیکن ان کی علمی صلاحیت اور صحافتی تجربات کی بنیاد پر علامہ شبلی نے یہ اہم ذمہ داری ان کے سپرد کی، اس کا دائرہ علوم وفنون کی تمام ہی شاخوں تک محیط تھا، آپ نے اس میں کئی وقیع علمی مضامین لکھے، کتابوں پر علمی تبصرے شائع کئے، گرچہ مولانا

اکتوبر 1905ء سے مارچ 1906ء تک اس پرچہ سے وابستہ رہے لیکن اپنے ذوق اور معیار کا اعلیٰ نمونہ دوسروں کے لئے چھوڑ گئے۔

وکیل: لکھنو چھوڑ کر مولانا امرتسر چلے آئے، وہاں سے ایک مشہور اخبار "وکیل" نکلتا تھا، جس کے مالک شیخ غلام احمد امرتسری تھی، مولانا جب الندوہ کے ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوئے تو انہوں نے "وکیل" کی ادارت سنبھالنے کی دعوت دی، "الندوہ" سے الگ ہونے کے بعد اسی پرچہ سے وابستہ ہو گئے، اس میں آپ نے بڑی خوش گوار تبدیلیاں کیں، اس کی ظاہری اور معنوی دونوں صورتوں میں گویا ایک انقلاب آ گیا، اس کی اشاعت میں باقاعدگی نہ تھی، صفحات محدود تھے، آپ نے صفحات میں اضافہ کیا، باقاعدہ شائع کرنا شروع کیا، عمدہ کاغذ پر چھپنے لگا، کتابت بھی صاف اور خوبصورت ہو گئی جس سے اس پرچہ کی مقبولیت میں کافی اضافہ ہوا، اس زمانے میں "زمیندار" جسے مولوی ظفر علی خان نکالا کرتے تھے اپنے وقت کا معروف اخبار تھا، مگر وکیل کی اتنی شہرت ہوئی زمیندار قعر گمنامی میں چلا گیا، خود مولانا کی علمی اور ذہنی سطح بلند ہوئی، آپ کے قومی خیالات میں تبدیلی آئی، آپ پوری تندہی سے "وکیل" میں کام کرتے رہے، بعد میں کسی ناخوش گوار واقعہ کی وجہ سے آپ کو اس سہ روزہ اخبار کو الوداع کہنا پڑا۔

الہلال والبلاغ: 20 سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے آپ نے کئی ایک پرچوں میں کام کیا، کچھ اخبارات خود ہی جاری کئے جب کہ بعض اخبارات اور رسائل میں کام کیا، گویا وہ اپنے نصب العین تک پہنچنے کے لئے تربیت اور تجربات کے مراحل سے گزر رہے تھے، اسی دوران یہ بھی تجربہ ہوا کہ ملک میں اصلاح و بیداری، انقلابی افکار کا اظہار کے لئے کوئی تحریک اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتی جب تک ایڈیٹر کا قلم مالک کی مداخلت کے خطرے سے پوری طرح مطمئن نہ ہو اور ہر طرح کی مصلحتوں سے پرے ہو، یہ بات اسی وقت ممکن ہے جب کہ اخبار کی ادارت کے ساتھ ساتھ ملکیت کی زمام بھی ایک ہی ہاتھ میں ہو، گویا یہ پرچہ مولانا کی سالوں تجربوں اور محنت کا نتیجہ تھا۔

جولائی 1912ء میں ہفت روزہ اخبار "الہلال" کا اجراء اسی فکر کا نتیجہ تھا، اس کا پہلا شمارہ 13 جولائی 1912ء کو شائع ہوا، اس پرچہ میں بڑے بڑے لوگوں نے کام کیا، جن میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبد اللہ عمادی، مولانا عبد السلام ندوی اور دیگر بڑی بڑی شخصیات شامل تھیں، علامہ شبلی کی کئی ایک نظمیں پہلی بار الہلال ہی میں شائع ہوئیں، چند ہی برسوں میں اس پرچہ نے عوامی مقبولیت حاصل کر لی، لہذا حکومت کو اس کی جانب سے اندیشہ ہونے لگا، بمشکل تین برس ہی چلا تھا کہ حکومت نے ان سے دو ہزار ضمانت طلب کر لی، لیکن جب یہ وار خالی گیا تو دس ہزار طلب کیا، یہ رقم مولانا کی مقدار سے کہیں زیادہ تھا، لہذا انہوں نے یہ پرچہ بند کر دیا اور اس کی جگہ دوسرا پرچہ "البلاغ" جاری کیا، ان دونوں میں صرف نام کا ہی فرق تھا ورنہ صوری اور معنوی حیثیت میں کوئی بھی فرق نہ تھا، مگر یہ پرچہ بھی حکومت کی نظر بد سے محفوظ نہ رہ سکا، مارچ 1916ء میں حکومت بنگال نے ڈیفنس آف انڈیا آرڈی ننس کے تحت ان کے صوبے سے اخراج کا حکم جاری کر دیا اور بیشتر صوبے پہلے ہی اپنے یہاں ان کا داخلہ ممنوع قرار دے چکے تھے، اس کے بعد مولانا رانچی منتقل ہو گئے اور رانچی میں قیام پر پانچ مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ 8 جولائی 1916ء کو حکومت ہند نے ان کی رانچی ہی میں نظر بندی کا حکم جاری کر دیا۔

الہلال اپنے عہد کا نمایاں پرچہ تھا، اس شان کا کوئی بھی ہفتہ وار پرچہ اردو میں نہیں شائع ہوا، اس کے بعد جو بھی پرچے نکلے سبھی مدیران حضرات کی یہی خواہش تھی وہ شکل و صورت اور مضامین کی ترتیب میں، اداریے اور تصاویر وغیرہ میں الہلال کی ہی پیروی کریں،

اس پرچہ کی سب سے نمایاں خاصیت اس کے مدیر مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریر تھی، مولانا نے اپنے ہم وطنوں، ارباب حکومت، اکابر قوم سبھی کو للکارا، کسی کو بھی نظر انداز نہیں کیا، بے خوف وخطر ہر ایک کی گرفت کی، انگریز حکومت کی آپ نے شدید تنقید کی، آپ سے پہلے پوری سیاسی تحریک نرم گفتاری سے چل رہی تھی، حکومت کی کڑی تنقید کا آغاز آپ کی تحریر سے ہوا، الہلال 1912 میں جاری ہوا اور البلاغ سمیت 1916 میں بند ہو گیا،"الہلال"مولانا کے لئے ایک نیا تجربہ تھا، آپ نے اسے بجائے لیتھو کے ٹائپ میں چھپوانا شروع کیا، گرچہ لوگ اس وقت تک اردو ٹائپ میں چھپی ہوئی چیزوں کو بہت زیادہ پسند نہیں کرتے تھے اور لیتھو کی نستعلیق ہی کے عادی تھے، مگر الہلال کا اردو ٹائپ میں چھپنا اس کی مقبولیت میں بالکل مانع نہیں ہوا، اس میں کاغذ بھی نہایت اعلی اور سفید گلیز ڈ استعمال کیا گیا، اس میں تصاویر کا بھی خاصہ اہتمام تھا، تصویروں کے بلاک نہاعت عمدہ اور صاف ہوتے تھے، اکثر نوجوانان ترکی کی تصویریں نہایت دیدہ زیب الفاظ میں چھپتی تھی۔

الہلال اور البلاغ میں آپ نے جو مضامین لکھے اس کا ادبی معیار بھی کافی بلند تھا، مدیر مسئول و محرر خصوصی کا خصوصی فقرہ ہوا کرتا تھا، آج کل یہ فقرہ اخباروں اور رسائل میں کافی مستعمل ہے، اردو زبان میں مولانا ہی نے اسے داخل کیا۔ آپ کی تحریروں میں جوش وخروش ہوا کرتا تھا، آپ کی تحریریں پڑھنے کے بعد لوگ بے خود ہو جاتے تھے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ مولانا الفاظ کے جادو گر تھے، انہیں یہ کمال حاصل تھا کہ ایسے الفاظ وتراکیب کا استعمال کرتے تھے کہ لوگ پڑھ کر مسحور ہو جاتے تھے۔ باوجود اس کے کہ آپ کی تعلیم عربی اور فارسی میں ہوئی تھی اور آپ کو ان زبانوں پر مہارت بھی حاصل تھی، لیکن ان کی تحریر عربی وفارسی کے ثقیل الفاظ سے گرانبار نہ تھی، نہ ہی اس میں کچھ روانی اور شگفتگی میں کمی تھی، جہاں کہیں مشکل عبارت ملے گی اس کی توجیہ یہ کی وہاں ان کے مخاطب عوام نہیں بلکہ اہل علم کا طبقہ ہوتا ہے، خصوصا الہلال، اس میں بیشتر موضوعات انہیں اصحاب کی دلچسپی کے لئے تھے۔

23.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- مولانا ابوالکلام آزاد ایک حریت پسند آدمی تھے، اپنی زندگی کے کسی بھی مرحلہ میں کبھی بھی آزادی سے سودا نہیں کیا، ہمیشہ وہی کام کئے جو انہیں پسند تھے، وہ کام جس میں آپ کا میلان نہیں تھا اس میں چاہے جتنے ہی فائدے ہوں آپ کبھی اس کی طرف نہیں گئے، لہذا والد محترم نے جب آپ کو اپنا جانشین بنانا چاہا، اور یہ خواہش کی کہ وہ بھی پیری مریدی کے راستے پر آجائیں، اور آرام سے اپنی زندگی گزاریں، لیکن آپ نے اس آسان راستے کو چھوڑ کر صحافت جیسا دشوار گزار راستے کا انتخاب کیا، کیوں یہ راستہ آپ کے دل کے قریب تھا۔
- آپ نے ہمیشہ حق کو ببانگ دہل کہا، مخالفتوں کے طوفان آئے اور بڑے بڑے صاحبان عزیمت تنکوں کی طرح بہہ گئے، عوام کے سیلاب کے آگے بڑے بڑے لوگوں کا وقار خاک میں مل گیا، لیکن کوئی بھی آندھی آپ کے پائے استقلال کو جنبش نہ دے سکی، آپ جس مقام پر کھڑے تھے ہمیشہ کھڑے رہے، اپنی فہم وفراست، نظر و بصیرت اور وسیع مطالع کے نتیجہ میں زندگی کا جو رخ

متعین کر لیا تھا زندگی بھر اسی راہ پر چلے۔

- صحافت مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کا بڑا میدان ہے، اس میدان میں ان کی بہترین ذہنی وفکری صلاحیتوں کا اظہار ہوا، مولانا کے فکر و نظر کی گہرائی، مطالعہ کی وسعت اور آپ کی دلچسپی کا اندازہ صحافت ہی سے ہوتا ہے، ان کی صحافت کا ایک ایک صفحہ آپ کی علمی، ادبی، مذہبی اور فکری کمالات کی داستان بیان کرتا ہے، اس سے مولانا کے تبحر علمی اور ذوق و نظر کے نئے نئے گوشے سامنے آتے ہیں۔
- آپ کا نصب العین ہمشہ بلند رہا، ہمیشہ ملک و قوم کی بہتری کے لئے سرگرم رہے، صحافت کے میدان میں بھی اسی وجہ سے داخل ہوئے کہ ملک و قوم کے مسائل کو عام لوگوں تک پہونچایا جائے، آپ کے اندر ایک پاکیزہ جمالیاتی ذوق تھا، آپ کے فضل و کمال اور علمی و فنی صلاحیتوں میں بڑا تنوع تھا، گویا مولانا کی جو خصوصیات دنیا پر ظاہر ہو سکیں وہ ان سے بہت کم تھیں جو چھپی رہ گئیں۔

23.5 کلیدی الفاظ

حریت پسند : آزادی چاہنے والا

ببانگ دہل : بآواز بلند

نستعلیق : ایک اہم اور مشہور ترین طرز تحریر

دیدہ زیب : دیکھنے کے لائق

23.6 نمونہ امتحانی سوالات

23.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. مولانا ابوالکلام آزاد کا اصل نام کیا تھا؟

(a). محمد احمد (b). محی الدین (c). شریف الدین (d). محمد اسد

2. ابوالکلام آزاد کی پیدائش کس جگہ ہوئی؟

(a). مکہ (b). مدینہ (c). دہلی (d). کلکتہ

3. 1903ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے کس پرچہ کا اجراء کیا؟

(a). الہلال (b). البلاغ (c). ماہنامہ بجنور (d). لسان الصدق

4. "الندوہ" کس ادارہ کا ترجمان رسالہ تھا؟

(a). دہلی کالج (b). دارالعلوم دیوبند (c). مدرسہ رحیمیہ (d). دارالعلوم ندوۃ العلماء

5. البلاغ پرچہ کب بند ہوا؟

(a).1916ء (b).1915ء (c).1917ء (d).1918ء

6. مولانا ابوالکلام آزاد کے والد کا کیا نام تھا؟

(a). خیر الدین (b). شیخ جمال الدین (c). محمد نظام الدین (d). محمد رئیس

7. مولانا ابوالکلام آزاد سب سے پہلے کب قید کیا گیا؟

(a).1912ء (b).1916ء (c).1918ء (d).1920ء

8. ہفت روزہ الہلال کا اجراء کب ہوا؟

(a). جولائی1912ء (b). اگست1920 (c). اگست1913 (d). ستمبر1921ء

9. آزاد ہندستان کی پہلی حکومت میں آپ کس وزارت پر فائز ہوئے۔

(a). وزات خارجہ (b). وزارت خزانہ (c). وزارت داخلہ (d). وزارت تعلیم

10. وکیل اخبار کس جگہ سے نکلتا تھا؟

(a). دہلی (b). امر تسر (c). لاہور (d). لکھنو

23.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. لسان الصدق پرچہ کے بارے میں کیا جانتے ہیں تحریر کیجیے۔
2. الندوہ پرچہ کے سلسلے میں مختصر تحریر کیجیے۔
3. الہلال اور البلاغ پر مختصر مضمون قلم بند کیجیے۔
4. مولانا آزاد کی سر گرم سیاسی زندگی بیان کیجیے۔
5. مولانا کے اخلاقی احوال پر مختصر روشنی ڈالیے۔

23.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. مولانا آزاد کی حالات زندگی بیان کیجیے۔
2. مولانا آزاد کی صحافتی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
3. مولانا آزاد کی ادبی زندگی پر مقالہ تحریر کیجیے۔

23.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت : ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری
2. ابوالکلام آزاد ایک مطالعہ : ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری
3. ابوالکلام آزاد : شورش کاشمیری
4. ابوالکلام آزاد : جگن ناتھ آزاد

اکائی 24: مولانا ابو الکلام آزاد (حصہ دوم)

اکائی کے اجزا:

24.0 تمہید

24.1 مقاصد

24.2 مولانا آزاد کی تفسیری خدمات

24.2.1 تفسیر کی خصوصیت

24.2.2 ترجمہ کی خصوصیت

24.3 مولانا ابو الکلام آزاد کی سیاسی خدمات

24.4 مولانا آزاد بحیثیت ادیب

24.5 مولانا آزاد بحیثیت خطیب

24.6 اکتسابی نتائج

24.7 کلیدی الفاظ

24.8 نمونہ امتحانی سوالات

24.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

24.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

24.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

24.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

24.0 تمہید

مولانا ابو الکلام آزاد کی ذات میں قدرت نے بیک وقت اتنی خصوصیات جمع کر دی تھیں جن کا ظہور کسی ایک شخصیت میں نادر

الوجود ہے، وہ خطیب بھی تھے اور ادیب بھی، صحافی بھی تھے اور عملی سیاست داں بھی، یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی کون سی خصوصیت باقی دوسری خصوصیتوں پر حاوی ہے، خطابت ہو یا صحافت، انشاء پردازی ہو یا تفسیر قرآن، گرچہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ حرف آخر ہے، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ "الہلال" اور "البلاغ" کے بعد کم سے کم اردو میں آج تک اس پائے اور ان خصوصیات کا حامل کوئی بھی اخبار نہ شائع ہو سکا، تفسیر "ترجمان القرآن" بھی اپنی خصوصیات کے ساتھ سب سے نمایاں ہے۔

مولانا ابو الکلام آزاد ایک بلند پایہ مفکر بھی تھے بلکہ اعلی سطح کے غیر جانب دار محقق بھی تھے، اسی لئے ان کے قلم سے جو رائے نکلتی تھی وہ بیشتر حیثیت سے مکمل ہوتی تھی، ان کی ہر جنبش قلم ان کی بلند مجتہدانہ فکر کا نمونہ ہوا کرتی تھی، آپ عدیم الفرصت انسان تھے، آپ کے گوناگوں مشاغل تھے، سیاست کے ساتھ ساتھ علمی وادبی سرگرمیاں بھی چلا کرتی تھیں، آپ کی علمی سرگرمی کی ایک واضح نمونہ تفسیر ترجمان القرآن ہے، آپ قرآن کا گہرا مطالعہ اور اس میں فہم وتدبر کرنے کا شوق رکھتے تھے، اسی انہماک اور شوق کے نتیجہ میں اٹھارہ پاروں کا ترجمہ اور تفسیر انتہائی جامع انداز میں کیا، آپ نے اپنی علمی ودینی بصیرت سے فکر ونظر کے نئے نئے راستے کھولے، تفسیر میں اوہام پرستی اور اسرائیلیات کے بے سروپا افسانہ سے تفسیر کا دامن پاک رکھا۔

مولانا ابو الکلام آزاد اپنی نظیر آپ تھے، آپ نے جس میدان میں قدم رکھا اس میں کامیابی حاصل کی، جس مجلس میں شرکت کی اسے اپنی گفتگو اور خطابت مسحور کر دیا، زبان ایسی بولتے کہ لفظ لفظ ادب لطیف کے عطر میں ڈوبا ہوتا، وہ صحیح معنوں میں آزاد تھے، دور غلامی میں بھی آپ ہمیشہ اسم با مسمی رہے، آپ کی فکر اور سوچ کو کوئی قوت مغلوب نہیں کر سکی، آپ نے پورے خلوص کے ساتھ اپنی پوری زندگی ملک وقوم کی خدمت کے لئے وقف کر دی، بڑے بڑے عہدوں اور مرتبے تک پہونچنے کے باوجود کبھی اپنے لئے کچھ مال ودولت نہیں جمع کی۔

24.1 مقاصد

مولانا ابو الکلام آزاد کی شخصیت متنوع الجہات ہے، صرف ان کی سوانح کو پڑھ کر کوئی ان کی پوری شخصیت سے واقف نہیں ہو سکتا، سیاسی سرگرمی، علم، ادب اور خطابت آپ کی شخصیت کے نمایاں پہلو ہیں، اس مضمون کا مقصد مولانا آزاد کی شخصیت کے انہی جہتوں سے واقفیت حاصل کرنا ہے۔

24.2 مولانا آزاد کی تفسیری خدمات

تفسیر ترجمان القرآن: آپ کا تعلق ایک دینی خاندان سے تھا، آپ نے علم دین کی تعلیم حاصل کی اور اس میں کمال درجہ امتیاز پیدا کیا، آپ کی دینی خدمات میں سب سے نمایاں نام تفسیر "ترجمان القرآن" ہے، اس میں قرآن کا ترجمہ اور تفسیر دونوں ہے، آپ کا مطالعہ قرآن کافی وسیع تھا، جا بجا اس کا اظہار مختلف مواقع پر ہوتا رہتا تھا، خصوصا جب آپ کلکتہ سے "الہلال" شائع کر رہے تھے تو اس میں جا بجا قرآنی آیتوں سے استدلال کرتے تھے، دنیائے صحافت میں یہ ایک نیا طریقہ تھا، پھر یہ اتنا مقبول ہوا کہ قرآن کی تفسیر لکھنے کا خیال پیدا ہوا،

آپ کے سامنے تین چیزیں تھیں، ترجمہ، تفسیر اور مقدمہ تفسیر، 1916ء کے ابتدائی مہینوں تک ترجمہ پانچ پاروں تک ہو چکا تھا، اور تفسیر سورہ "آل عمران" تک پہونچ چکی تھی اور مقدمہ تفسیر یادداشت کی شکل میں آ چکا تھا، کچھ تفسیر کے فارم چھپ چکے تھے اور ترجمہ کی کتابت شروع ہو رہی تھی کہ حکومت ہند نے 1916ء مولانا کو کلکتہ سے خارج کر دیا اور آپ رانچی پہونچ گئے، لیکن وہاں بھی حکومت نے انہیں نظر بند کر دیا، نظر بندی کے دوران تمام کاغذات خفیہ پولیس اٹھالے گئی اور اس میں قرآن کا ترجمہ اور تفسیر بھی موجود تھا، رہائی کے بعد 1921ء میں دوبارہ گرفتار ہوئے، آپ کے گھر کی تلاشی لی گئی، تفتیشی افسران پھر سارا علمی مسودہ اپنے ساتھ اٹھالے گئے اور طویل مدت کے بعد جب واپس ملے تو نصف سے زائد غائب ہو چکے تھے، اور بقیہ بھی صحیح سلامت نہ تھے، بلکہ اطراف سے پھٹے ہوئے اور پارہ پارہ تھے، لیکن مولانا بہت ہی صابر اور مستقل مزاج آدمی تھے، لہذا رہا ہونے کے بعد دوبارہ تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور ترجمان القرآن کی پہلی جلد 1932ء میں اور جلد دوم 1936ء میں بڑی تقطیع پر شائع ہوئی، ان دو جلدوں میں 18 پاروں کا ترجمہ ہے، اس میں مولانا نے سورہ فاتحہ کی تفسیر بہ طور دیباچہ کے لکھی جو 172 صفحات پر مشتمل ہے، جب مولانا کی تفسیر چھپ کر آئی تو جیسا کہ توقع تھی اسے سراہا بھی گیا، اسی کے ساتھ ایک طبقہ میں اس پر سخت تنقید اور نکتہ چینی بھی ہوئی۔

افسوس کی یہ تفسیر مکمل نہ ہو سکی، وہ نصف سے کچھ زیادہ شائع کر سکتے تھے لیکن سیاسی سرگرمیوں نے ان کے وقت اور صلاحیت پر قبضہ کر لیا اور وہ بقیہ تفسیر مکمل نہ کر سکے، یقیناً یہ ایک بڑا علمی خسارہ ہے، لیکن قرآن کے نصف اول میں بنیادی علمی گفتگو اس طرح سے کی ہے کہ اس سے بیشتر دین کے مسائل کا احاطہ ہو جاتا ہے۔

24.2.1 تفسیر کی خصوصیت

قرآن جب اپنے ابتدائی عہد میں نازل ہوا تو اس وقت مسلمانوں کا تمدن فطرت کی سیدھی سادی اور غیر فلسفیانہ فکر پر قائم تھا، لہذا قرآن کو سمجھنا جیسا کہ وہ اترا تھا آسان تھا، اس کے فہم و فراست میں کوئی دشواری نہیں محسوس ہوتی تھی، لیکن بعد میں جو تفسیریں لکھی گئیں ان پر اولاً اسرائیلیات کی خرافات کی آمیزش ہوئی پھر یونانی منطق و فلسفہ کا دخل آیات کے معانی اور اس کی تفسیر میں ہو گیا، پھر جب اسلامی ممالک پر یورپی تہذیب کا غلبہ ہوا تو جدید نظریات کی بنیاد پڑی تو اس کا بھی دخل تفسیروں میں ہونے لگا، اسی طرح عربی و فارسی کی بہت ساری تفسیریں ایسی ہیں جن میں آیات کی تشریح و توضیح میں مستخرج احکام کے بارے میں متقدمین مفسرین کے جو مختلف اقوال منقول ہیں ان سب کو نقل کرتے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ان اقوال میں سے ہر ایک کی دلیل بھی بیان کر دیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ارباب علم تو ان سے استفادہ کر لیتے ہیں لیکن عوام الناس کا ذہن اس علمی پیچیدگی میں الجھ جاتا ہے، اس کے علاوہ مفسر کوشش کرتا ہے کہ وہ فقہ یا علم الکلام کے جس مسلک سے تعلق رکھتا ہو اس کو قرآن کی آیات سے ثابت کرے اور دوسرے مسلک کے لوگوں کی تردید میں ان سے استدلال کرے، اس طرح قرآن کی تفسیر و تاویل میں ایک ایسا باب کھل جاتا ہے کہ قرآن کی عمومیت اور اس کی جامعیت قید اور محدود ہو جاتی ہے، مولانا نے اس عام روش کے خلاف بالکل ایک نیا طریقہ اور نیا اسلوب اختیار کیا ہے جو قرآن کی عمومیت کے ساتھ ہم آہنگ ہے، مولانا ابوالکلام آزاد اپنی تفسیر میں اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ قرون وسطی کے فلسفیانہ اور منطقیانہ پردوں کو ہٹا کر اس کی اصل فطرت میں

واضح کیا جائے، اور تفسیر بالرائے کا جو دروازہ علوم جدیدہ نے کھولا ہے اسے بند کیا جائے، مولانا عربی زبان اور اس کے اسالیب بیان، صحابہ کرام کے اقوال اور قدماء مفسرین کی تشریحات وتوضیحات کی روشنی میں کامل غور وخوض کے بعد قرآن کی آیت کا ایک مطلب معین کر لیتے ہیں پھر اس کو کمال قوت وبلاغت کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں، آپ کی تفسیر کو پڑھ کر ایمان کی جلا ہوتی ہے، آپ کے یہاں قرآن کے مفاہیم کو سمجھنے میں یونانی افکار و نظریات کی چھاپ نہیں ہے، وہ قرآنی مطالب کو سمجھنے میں جدید ہیئت اور جدید فلسفہ کا بھی سہارا نہیں لیتے ہیں، وہ قرآن کو قرآن سے ہی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اس سے معانی اور حقائق کے گہر نکالتے ہیں، عربی محاوروں، احادیث نبوی اور اقوال سلف سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔

آپ کے ترجمہ میں جو لطافت، صحت اور برجستگی ہے وہ کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتی، مولانا کو چوں کہ عربی اور اردو دونوں ہی زبانوں پر دسترس حاصل تھی اس وجہ سے ان کا ادبی معیار کافی بلند تھا، وہ محض معنی ہی کا خیال نہیں رکھتے بلکہ موزونیت، مقام اور اردو زبان کے مزاج کا بھی خیال رکھتے ہیں، آپ ایک طرف تو اس فطرت اور سادگی کا رشتہ برقرار رکھتے جو قرآن کے اسلوب بیان کی نمایاں خصوصیت ہے اور دوسری طرف جہاں کہیں قرآن کی کسی تاریخی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے سائنٹفک طریقہ استدلال کی ضرورت ہوتی ہے وہاں تحقیق وتدقیق اور بحث ونظر کا حق ادا کر دیتے ہیں، مولانا کا اسلوب بیان وہی ہے جو قرآن کا ہے، یعنی حکیمانہ ہونے کے ساتھ ساتھ خطیبانہ بھی ہے، اس میں وعد بھی ہے اور وعید بھی، تبشیر بھی ہے اور انذار بھی، کہیں نسیم جاں فزا ہے اور کہیں برق ساعقہ فگن، اس لئے قدرتی طور پر اس کا اثر ہوتا ہے، اور قاری میں ہیجانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، مولانا کا یہ طرز ادا اور اسلوب بیان ان کے ہر مذہبی مضمون میں نمایاں ہے، لیکن جہاں تک ترجمان القرآن کا تعلق ہے، تو یہ شراب دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ ہو گئی ہے۔

24.2.2 ترجمہ کی خصوصیت

ترجمہ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ اصل زبان سے واقف نہیں ہیں وہ ترجمہ کے ذریعہ عبارت کا مفہوم ومطلب سمجھ جائیں مگر عام طور پر قرآن کے جو تراجم اردو میں پائے جاتے ہیں ان سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا، کیوں کہ تراجم لفظی بلکہ تحت اللفظی ہیں اور ان سے مقصد اخذ کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے، اس قسم کے تراجم کے خلاف مولوی نذیر احمد دہلوی نے ترجمہ قرآن میں دلی کی بولی ٹھولی کو اس درجہ دخل دیا کہ بعض مقامات پر قرآن مجید کی سنجیدگی اور ثقاہت مجروح ہو گئی، لیکن مولانا نے نہ وہ راہ اختیار کی نہ یہ، ایک طرف قرآن کی عظمت وثقاہت کا پورا خیال رکھتے ہیں اور ایسا کوئی لفظ آنے نہیں دیتے جو قرآن کے مرتبہ ثقاہت سے فروتر ہو اور دوسری جانب ترجمہ کی ترتیب اس طرح قائم ہے کہ وہ اپنی وضاحت میں کسی کا محتاج نہیں، بلکہ ایک عالم کی طرح ایک عام اردو خواں بھی پڑھ سکتا ہے، آپ کے ترجمہ میں عربی کی اہمیت قریب قریب ترجمہ میں باقی رہتی ہے اور زبان کا لطف بھی زائل نہیں ہوتا، دوسرے مترجمین اس قدر شدت کے ساتھ ترجمہ میں لفظی پابندی کرتے ہیں کہ جملہ کا کہیں سراغ نہیں ملتا، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ترجمہ کے مطالعہ سے دماغ میں ایک قسم کی الجھن پیدا ہو جاتی ہے اور عقیدت مند دل کسی اچھے اور بامحاورہ ترجمہ کا متقاضی ہوتا ہے، پھر مولانا نے صرف ترجمہ پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ جابجا نوٹوں کا بھی اضافہ کیا ہے جن میں مطالب قرآن کی تفسیر وتوضیح ہو گئی ہے، قرآن میں جو حکم مجمل تھا اس کی تفصیل لکھی تا کہ قرآن

کے اصل مطلب کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو، اور جہاں جہاں قرآن کے کسی مطلب کو واضح کرنے کے لئے دلائل وشواہد کی ضرورت وہاں دلائل وشواہد ہیں، اس طرح یہ ترجمہ خود مستقل افادیت کا حامل ہے۔

24.3 مولانا ابو الکلام آزاد کی سیاسی خدمات

ہندوستانی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جس نازک دور میں فہم وبصیرت کے ساتھ مولانا ابو الکلام آزاد نے جو سیاسی خدمات انجام دی ہیں وہ اپنے آپ میں بے مثال ہیں اور شاید ہی تاریخ اپنے آپ کو دہرائے، یہ ہندستان کی خوش قسمتی ہے اسے تحریک آزادی کے دوران ایسی قد آور شخصیتیں میسر آئیں جن کا مثیل ملنا دشوار ہے، مولانا آزاد نیشنلسٹ اور جمہوری نظام کے علم بردار تھے، ملک کی سیاست نے بہت سی کروٹیں لیں، بڑے سے بڑے لیڈر ادھر سے ادھر ہو گئے لیکن مولانا آزاد کے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے۔

الہلال کے اجراء سے پہلے آپ بنگال کے انقلابیوں سے متاثر تھے، ہندستان میں مسلح بغاوت کی تیاریوں میں لگے ہوتے تھے، ایک طرف بنگال کے انقلابیوں سے تعلقات استوار تھے دوسری طرف سرحد کے قبائل میں ان کے آدمی کام کر رہے تھے اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور مولانا عبید اللہ سندھی سے بھی رشتہ مضبوط تھا لیکن کچھ ہی وقت گزرنے کے بعد آپ کے خیالات میں تبدیلی آگئی اور آپ سمجھ گئے کہ ہتھیاروں کے زور پے انگریزوں کو نہیں نکالا جاسکتا، آپ کی سیاسی زندگی کا اصل موڑ اس وقت آیا جب آپ 1920ء میں رانچی کی نظر بندی سے رہا ہونے کے بعد پہلی دفعہ گاندھی جی سے ملے، اور گاندھی جی نے تحریک خلافت کے ساتھ اپنی عملی وابستگی کا اظہار کیا اور اسی کے ساتھ عدم تعاون کی تحریک کا آغاز ہوا، جس نے ایک طرف ہندستان میں برطانوی حکومت کی جڑیں ہلا دیں اور دوسری طرف ہندو مسلم اتحاد کی روح پرور مناظر سامنے آئے، 1920ء سے 1930ء تک کانگریس نے آزادی کے لئے جتنی بھی تحریکیں چلائیں ان میں ایک ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں نے بڑھ چڑھ حصہ لیا، یہ سب مولانا آزاد کی کوششوں کا نتیجہ تھا، چنانچہ کانگریس نے جب 1930ء میں نمک ستیہ گرہ شروع کیا اور گاندھی جی نے ڈانڈی مارچ کیا تو تقریبا چار ماہ کے اندر جیل بھر گئے، ستر ہزار کے لگ بھگ سیاسی قیدی بنائے گئے جن میں چوبیس ہزار کے قریب مسلمان تھے۔

مولانا ابو الکلام آزاد کے سیاسی میدان میں داخل ہونے سے پہلے ہندستانی تحریک آزادی انگریزوں کے سامنے کچھ لو کچھ دو انداز میں کام کر رہی تھی، لیکن آپ نے بنا کسی سودے کے مکمل آزادی کی بات کی، گاندھی جی کے ساتھ مل کر ابو الکلام آزاد نے تحریک آزادی کو صحیح معنوں میں ایک قومی تحریک بنایا، آپ نے ہندو اور مسلم دونوں کو اس تحریک سے جوڑا، آپ صحیح معنوں ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے، آپ کا کہنا تھا کہ "اگر بادلوں سے اتر کر ایک فرشتہ قطب مینار کی چوٹی پر چڑھ جائے اور یہ اعلان کرے کہ ہندستان کو آزادی آج ہی مل سکتی ہے بشرطیکہ ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جاؤ، لیکن میں ہندو مسلم اتحاد کو نہیں چھوڑوں گا کیوں ہمیں آزادی نہ ملی تو یہ ہندستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہندو مسلم اتحاد قائم نہ رہ سکا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہوگا"۔ آپ مذہبی، سماجی اور سیاسی ہر طرح کے اتحاد ویگانگت کے داعی تھے، آپ نے ملک کے علاقائی بنیادوں پر ہونے والے اختلاف کے خلاف بھی آواز اٹھائی، آپ کے دور میں بعض صوبوں کے لوگ

صوبائی عصبیتوں کے قائل ہو رہے تھے، خصوصا بنگال کے لوگ "مائی بنگال" کے نعرے لگ رہے تھے، آپ نے کہا کہ یہ چیز انڈین نیشنلٹی کے لئے سخت مضر ہے، اور اس کے لئے آواز بلند کی اور لوگوں کو متحدہ ہندستان کے شہری بننے کی دعوت دی۔

آپ کو کانگریس کے سب سے کم عمر صدر ہونے کا بھی اعزاز حاصل رہا، آپ نے پہلی دفعہ 15 دسمبر 1923ء کی دہلی کے خصوصی اجلاس کی صدارت کی، یہ اجلاس کانگریس کی لیڈر شپ کے دو گروہوں کو جوڑنے کے لئے تھا، ایک گروہ نسلوں کے حق میں اور دوسرا اس کے خلاف تھا، مولانا نے انہیں اکٹھا کیا اور اختلاف کے بجائے تعاون کا راستہ پیدا کیا، یہ کوئی معمولی چیز نہ تھی، مولانا نے کانگریس کو انتشار سے بچایا اور دونوں گروہوں کے نقطہ نظر میں ہم آہنگی پیدا کرکے باہمی تصادم کو ختم کیا۔

1942ء سے 1945ء تک مولانا ابو الکلام آزاد نظر بند رہے، 1945ء میں ان کی رہائی کے بعد برطانوی حکومت سے حصول آزادی کے لئے مذاکرات ہوئے اور اسی دور میں انتقال اختیارات کا بھی فیصلہ ہوا، یہ سب آپ ہی کے دور صدارت 1940ء تا 1946ء کے درمیان ہوا، یہ آپ کے سیاسی تدبر کا سب سے بڑا امتحان تھا، جس میں آپ کامیاب و کامران ہو کر نکلے، تقسیم ہند کے بعد قومی رہنماؤں نے ملک کا جو دستور بنایا اس کی بنیاد سیکولرازم پر رکھی، اس میں ہر میدان میں مساوی حقوق دئے گئے، یہ ایک بڑا کارنامہ تھا، اس کا کریڈٹ گاندھی، نہرو اور مولانا ابو الکلام آزاد کو برابر جاتا ہے، دستور سازی کے تمام مرحلے میں مولانا عملی طور پر اس سے وابستہ رہے اور جہاں جہاں تک ممکن ہوا بدلے ہوئے حالات کے باوجود دستور ساز اسمبلی کو صحیح راستے سے ہٹنے نہیں دیا۔

تقسیم وطن نے ملک میں جو بہت سارے مسائل پیدا کر دئے تھے اس میں سب سے بڑا مسئلہ مسلمانوں کے اپنے وجود کو قائم رکھنے کا تھا، مسلم لیڈروں کی ایک بڑی جماعت پاکستان جا چکی تھی، ملک میں فسادات کا دور چل رہا تھا، اس وقت مسلمانوں کی ہمت بندھانے اور ان کی رہنمائی کرنے لئے جو شخصیت میدان میں موجود تھی وہ مولانا ابو الکلام آزاد کی تھی، دلی کی جامع مسجد سے مسلمانوں کو جھنجھوڑا، لکھنو کے پلیٹ فارم سے مولانا آزاد نے مسلمانوں سے کہا فرقہ وارانہ بنیادوں پر جماعت سازی کا تجربہ تم کر چکے ہو اور اس کے نتائج بھی دیکھ چکے، اب ملک کی مشترکہ سیاسی جماعتوں میں شریک ہو کر کام کرنے کا تجربہ کرو۔

24.4 مولانا آزاد بحیثیت ادیب

مولانا آزاد اردو ادب کے نثر نگاروں میں ایک امتیازی شان رکھتے ہی، مولانا کی ادبی زندگی کے تین دور قرار دئے جاسکتے ہیں، پہلا بارہ برس کی عمر سے جب انہوں نے اخباروں اور رسالوں میں لکھنا شروع کیا، 28 برس کی عمر تک جب انہوں نے "تذکرہ" تصنیف کیا، دوسرا 1936ء سے شروع ہوتا ہے، اس دور میں آپ زیادہ تر قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کے کام میں مصروف تھے، تیسرا دور 1936ء سے 1945ء تک ہے، اس دوران انہوں نے "غبار خاطر" شائع کی جو دراصل آپ کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جسے نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمان شروانی کے نام لکھے تھے، اس کے بعد آپ حکومتی سرگرمی میں اس قدر مصروف ہوگئے کہ ادبی زندگی کے لئے وقت نکالنا بہت مشکل ہو گیا۔

آپ کے پہلے دور کی تحریروں کا بہترین نمونہ "تذکرہ" جو دراصل مولانا آزاد کی خود نوشت سوانح ہے، اس دور میں آپ سن شباب کو پہونچے ہوئے تھے، اس دوران آپ کے یہاں شدت احساس، شدت اظہار، بے قید تخیل، بے ضبط مبالغہ، غرض وہ سب چیزیں موجود تھیں جسے نقاد رومانی ادب کی خصوصیتیں قرار دیتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ "الہلال" میں آپ کی تحریروں میں اخلاقی شدت پسندی اور انتہائی درجہ خود اعتمادی بھی موجود ہے اور یہ رومانی طرز فکر میں کسی بھی طرح فٹ نہیں بیٹھتی۔

دوسرے دور میں مولانا آزاد کا ذہن سیاست کے جھمیلوں کے باوجود قرآن اور قرآنیات کے مطالعے میں ڈوبا رہا اور ان کا قلم زیادہ تر ترجمہ وتفسیر میں مصروف رہا، اس کا اثر ان کے ادبی طرز پر یہ پڑا کہ شدت احساس کا رخ خود بینی سے خدا بینی کی طرف مڑ گیا، اور زور بیان خود نمائی کی جگہ حق نمائی میں صرف ہونے لگا، مولانا آزاد کے زعیمانہ اسلوب میں ایک نیا کلیمانہ آہنگ پیدا ہو گیا، اس عہد میں بے پناہ صلاحیت اور ایک علم کے بحر ناپید کنار کے بہاؤ کا احساس ہوتا ہے، یہاں نسبتاً زیادہ ٹھہراؤ ہے، تاریک گوشوں اور ان دیکھے زاویوں تک روشنی کی شعاعیں پہونچانے کی خواہش ہے، خطابت کم اور ذہانت، متانت اور علمیت کا وقار زیادہ ہے، یہاں جذبات کو عام کرنے اور ہر دل میں چنگاری جگا دینے کی خواہش کم ہے، زیادہ سے زیادہ لوگوں کے دماغوں میں نئی فکر کے چراغ جلانے کا حوصلہ زیادہ ہے، لہٰذا علمی نثر نے ایک پر سوز تخیل کے سہارے شگفتگی پیدا کرلی ہے، آپ غزل کے شوخ اشعار کی مدد سے اپنی باتیں واضح کرنے میں نہیں ہچکچاتے، یہی وجہ ہے کہ ترجمان القرآن کی پہلی جلد جو سورہ فاتحہ کی تفسیر پر مشتمل ہے، حکیمانہ نکتہ سنجیوں کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں شاعرانہ شوخی سے بھی کام لیتے ہیں، تاکہ حکمت بوجھ نہ معلوم ہو بلکہ باعث کشش نظر آئے، ترجمان القرآن کی نثر کو ہم غالب کے درمیانی دور کی شاعری کی مثال سمجھ سکتے ہیں، لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں مولانا کا یہاں بیان علمی ہے مگر اس میں علم کی خشکی نہیں بلکہ ایک جمالیاتی حسن ہے، اس طرح مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو نثر کو برگزیدیت عطا کی، اسی لئے سجاد انصاری نے کہا کہ اگر قرآن اردو میں اترتا تو اس کے لئے ابوالکلام کی نثر منتخب کی جاتی۔

تیسرے دور میں مختلف عوامل نے مولانا کی طبیعت اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے ادبی اسلوب پر گہرا اثر پڑا، عمر، تجربے اور قومی ذمہ داریوں کے بوجھ نے ان کے مزاج کی لو کو دھیما کر دیا تھا، پھر بیس سال قرآن مجید کے فہم وتفہیم میں مصروف رہنے سے ان کی مذہبی احساس میں سلوک کا رنگ غالب آگیا تھا، اس کے علاوہ مغربی ادب کے مطالعہ نے جس کی طرف مولانا نے اس زمانے میں زیادہ توجہ کی، ان کی فکر میں ضبط واعتدال پیدا کر دیا تھا، چنانچہ "غبار خاطر" کے اسلوب میں جو ان کے اس زمانے کے طرز بیان کی پوری نمائندگی کرتا ہے، دریائے فصاحت کی روانی بدستور قائم ہے، لیکن روسے دریا کی تیزی اور تندی کی جگہ قعر دریا کے جزم وسکون نے لے لی ہے، اب صحت فکر، ہمواری اور توازن نے مولانا کی تحریر میں اس ادیبانہ اسلوب کی شان پیدا کر دی ہے جو جدید مغربی انشاء پردازوں کا طرہ امتیاز ہے۔

ابوالکلام آزاد کی نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے وہ انتہائی مربوط ہوتی ہے، ایک لفظ بھی ادھر سے ادھر نہیں کیا جاسکتا، فعل، متعلقات، مبتداء اور خبر سب میں ایک خاص معنوی ربط ہوتا ہے، ہر ٹکڑا اپنی جگہ پہاڑ کی حیثیت رکھتا ہے، دوسرے انشاء پردازوں کی نثر میں آپ ردوبدل کر کے بہت کچھ حسن اور خوبی پیدا کر سکتے ہیں، مگر ابوالکلام آزاد کو الفاظ اور جملوں کے ربط میں ید طولی حاصل ہے، ان کے ایک جملہ کی ترتیب کو بھی اگر الٹ پلٹ دیا جائے تو بجائے حسن کے قباحت پیدا ہو جائے گی، واقعہ یہ ہے کہ ابوالکلام نثر میں شاعری کرتے ہیں،

آپ کے جملوں کے امتزاج و تالیف سے ترنم کی ایک شان پیدا ہو جاتی ہے، ان کی تحریر پڑھتے وقت زبان لطافت محسوس کرتا ہے، اور سامع پر کیف کی بارش ہونے لگتی ہے، وہ اپنی نثر کے ذریعہ انسانی خیال کو ایک ایسے مقام تک پہونچا دیتے ہیں جہاں سرور کے آبشاروں کا شور سنائی دیتا ہے، اور کیف و نشاط کے چشمے ابلتے ہیں، ان کی تحریر کو پڑھ کر دماغ ذرا بھی بار نہیں محسوس کرتا اور وجدان ایک لمحہ کے لئے بھی پریشان نہیں ہوتا، جملے کے پہلے لفظ سے آخر لفظ تک ایسا دلفریب تسلسل ہوتا ہے کہ طوالت قطعاً ناگوار نہیں محسوس ہوتی، شیرینی، سلاست، گھلاوٹ، نزاکت، لطافت جیسی تمام خوبیوں سے ایک ایک جملہ لبریز ہوتا ہے۔ اسی لئے سید الاحرار حسرت موہانی نے کہا:

جب سے دیکھا ابو الکلام کی نثر　　　　نظم حسرت میں کچھ مزہ نہ رہا

آپ کی تحریروں میں پہاڑی چشمہ کی روانی ہے جو بڑے بڑے پتھروں کو بہا کر لے جاسکتی ہے، کیوں کہ جب دل و دماغ پر اپنے نصب العین کے حصول کا گہرا احساس ہو تو والہانہ نغمے اور روح پرور نعرے زبان پر آتے ہیں، مزید یہ کہ مولانا کو ہزاروں منتخب اشعار، امثال اور اقتباسات یاد تھے لہٰذا اس اتھاہ سمندر سے جو موج اٹھتی تھی اس میں شعر و نغمہ کی دل کشی بھی ہوتی تھی، مولانا کی تحریروں میں علمی اصطلاحات وافر مقدار میں موجود ہے، کیوں کہ مولانا کا علمی سرمایہ بہت بڑا تھا اسی کے ساتھ ساتھ مولانا ایک مفکر بھی تھے، اور مفکر اپنی فکر کے اظہار کے لئے علمی اصطلاحات لانے پر مجبور ہے، اسی کے ساتھ ساتھ آپ کی تحریر کا کمال یہ بھی ہے کہ آپ کے کسی مضمون میں ابہام نہیں شامل ہوتا، آپ صرف الفاظ کی رنگینی اور جملہ کی دلآویزی سے کام نہیں چلاتے بلکہ ہر بات کو کھول کھول کر بیان کر دیتے ہیں، مشکل الفاظ اور جملوں کی دلفریبی کے ساتھ قوی دلائل اس طرح لاتے ہیں کہ مضمون اپنی پوری شرح و تفصیل کے ساتھ دل میں اتر جاتا ہے۔

24.5 مولانا آزاد بحیثیت خطیب

مولانا آزاد اپنے تدبر و تفکر اور علم و فضل کی وجہ اپنے وقت میں ایک نمایاں مقام رکھتے تھے، ہندوستان کے عوام کے درمیان ان کی مقبولیت کی وجہ ان کی بے مثال خطابت تھی، آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ اور شعر و مثل ایسا برمحل استعمال کرتے تھے کہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ گویا وہ اسی جگہ کے لئے بنے ہوں، تقریر کا ملکہ وہبی ہو سکتا ہے، لیکن تقریر محض ملکہ خطابت کا ہی نام نہیں ہے، تقریر میں بنیادی عنصر مواد کا بھی ہوتا ہے، اور مواد کسبی ہوتا ہے اور مواد کے ساتھ زبان کی بھی ضرورت ہوتی ہے، مولانا ابو الکلام کی ذات ان تمام چیزوں پر ید طولی رکھتی تھی۔

مولانا آزاد نے اوائل عمر ہی میں علم و مطالعہ کی وادیاں طے کر لی تھیں، وہ موروثی خطیب تھے، آپ کے والد خود ایک بڑے واعظ تھے، ابتدائی عمر ہی میں والد صاحب نے مولانا کو منبر و محراب پر کھڑا کر دیا تھا، آپ بیس سال کی ہی عمر میں اکابرین کے لئے موجب حیرت تھے، انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں جب پہلی بار خطاب کیا تو مولانا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ شبلی ہکا بکا رہ گئے، ڈپٹی نذیر احمد نے کہا کہ تقریر رٹی ہوئی ہے، ان کے ریمارکس پر مولانا نے کہا ڈپٹی نذیر صاحب عنوان تجویز فرمائیں اسی اجلاس یا اگلے اجلاس میں اسی موضوع پر تقریر کریں گے، انہوں نے موضوع تجویز کیا، مولانا نے تقریر کی تو مجمع لوٹ پوٹ ہو گیا، علامہ شبلی نے انہی

کمالات پر کہا تھا کہ تمہارا دماغ عجائب روزگار میں سے ہے۔

ندوہ کے ایک اجلاس میں مولانا نے اپنے خطیبانہ مہارت سے لوگوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا، 1912ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے اجلاس میں مصر کے مایہ ناز ادیب وخطیب علامہ رشید رضا تشریف لائے تھے، انہیں کی صدارت میں جلسہ ہو رہا تھا، انہوں نے ڈھائی گھنٹہ تک عربی میں نہایت فصیح تقریر کی، آپ کی تقریر سے ایک سماں بندھ گیا، اس اجلاس میں مولانا ابو الکلام آزاد نے اپنی عربی مہارت کا ثبوت دیا، آپ اسی وقت فی الفور علامہ رشید رضا کی تقریر کا خلاصہ اردو میں پیش کر رہے تھے، اردو میں جب وہ خلاصہ پیش کرتے تو ان کی سحر بیانی اور جوش روانی سے لوگ حیرت واستعجاب میں مبتلا ہو جاتے، جب وہ اسٹیج سے اترتے ہیں علامہ شبلی انہیں اپنے گلے سے لگا لیتے ہیں۔

مولانا کی مشہور تقریر کا نمونہ دلی کی شاہجہانی مسجد کا وہ خطاب ہے جب انہوں نے تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کو نصیحت کی تھی، اس کا ایک ایک لفظ آج بھی سینے کو چیرتا ہوا دلوں میں پیوست ہو جاتا ہے، آپ نے فرمایا:

"یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے، اُس پر غور کرو۔ تمہیں محسوس ہو گا کہ یہ غلط ہے۔ اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمہارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہو اور کیوں جا رہے ہو؟ یہ دیکھو۔۔۔ مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ یہیں جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ دہلی تمہارے خون کی سینچی ہوئی ہے، عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو۔ یہ نہ کہو کہ ہم اِس تغیر کے لئے تیار نہ تھے۔ بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تو چمک رہا ہے، اُس سے کرنیں مانگ لو اور اُن اندھیری راہوں میں بچھا دو جہاں اُجالے کی سخت ضرورت ہے، آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے۔ ہم اِسی کے لئے ہیں اور اِس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔ آج زلزلوں سے ڈرتے ہو۔ کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو، کیا یاد نہیں رہا کہ تمہارا وجود ایک اُجالا تھا، "عزیزو! میرے پاس تمہارے لئے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے، چودہ سو برس پہلے کا نسخہ ہے، وہ نسخہ جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا، وہی نسخہ تمہاری حیات کا ضامن اور تمہارے وجود کا رکھوالا ہے، اُسی کا اتباع تمہاری کامرانی کی دلیل ہے"۔

بریلی میں ایک بار ترک موالات کے سلسلے میں جمعیت العلماء ہند نے کانفرنس کا انعقاد کیا، مولانا آزاد صدر تھے، بریلی کے کچھ لوگ ترک موالات تحریک کی مخالف تھے، وہ کسی بھی صورت میں اس کانفرنس کو منعقد نہیں ہونے دینا چاہتے تھے، خون خرابہ تک کا اندیشہ تھا، مولانا کے کچھ ساتھیوں نے خطرہ کے پیش نظر کانفرنس دوسری جگہ کرنے کا مشورہ دیا، مولانا آزاد نے کہا کہ کانفرنس بریلی ہی میں ہو گی، کانفرنس شروع ہوئی تو مخالف جماعت کے خنجر برداروں نے پورا اسٹیج گھیر لیا، سامعین میں بھی انہیں کہ کثرت تھی، مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی کہتے ہیں اسٹیج پر مخالف جماعت کے مقرر مولانا مولانا سید سلیمان اشرف نے اپنی فصیح وبلیغ تقریر سے کانفرنس کو ہلا کر رکھ دیا، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اب اس مسئلہ پر کچھ بھی کہنے کی گنجائش نہیں ہے، لیکن جب مولانا آزاد جوابی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو آپ کی

خطابت سے مجمع مبہوت ہو کر رہ گیا، مولانا آزاد نے جب تقریر ختم کی تو سید سلیمان اشرف نے اٹھ کر اعلان کیا کہ مولانا آزاد نے ہم کو مطمئن کر دیا، اب ہم تحریک ترک موالات کے مخالف نہیں رہے، اس طرح متعدد بار ایسے مواقع پیش آئے جب مخالفین آپ کی تقریروں سے اپنا نقطہ نظر بدلنے پر مجبور ہو گئے۔

مولانا آزاد کی تقریروں کو نوٹ کرنا بہت مشکل کام تھا، مولانا جب مسلمانوں کے مجمع کو خطاب کرتے تو قرآن وحدیث اور اسلامی اصطلاحات کا کثرت سے استعمال کرتے، تقریروں کے دوران اردو فارسی کے اشعار کا بھی بر محل استعمال کرتے، ان کی تقریر کو نوٹ کرنے والا رپورٹر بھی ان کی تقریر کے سحر میں گرفتار ہو جاتا، اس کے لئے تقریر کا نقشہ کھینچنا آسان نہ تھا، آپ کی تقریر محض مضمون نہیں ہوتی تھی، بلکہ آواز کا اتار چڑھاؤ اور اشارات کے رنگ و آہنگ بھی ساتھ ہوتے۔ حکومت ہند کے پبلیکیشنز ڈویزن نے مولانا آزاد کی تقاریر کا انگریزی مجموعہ 1956ء میں شائع کیا، ڈاکٹر مالک رام نے بھی مولانا آزاد کی تقریروں کا مجموعہ 1974ء میں شائع کیا، اس کے علاوہ دیگر کئی اداروں نے بھی مولانا کی خطبات شائع کئے ہیں۔

24.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- ابو الکلام آزاد کو اللہ تعالی نے غیر معمولی فہم و بصیرت سے نوازا تھا، لہذا جو فیصلہ آپ کر لیتے اس پر پوری عزم و ہمت کے ساتھ قائم رہتے اور زندگی کے مختلف اتار چڑھاو میں کبھی اس سے پیچھے نہیں ہٹے، اور آخر کار وہی صحیح ثابت ہوتا، جیسا کہ انہوں نے اپنے سیاسی سفر کا آغاز 1912ء میں اسی وقت کر دیا تھا جب کلکتہ سے "الہلال" کا اجراء کیا، اس وقت ان کی عمر 24 سال تھی، اور جب 1958ء ستر سال کی عمر میں وفات پائی تو اس وقت بھی وہ اسی راستے پر گامزن تھے جو 46 سال قبل انہوں نے اپنے لئے منتخب کیا تھا، یہ راستہ ہندستان کی آزادی تھا جس کی تکمیل آپ کی زندگی ہی میں ہو گئی تھی۔
- مولانا آزاد نے نظم ونثر دونوں میں طبع آزمائی کی، لطیف شعری مزاج آپ کی طبیعت کا انتہائی اہم خاصہ تھا لیکن جلد ہی بحر و قافیہ کی قید سے آزاد ہو گئے، اور مکمل طور پر نثر کی خدمت میں لگ گئے، آپ ایک باذوق اور حساس فن کار تھے، لیکن صلاحیتوں پر سیاسی اور معاشرتی ہنگامہ آرائیوں نے پردے ڈال دئے، مولانا نے جو کچھ لکھا اسی اضطراب اور طوفان خیز فضاوں میں سانس لیتے ہوئے لکھا جہاں کم صلاحیت والے ٹھوکر کھا کر گر جاتے ہیں، مولانا کے دل و دماغ میں علوم وفنون کا ایک دریا موجیں مار رہا تھا جسے وہ دوسروں تک پہونچانا چاہتے تھے، زمانہ مہلت دیتا تو وہ صرف خدمت قلم کرتے، لیکن قومی تقاضوں نے ان پر ایسی ذمہ داریاں ڈال دی تھیں کہ وہ بے اختیاری کے عالم میں میدان کارزار کی طرف دوڑ پڑے اور وہاں سے ایک فرض شناس کی طرح واپسی کی تمام راہیں خود ہی مسدود کر لیں۔
- ابو الکلام آزاد کا مطالعہ اس قدر وسیع ہے کہ متوسط قابلیت کا آدمی اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتا، وہ اکثر ایسی گہری اور جامع باتیں

کہ جاتے ہیں جس طرف عوام کیا خواص کا بھی ذہن منتقل نہیں ہوتا، آپ کا مطمح نظر واپری چھلکا نہیں بلکہ مغز ہوتا ہے، آپ صرف الفاظ کے خوش نما کھلونوں سے ناظرین کو بہلانا نہیں چاہتے اور نہ ہی آپ کا اسلوب خطابت اور اسلوب نگارش داد و تحسین کے حصول کے لئے ہوتا، بلکہ آپ اپنے ہر لفظ سے ایک عملی جوش، حرکت پیدا کرنا چاہتے ہیں، اور سامع اور قاری کے اندر ملک و قوم کی تعمیر کے لئے حرکت و عمل کا جذبہ بیدار کرنا چاہتے ہیں۔

24.7 کلیدی الفاظ

ورطہ حیرت	:	تعجب میں
برجستگی	:	فوری
نسیم جاں فزا	:	ایسی ہوا جو جسم میں امنگ پیدا کردے
برق ساعقہ فگن	:	بجلی گرانے والا
عدیم الفرصت	:	مشغول

24.8 نمونہ امتحانی سوالات

24.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر قرآن کا کیا نام ہے؟

(a). بیان القرآن (b). تفہیم القرآن (c). تدبر قرآن (d). ترجمان القرآن

2. ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر کتنی جلدوں میں لکھی؟

(a).3 (b).2 (c).1 (d).4

3. یہ جملہ کس نے کہا کہ اگر قرآن اردو میں نازل ہوتا تو مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر منتخب کی جاتی؟

(a). علامہ شبلی نعمانی (b). حالی (c). سرسید احمد (d). سجاد انصاری

4. مولانا آزاد نے سب سے پہلے خطاب کہاں کیا؟

(a). جلسہ عام دہلی (b). جلسہ ختم نبوت

(c). انجمن اسلامیہ کالج، پنجاب (d). انجمن حمایت اسلام، لاہور

5. مولانا آزاد نے سب سے پہلے کب کانگریس کے اجلاس کی صدارت کی؟

(a).1923 (b).1925 (c).1942 (d).1945

6. تفسیر ترجمان القرآن کی پہلی جلد کب شائع ہوئی؟

(a).1920ء (b).1932ء (c).1935ء (d).1940ء

7. تفسیر ترجمان القرآن کی پہلی جلد کن سورتوں پر مشتمل ہے؟

(a).سورہ آل عمران تک (b).سورہ نساء تک (c).سورہ فاتحہ تک (d).سورہ مائدہ تک

8. غبار خاطر کس طرح کی کتاب ہے؟

(a) .مقالات کا مجموعہ (b).خطابات کا مجموعہ (c).نظموں کا مجموعہ (d).خطوط کا مجموعہ

9. ابو الکلام آزاد کی خود نوشت سوانح کا کیا نام ہے؟

(a).البلاغ (b).تذکرہ (c).الجامعہ (d).لسان الصدق

10. "تمہارا دماغ عجائب روزگار میں سے ہے" یہ جملہ ابو الکلام آزاد کے لئے کس نے کہا؟

(a).مولانا حسرت موہانی (b).علامہ شبلی نعمانی (c).ڈپٹی نذیر احمد (d).مولانا حالی

24.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. ہندو مسلم اتحاد کے لئے مولانا کی خدمات بیان کیجیے۔
2. مولانا کی خطابت پر روشنی ڈالیے۔
3. ہندستان کی آزادی میں ابو الکلام آزاد کی خدمات بیان کیجیے۔
4. ترجمان القران کے ترجمہ کی خصوصیات پر مختصراروشنی ڈالیے۔
5. مولانا کے ادبی زندگی کے مراحل پر مختصراروشنی ڈالیے۔

24.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. ترجمان القرآن کے بارے مفصل نوٹ لکھیے۔
2. مولانا آزاد کی سیاسی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
3. مولانا آزاد کے ادبی اسلوب پر روشنی ڈالیے۔

24.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. مولانا ابو الکلام آزاد کی صحافت : ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری
2. ابو الکلام آزاد ایک مطالعہ : ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری
3. ابو الکلام آزاد : سورش کاشمیری

بی۔اے، اسلامک اسٹڈیز

چھٹا پرچہ (تحریکات ادارے اور مفکرین)

جملہ نمبرات:70 **وقت:3 گھنٹے**

ہدایات:

1. حصہ اول میں 1 لازمی سوال ہیں جو کہ معروضی سوالات / خالی جگہ کو پر کرنا / مختصر جوابات والے سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے ایک نمبر مختص ہے۔ 10x1=10

i. جمعیت علمائے ہند کا قیام کس سن میں عمل میں آیا؟

(a).1909ء (b).1919ء (c).1920ء (d).1929ء

ii. تبلیغی جماعت کے بانی کا نام کیا ہے؟

(a). مولانا الیاس (b). مولانا یوسف (c). مولانا مودودی (d). مولانا موگیری

iii. جماعت اسلامی ہند کا آغاز کب ہوا؟

(a) .1920 (b).1948 (c).1950 (d).1857

iv. زاویہ کس تحریک کی انفرادی شناخت ہے؟

(a). وہابی (b). نورسی (c). سنوسی (d). نہضۃ العلما

v. اخوان المسلمون کی تحریک کا تعلق کس ملک سے ہے؟

(a). مصر (b). لیبیا (c). ترکی (d). ان میں سے کوئی نہیں

vi. دار لعلوم دیوبند کے بانی کون ہیں؟

(a). مولانا قاسم نانوتوی (b). مولانا رشید احمد گنگوہی (c). مولانا علی مونگیری (d). سر سید احمد خاں

vii. جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام کب عمل میں آیا؟

(a).1920 (b).1947 (c).1998 (d).2000

viii. مجدد الف ثانی کس کا لقب تھا؟

(a). شیخ احمد سرہندی (b). مولانا انوار اللہ خاں (c). شاہ ولی اللہ (d). ان میں کوئی نہیں

ix. بیان القران کے نام سے قرآن کی تفسیر کس سے منسوب ہے؟

(a). اشرف علی تھانوی (b). محمد (c). شاہ ولی اللہ (d). شبلی نعمانی

x. ان میں کون سی تصنیف مولانا ابو الکلام کی نہیں ہے؟

(a). ترجمان القرآن (b). غبار خاطر (c). انڈیا ونس فریڈم (d). بانگ درا

(ب) حصہ دوم آٹھ سوالات پر مشتمل ہے اور پانچ سوالات کے جوابات دینے ہیں ہر سوال کا جواب تقریباً دو سو لفظوں پر مشتمل ہو گا۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبر مختص ہیں۔ **6x1=6**

2. جمیعت علمائے ہند کے مقاصد پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔
3. تبلیغی جماعت کے بنیادی اصولوں پر روشنی ڈالیے۔
4. وہابی تحریک کے بانی کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔
5. نہضۃ العلما تحریک کا تعلق کس ملک سے ہے؟ اس کے قیام کے اسباب پر روشنی ڈالیے۔
6. شیخ عمر مختار کون تھے؟ ان کے کارناموں کو قلم بند کیجیے۔
7. ندوۃ العلما کے آغاز و ارتقا پر ایک جامع نوٹ قلم بند کیجیے۔
8. شبلی نعمانی کی تصنیفی خدمات پر ایک نوٹ قلم بند کیجیے۔
9. علامہ اقبال کے سیاسی افکار پر ایک تبصراتی نوٹ لکھیے۔

(ج) حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں۔ ان میں سے طالب علم کو کوئی تین سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً 500 لفظوں پر مشتمل ہو گا۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبر مختص ہیں۔

10. جماعت اسلامی ہند کی تعلیمی خدمات پر مضمون قلم بند کیجیے۔
11. نورسی تحریک کے ارتقا میں رسائل نور کے کردار پر جامع مضمون تحریر کیجیے۔
12. علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام کے پس منظر اور اس کی خدمات پر ایک تعارفی مضمون تحریر کیجیے۔
13. شاہ ولی اللہ کے حیات و خدمات کا جائزہ پیش کیجیے۔
14. مولانا ابو الکلام کے سیاسی اور مذہبی افکار پر روشنی ڈالیے۔